آج

٦٦

وبھوتی نرائن رائے

خالد طور

شمس الحق عثمانی

ترتیب

اجمل کمال

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

آج: پہلی جلد

ترتیب: اجمل کمال

Rs.795

ارشد محمود

ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ

Rs.200

تیسری جنس

مؤلف: اختر حسین بلوچ

Rs.200

ہوشنگ گلشیری

شہزادہ احتجاب

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

Rs.70

افضال احمد سید

مٹی کی کان

Rs.500

Scanned with CamScanner

ترجمہ:

زیبا علوی

۶۶

آج

ترتیب: اجمل کمال

Scanned with CamScanner

آج

ادبی کتابی سلسلہ شمارہ 66

فروری 2010

سالانہ خریداری:
پاکستان: ایک سال (چار شمارے) 600 روپے (بشمول ڈاک خرچ)
بیرون ملک: ایک سال (چار شمارے) 60 امریکی ڈالر (بشمول ڈاک خرچ)

رابطہ:
پاکستان: آج کی کتابیں، 316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400
فون: 35213916 35650623
ای میل: ajmalkamal@gmail.com

دیگر ممالک:
Dr. Baidar Bakht, 21 White Leaf Crescent, Scarborough,
Ontario M1V 3G1, Canada.
Phone: (416) 292 4391Fax: (416) 292 7374
E-mail: bbakht@rogers.com

Scanned with CamScanner

آج کی نئی کتابیں

آج
(پہلی جلد)

ترتیب: اجمل کمال

Rs.795

ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ
ارشد محمود

Rs.200

تیسری جنس
سندھ کے خواجہ سراؤں کی

معاشرت کا ایک مطالعہ

مؤلف: اختر حسین بلوچ

Rs.200

شہزادہ احتجاب
(ناول)

ہوشنگ گلشیری

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

Rs.70

ریت پہ بہتا پانی
(شاعری)

قاسم یعقوب

Rs.160

اردو کا ابتدائی زمانہ
(تنقید و تحقیق)

(تیسرا ایڈیشن)

شمس الرحمٰن فاروقی

Rs.250

امید اور دوسرے خطرناک مشاغل
(ناول)

لیلیٰ العلمی

انگریزی سے ترجمہ: محمد عمر میمن

Rs.100

اِنکی کے دیس میں
(ناول)

ولاس سارنگ

مراٹھی سے ترجمہ: گوری پٹوردھن، اجمل کمال

Rs.150

Scanned with CamScanner

آج کی کتابیں

کراچی کی کہانی
(جلداول و دوم)
ترتیب: اجمل کمال
Rs.1100

ریت پر لکیریں
(انتخاب)
محمد خالد اختر
Rs.300

قرۃ العین حیدر کے خطوط
ایک دوست کے نام
ترتیب: خالد حسن
Rs.180

انیس
(سوانح)
نیر مسعود
Rs.375

مرثیہ خوانی کا فن
(تنقید و تحقیق)
نیر مسعود
Rs.150

مٹی کی کان
(کلیات)
افضال احمد سید
Rs.500

لغاتِ روزمرہ
(تنقید و تحقیق)
شمس الرحمن فاروقی
Rs.250

آئینۂ حیرت
اور دوسری تحریریں
سید رفیق حسین
Rs.375

منتخب مضامین
(تنقید و تحقیق)
نیر مسعود
Rs.280

کافکا کے افسانے
(افسانے)
نیر مسعود
Rs.70

Scanned with CamScanner

ترتیب

وبھوتی نرائن رائے

7

تبادلہ

(ناول)

❄

خالد طور

225

برچی

(ناولا)

❄

شمس الحق عثمانی

295

ابوالفضل صدیقی کی کہانیاں: فہم ونظر کا اسملاژ

Scanned with CamScanner

سٹی پریس میں دستیاب اردو رسائل وجرائد

سہ ماہی نقاط، فیصل آباد
مدیر: قاسم یعقوب
قیمت: 150 روپے

سہ ماہی دنیازاد، کراچی
مدیر: آصف فرخی
قیمت: 160 روپے

سہ ماہی آئندہ، کراچی
مدیر: محمود واجد
قیمت: 80 روپے

بادبان، کراچی
مدیر: ناصر بغدادی
قیمت: 200 روپے

سہ ماہی ارتقا، کراچی
ترتیب: راحت سعید/ڈاکٹر محمد علی صدیقی
قیمت: 100 روپے

سہ ماہی روشنائی، کراچی
مدیر: احمد زین الدین
قیمت: 250 روپے

سہ ماہی سمبل، راولپنڈی
مدیر: محمد علی فرشی
قیمت: 150 روپے

کتابی سلسلہ اجرا، کراچی
مدیر: احسن سلیم
قیمت: 250 روپے

کتابی سلسلہ مکالمہ، کراچی
مدیر: مبین مرزا
قیمت: 350 روپے

شعر و حکمت، حیدرآباد دکن
مدیر: شہریار، مغنی تبسم
قیمت: ضخامت کے اعتبار سے

سہ ماہی نیا ورق، ممبئی
مدیر: ساجد رشید
قیمت: 120 قیمت

سہ ماہی اردو، کراچی
مدیر: ڈاکٹر ممتاز احمد خان
قیمت: 100 قیمت

ماہنامہ قومی زبان، کراچی
مدیر: ڈاکٹر ممتاز احمد خان
قیمت: 15 روپے

ماہنامہ الحمراء، لاہور
مدیر: شاہد علی خاں
قیمت: 50 روپے

ماہنامہ نیا زمانہ، لاہور
مدیر: محمد شعیب عادل
قیمت: 20 روپے

Scanned with CamScanner

وبھوتی نرائن رائے

تبادلہ

ہندی سے ترجمہ

زیبا علوی

Scanned with CamScanner

انیسویں صدی کے کم و بیش وسط میں برصغیر پر انگریزوں کے نوآبادیاتی تسلط کا جب ایک نیا مرحلہ شروع ہوا اور انھوں نے اس خطے کو معاشی طور سے برطانیہ کی معیشت سے جوڑنے کے عمل کا آغاز کیا — جس کے تحت یہاں ان زرعی اجناس کی کاشت اور پیداوار ہوتی تھی جو برطانیہ کی بڑھتی ہوئی صنعتی معیشت کو درکار تھیں اور انھیں بندرگاہوں تک پہنچانے اور سمندر کے راستے برآمد کرنے کا پورا نظام تیار کیا جاتا تھا — تب ہی بڑے پیمانے پر ان سرگرمیوں کی بھی شروعات ہوئی جنھیں 'ترقیاتی' اور 'تعمیراتی' سرگرمیوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ریلوے، سڑکوں، پلوں، آبپاشی کی نہروں اور مواصلاتی نظام کو تعمیر کرنے کے مقصد سے نوآبادیاتی حکمرانوں نے وہ ادارہ قائم کیا جو پبلک ورکس ڈپارٹمنٹ (PWD) کہلاتا ہے۔ یہ ادارہ ان افسروں اور اہلکاروں پر مشتمل ہے جنھیں اصطلاحاً 'بیوروکریٹ' اور 'ٹیکنوکریٹ' کہا جاتا ہے اور جو اس تمام تعمیراتی کام کی نگرانی پر متعین کیے جاتے ہیں۔ تعمیراتی اور ترقیاتی کام کے لیے 'ٹھیکیدار' نامی مخلوق کو وجود میں لایا گیا جو مقامی مزدوروں کو — شروع شروع میں بیگار کے روایتی طریقے کے تحت اور بعد میں قلیل معاوضے پر — بھرتی کر کے پی ڈبلیو ڈی کی زیرِ نگرانی ان کاموں کو سرانجام دینے لگے۔ اس عمل کے نتیجے میں ٹھیکیدار اور اس کی نگرانی پر متعین سرکاری اہلکار کا اہم اور دلچسپ گٹھ جوڑ وجود میں آیا جس نے گہرے سماجی اثرات مرتب کیے۔ یہ پورا نظام جوں کا توں آج بھی قائم ہے؛ فرق صرف یہ آیا ہے کہ اس گٹھ جوڑ میں ایک تیسرے اور بااثر فریق کے طور پر (منتخب یا غیر منتخب) سیاست کار (وزیر اور ان کے متوسلین) بھی شامل ہو گئے ہیں۔

ہندی کے معروف ادیب وبھوتی نرائن رائے کے طنزیہ ناول تبادلہ کا موضوع یہی نظام اور اس کے مختلف کردار ہیں۔ اپنی بے حد باریک بین قوتِ مشاہدہ اور طنز کی نشتریت سے بھرپور کام لیتے ہوئے انھوں نے ایک کامیاب مختصر ناول تحریر کیا ہے۔ رائے 1950 میں مشرقی یوپی میں پیدا ہوئے، بنارس اور الہ آباد میں تعلیم پائی۔ انگریزی میں ایم اے کرنے کے بعد انھوں نے پولیس سروس میں ملازمت کر لی۔ بطور انسپکٹر جنرل ریٹائر ہونے کے بعد اب وہ وردھا کی مہاتما گاندھی یونیورسٹی سے وابستہ ہیں۔

وبھوتی نرائن رائے کا ایک ناول شہر میں کرفیو اردو میں ایک سے زیادہ بار شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے چار اور ناول شائع ہو چکے ہیں: گھر، قصہ لوک تنتر اور پریم کی بھوت کتھا۔ ان کے علاوہ انھوں نے ہندو مسلم فسادات میں ہندوستانی پولیس کے کردار کے موضوع پر ایک جرأت مندانہ کتاب بھی تحریر کی ہے۔

Scanned with CamScanner

سر پر کمبھ اور تبادلہ! اگر محاورے کی زبان میں کہا جائے تو شری کملا کانت ورما، ضلعے کے ایگزیکیٹو انجینئر محکمۂ تعمیرات، کے لیے یہ کیفیت کسی بجلی گرنے سے کم نہ تھی۔ اکتوبر کا اختتام اور کمبھ میلے کا کام اپنے عروج پر تھا۔ زیادہ تر کاموں کے ٹینڈر مکمل ہو چکے تھے۔ کچھ کام ایوارڈ ہو چکے تھے، کچھ فیصلہ کن مراحل میں تھے۔ میلے کے علاقے کی سڑکیں تقریباً بن چکی تھیں اور پلوں کے لیے ٹین کے پیپے ندی کے کنارے پہنچنے لگے تھے۔ بلیاں، شامیانے، چیکر پلیٹس ڈھیر کے ڈھیر گنگا جمنا کے کنارے پڑے تھے۔ میلے کے علاقے میں جیپ پر سوار ہو کر جب بھی کملا کانت نکلتے تو تقریباً ہر مرتبہ بندھے پر کہیں گاڑی رکوا کر سارے پھیلے ہوئے سامان پر ایک تسلی بخش نظر ڈالتے۔ ان چیزوں سے ٹکراتی ہوئی ہوا کو وہ گہری سانس کھینچ کر اپنے پھیپھڑوں میں بھرتے۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے سرکاری نوٹ چھاپنے کی مشینوں سے ٹکرا کر آ رہی ہو یہ ہوا— ٹھنڈک اور تازگی بخشنے والی۔

ایسے وقت میں تبادلہ! جتنا کچھ خرچ کر کے وہ یہاں آئے ہیں، ابھی تو دسواں حصہ بھی نہیں نکلا، بچت کی بات تو دور رہی۔ اس لیے کملا کانت ورما، جنھیں دفتر میں سب بڑے صاحب کہتے ہیں، دل برداشتہ ہیں اور دفتر کا کمرہ بند کر کے اپنے خاص ماتحتوں کے ساتھ اس حکم نامے پر صلاح مشورہ کر رہے ہیں جسے ابھی ابھی صدر دفتر سے ایک چپراسی تھما گیا تھا۔

کمرے میں ورما صاحب کے علاوہ چار لوگ اور تھے۔ یہ چار افراد مختلف وجوہات کی بنا پر وہاں موجود تھے۔ وہاں ان چاروں کی موجودگی کی در پردہ ایک خاص وجہ تھی۔ بالائی سطح پر دفتر میں اہم تبدیلی ہونے جا رہی تھی اور یہ بالائی سطح کی قیادت کے اہم کردار تھے۔ نوکر شاہی میں بھی سیاست کی طرح ان تبدیلیوں کے رونما ہوتے ہی منھ پھیرنے کا رواج شروع ہو چکا تھا، مگر یہ لوگ کچھ حیادار

لگتے تھے، جو تبادلے کا حکم آنے کے باوجود بھی صلاح مشورہ دینے کے لیے موجود تھے۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چھوٹے موٹے بنانا رپبلکوں کی طرح یہاں بھی ابھی سب کچھ غیر یقینی تھا۔ تختہ پلٹ بھی سکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شاہِ وقت دشمن کے ہاتھی گھوڑوں کو روندتا ہوا واپس قلعے پر قابض ہو جائے۔ ویسے بھی اس صوبے میں نوکرشاہی کے تبادلوں کے احکامات نیلام ہوتے تھے۔ دن میں چار بار بھی ان میں تبدیلی ہو سکتی تھی۔ جو بھی وجہ ہو، یہ چاروں لوگ تبادلے کا حکم آنے کے بعد بھی وہاں تھے اور حکم نامے کو بار بار الٹ پلٹ کر پڑھ رہے تھے۔ سرگوشیاں کر رہے تھے اور بڑے صاحب کو اپنی قیمتی آرا سے مستفیض کر رہے تھے۔

ورما صاحب کے بائیں طرف تھے رضوان الحق جو اس دفتر میں اسسٹنٹ انجینئر تھے۔ پچاس کے پیٹے میں پہنچا ان کا جسم بیماری اور صدمات کی وجہ سے ڈھل چکا تھا۔ پیشانی کے اوپر آدھی صفاچٹ چاند کی وجہ سے ان کی پوری شخصیت گمبھیر قسم کی لگتی تھی۔ وہ کم بولتے تھے اور بغیر مانگے کبھی رائے نہیں دیتے تھے۔ دفتر میں کوئی بھی بڑا صاحب آجائے، ان کی اسی عادت کی وجہ سے انھیں اپنا رازدار بنالیتا تھا۔ لوگوں کو یاد نہیں پڑتا تھا کہ کبھی کسی ایگزیکٹیو انجینئر سے ان کی نہ پٹی ہو۔

جب کملا کانت ورما یہاں آئے تو کچھ دنوں تک ان سے بھڑکتے رہے۔ وجہ صرف یہ تھی کہ وہ سابق افسر کے قریب تھے اور ماضی میں جب ورما اسی طرح کا حکم نامہ لے کے لکھنؤ سے روانہ ہوئے تو ان کے سابق افسر نے اپنے بنگلے پر جو ایک ایمرجنسی میٹنگ کال کی تھی، اس میں بھی وہ شریک ہوئے تھے۔ دفتر میں کچھ دنوں تک حق صاحب کو بے چین دیکھا گیا۔ ان کے مخالفین نے چٹخارے لے لے کر حقیقی، نیم حقیقی، تصوراتی خبریں نشر کرنا شروع کر دیں کہ حق صاحب کو کس کس طرح بڑے صاحب کے کمرے میں گھسنے سے پہلے تین گھنٹے انتظار کرنا پڑا، یا یہ کہ ان کے پاس اب کوئی اہم اسائنمنٹ نہیں رہا، یا یہ کہ جلد ہی بڑے صاحب انھیں ڈزائن سیکشن میں شفٹ کرنے والے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

حق صاحب ان ساری افواہوں سے گھبرائے نہیں۔ دفتر کے تجربہ کار بابوؤں کی طرح انھیں بھی یہ معلوم تھا کہ یہ تو ایک غیر مستحکم دور ہے، یہ ہر بار بالائی سطح پر تبدیلی کے ساتھ آتا ہے؛ پھر چند مہینوں میں سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اس مرتبہ بھی یہی ہوا۔ کبھی عید پڑی، کبھی بقرعید۔ حق صاحب

Scanned with CamScanner

کی بیگم اچھا مرغ پکاتی تھیں اور ورما صاحب کی بیوی کھانے کی شوقین تھیں۔ پہلی عید پر حق صاحب بڑے صاحب کے سرد مہری کے رویے کے باوجود، جو انھیں مبارکباد پیش کرنے کے موقعے پر جھیلنا پڑا تھا، دوہرے ہوتے ہوئے بولے، ''سر، میری فیملی کی بڑی خواہش تھی کہ میڈم اور بچے ہمارے غریب خانے پر تشریف لاتے، مگر آپ اتنے بزی رہتے ہیں کہ عرض کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔ اب میں خود ہی حاضر ہوا ہوں۔ بیگم نے اپنے ہاتھ سے مرغا پکایا ہے، امید ہے بچوں کو پسند آئے گا۔''

مرغا بچوں کو خوب پسند آیا، پر ورما صاحب کی پھانس ابھی کھٹک رہی تھی۔ آنے والے دنوں میں بھی حق صاحب کی بیگم صاحبہ کسی نہ کسی موقعے پر مرغے یا بکرے کی کوئی لذیذ ڈش بنا کر بھیجتی رہیں۔ مخالف کیمپ کا چپراسی بڑے صاحب کے گھر پر تعینات تھا۔ اس سے بات کھلی تو یہ کیمپ چوکنا ہوا۔

ایک شام جب دو ٹفن کیریروں میں بھر کر مٹن قورمہ، چکن مغلئی، مٹن یخنی اور سیخ کباب جیسی چیزوں کے ساتھ جونی واکر بلیک لیبل کی بوتل اس اصرار کے ساتھ پہنچی کہ ''سر، میرا سالا کل سعودی عرب سے آیا ہے، وہی ایرپورٹ سے میرے لیے ڈیوٹی فری اسکاچ لے آیا۔ اب میں نے تو چھوڑ رکھی ہے۔ سالا ٹھہرا نمازی، ہاتھ نہیں لگاتا۔ بیگم نے کہا، بڑے صاحب اس کی قدر جانتے ہیں، انھیں یہ تحفہ دے آؤ۔ ساتھ میں تھوڑا نان ویجیٹیرین بچوں کے لیے لیتے جاؤ۔ پتا نہیں کیسا ہے۔ میم صاحب نے کبھی رائے نہیں دی۔'' مخالف کیمپ متحرک ہو گیا۔ جاسوس چھوڑے گئے، اور جو خبر وہ لے کر آئے، اس سے اس کیمپ کی باچھیں کھل گئیں۔

دوسرے دن بڑے صاحب کے کمرے میں اسٹاف میٹنگ کے دوران جب چائے کا وقفہ ہوا تو ہلکی پھلکی باتوں کے درمیان اسسٹنٹ انجینئر گپتا نے ایسے ہی بے ضرورت حق صاحب سے پوچھ لیا، ''بھابھی کو کب لا رہے ہیں حق صاحب؟ کب تک ماتا دین کے ہاتھ کا کھانا کھائیں گے؟''

حق صاحب نے چونک کر دیکھا۔ وہ بولتے کم تھے مگر دماغ ان کا بڑی تیزی سے حرکت کرتا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ بڑے صاحب کو مخالف کیمپ یہ باور کرانے کی کوشش کر رہا تھا کہ پچھلے دو مہینے سے ان کی بیوی اپنے مائیکے بارہ بنکی گئی ہوئی ہیں اور وہ کریم ڈھابے سے مرغا بنوا کر اپنی بیگم کے نام پر بڑے صاحب کو کھلا رہے تھے۔

Scanned with CamScanner

بڑے صاحب نے چائے کا پیالہ نیچے رکھا اور ہلکے سے چشمہ ہاتھ میں لے کر اسے رومال سے پونچھنے لگے۔ ''بیگم تو بارہ بنکی اور یہاں کے بیچ چکر لگایا کرتی ہیں۔ دراصل سر، جب سے فادر ان لا کی طبیعت خراب ہوئی ہے، انھیں دو جگہ کے انتظام دیکھنے پڑ رہے ہیں۔ ایک ہی بھائی ہے ان کا، جو سعودی عرب میں ہے۔ زمینداری ہے، چھوڑی بھی نہیں جا سکتی، بیگم کو ہی دیکھنی پڑ رہی ہے۔ کل سالا انھیں لے کر آیا تھا۔ آج پھر واپس گئے ہیں وہ لوگ''۔

مخالف کیمپ کے لوگ اس طرح مسکرائے کہ کسی اور کو مسکراہٹ دکھائی دے نہ دے، بڑے صاحب کو ضرور دکھائی دے۔

اپنے ملک میں پچھلے کچھ سالوں میں اور کوئی ترقی ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، پر الیکٹرانک ایکسچینجوں کی بہار ضرور آ گئی ہے۔ محلے محلے میں کھلے پی سی اوز میں سے ایک بارہ بنکی کے لیے متحرک ہوا اور دیر گئے رات تک بیگم حق شہر میں حاضر ہو گئیں۔ مخالف کیمپ والوں کو زور کا دھچکا لگا جب انھیں معلوم ہوا کہ میم صاحبہ کی بیماری کی خبر سن کر، جو کہ بالکل بے بنیاد تھی، بیگم صاحبہ بڑے صاحب کے گھر اگلے دن دوپہر کو حال چال پوچھتی دیکھی گئیں۔ ساتھ میں پچھلے دن سے بڑا ٹفن کیریر تھا۔

بعد میں، جیسا کہ پچھلے کئی موقعوں پر ہوا تھا اور دفتر کے تجربہ کار بابو پہلے سے جانتے تھے، ویسا ہی ہوا۔ وہ بڑے صاحب کی خیر خواہ ٹیم کے ممبر بن گئے اور اسی حیثیت میں آج کے صلاح مشورے میں شامل تھے۔

کمرے میں ورما صاحب کی داہنی جانب بیٹھے ہوئے شخص کی موجودگی کی وجہ بڑی ہی دلچسپ تھی۔ چھوٹے چھوٹے بال، گینڈے جیسی گردن اور ٹوٹے ہوئے کان والے ان حضرت کو کسی اکھاڑے میں ہونا چاہیے تھا۔ وہ دفتر میں تھے، پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا؛ زندگی کے متعلق ان کی سوچ کا لب لباب تھا کہ یہ زندگی بجائے خود ایک اکھاڑا ہے۔ وہ کبھی بھی، کہیں بھی کشتی لڑنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ چونکہ اپنی زندگی کا بیش قیمت حصہ وہ دفتر میں گزارتے تھے، اس لیے اپنی موجودہ زندگی کی زیادہ تر کشتیاں بھی وہ وہیں لڑتے تھے۔ اکثر ان کے ساتھ بات چیت کرنے والوں کو ان کے کشتی کے اس فن کو جاننے کا ایک بہت اچھا موقع ملتا تھا۔ دھوبیا پاٹ ان کا پسندیدہ داؤ تھا، اور دفتر کے برآمدے میں اگر کوئی کارندہ، ٹھیکیدار یا ملاقاتی لنگڑاتا ہوا دکھائی دے جاتا تو بغیر بتائے

Scanned with CamScanner

ہوئے لوگ سمجھ جاتے کہ وہ شخص ان سے کسی بہت سنجیدہ قسم کے موضوع پر تبادلہ خیال کر کے جا رہا ہے۔

دھورولال یادو نامی یہ حضرت جونیر انجینئر تھے اور ڈاکٹر رگھوبیر جیسے جوشیلے ہندی پریمیوں کی محنت کو دھتا بتاتے ہوئے لوگ انھیں جونیئر انجینئر نہ کہہ کر ''جے ای'' کہتے تھے۔ وہ جے ای تھے، اس لیے جب تک بولتے یا لکھتے نہیں تھے، لوگ یہی سمجھتے کہ انھوں نے سول انجینئرنگ میں ڈپلوما ضرور حاصل کیا ہوگا۔ جیسے ہی ان کے مبارک ہونٹوں سے کوئی جملہ نکلتا یا وہ کاغذ پر اپنے پیشے سے متعلق کوئی چیز لکھتے، سامنے والا سمجھ جاتا کہ وہ بھی اُن فیکٹریوں سے نکلا ہوا مال تھے جنھیں ہمارے ماہرین تعلیم اسکول، کالج، یونیورسٹی یا پالی ٹیکنیک کے نام سے پکارتے ہیں اور جو دھڑا دھڑ، سال در سال، ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں دھورولال جیسے ہونہار نکالتے رہتے ہیں۔ انھوں نے پالی ٹیکنیک میں پڑھائی کے علاوہ استعمال ہونے والے دو طریقوں میں سے ایک کا استعمال کر کے ڈپلوما حاصل کیا تھا۔ اور ان کا اپنا دوسرا وضع کردہ طریقہ ڈپارٹمنٹ میں بھی بہت کام آتا ہے، انھیں نوکری کے شروع کرتے ہی اس کا خوب اندازہ ہو گیا تھا۔

دھورولال یادو کے سامنے زندگی کے اوّلین مقاصد بہت واضح تھے۔ ان کے باپ منجھولے درجے کے کاشتکار تھے اور تقریباً بیس عدد گائے بھینسوں کی خدمت گذاری کے سبب اپنے خاندان کو اوسط درجے کے ہندوستانی کسان کی زندگی سے بہتر زندگی دے رہے تھے، لیکن دھورولال اپنے ماحول کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی حوصلہ مند تھے۔ ٹخنے ٹخنے تک گوبر میں ڈوب کر گائے بھینسوں کی خدمت کرنا اور شام کو کان پر ہاتھ رکھ کر برہا گانا، صرف ان دو کاموں تک وہ اپنی زندگی کو محدود نہیں رکھنا چاہتے تھے، لہٰذا انھوں نے پڑھنے کا فیصلہ کیا۔ باپ کے بہت بچے تھے۔ زمانہ بھی بدل رہا تھا۔ اپنے لیے اب ''کالا اکھشر بھینس برابر'' سننا باپ کو کھلنے لگا تھا۔ اس لیے ایک لڑکے کا پڑھنے کی طرف رجحان اس کے لیے خوشی کی بات تھی۔ اس نے اوپری دل سے ''سسری مہنگائی'' کا رونا ضرور رویا لیکن دھورولال کو شہر بھیج دیا۔

بچپن سے ہی دودھ گھی کا سکھ اٹھانے اور باپ کے پسندیدہ محاورے کے مطابق جوتا مار کر صبح صبح اکھاڑے میں ٹھیل دیے جانے کے باعث دھورولال ایک عدد کسرتی بدن کے مالک تھے۔ ان کا

Scanned with CamScanner

قد چھ فٹ سے کچھ اوپر تھا، دونوں طرف کے کان ٹوٹے ہوے تھے، رنگ گندمی اور آواز لٹھ مار حد تک بے ہنگم تھی۔ یہی ساری چیزیں ان کی پونجی تھیں۔ سب سے پہلے یہ پونجی پالی ٹیکنیک میں کام آئی۔

پالی ٹیکنیک میں پہنچنے کے پہلے دو تین ہفتے میں ہی یہ بات واضح ہوگئی کہ قومی زبان ہندی میں چھپی درسی کتابیں ان کے لیے یونانی اور لاطینی کی اعلیٰ شاعری کی کتابوں کے مانند تھیں۔ دھورو لال یادو کے ایماندار دل نے انھیں صلاح دی کہ بھاگ چل پیارے! کہاں پھنس گیا؟ زندگی ان کتابوں سے پرے زیادہ خوش کن ہے۔ درجہ آٹھ میں کسی شاعر نے، جس کا نام ظاہر ہے کہ وہ بھول چکے تھے، صحیح لکھا تھا کہ ''اہا! گرام جیون بھی کیا ہے، کیوں نہ اسے سب کا من چاہے۔'' لیکن کاشی پھل دودھ دہی گھی کے ساتھ ساتھ بھوسا، گوبر اور باپ کے جوتے کا ایسا تکون فلیش بیک کی طرح سامنے آتا کہ وہ تو وہ، ان کا ایماندار دل بھی کانپ اٹھتا۔ انھوں نے اپنے دل کی ان سنی کردی اور کامیابی کے گر دوسری جگہ تلاش کرنے شروع کردیے۔

ہندوستانی سوسائٹی میں برادری ایک بہت بڑی طاقت ہے۔ دھورو لال کے کام بھی یہی طاقت آئی۔ پہلے ریگنگ (ragging) کے وقت بھی یہی طاقت ان کے ساتھ ساتھ رہی۔ ریگنگ سے تو ان کا ڈیل ڈول اور ٹوٹے ہوے کان بھی نمٹ لیتے، مگر پڑھائی میں معاملہ کچھ دوسرا تھا۔ ان کی برادری کے سینیئروں نے ان کو بتایا کہ صوبے کے دوسرے پالی ٹیکنیکوں کی طرح اس پالی ٹیکنیک میں بھی کامیابی کے لیے پڑھائی کے علاوہ دو راستے تھے۔ پڑھائی تو خشک قسم کے طالب علم کرتے تھے؛ ہوشیار دھورو لال کو تو باقی دو راستوں میں سے ایک کو چننا تھا۔

پہلا راستہ تھا طاقت کے برتے پر، اور دوسرا تھا دولت کے بل بوتے پر۔ طاقت کے بل بوتے پر پہنچنے والے طلبا کٹا یا چاقو میز پر رکھتے اور آرام سے کتابیں کھول کر نقل کرتے۔ ان طاقتور طالب علموں کی صلاحیت و اہلیت سال کے شروع ہی میں پہچان لی جاتی اور اساتذہ کا کوئی نہ کوئی گروپ ان کے سر پر نرم ہاتھ رکھ دیتا۔ طاقت کے بل بوتے پر یہ گروہ اپنے مخالف اساتذہ کو پٹواتا یا گالیاں دلواتا رہتا اور امتحان میں انھیں پرچہ آؤٹ کرانے سے لے کر چھوٹی چھوٹی پرزیوں پر جواب لکھ کر پہنچانے تک کا کام کرتا۔

دوسرا راستہ تھا دولت کی طاقت کا۔ جس وقت دھورو لال پالی ٹیکنیک پہنچے، ہندوستانی سماج میں

Scanned with CamScanner

بہت کچھ بدل رہا تھا۔ تعلیم کی دنیا بدل رہی تھی اور اس سے جڑے استاد بدل رہے تھے۔ وہ دولت مند طالب علموں سے ایک اچھی رقم وصول کر کے انھیں دوڑ سے پہلے ہی آگے کر دیتے۔ آج کے استاد کا وہ کردار نہیں رہا تھا کہ غریب طالب علم اپنے انگوٹھے کا نذرانہ انھیں پیش کر دے۔ پرنسپل اور کالج کے منیجروں نے نقل کو ایک مستقل روزگار کا ذریعہ بنا دیا تھا۔ ہر چیز کے ریٹ مقرر ہو گئے تھے۔ اگر انھیں مقررہ کمرۂ امتحان میں نقل کرانی تھی تو اس کی ایک قیمت تھی، کسی الگ کمرے میں بیٹھ کر کسی مددگار سے امتحان کی کاپی لکھوانا ہوتا تو اس کی دوسری قیمت تھی، اور اگر کوئی طالب علم چاہتا تھا کہ اسی سبجیکٹ کا استاد اس کے پاس کھڑا ہو کر املا دے تو اس کی فیس سب سے مختلف تھی۔

دھورو لال نے پہلا راستہ چنا۔ وہ ایک ایک کر کے سارے درجے پاس کرتے گئے۔ یہ طریقہ امتحان پاس کرنے کے علاوہ نوکری میں بھی ان کے کام آیا۔ شروع میں جب وہ اس دفتر میں آئے، ان کا سراپا پہلے ہی یہاں پہنچ چکا تھا۔ اپنے مضبوط گٹھیلے جسم اور کرخت لہجے کے ساتھ وہ ایک اینٹی اسٹیبلشمنٹ عنصر بن کر اس دفتر میں گھسے۔ تقرر نامے کے مطابق جس وقت انھیں وہاں ہونا چاہیے تھا، اس سے وہ صرف پانچ مہینے لیٹ تھے۔ ہوا یہ کہ سرکاری نوکری ملنے سے پہلے انھیں کہیں کسی دوسرے ملک میں نوکری دلانے کا جھانسا کسی ایجنٹ نے دیا تھا۔ اس طرح اس سرکاری نوکری کا تقرر نامہ وہ جیب میں رکھے باہری نوکری کے لیے دوڑتے رہے اور آخر میں مایوس ہو کر پانچ مہینے بعد اس دفتر میں پہنچے۔ پہنچتے ہی ان کے اور بڑے بابو کے درمیان بہت ہی قانونی قسم کی بحث چھڑ گئی۔ بڑے بابو کے مطابق کوئی بھی تقرر نامہ کسی خاص مدت کے لیے ہی لیگل ہوتا ہے نہ کہ پانچ مہینے تک۔ ان کے مطابق دھورو لال یادو کو پھر سے جا کر اپنے تقرر نامے کو ری نیو کرانا چاہیے تھا۔ اس کے برعکس دھورو لال اس بات پر مصر تھے کہ ایک بار تقرر نامہ ملنے کے بعد ریٹائرمنٹ کی عمر تک لیگل رہتا ہے۔ انھوں نے بڑے بابو کو چیلنج بھی کیا کہ وہ ایک بھی قانون ایسا دکھا دیں جس کے مطابق کوئی بھی تقرر نامہ پانچ مہینے کے بعد منسوخ ہو جاتا ہے۔ بڑے بابو کوئی بھی ایسا قانون نہیں دکھا پائے، پھر بھی بڑے بابو کو آزمائش سے نکالنے کے لیے انھوں نے بہت دھیمے لہجے میں التجا کی کہ انھیں پانچ مہینے پہلے کی مقرر کردہ تاریخ میں ہی جوائن کرنے دیا جائے۔ بڑے بابو جو دفتر کے دوسرے بابوؤں کی طرح ان کے گٹھے جسم اور منھ میں ٹھونسے ہوئے پان کی وجہ سے ''کیا تعریف کی جائے'' والے انداز

Scanned with CamScanner

سے انھیں تک رہے تھے، ان کی اس التجا پرتن کر ایک دم سے بڑے بابو بن گئے۔ انھوں نے اپنی تین سال کی بابوگیری کا نچوڑ فنانشیل ہینڈ بک کے فلاں چیپٹر اور فلاں پیرا اور گورنمنٹ سرونٹس کنڈکٹ رولز چیپٹر نمبر اتنے اتنے کے حوالوں سے مثالیں دینا شروع کر دیں، جسے دھورو لال کافی بے دلی اور بے صبری کے ساتھ جھیلتے رہے۔ اسی لیے پبلک سیکٹر اس ملک میں ناکام ہو رہا ہے، انھوں نے مایوسی سے سوچا اور ہوا میں منھ اٹھا کر کسی تصوراتی شخص کی ماں بہن کے ساتھ اپنے جسمانی رشتے قائم کرنا شروع کر دیے۔ بڑے بابو اگر کافی موٹی چمڑی کے نہ ہوتے تو ان رشتوں کو اپنے لیے ہی سمجھ لیتے، پر وہ لاتعلقی ظاہر کرتے ہوئے کسی دوسری فائل میں ڈوب گئے۔ دوسرے بابوؤں نے ضرور آنکھیں مٹکائیں، ایک دوسرے کو دیکھ مسکرائے اور اپنے جذبات کے مطابق ان باتوں کی وضاحت کی کوشش اندر ہی اندر کرنے لگے کہ شری دھورو لال جن خواتین کی عزت افزائی کے قصیدے پڑھ رہے تھے، وہ بڑے بابو کی ہی بیوی بیٹیاں تھیں۔

بڑے بابو نے بھارتی نوکر شاہی کا ٹکا بندھا اصول پکڑ لیا۔ جب کوئی فیصلہ نہ کرنا ہو تو فوراً فائل پر لکھو: "بات کریں۔" یہاں ان کے نیچے کوئی ایسا نہ تھا جس کے پاس "پلیز اسپیک" لکھ کر وہ فائل بھیج سکتے اور موت کے فرشتے کی طرح دھورو لال سامنے کھڑے تھے، اس لیے وہ بھنبھناتے ہوئے خود ہی ان کا تقرر نامہ لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور بڑے صاحب کے کمرے کی طرف بات کرنے کے لیے بڑھ گئے اور دو تین گھنٹے تک نہیں لوٹے۔

ان دو تین گھنٹوں کا بڑے صاحب کے مخالفین نے جم کر استعمال کیا۔ دوسرے دفتروں کی طرح اس دفتر میں بھی کام ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو، سیاست خوب ہوتی تھی۔ کوتلیا کی کتاب ارتھ شاستر میں کوتلیا نے سینکڑوں برس پہلے سیاست اور جاسوسی کے رشتے کی جو تعریف دی تھی اس پر دفتر بڑی عقیدت مندی سے عمل پیرا تھا۔ جاسوسی ایجنسیوں کی طرح یہاں رازوں اور خبروں کی کترنیں اخباروں سے نہیں اُپجتی تھیں بلکہ انھیں حاصل کرنے کے لیے محنت کی جاتی تھی، اس لیے اکثر ان میں کچھ دم بھی ہوتا تھا۔ دھورو لال یادو کا کمرے میں داخل ہونا، بڑے بابو کے ساتھ ان کے ڈرامائی انداز کے مکالمے اور بابوؤں کے ردعمل کے بیچ اچانک جیسوال نامی ٹھیکیدار کیوں بابوؤں کی خدمت میں لایا گیا مگھئی پان کا آدھے سے زیادہ بھرا پُڑا تیواری بابو کی میز پر چھوڑ کر کمرے سے غائب

Scanned with CamScanner

ہو گیا؟ اس بات کا پتا لگانے کے لیے اشوک کمار شکلا، اسسٹنٹ انجینئر (اے ای)، کے کمرے میں چلنا پڑے گا جو اس کمرے سے تین کمرے دور تھا اور جس میں چورسیا نامی ایک دوسرے اے ای یعنی اسسٹنٹ انجینئر بیٹھتے تھے اور اس وقت کسی سائٹ پر گئے ہوئے تھے۔ اگر وہ ہوتے تو یہ میٹنگ کہیں اور ہوتی۔ ان کے وہاں نہ ہونے سے ہی دھورولال وہاں مدعو کیے گئے تھے، کیونکہ ان کے بارے میں شکلا کا خیال تھا کہ وہ بڑے صاحب کے جاسوس تھے اور انھیں اس کمرے میں بٹھایا ہی اس لیے گیا تھا کہ وہ شکلا اینڈ کمپنی کی نگرانی کر سکیں۔

اسی کمرے میں دھورولال یادو کی دفتری تربیت شروع ہوئی تھی۔

کمرے میں دو میزیں تھیں۔ دو میزیں اس لیے تھیں کہ صرف دو ہی میزیں اس میں آسکتی تھیں۔ دونوں میزوں کے پیچھے ایک ایک کرسی تھی۔ ایک کرسی کا ایک ہتھا اکھڑا ہوا تھا اور پیچھے کے تانت بھی جگہ جگہ سے ٹوٹے ہوئے تھے؛ اس پر شکلا بیٹھے ہوئے تھے۔ دوسری کرسی گھومنے والی تھی اور اس پر نہ صرف ایک میلی سی گدی تھی بلکہ پیچھے ایک لحاف بھی تھا جو شروع میں ضرور سفید رہا ہوگا، پر اب بدرنگ ہو چکا تھا۔ کرسیوں کی یہ حالت دفتر میں بڑے صاحب سے قربت کا پیمانہ تھی۔

دونوں میزوں کے سامنے دو کرسیاں تھیں۔ چار میں سے کوئی کرسی ثابت نہیں تھی۔ کسی کے پیچھے کے تانت ٹوٹے تھے، کسی کے نیچے کے، کسی کا ہتھا ہل رہا تھا تو کسی کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے۔ میزوں پر بے ترتیب فائل کور، کاغذ، پیپر ویٹ اور پان کے خالی کھوکھے پڑے ہوئے تھے۔ پورے کمرے میں سگریٹ کے ٹکڑے اور راکھ بکھری ہوئی تھی اور کمرے کے ہر کونے کی دیواریں پان کی پیک سے ایبسٹریکٹ آرٹ کا نمونہ پیش کر رہی تھیں۔ دفتر میں بڑے صاحب کے کمرے کو چھوڑ کر سبھی کمروں کی ایسی ہی حالت تھی اور اس کمرے میں بھی دوسرے کمروں کی طرح سرکاری کام کے علاوہ سب کچھ ہوتا تھا۔

اسی کمرے میں دھورو لال یادو نے نوکر شاہی کی تربیت پائی تھی۔ انھیں چورسیا ٹھیکیدار کنکھیوں سے اشارہ کرتے ہوئے یہاں تک لے آیا تھا۔

کمرے میں شکلا نامی اسسٹنٹ انجینئر یا اے ای کے علاوہ دو جے ای اور ایک بابو پہلے سے ہی تھے۔ چھوٹے کمرے میں انھوں نے سامنے پڑی کرسیوں کا رخ اس طرح موڑ رکھا تھا کہ پہلی بار

Scanned with CamScanner

داخل ہونے پر کسی گول میز کانفرنس کا سا ماحول لگتا تھا۔ کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں پڑی، دھورولال نے چوتھی خالی پڑی کرسی پر قبضہ کرلیا۔ جیسوال نے چاروں طرف اس طرح دیکھا جیسے اس کے دیکھنے سے وہاں کوئی کرسی پیدا ہوجائے گی۔ ابھی اس کی حیثیت ایسی نہیں تھی کہ شکلا اسے چورسیا کی کرسی پر بیٹھنے کو کہتے، اس لیے تھوڑی دیر ادھر اُدھر دیکھ کر وہ ''ابھی پان لے کر حاضر ہوتا ہوں'' جیسا کوئی جملہ بڑبڑا کر غائب ہوگیا۔

''آیئے... آیئے، یادو جی۔ ڈپارٹمنٹ میں آپ کا سواگت ہے۔''

دھورولال کچھ کسمسائے۔ اس طرح کے بے تکلف ماحول کے وہ عادی نہیں تھے۔ انھوں نے گمبھیر ہوکر انگریزی میں ''تھینک یو'' سے ملتا جلتا کچھ کہا۔

کمرے میں موجود آٹھ جوڑی شاطر آنکھوں نے ان کا معائنہ شروع کردیا۔ بیچ بیچ میں یہ آنکھیں ایک دوسرے کو اپنے اندازے بھی دے رہی تھیں۔ ہے پٹھا زوردار! ایسا آدمی جو جسمانی طور سے مضبوط اور دماغی طور سے کمزور ہو، ان کے لیے بڑے کام کا تھا۔

دھورولال کو کمرے کا ماحول گھبراہٹ پیدا کرنے والا لگ رہا تھا۔ وہ وہاں موجود لوگوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی خود اعتمادی ظاہر کرنے کی بیچ بیچ میں کوشش کرتے مگر جلد ہی ان کی آنکھیں جھک جاتی تھیں۔ ان کے لیے یہ ایک دم اجنبی دنیا تھی۔ اگر کوئی کہتا کہ وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کسی کو جوتا اتار کر مارو تو وہ بہت خوش ہوتے، مگر یہاں تو معاملہ 'اکراس دی ٹیبل'' یعنی میز کے آر پار تھا۔ دوسرے کھلاڑی زیادہ منجھے ہوئے تھے، اس لیے وہ پھنستے گئے۔

''جوائن کرلیا؟'' بغل میں بیٹھے بابو نے بھولے پن سے میٹھے لہجے میں پوچھا۔

''کریں گے۔ بڑے بابو کو جوائننگ لیٹر دے دیا ہے۔'' دھورولال نے اپنی خود اعتمادی برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

''سالا ایک نمبر کا پاجی ہے۔ جوائن کرتے وقت تاریخ دیکھ لیجیے گا۔''

''در حرامی ہے صاحب۔ بغیر پیسہ لیے پادتا بھی نہیں ہے۔ ایک پیسہ بھی مت دیجیے گا۔ جوائن تو اس کے باپ کرائیں گے۔''

''اتنا آسان مت سمجھیے گا مشرا بابو۔ پچھلی بار اُپادھیائے کا کیس نہیں یاد ہے؟ بیچارہ کتنے دن

Scanned with CamScanner

یہاں سے لکھنؤ دوڑا۔ بس اتنی غلطی تھی کہ اپادھیائے بیچارہ تین دن لیٹ آیا تھا۔ سالے نے اس کے ہزاروں روپے خرچ کرادیے، جب جاکر کہیں جوائن کرنے دیا۔''

دھورولال کے کان کھڑے ہوگئے۔ وہ تو پانچ مہینے لیٹ ہیں۔

''پر یہ سب سالے جوتے کے یار ہیں۔ آپ نے اچھا کیا کہ سالے کی ماں بہن ایک کردی۔ اب آپ سے یہ شرافت سے بولے گا۔'' اچھا تو شہرت یہاں تک پہنچ گئی! وہ خوش ہوے۔

یہ ایک لمحے بھر کی خوشی تھی۔ آنے والے دنوں میں جو خوفناک امکانات ان کے سامنے رکھے گئے، ان کے مطابق کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ وہ پانچ ماہ لیٹ تھے (بغیر بتائے یہ بات کمرے کے اس دستے کو معلوم تھی)۔ بڑا بابو انھیں جوائن کرنے دینے سے انکار کرسکتا تھا۔ اور بھی کچھ ہوسکتا تھا۔ مثلاً ان کی تقرری منسوخ ہوسکتی تھی، ان کی سینیارٹی خطرے میں پڑ سکتی تھی یا اس جیسا کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ خوداعتمادی قائم رکھنے کی کوشش کرتے کرتے وہ روہانسے ہوگئے۔ کھنکھار کر انھوں نے گلا صاف کیا اور جو کچھ انھوں نے پوچھا اس کا مطلب یہ تھا کہ اب انھیں کیا کرنا چاہیے۔

انھیں بتایا گیا کہ اب ان کے پاس تین طریقے بچے ہیں:

پہلا یہ کہ وہ ہائی کورٹ کی پناہ میں جائیں جو خوش قسمتی سے اسی شہر میں تھا، اور جہاں معطلیاں، تبادلے یا ایسے معاملات جو سرکاری ملازمین کو درپیش ہوں، جاتے تھے۔ مشکل تھی تو بس یہ کہ وکیلوں پر انھیں چند ہزار روپے خرچ کرنے پڑتے، اور اگر ''قسمت کام کرجائے تو پرسوں تک، نہیں تو برسوں تک انتظار کرنا پڑسکتا ہے۔''

دوسرا: وہ شام کی گاڑی سے لکھنؤ چلے جائیں اور کسی زوردار ایم ایل اے کو پکڑ کر کل تک منسٹر کے سامنے حاضر ہوجائیں اور ''جب منتری جی سالے کی خاص جگہ میں ڈنڈا کریں گے تو بڑے بابو کو چھوڑو، بڑا صاحب بے مالا ہاتھ میں لے کر جوائن کرائے گا۔''

تیسرا: وہ وہی کریں یعنی جو ایسے حالات میں پھنسنے پر ان کے جیسے بہادر لوگوں کو کرنا چاہیے۔ یعنی ''نکالیے جوتا اور دیجیے ہنہنا کے۔ لگایئے پچاس اور گنیے پانچ۔ سالا پینٹ میں ہگ دے گا اور جوائن کرائے گا۔''

تینوں متبادل طریقوں پر بڑی سنجیدگی سے صلاح مشورے ہوے۔ عدالتِ عالیہ کا خیال

دھورولال نے خارج کردیا۔ نہ تو ان کے پاس پیسہ تھا اور نہ اتنا صبر و استقلال کہ اگر قسمت ساتھ نہ دے تو وہ کچھ سالوں تک انتظار کریں۔ مشورے دینے والی کمیٹی بھی اس طریقے کے معاملے میں سنجیدہ نہیں تھی کیونکہ اس میں مسالا فلموں کا سب سے اہم جز یعنی ایکشن نہیں تھا۔ بغیر ایکشن کے وہ اس دفتر میں وہ ایک غیر ضروری چیز بنے بیٹھے رہتے اور ساری ملائی بڑے صاحب کے ارد گرد بیٹھے لوگ کھاتے رہتے۔

دوسرے طریقے کے لیے ایک عدد زوردار ممبر اسمبلی درکار تھا۔ بغیر زیادہ زور دیے ان کے دماغ میں جھٹ سے خیال آیا کہ ان کے ایک دور کے ممیا سسر ایم ایل اے زوردار ہیں یا نہیں؟ بار بار پوچھنے پر بھی ان کے پاس کوئی تسلی بخش جواب نہیں تھا کیونکہ ابھی تک ان سے کوئی کام نہیں پڑا تھا۔ مگر ہاں، وہ ہوں گے زوردار، کیونکہ ایم ایل اے ہونے سے پہلے ان پر قتل اور ڈکیتی کے کئی مقدمے درج ہوئے تھے، اتنی دلیل وہ ضرور دے پائے۔ وہ اس وقت لکھنؤ میں ہوں گے، یا ان کے پی ڈبلیو ڈی کے منسٹر سے اچھے تعلقات ہیں، وہاں ہوں گے۔ کیا وہ دھورولال کے پہنچتے ہی ہاتھ میں سوٹا لے کر سکریٹریٹ چل دیں گے؟ سوالات کی ایسی بھول بھلیاں تھیں جس میں پھنسا کر کمرے میں موجود لوگ چالاکی سے انھیں تیسرے طریقے کی طرف دھکیل رہے تھے۔

تیسرا طریقہ دھورولال کو شروع ہی سے پسند تھا، کیونکہ وہ ان کی شخصیت اور سوچ کے مطابق بالکل درست تھا۔

اس طریقے کو سرانجام کیسے دیا جائے، اس پر سنجیدگی سے صلاح مشورے شروع ہوئے۔ اس مشورے میں جیسوال ٹھیکیدار کا کردار بڑا اہم رہا۔ وہ اس عرصے میں پان لے کر لوٹ آیا تھا۔ سب کو باری باری سے پان دکھانے کے بعد وہ چورسیا والی میز پر اس طرح ٹک کر کھڑا ہو گیا کہ دیکھنے والے اپنی اپنی آسانی کے لحاظ سے اسے کھڑا یا بیٹھا سمجھ لیں۔ اس طرح اسے بیٹھنے کا سکھ بھی ملنے لگا اور کمرے میں موجود اے ای اور جے ای اس جیسے ٹٹ پونجیا ٹھیکیدار کے سامنے میز پر بیٹھ کر ڈسپلن توڑنے کے الزام سے بھی بچ گئے۔

جیسوال ٹھیکے دار نے دفتروں میں پٹائی کے بارے میں دھورولال کی عام معلومات میں کافی اضافہ کیا۔ "یادو جی، ابھی تو آپ کو بہت نوکری کرنی ہے۔ ان سالوں کو جوتے کی نوک پر رکھیے۔ پچھلی

Scanned with CamScanner

فروری میں سکسینہ جے ای نے مجھے پے منٹ میں بڑا دوڑایا۔ میں نے کہا کہ سالے! ایڈوانس کمیشن تم لو، گھر کی سبزی اور راشن پانی تم منگواؤ، بچوں کی فیس تم ہم سے بھرواؤ۔ اب راجہ ہریش چندر کے اوتار، تمھیں اور کیا چاہیے؟ ارے پے منٹ کرو اور باقی کمیشن بھی لو۔ ہم کہاں بھاگ رہے ہیں؟ پر نہیں صاحب، پٹھا ہاتھ نہ دھرنے دے۔ کبھی بولے سائٹ پر پھر سے میجر مینٹ کریں گے، کبھی میٹریل گھٹیا ہونے کی شکایت، کبھی کچھ، کبھی کچھ۔ میں پریشان ہوگیا۔ یہ تو بعد میں شکلا صاحب نے بتایا کہ اس میں دفتر کی پالیٹکس ہے۔ میں تو سینہ ٹھونک کر کہتا ہوں کہ شکلا صاحب کا آدمی ہوں، تو اس لیے نہیں ہو رہا تھا پے منٹ۔ پر راستہ بھی صاحب نے ہی بتایا۔'' جیسوال شکلا صاحب کی طرف اشارہ کر کے چپ ہوگیا۔ دھورو لال کے سامنے ایک نئی دنیا آشکار ہو رہی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ جیسوال اس نام نہاد راستے کے بارے میں تفصیل سے بتائے۔

کافی دیر تک کمرے میں بیٹھے لوگ ان کی بے چینی کا مزہ لینے کے لیے پان کھانے، کھانسنے، کھنکھارنے یا موسم کے بارے میں تبادلۂ خیال کرنے جیسی بے ہودہ باتوں میں مشغول رہے۔ اگر دھورو لال یادو آج جیسی صورت حال میں مبتلا نہ ہوتے تو وہ بھی ان ساری حرکتوں میں مزہ لیتے اور غیر جانبدارانہ رویے والی حیثیت میں ''ہم سے کیا مطلب'' والا تاثر چہرے پر اوڑھ کر جیسوال ٹھیکیدار کو اصل بات پر آنے کے لیے مجبور کر دیتے۔ پر اس وقت تو وہ پورے بدحوّے تھے (یہ لفظ بعد میں ان کا پسندیدہ اسم صفت بن گیا تھا اور وہ گمبھیر سے گمبھیر ماحول میں اپنے مخالف کے لیے بغیر چہرے پر شکن لائے اس کا استعمال کرتے تھے)۔ تھوڑی دیر میں ان کے صبر کا باندھ ٹوٹ گیا اور باوجود پُرسکون دکھائی دینے والی حالت کے، جس کا وہ مظاہرہ کر رہے تھے، جب وہ بولے تو ان کی آواز کچھ گھٹی گھٹی سی تھی۔

''پھر کیا ہوا جیسوال صاحب؟''

کمرے میں بیٹھے لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''اجی سرکار، ہوا کیا؟ وہی فارمولا نمبر انیس۔''

دھورو لال نے احمقانہ انداز میں آنکھیں جھپکائیں۔

''اپنے شکلا صاحب کا فارمولا نمبر انیس بڑا کارگر ثابت ہوا۔ صاحب نے ہری جھنڈی دی اور

میں دوسرے دن اپنی بلٹ پر...''

''ارے پاجی! مجھے کیوں بدنام کرتا ہے؟'' شکلا نے اسے گھورا۔

جیسوال کائیاں ڈھنگ سے مسکرایا۔''بغیر آپ کے حکم کے میں ایک قدم آگے نہیں دھرتا۔ یادو صاحب تو اپنے آدمی ہیں اس لیے زبان پھسل گئی، نہیں تو مجال ہے کہ کہیں زبان کھولی ہو۔''

دھورو لال کو اس غیر ضروری تفصیل میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ فارمولا نمبر انیس جاننا چاہتے تھے اور یہ لوگ بات کو طول دینے پر تلے ہوئے تھے۔

بہر حال تھوڑی دیر میں ان کی بے چینی ختم ہوگئی۔ ہوا کچھ یوں کہ جیسوال ٹھیکیدار اپنی بلٹ موٹر سائیکل پر دو مقامی غنڈوں کو لے کر جونیئر انجینئر سکسینہ کے گھر پر صبح صبح پہنچا۔ وہ موٹر سائیکل اسٹارٹ کیے سڑک پر کھڑا رہا اور دونوں غنڈے، جنھیں اس کی زبان میں ''ٹھیکیداروں کو پالنا ہی پڑتا ہے،'' دندناتے ہوئے اوپر سکسینہ کے گھر پر چڑھ گئے۔ جب تک نیچے مالک مکان کا خاندان یا اوپر سکسینہ کی بیوی کچھ سمجھتیں تب تک دونوں سکسینہ کو بنیان پاجامے میں گھسیٹتے ہوئے نیچے لے آئے۔

''اس کے بعد سالا چار گھونسوں میں ہی لائن پر آ گیا۔ بیوی کے پیچھے چھپ گیا۔ بیوی نے بھیا بھیا! کہنا شروع کیا۔ ہم نے بھی کہا، چل بیٹا، قسمت ہی خراب ہے سالی، ساری بہنیں ہی ملتی ہیں۔'' جیسوال انتہائی گھناؤنے ڈھنگ سے مسکرایا۔

آگے کی کہانی ہندی فلموں کے انجام کی طرح واضح تھی۔ جیسوال ٹھیکیدار کا پے منٹ ہوگیا۔ ہاں، انھوں نے سکسینہ جونیئر انجینئر اور اوپر والوں کا کمیشن پورا دیا کیونکہ ''صاحب، دھندے کے اصول بہت صاف ہیں۔ اگر ٹھیکیداری کرنی ہے تو کمیشن تو نقد گن کر ہی دینا پڑے گا۔''

اس دن یادو جی نے بھی فارمولا نمبر انیس اپنایا۔

ہنومان کی طرح کمرے میں موجود لوگوں کی حوصلہ افزائی سے، جو ان کی طاقت کے متعلق تھی، وہ چمک کر اٹھے اور پہلے انھوں نے دفتر کے کمرے میں بڑے بابو نامی جاندار کو تلاش کیا۔ کئی گھنٹے گزر جانے کے باوجود بھی وہ ابھی تک اپنی کرسی پر نہیں آئے تھے۔ بعد میں جب وہ اس سسٹم کا حصہ بن گئے تب ان کی سمجھ میں اتنی لمبی غیر حاضری کی وجہ آئی۔ جب کبھی ایسی کٹھن گھڑی بڑے بابو کے پیش نظر ہوتی، وہ راج نیتاؤں کی طرح اس محاورے پر عمل کرنے لگتے تھے جس میں شتر مرغ اور

Scanned with CamScanner

ریت کا ذکر آتا ہے۔ وہ بڑے صاحب کے کمرے میں فائل دبائے گھسے تھے اور تھوڑی دیر تک کھسر پھسر کر کے دوسرے دروازے سے باہر نکل گئے تھے اور نیم، املی، جامن جیسے پرانے درختوں کے نیچے کھلے بہت سے اوپن ایئر ریسٹورنٹوں میں سے کسی ایک میں بیٹھے، چائے سموسے کے تیسرے دور سے گزرتے ہوئے چائے والے کا بھگتان کرتے ہوئے کسی ٹھیکیدار کے ساتھ سنجیدہ گفتگو میں مشغول تھے۔

اس بیچ بڑے صاحب بھی اٹھ کر لنچ پر چلے گئے۔

مسئلہ پیچیدہ تھا اور دھورو لال اکیلے اس کا حل نہیں نکال سکتے تھے۔ دوست، فلسفی اور رہنمائی کرنے والے کی حیثیت میں جیسوال ٹھیکیدار اگر وقفے وقفے سے جنم نہ لیتا رہتا تو وہ دفتر کی بھول بھلیاں جیسی گلیوں میں کسی بے چین روح کی طرح ادھر اُدھر بھٹکتے رہتے۔

جیسوال بیچ بیچ میں انھیں اشارے سے کسی چائے یا پان کی دکان پر لے جا کر جو بتاتا رہا، اس سے یہ صاف ظاہر تھا کہ آج نہ بڑا صاحب آئے گا اور نہ بڑا بابو۔ یہ دونوں جب ہی آسکتے تھے جب دھورو لال انھیں اپنی حرکتوں سے مجبور کردے۔ دھورو لال نے یہی کیا۔

بڑے صاحب کے کمرے کے سامنے کھڑے ہو کر انھوں نے ہوا میں کسی اجنبی جاندار کو ماں بہن کی گالیاں دیں۔ بھونچکے چپراسی کے سامنے اُنگھے ہوئے کواڑ کو لات مار کر کھولا اور بڑے صاحب کی غیر حاضری جیسی سچائی کی اپنے اجڈ تھوبڑے کے ذریعے تصدیق کی۔ پھر وہ ہنکارتے سانڈ کی طرح بڑے بابو کے کمرے کی طرف آئے۔ وہاں جیسوال کے اشارے پر بڑے بابو کے خاص چمچے بابو کے سامنے کھڑے ہو کر انھوں نے طرح طرح کے اعلانات کیے۔

دھورو لال کے اعلانات علم حیاتیات اور زبان کے ماہروں، دونوں کے لیے زبردست اہمیت کے حامل تھے۔ جسم کے ایک ایک انگ کی اتنی خوبصورت تعریف دونوں کے لیے آنکھ کھول دینے کے مترادف تھی۔ ان کے یہ اعلانات اقوامِ متحدہ کے اعلانات یا ڈپلومیسی کی طرح بے معنی اور محض زبانی جمع خرچ جیسے نہ تھے؛ ان سے ٹھوس اقدامات اور منصوبوں کی جھلک مل رہی تھی۔ ان منصوبوں کے مطابق اگر شام تک انھیں جوائن نہ کرنے دیا گیا تو بڑے صاحب اور بڑے بابو نامی جانداروں کے فانی جسم کے کچھ حصوں کا ایسا خوبصورت استعمال ہوتا جس کا بیان سن کر غلیظ، فحش اور پھوہڑ زبان کا

Scanned with CamScanner

استعمال کرنے والے بابو، ٹھیکیدار اور دفتر میں لاتعداد گھومنے والے دلاّل بھی سناٹا کھا گئے ہوتے۔

اشو میگھ یگ کے ''اشو'' (گھوڑے) کی طرح لمبی گردن کے ساتھ برآمدوں، کمروں، فائلوں، کرسیوں، میزوں پر سخت گیر نظر دوڑاتے ہوئے شری دھورو لال یادو باہر پیپل کے درخت کے نیچے اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہوئے چلے تو گئے مگر ان کی کرخت، جوشیلی آواز سے پیدا شدہ تھرتھراہٹ کافی دیر تک اس دفتر کو کپکپاتی رہی۔

اس کے بعد کے واقعات بڑی تیزی سے رونما ہوئے۔ بڑے صاحب اور بڑے بابو یعنی حکمراں ٹولے کے تمام حمایتی بابوؤں، چپراسیوں اور ٹھیکیداروں کی ایک ایمرجنسی میٹنگ کال کی گئی اور عام رائے بنی کہ ایسے باصلاحیت شخص کا مخالف کیمپ میں چلے جانا اپنے کو جوکھم میں ڈالنے کے مترادف ہوگا، چنانچہ ان تمام خوبیوں سے لیس یادو جی کو اپنے کیمپ میں شامل کرنا ہی مناسب ہے۔ اس پورے واقعے میں دھورو لال کا شکلا کے کمرے میں جانا اور بار بار جیسوال ٹھیکیدار کے ساتھ کھسر پھسر باتیں کرنا، ان سب باتوں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا اور رام دین چپراسی اور رول تیواری جونیئر انجینئر کو اگلی کارروائی کے لیے مقرر کیا گیا۔ ان سفیروں نے بڑے بابو کو کچہری کی ایک لسّی کی دکان پر ڈکارتے ہوئے پکڑا۔ ان کے ساتھ گپ لگا رہے ٹھیکیدار کو بھگتان (پے منٹ) کا اشارہ کرتے ہوئے وہ انھیں ایک پان کے کھوکھے پر لے گئے۔ جتنی دیر میں بنارسی پان لگا، منھ میں گیا اور پہلی پیک تھوکی گئی، بڑے بابو سارا معاملہ سمجھ گئے۔ لسّی کے پیسے دے کر ان کا پچھلا ساتھی جب تک لوٹا، بڑے بابو رکشا پر بیٹھ کر چل چکے تھے اور رول تیواری پان کے پیسے دے رہے تھے۔

شام کو چار بجتے بجتے بڑے بابو کے غائب ہونے کا نتیجہ بھی برآمد ہو گیا۔

رام دین چپراسی نے پیپل کے نیچے واقع چائے کی دکان پر دھورو لال کو نہایت آہستگی سے مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''صاحب، آپ یہاں بیٹھے ہیں۔ ہم پوری کچہری ڈھونڈ ڈھونڈ کر حیران ہو گئے۔ چلیے، بڑے بابو کب سے آپ کو بلا رہے ہیں۔''

دھورو لال نے کسی بوڑم کی طرح آنکھیں جھپکائیں۔ وہ مسلسل دفتر کے دروازے پر آنکھیں گڑائے بیٹھے تھے۔ بڑا بابو اندر گھسا کیسے؟ ان کا بلاوا کیوں؟ وہ اس کھیل کے نئے کھلاڑی تھے، یہ

Scanned with CamScanner

سارے سوالات ایک ان بوجھ پہیلی کی طرح تھے، مگر پہلو میں بیٹھے ہوئے جیسوال ٹھیکیدار نے آنکھ کے اشارے سے انھیں چپراسی کے ساتھ جانے کو کہااور وہ اٹھ گئے۔

اندر کا ماحول استقبال اور دلی مسرتوں سے لبریز تھا۔ دن بھر کے تناؤ کا مدراسی فلموں جیسا اختتام انتہائی خوش کن تھااور دھورولال کے لیے خلافِ امید بھی۔ انھوں نے لاکھ گمبھیر بنے رہنے کی کوشش کی، پر بیچ بیچ ان کے بھدے چہرے پر بڑے بابو کی مصری میں گھلی باتیں سن کر بھس سے مسکراہٹ آہی جاتی تھی۔

''کہاں تھے یادو جی آپ؟ بڑے بابو کب سے آپ کو تلاش کر رہے ہیں۔ بیچارے اس دُپہریا میں آپ کا کاغذ دستخط کرانے بڑے صاحب کے بنگلے تک گئے تھے۔''

دھورولال نے دیکھا کہ بولنے والا وہی بابو تھا جسے جیسوال نے بڑے بابو کا خاص چمچہ بتایا تھا اور جسے وہ ابھی ابھی گریا کر گئے تھے۔ اس کے چہرے پر کوئی شکن نہیں تھی۔

''بنا مٹھائی کھائے تو جوائن نہیں کراؤں گا۔''

بڑے بابو کے رویے پر دھورولال شرمائے۔ انھوں نے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر پاس کھڑے ہوئے چپراسی کو تھما دیا۔

''ان افسروں کا تو ٹائم سے لنچ اور ٹائم سے سونا، مرن تو ہماری ہوتی ہے۔ آپ کا کاغذ تو ٹائپ ہو گیا تھا پر بڑے صاحب کے لنچ کا ٹائم ہو گیا۔ جب تک کاغذ لے کر پہنچا، صاحب نکل گئے۔ پھر اس چلچلاتی دھوپ میں رکشے پر بیٹھ کر ان کے گھر گیا۔ کھوپڑی چٹخ گئی۔''

دھورولال پوری طرح چت ہو گئے۔ بیکار بڑے بابو کو اول فول بک دیا۔ تشکر آمیز لہجے میں بولے،''بیکار پریشان ہونے کی کیا ضرورت تھی بڑے بابو! شام کو دستخط ہو جاتے۔''

''ارے نہیں بھیا! ایک بار دفتر سے نکلے افسر کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔ پھر ملے نہ ملے۔ اس لیے میں نے کہا کہ ایک ہونہار نوجوان ہمارے دفتر میں آیا ہے، کل ہمارا صاحب بنے گا، اس کے کاغذ پر آج ہی چڑیا بٹھواؤ۔ کل کا بھروسا نہیں، صاحب کہیں نکل جائیں، اس لیے چلچلاتی دھوپ میں گیا۔ اچھا ہوا جو چلا گیا۔ ذرا بھی کاہلی کرتا تو کئی دن کی چھٹی تھی۔ صاحب کل لکھنؤ جا رہے ہیں۔ میٹنگ ہے۔''

دھورو لال کو جیسوال ٹھیکیدار اور اس کے ٹولے کے سارے لوگ دنیا کے سب سے نیچ انسان لگ رہے تھے۔ اگر اس وقت جیسوال ٹھیکیدار مل گیا ہوتا تو وہ یقیناً اس کے ساتھ طاقت آزمائی کر چکے ہوتے۔ بڑے بابو جیسے بھلے مانس کے لیے کیسے کیسے گندے خیالات ان کے دماغ میں بھر دیے تھے اس نے!

اب جب دھورو لال یادو اس نظام کا حصہ بن چکے ہیں، انھیں کبھی کبھی اس واقعے کی یاد آتی ہے تو مسکرا کر کہتے ہیں، ''سالا... چالو... اچھی ایکٹنگ کرتا ہے۔ خوب بڑبک بنایا۔''

پہلے دن دھورو لال کی اینگری ینگ مین کی جو تصویر بنی، وہ آج تک ان سے چپکی ہوئی ہے۔

دفتر میں کئی ٹولے تھے۔ اکثر کوئی نہ کوئی ٹولہ ان کا استعمال اپنے مخالف کیمپ کے کسی نہ کسی ممبر کی پٹائی کرانے یا گالی دلوانے کے لیے تیار کر لیا کرتا تھا۔ پر شروع میں وہ اپنی اس تصویر کے کارن گھاٹے میں رہا کرتے تھے۔ وہ نظام کی مخالفت کے چکر میں اکثر دفتر کے ہائی اپس (high ups) کے خلاف کھڑے ہو جاتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ لوگ ان سے خوفزدہ رہتے، انھیں دفتر میں بگڑیل سانڈ کی طرح نتھنے پھلائے گھومتے ہوئے دیکھ کر لوگ ان پر نثار ہوتے ہوئے ان کے کسرتی بدن کی طرف جم جم کر تعریفی نگاہیں ڈالتے یا چائے پان کی دکان پر گھیر کر ان کی خوب واہ واہ کرتے، خاطر مدارات کرتے؛ لیکن مارچ کے مہینے میں جب کمیشن کے آخری بٹوارے کا وقت آتا تو وہ سب سے کم پیسے جیب میں ڈالے ہوئے نکلتے۔

وقت نے دھیرے دھیرے انھیں ہوشیار بنا دیا۔ وہ اب بھی بے ڈھنگے، اجڈ اور عقل سے عاری تھے اور اپنی جسمانی صلاحیت کا ہی استعمال کرتے تھے، پر اب وہ حکمراں ٹولے کے استعمال کی چیز تھے۔ جس طرح ہندی ادب کا ایک انقلابی ادیب پہلے تو بایاں بازو، محنت، اشتراکیت'' کے اعلان کرتا پھرتا ہے پھر دھیرے دھیرے اعزازات اور ٹیچر سے ریڈر بننے کے چکر میں اپنے لیے ایک اور میدان منتخب کرتا ہوا دنیاداری، عیش و آرام کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے، اسی طرح دھورو لال یادو، جے ای، کو بھی وقت نے دھیرے دھیرے اتنا ماہر کر دیا تھا کہ ادھر وہ دفتر کے حکمراں طبقے کی چھتر چھایا میں رہ کر دفتری محاورے کے مطابق سال بھر کافی موٹی رقم چیرتے تھے۔

اسی لیے دھورو لال یادو اس وقت سنجیدہ قسم کے اس صلاح مشورے کی میٹنگ میں شریک تھے۔

Scanned with CamScanner

مشورے میں شامل دو اور لوگ بڑے صاحب کے سامنے بیٹھے تھے۔ بائیں طرف بیٹھے تھے دفتر کے بڑے بابو، لابھ چندر شریواستو، عرف لالہ بابو۔ انھوں نے اس دفتر میں اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ گزارا تھا۔ انھوں نے لگ بھگ تین دہائی پہلے اپنی سرکاری زندگی اسی دفتر میں بابوؤں کے سب سے نچلے درجے سے شروع کی تھی۔ وہ مکاری، چاپلوسی اور گراوٹ کے بھی نچلے درجے پر تھے اور اسی لیے اب وہ مستقل ایک کامیاب آدمی تھے۔ بھارتی نوکر شاہی ان جیسے پختہ کھمبوں پر ہی ٹکی ہوئی تھی۔

لابھ چندر شریواستو، جن کا اصلی نام دفتر کے زیادہ تر افسر، بابو یا ٹھیکیدار نہیں جانتے تھے اور جنھیں لوگ لالہ بابو کے نام سے پکارتے تھے، بیچ بیچ تبادلہ ہو کر باہر جاتے تھے، لیکن پھر گھوم پھر کر سال چھ مہینے میں واپس آ جاتے تھے۔ اس شہر میں انھوں نے ایک مکان بنا لیا تھا جسے وہ خود بہت ہی انکساری و عاجزی سے ''جھونپڑا'' کہتے تھے اور ان کے مخالفین ان کے تبادلے کے لیے درخواستیں دیتے وقت اسے ''تمنزلہ محل'' کہتے تھے۔ سب سے اوپری منزل پر دو چھوٹے چھوٹے کمروں میں وہ اپنے کنبے یعنی خود، بیوی اور چار لڑکوں کے ساتھ رہتے تھے۔ باقی دو منزلوں پر ان کے ان گنت کرایہ دار رہتے تھے۔ ان گنت اس لیے کہ ان کے اور ان کی بیوی کے علاوہ اس محل میں رہنے والے بھی نہیں جانتے تھے کہ کس وقت وہاں کتنے کرایہ دار تھے۔ مکان بنواتے وقت انھیں جہاں کہیں جگہ ملی، انھوں نے پاخانہ، غسل خانہ یا باورچی خانہ بنوا دیا۔ اس سے فائدہ یہ ہوا کہ عمارت کی دو منزلوں پر کئی آزاد حصے نکل آئے جن میں انھوں نے کرایہ دار بسا دیے۔ پورا گھر سرائے کی طرح لگتا تھا اور اس میں رہنے والے گورکی کے کرداروں کی طرح بھانت بھانت کے لگتے تھے، جن سے مستقل گالیاں، گھڑکیاں اور دھمکیاں وصول کرتے ہوئے بھی وہ اپنی روزانہ صبح کی پوجا میں ایشور کا شکر ادا کیا کرتے تھے۔

لالہ بابو کی زندگی کے کچھ بنیادی اصول تھے، جنھیں وہ کبھی نہیں چھوڑتے تھے۔ ان میں سے ایک ان کی نرم خوئی تھی۔ بڑی سے بڑی ذلت آمیز صورت حال میں بھی وہ ''ہی ہی، ہی ہی'' کرتے ہوئے اپنے کو غصے سے دور کیے رہتے تھے۔ بھارتی نوکر شاہی میں بابوؤں کی پوزیشن ہی کچھ ایسی ہے کہ ذلت کی گھڑیاں پل پل ان کے سامنے آتی رہتی ہیں۔ کبھی افسر گھڑکتا ہے، کبھی ماتحت؛ لالہ بابو

کے محکمے میں تو ٹھیکیدار نامی ایک تیسرا طبقہ بھی تھا، انتہائی خرانٹ، چالاک، جس سے مستقل بابوؤں کا پالا پڑتا تھا۔ ٹھیکیداری میں جونئی پود نوجوانوں کی آ رہی تھی وہ ایک دم گنوار، اجڈ تھی، جو چاقو پستول کے بل پر سارا کام کرانا چاہتی تھی۔ ان کی گالم گلوچ کا سیدھا نشانہ بابو ہی بنتے تھے، پر لالہ بابو مشکل سے مشکل گھڑی میں بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے۔

حالیہ دنوں میں جو نئے بابو آ رہے تھے، انھیں دیکھ کر لالہ بابو کو ضرور کچھ مایوسی ہوتی تھی۔ یہ بابو نئے فیشن کے کپڑے پہنتے، افسروں کے سامنے کرسی پر بیٹھ جاتے، کئی بار ان سے تو تڑاق بھی کر دیتے اور سب سے بری بات، دفتر میں اپنے پیسے سے منگا کر چائے سموسہ کھا لیتے۔ لالہ بابو کو نئی پیڑھی کے بابوؤں کے ساتھ بیٹھ کر ان کی پست ذہنی کا ماتم کرنے کے سوا کچھ نہ کر پاتے۔

کسی نئے بابو کے آنے پر وہ اسے اپنی زندگی کا ایک تجربہ ضرور سناتے۔ یہ قصہ دفتر کے سارے بابوؤں کے سامنے الگ الگ ڈھنگ سے سنایا جا چکا ہے، کبھی لالہ بابو کے منھ سے اور کبھی ان کے مخالف کیمپ کے کسی فرد کی زبانی، اس لیے دفتر کے تقریباً سبھی لوگ اس کی ایک ایک کڑی سے واقف ہیں۔ کسی ایک جز کو اگر بیان کرنے والا بھول بیٹھے تو سننے والے اس کڑی کو جوڑ دیتے ہیں۔ بڑے بابو اس قصے کو یوں شروع کرتے ہیں، ''برخوردار، جب میں بھی تمھاری طرح جوان تھا...'' یا ''جب میری بھی کمر میں طاقت تھی، تب کا واقعہ ہے...'' مخالف اسے کچھ ایسے سناتے، ''سالا جب نیا نیا دفتر میں آیا تب سے ہی افسروں کے سامنے پتلون کھول دیتا ہے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ...''

جس طرح ہندی کی زیادہ تر فلموں میں کہانی گھما پھرا کر ایک جیسی ہوتی ہے، صرف طرز بیان بدلتا رہتا ہے، اسی طرح دونوں کیمپوں کی کہانی کا لب لباب ایک ہی تھا، صرف سنانے کا ڈھنگ بدل جاتا تھا۔ کہانی شروع ہوتی تھی لالہ بابو کے ایک نوجوان جونیئر کلرک کی حیثیت سے دفتر میں ان کے داخلے اور افسروں کے لیے ان کی تابعداری کے احساس کے بیان سے۔ اس منظر کو لالہ بابو اپنی فرض شناسی، قواعد و ضوابط کی پابندی جیسی خصوصیات سے مرصع کر کے بیان کرتے اور ان کے مخالفین ''پکا حرام الدہر جو ہمیشہ افسر کا گو اٹھانے کو تیار رہتا تھا'' جیسے حاسدانہ جملوں سے بھرے اسلوب میں بیان کرتے۔

اس کے بعد کہانی کا دلچسپ حصہ شروع ہوتا۔ اس کو بڑے بابو تیزی کے ساتھ اس خبر کو شامل

Scanned with CamScanner

حال کرتے ہوئے نپٹاتے کہ ''میری گھروالی کو گاؤں کا پانی راس نہیں آرہا تھا، اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے یہاں لانا پڑا اور یہیں کالونی میں بڑے صاحب سے کہہ کر ایک کوارٹر مل گیا، جس میں تقریباً پندرہ سال ہم لوگ رہے، اور ایک ایک کرکر کے چار بیٹوں کی وصولی یہیں ہوئی۔''

پر مخالف ٹولہ اس کو جلد بازی میں نہ سناتا۔ پہلے تو وہ اس معاملے کی تہہ میں جانے کی کوشش کرتا کہ ان کی بیوی اچانک گاؤں سے ایک دن دفتر کے دروازے پر کیسے وارد ہوئیں۔ اس کے بارے میں مختلف کہانیاں تھیں، پر کم وبیش اس معاملے پر سب کی ایک ہی رائے تھی کہ لالہ بابو کی شہر میں گلچھرے اڑانے کی افواہیں کچھ اس طرح گاؤں پہنچیں کہ ان کے بوڑھے باپ اپنی بہو کو لے کر سیدھے ان کے دفتر پہنچ گئے اور اس حملے سے ہکا بکا، منھ بائے لالہ بابو کے پاس چھوڑ کر سیدھے بس اڈے روانہ ہو گئے۔

مسئلہ بڑا پیچیدہ تھا۔ لالہ بابو خود ایک دوسرے بابو کے ساتھ ایک کمرہ لے کر رہتے تھے۔ دونوں اکیلے تھے، اس لیے کوئی دقت نہیں تھی۔ دفتر کے ایک چپراسی کو ان لوگوں نے پٹا رکھا تھا، وہ کھانا ان کے ساتھ کھاتا اور عوض میں کھانا پکا دیا کرتا تھا۔ جن گلچھروں کی خبریں اڑتی پڑتی گاؤں تک پہنچی تھیں، وہ اسی قربت اور چھڑے پن کی اُپج تھیں۔ اس ماحول میں لالہ بابو بیوی کو لے کر کیسے جاتے؟

دفتر میں اچانک بیوی کی موجودگی کو لے کر الگ الگ چہروں پر جو مسکراہٹیں تیر رہی تھیں، انھوں نے لالہ بابو کو جز بز کر دیا تھا۔ یہ مسکراہٹیں مکاری، تمسخر، گھناؤنے پن اور ترس سے بھری تھیں۔ انھوں نے پہلا کام یہ کیا کہ سر سے پیر تک کپڑے کی گٹھری بنی بیوی کو دفتر کے سامنے ایک جان پہچان کے چائے والے کی دکان پر بٹھا دیا اور اس وقت کے دفتر کے بڑے بابو، پچھی بابو، کے پاس روہانسا منھ بنا کر اپنے رہائش کے مسئلے کو لے کر پہنچ گئے۔

واقعہ تقریباً دو دہائی پرانا ہے مگر دفتروں کی سیاست آج بھی ویسی کی ویسی ہے۔ اُس زمانے کے بڑے بابو، پچھی دھر دُویدی عرف پچھی بابو کی بڑے صاحب سے نہیں پٹتی تھی۔ انھوں نے لالہ بابو کو دفتر کی سیاست کا شکار بنا دیا۔

پچھی بابو کی میز کے ارد گرد دفتر کے لوگوں کی فوری میٹنگ کال کی گئی اور اس معاملے پر سنجیدگی سے صلاح مشورہ ہوا۔ پچھی بابو خود تو بہت کم بولے، مگر ان کے ایک حمایتی نے جو حل پیش کیا، وہ اس

Scanned with CamScanner

وقت لالہ بابو کو بہت آسان لگا، مگر اب، جب وہ بھی اسی خرانٹ قسم کے نظام کا حصہ بن چکے ہیں، انھیں اس وقت کی اس تجویز کے داؤ پیچ سمجھ میں آ گئے ہیں۔

پی ڈبلیو ڈی کالونی میں ایک ٹائپ ٹو کا مکان کافی دنوں سے خالی تھا۔ اس زمانے میں کالونی میں مکان بہت کم تھے، پر آج کے مقابلے میں دفتروں میں کام کرنے والے افسر و ماتحت بھی کم ہی تھے، اس لیے مارا ماری بھی کم و بیش آج جیسی ہی تھی۔ یہ مکان کسی بھی بابو کو مل سکتا تھا اور کئی بابو شہر کے گندے اور تنگ علاقوں کے چھوٹے چھوٹے مکانوں میں رہتے تھے؛ ان سبھی نے اس مکان کے لیے اپنی اپنی عرضیاں لگا رکھی تھیں۔ وہ باری باری بڑے صاحب کے سامنے پیش ہوتے تھے اور جھڑکیاں کھا کر واپس لوٹ آتے تھے۔ یہ مکان کسی بابو کو الاٹ کیوں نہیں ہو رہا تھا، یہ راز پچھمی بابو اور دفتر کے کبھی گھاگھ بابو اور چپراسی جانتے تھے، نہیں جانتے تھے تو صرف لالہ بابو یا ان کے جیسے دو چار گاؤدی، جو اس دنیا میں نئے نئے آئے تھے۔ بات کچھ ایسی تھی کہ بڑے صاحب کا ایک دور کا سالا کافی دنوں سے بے روزگار تھا۔ اس کی میم صاحبہ کی ضد کچھ ایسی تھی کہ بڑے صاحب نے اپنا سارا اثر و رسوخ استعمال کر کے اسے کسی طرح بابو بنا دیا تھا۔ اب وہ کوشش کر رہے تھے کہ اس کا تبادلہ اس دفتر میں ہو جائے۔ تبادلہ ہو بھی جاتا مگر اس بیچ ایگزیکٹو انجینئر کے دفتر میں ان کا ایک مخالف ایگزیکٹیو انجینئر کا پی اے ہو کر پہنچ گیا تھا؛ وہ مسلسل اڑنگے ڈال رہا تھا اور کئی مہینوں سے ان کی کوشش کامیابی کی کگار پر پہنچ پہنچ کر مقصد سے تھوڑی دور رہ جاتی۔ یہ مکان اسی چکر میں پچھلے کئی مہینوں سے ان کے سالے کے انتظار میں خالی پڑا تھا۔

اس دن پچھمی بابو کی میز کے ارد گرد جو میٹنگ ہوئی، اس میں یہ طے پایا کہ لالہ بابو اسی مکان کے لیے اپنی درخواست پیش کریں گے۔ ممکنہ دلائل اور ان کی کاٹ بھی انھیں سمجھا دی گئی۔ بڑے ہلکے ڈھنگ سے بتایا گیا کہ لکھیم پور کھیری میں کوئی بابو ہے، جو بڑے صاحب کا دور کا رشتے دار ہے اور جس کا یہاں تبادلہ کرانے کے لیے بڑے صاحب کوشاں ہیں۔ اول تو یہاں کوئی جگہ نہیں جہاں اس کا تبادلہ ہو سکے، اور اگر ہو بھی گیا تو اس کے یہاں پہنچنے میں دو چار مہینے تو لگ ہی جائیں گے۔ لالہ بابو کا مسئلہ تو فوری مسئلہ ہے۔ فی الحال وہ اپنی بیوی کو لے کر اس کوارٹر میں چلے جائیں، بعد میں اگر بڑے صاحب کا رشتے دار یہاں آیا تو وہ مکان خالی کر دیں گے؛ تب تک سب لوگ مل کے ان کے لیے شہر

میں کوئی نہ کوئی مکان ڈھونڈ ہی لیں گے۔

لالہ بابو کو ایک بات اور الگ طریقے سے سمجھائی گئی۔ اس دفتر میں سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلتا۔ دفتر کے سیدھے لوگوں پر سبھی افسر سواری گانٹھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بڑا صاحب بھی آسانی سے نہیں مانے گا، پر لالہ بابو کو اپنی آواز تھوڑی سی اونچی کرنی ہوگی اور آنکھیں تریرنی ہوں گی۔ مکان دے گا کیسے نہیں؟ کوئی اس کے باپ کا کوارٹر ہے؟ اتنے مہینے سے خالی پڑا ہے، سرکار کو کرائے کا اتنا نقصان ہو رہا ہے، اسے کون بھرے گا؟

سارے بحث مباحثے اور دلیلوں میں یہی ایک مشکل درپیش تھی۔ لالہ بابو کی فطرت کے یہ خلاف تھا کہ وہ صاحب کے سامنے اونچی آواز میں بول سکیں، پر بیوی باہر چائے کی دکان پر گھونگھٹ کاڑھے بیٹھی تھی۔ اس شہر میں کوئی سگا رشتے دار بھی نہیں تھا کہ جس کے پاس جا کر دو چار دن بتائے جا سکیں۔ کرائے کا مکان بھی اتنی آسانی سے کہاں ملے گا؟ انھیں رہ رہ کر اپنے باپ اور بیوی پر غصہ آ رہا تھا۔ پر اب غصہ کرنے سے کیا ملنے والا تھا؟ شام ہو رہی تھی۔ ایک بار بڑے صاحب اٹھ کر گھر چلے گئے تو انھیں پکڑ پانا بہت مشکل ہوگا۔ انھوں نے دل کڑا کیا۔ کاغذ قلم لے کر ایک درخواست لکھی اور میدان جنگ کی طرف بڑھ چلے۔

بچھی بابو نے ان کے ساتھ دو تین بابو اور کر دیے۔ یہ ایک ڈیلی گیشن کی سی شکل بن گئی، جس سے شروع میں تو لالہ بابو کا حوصلہ بڑھا، پر بعد میں کمرے سے باہر نکلنے پر انھیں سب کو ساتھ لے جانے کا افسوس ہوا کیونکہ بہت سی باتیں باہر نکل کر انھی لوگوں نے نمک مرچ لگا کر پھیلائیں۔

جب یہ مہذب دستہ کمرے میں داخل ہوا تو بڑا صاحب عینک ناک پر چڑھائے، کسی فائل کو پڑھنے میں مشغول تھا۔ ایک بابو اس کی بغل میں کھڑا اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ تین چار بابوؤں کا اس کمرے میں ایک ساتھ گھس آنا کوئی نئی بات نہیں تھی، اس لیے اس نے کوئی دھیان نہیں دیا۔ پہلے سے کھڑے بابو کی بات بڑے صاحب کی سمجھ میں آ گئی اور اس نے فائل کے سامنے کھلے پیج پر دستخط کر کے فائل سرکا دی۔

بڑے صاحب نے تھوڑی دیر انتظار کیا کہ نئے آنے والے بابو کوئی فائل یا کاغذ اس کے سامنے رکھیں گے، پر ان کی طرف سے کوئی حرکت نہ ہونے پر اس نے چڑ کر پوچھا، "ہاں... کیا

Scanned with CamScanner

بات ہے؟''

''سرکار... یہ لالہ بابو کچھ عرض لے کر آئے ہیں۔ اس کی بیوی گاؤں سے آ گئی ہیں،'' لالہ بابو کی خاموشی نہ ٹوٹنے پر ایک دوسرے بابو نے کھیسیں نکالتے ہوئے کہا۔

''اچھا؟'' صاحب نے ایک عجیب مضحکہ خیز انداز میں لالہ بابو کو دیکھا جیسے اس نے آج کی سب مزے دار خبر سنی ہو۔ تھوڑی دیر پھر خاموشی رہی۔ ایک بابو نے لالہ بابو سے مذاق کے انداز میں ماحول کو کچھ سازگار بناتے ہوئے، اپنے کو پُرمذاق ثابت کرتے ہوئے اور صاحب کی دریادلی کی تعریف کرتے ہوئے، لالہ بابو کے اس روکھے پن کے رویے کو یوں دور کرنے کی کوشش کی۔

''ارے مسئلہ بتاؤ لالہ بابو۔ صاحب سے کیا شرم! کوئی بھگا کر تو لائے نہیں ہو، بیاہتا ہے۔ اس انجان شہر میں صاحب ہی تو گارجین ہیں۔ بتا ڈالو۔''

لالہ بابو نے ہمت بٹوری اور عرضی صاحب کے آگے بڑھا دی۔

بڑا صاحب چوکنا ہوا۔ ''تو یہ معاملہ ہے! سالے بڑے گھاگھ ہیں، بیوی کا بہانہ بنا کر مکان لینا چاہتے ہیں۔ حرامزادے پچھی نے پٹی پڑھائی ہوگی۔'' اس نے دل ہی دل میں اپنا طریقۂ جنگ متعین کر لیا۔

اس کے بعد کہانی میں کیا ہوا، اس کے بارے میں لالہ بابو اور ان کے مخالفین میں اتفاقِ رائے نہیں ہے۔ لالہ بابو بتاتے ہیں کہ کافی بحث مباحثے اور جدوجہد کے بعد جب بڑے صاحب کسی طرح ٹس سے مس نہیں ہوئے تو انھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ ''ہم تو آپ کی اولاد ہیں۔ نہیں مکان دیں گے تو شام تک آپ کی بہو کو لے کر آپ کے گھر پہنچ جائیں گے۔ کہیں نہ کہیں سر چھپانے کی جگہ میم صاحب دے ہی دیں گی۔ کچھ روکھا سوکھا بھی مل جائے گا، پڑے رہیں گے۔''

ان کے سامنے تو کوئی کچھ نہ کہتا، پر پیٹھ پیچھے لوگ ان بابوؤں کی پھیلائی افواہوں یا باتوں کو دہراتے جو لالہ بابو کے ساتھ اس تاریخی لمحے سے جڑی ہوئی تھیں۔

مخالف کیمپ اس برتاؤ کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ جب بڑی دیر تک بڑا صاحب دھتکارتا رہا اور ڈپٹتا رہا، ساتھ گئے بابوؤں کے اشارے کے باوجود لالہ بابو نے آواز اونچی نہیں کی، اور ساتھ میں گئے پورے مہذب دستے کو یہ یقین ہو گیا کہ اب زیادہ بحث مباحثہ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں،

Scanned with CamScanner

اس لیے واپس جانا ہی بہتر ہے، تبھی ایک ایسا واقعہ رونما ہوا کہ کمرے میں موجود بھی لوگ دل برداشتہ ہو گئے۔

افسروں کی موجودگی میں ہمیشہ بیچارگی کی مورت بنے رہنے والے لالہ بابو نے اچانک اور بھی انکساری سے کام لیا۔ انھوں نے ہاتھ جوڑ لیے اور بولتے بولتے ان کی آواز رندھ گئی۔ ''حضور ماں باپ کی جگہ ہیں۔ نہیں پالیں گے تو ہم کہاں جائیں گے؟''

اس کے علاوہ بھی لالہ بابو بہت کچھ بولے مگر آواز کے رُندھ جانے سے سب کچھ غیر واضح رہا۔

بڑا صاحب دل ہی دل میں تمسخر، تسکین اور خود پسندی کے ملے جلے احساس سے لالہ بابو کی آہ وبکا سنتا رہا۔ وہ ان کے ان جذبات سے متفق تھا کہ وہ رحم دل ہیں، بندہ پرور اور غریب نواز جیسے نہ جانے کیا کیا ہیں۔

لالہ بابو اور مخالف کیمپ والوں، دونوں کی کہانیوں کا نچوڑ یہی تھا کہ صاحب نے بالآخر لالہ بابو کی درخواست پر گھسیٹ کر ''کوارٹر الاٹڈ'' لکھ دیا اور فاتحانہ جذبات کے ساتھ مہذب دستہ کمرے کے باہر آ گیا۔

یہ کہانی لالہ بابو نئے بابوؤں کو اس جذبے سے سناتے تھے کہ وہ بھی افسر کو اپنا مائی باپ سمجھیں۔ شروع میں تو سب ٹھیک ٹھاک چلتا رہا تھا لیکن پچھلے سالوں سے بابوؤں کی پود میں کچھ مخصوص تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ اب بابو پہلے جیسی عزت افزائی اور اچھے برتاؤ جیسی گفتگو پر ذرا بھی دھیان نہیں دیتے۔ کچھ تو ان کا لحاظ اور ان کے وقار کو ٹھیس پہنچاتے ہوئے کہانی کے بیچ میں ہی اٹھ کر چل دیتے ہیں، کچھ منہ بناتے ہیں، کچھ ترس بھرے انداز میں مسکرانے لگتے ہیں اور کچھ کچھ تو اتنے شرارتی ہو گئے ہیں کہ مخالف کیمپ کی پھیلائی ہوئی افواہوں اور جھوٹ کو ان کے قصے میں بیچ بیچ جوڑتے جاتے ہیں۔ بابوؤں میں ہو رہی اس تبدیلی کے متعلق سوچ کر لالہ بابو بے چین ہو جاتے ہیں۔

تمام تر تبدیلیوں کے باوجود لالہ بابو نے اپنی لیک نہیں چھوڑی۔ وہ پچھلے تیس سالوں سے افسر کو مائی باپ سمجھتے آئے ہیں۔ آج بھی اس عادت کی بنا پر، نئے سے نئے چھوکرے افسر کے آگے بھی، ان کا سر ادب سے جھکا رہتا ہے۔ آج بھی وہ روز سویرے ایک گھنٹہ بھگوان کی پوجا کرتے

Scanned with CamScanner

ہیں۔ روز بھگوان کا اس بات کے لیے شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے انھیں لڑکیاں نہیں دیں، چار بیٹے ہی دیے؛ گھر کا کچھ باہر نہیں جائے گا، گھر میں ہی کچھ نہ کچھ آئے گا۔ کبھی کبھی کوئی کرایہ دار بہت تنگ کرتا ہے تو تب ہی وہ آخری آپشن کے طور پر دل میں اس کے لیے تھوڑا برے کی دعا کرتے ہیں بھگوان سے، ورنہ اتنے سے ہی مطمئن ہو جاتے ہیں کہ بھگوان کرایہ دار کی جیب میں پیسہ اور اتنی سمجھ پیدا کر دے کہ وہ انھیں وقت پر کرایہ دے دیا کریں، یا کرایہ دار کی بیوی میں اتنی سگھڑتا بھر دے کہ وہ اپنا کوڑا کچرا لالہ بابو کے باہر نکلنے والے دروازے پر نہ ڈالا کرے، یا کرایہ داروں میں سے نہ جانے کس کا بچہ جو ان کی سائیکل کا پہیہ بلیڈ سے کاٹ دیتا ہے، اسے عقل آ جائے اور وہ ایسا کرنا بند کر دے۔ یہ چھوٹے چھوٹے مکالمے تھے جو لالہ بابو برسوں سے شکر یا شکوے کے روپ میں ایشور سے کرتے جا رہے تھے۔

برسوں سے لالہ بابو دال روٹی کھا کر دفتر کے وقت سے آدھے گھنٹے پہلے گھر کا دروازہ کھول کر باہر نکلتے۔ اپنی بڑھیا سائیکل کو پندرہ منٹ تک جھاڑتے پونچھتے، دونوں پہیوں کی ہوا چیک کرتے، بریک، پیڈل اور چین کا معائنہ کرتے، گھنٹی بجاتے اور سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہونے پر دفتر کے وقت سے دس منٹ پہلے گھر سے نکل پڑتے۔ ان کے گھر سے دفتر قریب تھا اور سات منٹ میں وہ دفتر پہنچ جاتے۔ جب یہ زمین انھوں نے خریدی تھی، تب شروع کے کئی سالوں تک ایشور کا شکر ادا کرنے کے ایجنڈے میں یہ زمین بھی شامل تھی، جو دفتر کے اتنے قریب تھی اور جو بھگوان کی مہربانی سے ہی انھیں حاصل ہوئی تھی۔ ادھر وہ ضرور ایشور کا شکریہ اس لیے کم ادا کر رہے تھے کیونکہ اب شکر ادا کرنے لائق اور بہت سی چیزیں ہو گئی تھیں۔

دفتر میں پہنچنے والوں میں لالہ بابو ہمیشہ پہلے یا دوسرے ہوتے۔ چوکیدار یا فراش ابھی دفتر کا تالا کھول رہے ہوتے یا میز کرسیوں کی دھول پر کپڑا مار رہے ہوتے کہ لالہ بابو کی بڑھیا سائیکل دفتر کے باہر آ کر کھڑی ہوتی۔ چوڑے پائینچے والی پینٹ میں لوہے کا ہک پھنسا کر اسے پتلا کیے ہوئے لالہ بابو جیسی رفتار والی اپنی سائیکل بغیر کسی ہڑبڑاہٹ کے روکتے اور آہستہ سے نیچے اترتے۔ جب سے وہ بڑے بابو ہوئے ہیں، کوئی نہ کوئی چپراسی یا چوکیدار کہیں نہ کہیں سے نمودار ہو جاتا ہے اور ان کی سائیکل پکڑ کر برآمدے میں کھڑی کر دیتا ہے۔ اگر کوئی نظر نہیں آ رہا ہوتا تو خود ہی دھیرے دھیرے

Scanned with CamScanner

لے جا کر سائیکل مقررہ جگہ پر کھڑی کر دیتے ہیں۔ ان کی سائیکل ہمیشہ ایسی جگہ کھڑی ہوتی ہے جہاں سے وہ اپنے کرسی پر بیٹھے بیٹھے فائلوں سے سر اٹھا کر تھوڑی دیر بعد اسے دیکھ لیتے ہیں۔ وہ اس دفتر میں الگ الگ جگہوں پر بیٹھے ہیں لیکن سائیکل کے لیے ہمیشہ انھوں نے ایسی جگہ تلاش کر لی ہے جہاں سے سائیکل انھیں دکھائی دیتی رہے۔ اسی طرح سائیکل میں تالا لگانے کا کام بھی وہ ایک خاص اصول کے تحت کرتے ہیں۔ سائیکل کھڑی کوئی بھی کرے، تالا وہ خود لگاتے ہیں۔ تالا لگا کر وہ دو تین بار چیک کرتے ہیں، پھر مطمئن ہونے پر ہی آگے بڑھتے ہیں۔ ادھر زمانہ خراب ہو گیا ہے اس لیے وہ ربر چڑھا لوہے کی زنجیر والا دوسرا تالا بھی ساتھ رکھنے لگے ہیں جسے اگلے پہیے میں لگا دیتے ہیں۔ کبھی کبھی شدت جذبات میں بھرے صبح صبح کی دعا میں اس بات پر بھی بھگوان کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اتنے پُر آشوب دور میں بھی ان کی سائیکل کبھی چوری نہیں ہوئی۔

پچاس کے آس پاس کے لالہ بابو اپنی عمر سے کافی بڑے لگتے ہیں۔ چہرے پر موجود رہنے والی دو تین دن کی بڑھی ڈاڑھی، بیچارگی بکھیرتے ہوئے پچکے گال، چھوٹے چھوٹے سیدھے کھڑے بال، گندے کالروں والی قمیض اور چوڑے پائینچے والی بدرنگی پتلون ٹریڈ مارک کی طرح ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا مظہر ہیں۔

آج کی اس سنجیدہ میٹنگ میں لالہ بابو کی موجودگی کی دو وجہیں تھیں۔ ویسے تو سارے افسران کے لیے مائی باپ ہیں لیکن موجودہ بڑے صاحب کملا کانت ورما سے ان کا کچھ خاص قسم کا تعلق ہے۔ ایک تو وہ برادری کے ہیں، دوسرے سسرالی رشتے سے وہ ان کی بیوی کے ماما کے پھپھیا سسر بھی لگتے ہیں۔ یہ لالہ بابو کی شائستگی ہی تھی کہ انھوں نے آج تک کبھی بھی اس رشتے کا نامناسب فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی اور افسر اور ماتحت کے رشتے کو کبھی نہیں بھولے۔

دوسری وجہ بھی کچھ کم اہم نہیں تھی۔ نئے آنے والے بڑے صاحب تھے بنوک چند اُپادھیائے۔ لالہ بابو جیسا منکسر مزاج آدمی بھی کبھی کبھی دانت کٹکٹا کر ان کے لیے کہہ اٹھتا تھا: ''حرام الدہر!'' پہلے بھی بنوک چند اس دفتر میں رہ چکے تھے — ایک مرتبہ نہیں، دو دو مرتبہ۔ دونوں مرتبہ لالہ بابو کا تجربہ بڑا ہی تلخ تھا۔ اُپادھیائے جی ایک نمبر کے برادری وادی تھے۔ ان کے آتے ہی دفتر کے برہمن چپراسیوں اور بابوؤں کا راج ہو جاتا۔ بیچارے ٹھاکر، کائستھ ایک کنارے کر دیے جاتے۔

Scanned with CamScanner

پنڈت جی منھ میں پان دبائے، اپنے پیر میز کے باہر نکال کر دفتر میں بیٹھتے۔ ان کے کمرے میں داخل ہونے پر بابوؤں اور چپراسیوں کو پہلے ان کے پیر چھونے پڑتے؛ افسروں میں بھی زیادہ تر پیر چھوتے۔ پیر تو لالہ بابو نے بھی خوب چھوئے، پر بات کچھ بنی نہیں۔ دونوں بار اُپادھیائے نے لالہ بابو کا تبادلہ کرا دیا اور دونوں ہی بار وہ خوب پریشان ہو کر وہ اس دفتر میں لوٹ پائے۔

آج کی اس میٹنگ میں لالہ بابو کی شرکت کا راز یہی تھا۔ اپنے رویے اور فطرت کے برعکس بٹوک چند کی آمد نے ان میں ایک غصہ اور جوشیلا پن بھر دیا تھا اور خلافِ فطرت وہ اپنے سینیئروں کے سامنے بھی، جو بار بار اُپادھیائے کے آنے کے بارے میں صلاح مشورے کر رہے تھے، کبھی کبھی منھ بسور کر کہہ اٹھتے تھے: ''حرام الدہر!''

لالہ بابو کے پہلو میں، یعنی بڑے صاحب کے سامنے میز کی دوسری طرف، چیچک کے داغوں والا چہرہ لٹکائے، ہرے اور کالے رنگوں کے بیچ کے کسی رنگ والا چشمہ پہنے، اوپر کے دو کھلے بٹنوں والا چارخانے کا سفاری سوٹ چڑھائے اور بولتے وقت منھ میں ٹھونسے ہوئے پان کی پیک داہنے بائیں سامنے ہر طرف اچھالتے ہوئے، پھوہڑپن ہی جن کی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ تھا، شری للّن رائے براجمان تھے۔ ان کا یہاں ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ دفتر کا کوئی بھی شخص انھیں محکمے سے متعلق کسی میٹنگ میں شریک ہوتے دیکھتا اور وہ للّن رائے کے پس منظر سے واقف ہوتا تو اسے کوئی تعجب نہ ہوتا اور انھیں باہری شخص نہ مان کر ان کی وہاں موجودگی کو ایک عام سی بات محسوس کرتا۔

للّن رائے گوناگوں صلاحیتوں اور خوبیوں کے مالک تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا آغاز اخبار کے ہاکر کی حیثیت سے کیا تھا۔ اخبار بیچتے بیچتے وہ صحافی بن بیٹھے۔ شروع شروع میں وہ ایک روزنامے کے، جو اسی شہر سے چھپتا تھا، وہ اپنے محلے کے نامہ نگار بن گئے تھے۔ اگرچہ وہ صحیح ہندی نہیں لکھ پاتے تھے اور ان کے زیادہ تر مراسلوں کو ڈیسک پر بیٹھا کوئی نائب مدیر اپنا سر پیٹتے ہوئے تقریباً پھر سے پورا لکھتا تھا، پر وہ جلد ہی شہر کے سب سے معروف نامہ نگار بن گئے۔ وہ روز، بغیر کسی اجرت کی خواہش کیے، کئی کئی صفحے کالے کرتے تھے اور انھیں اندھیرا ہوتے ہوتے اپنے اخبار کے دفتر پہنچا آتے تھے۔

للّن رائے اور ان کا اخبار دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم تھے۔ انھوں نے ایک

ایسے وقت میں صحافت کی دنیا میں قدم رکھا تھا جب سماج کے دوسرے طبقوں کی طرح صحافت میں بھی ''آدرش'' ایک فالتو لفظ بن کر رہ گیا تھا۔ ہر شعبۂ زندگی میں خرید وفروخت جیسے نظریات نے صحافت کو بھی ایک کاروبار کی حیثیت دے دی تھی۔ اس دنیا میں یا تو بڑے کاروباری لوگ تھے جو ریاستی راجدھانیوں سے اخبار نکال رہے تھے اور جن کا مقصد صرف اخباروں کی طاقت کے بل بوتے پر اپنے جوٹ، سیمنٹ، تیل کے سامراجوں کی حفاظت کرنا تھا؛ یا چھوٹے اور منجھولے سرمایہ دار تھے جو چھوٹے شہروں سے اخبار نکال کر اپنی زمینوں کی خرید وفروخت، چٹ فنڈ یا سیاسی دلالی جیسے دھندوں میں بغیر کسی رکاوٹ کے پھلنا پھولنا چاہتے تھے۔ جس طرح کے اخبار کے للّن رائے نامہ نگار تھے، ان میں کام کرنے والے زیادہ تر لوگ تھوڑے تعلیم یافتہ یا تقریباً بالکل غیر تعلیم یافتہ تھے۔ انھوں نے اپنی سائیکلوں، اسکوٹروں اور موٹر سائیکلوں پر بڑے بڑے لفظوں میں ''پریس'' لکھوا رکھا تھا اور خود کو صحافی کہتے تھے۔ ان سے واسطہ پڑنے والے سرکاری افسروں کی نظر میں وہ صرف دلّال تھے جو پارٹ ٹائم صحافت بھی کرتے تھے۔

ان صحافیوں کی ایک ''نیوسنس ویلیو'' (nuisance value) تھی، جس کی وجہ سے سرکاری ملازمین یا افسران ان سے ڈرتے تھے۔ خبریں اکٹھی کرنے کے بہانے یہ تھانوں، دفتروں یا اسپتالوں میں کوئی نہ کوئی سفارش لیے گھومتے رہتے تھے۔ جن افسروں کے پاس وہ سفارش لے کر پہنچتے، وہ اکثر ان سے بھی بڑے گھاگھ ہوتے۔ سفارش کرنے والا چاہے جتنے ہی بھولے پن سے سفارشی کو اپنا رشتے دار، پڑوسی یا دوست یا حالات کا شکار بیچارہ کہے، گھاگھ افسر کو یہ تاڑنے میں زیادہ وقت نہ لگتا کہ پیروی کے پیچھے لین دین ہے۔ کچھ صحافیوں کے افسروں سے کئی قسم کے تعلقات قائم ہو جاتے۔ وہ تھانے پر پیروی کی جگہ سیدھے سیدھے لین دین کی بات کرنے لگ جاتے؛ اس لین دین کا ایک حصہ انھیں بھی مل جاتا۔ ٹھیکیدار اور انجینئر کے بیچ کمیشن کو لے کر کوئی تنازعہ کھڑا ہو جائے تو یہ ثالث کے فرائض انجام دیتے۔ ترقیاتی اور توسیعی کاموں میں پلاٹ یا فلیٹ الاٹ کرا کے وہ، اپنا حصہ کاٹ کے، افسر کو گھر پر اس کے حصے کی رشوت پہنچا آتے۔

للّن رائے کو صحافی بننے کا اعزاز ان کی ایک خاص اہلیت کی وجہ سے ملا۔ ان کے باپ اپنے علاقے کے سب سے بڑے نیوز ایجنٹ تھے۔ انھوں نے ابتدا تو ایک معمولی ہاکر کی حیثیت سے کی تھی

Scanned with CamScanner

مگر دھیرے دھیرے پچھلی دو دہائیوں میں ایک بڑے ایجنٹ کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ اس میں تکڑم کے ساتھ ساتھ ان کی محنت نے بھی ان کا ساتھ دیا تھا۔ پہلے وہ اپنے پانچوں لڑکوں کے ساتھ رات تین بجے سے ہی اٹھ کر میلوں سائیکل چلاتے تھے۔ گرمی، جاڑا، برسات ان کا ایک ہی جیسا معمول تھا۔ سارے باپ بیٹے صبح صبح ہی سے اٹھ کر اخباروں کے دفتروں یا ایجنٹوں کی دکانوں کے چکر لگاتے اور پھر آٹھ بجے تک گھر گھر گھوم کر اخبار رسالے بانٹتے، اس کے بعد ہی ان کے پیٹ میں کچھ اناج جاتا۔ دن میں پورا خاندان الگ الگ جگہوں پر الگ الگ دھندے کر کے روزی کماتا۔ باپ نے بھی بچوں کو پڑھانے کی کوشش کی تھی، پر گھر کے ماحول اور زندگی کی دشواریوں کی وجہ سے سب پانچ پانچ سات سات سال اسکول میں بتا کر باری باری اسکول سے نکل آئے۔ بعد میں باپ نے کچھ اخباروں کی ایجنسی لے لی۔ قسمت اور کاروباری صلاحیت نے اب ان کو ایک ایسے مقام پر پہنچا دیا تھا کہ باپ بیٹوں کو صرف انتظام دیکھنا پڑتا تھا اور بیسیوں ہاکر ان کے نوکر کی حیثیت سے اخبار لے جا کر بانٹتے تھے۔ اسی ایجنسی کی وجہ سے للن رائے کو ایک صحافی کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

ہوا کچھ ایسے کہ صوبے کے تین اخبار گھرانوں میں بھیانک قسم کی جنگ چھڑ گئی۔ یہ اخبار صوبے کے مغربی، مشرقی اور وسطی حصوں سے نکلتے تھے اور ان کے اپنے اپنے علاقے تھے۔ کاروباری مسابقت کی بنا پر تینوں کے مالکوں نے ایک دوسرے کے علاقوں میں گھس پیٹھ شروع کر دی۔ انھوں نے دھڑا دھڑ نئے نئے شہروں سے اپنے ایڈیشن نکالنے شروع کر دیے۔ بینکوں اور سرکاری اداروں کا پیسہ ان کی اخباری طاقت کی وجہ سے بآسانی حاصل تھا۔ حلوائیوں، حجاموں یا ہرا بیڑا (جڑی بوٹی) بیچنے والے دکانداروں میں ایسے حوصلہ مند نوجوان موجود تھے جو صحافی بننے کے لیے دو دو تین تین سو روپے پر بھی آنے کو تیار تھے۔

سنسنی خیز خبریں ہی ان اخباروں کی سب سے بڑی پونجی تھی۔ ہر طرح کے اخلاق اور احساسِ ذمہ داری کے اصول سے عاری یہ اخبار اپنی خبروں کی وجہ سے قصبوں یا دیہاتوں کے چائے خانوں میں سب سے زیادہ مشہور اور پسندیدہ تھے۔ ان میں چھپنے والی خبروں کو لکھنے کے لیے پڑھا لکھا ہونا ضروری نہیں تھا اس لیے للن رائے جیسے لوگ یہاں پوری طرح سے فٹ تھے۔

للن رائے میں کچھ خاص بات ضرور تھی جس سے وہ اپنے جیسے نیم تعلیم یافتہ لوگوں کے درمیان

بھی اپنی ایک الگ پہچان بنالیتے تھے۔ ان کے ایڈیٹر کم پروپرائیٹر ان کی اس صلاحیت کو پہچانتے تھے۔ اب ایودھیا میں بیس آدمی کارسیوا کے دوران مرے اور ان کے اخبار کے الگ الگ ایڈیشنوں میں مرنے والوں کی تعداد ہزار سے شروع ہو کر بیس ہزار تک پہنچادی گئی۔ اسی دور میں للن رائے کی ایک خبر نے ان کی تخیل پسند ایڈیٹر کو بھی چونکا دیا۔ للن رائے نے ایک شام خبر دی کہ جب سے رام جنم بھومی تحریک چل رہی ہے، شہر کی سبزی منڈی کی ایک مذہبی عقیدت سے سرشار بڑھیا کو سبزی والے کی دکان پر بکنے والے بینگنوں کو کاٹنے پر ان میں ''جے شری رام'' لکھا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

ان کی انھی صلاحیتوں کا کمال تھا کہ ان کا مالک، جس کا نام اخبار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے جانا جاتا تھا، اس نے صحافت کے علاوہ کچھ اور بھی ذمہ داریاں ان کو سونپ رکھی تھیں۔ بچوں کا داخلہ کرانا ہو، گھر میں گیس ختم ہوگئی ہو یا بندوق کا لائسنس رینیو کرانا ہو، یہ سارے کام للن رائے کے ذمے تھے۔ مالک کی بیوی کو بازار جانا ہوتا تو للن رائے کی تلاش جاری ہو جاتی۔ بچے سرکس جانا چاہتے تو للن رائے پاس لے کر حاضر ہوتے۔ گھر میں کسی کی سالگرہ ہوتی تو للن رائے شہر کے اعلیٰ حکام کو دعوت نامے دینے کی ذمے داری اٹھاتے۔ وہ کسی بھی ایسی تقریب میں مستقل پورٹیکو میں کھڑے رہتے اور افسروں کو خوش آمدید اور رخصت کرتے رہتے۔

اس بدلتے ہوئے دور میں لوگوں کے لیے صحافت جیسا پیشہ ایک دلالی بن کر رہ گیا تھا، چھوٹے یا بڑے پیمانے پر ہی سہی۔ مثلاً للن رائے کا مالک کولونائزنگ کرتا تھا۔ اخبار نے ہی اسے یہ طاقت دی تھی کہ سارے اصولوں، سارے قواعد وضوابط کی دھجیاں اڑا کر عین سول لائنز میں بنائی ملٹی اسٹوری بلڈنگ کا افتتاح صوبے کے وزیر برائے توسیع وترقیاتی منصوبہ جات نے کیا تھا، اور اب جب اس نے آدھی خریدی اور آدھی غیر قانونی طور پر قبضہ کی گئی سرکاری زمین پر ایک نئی کالونی بنانے کا اعلان کیا تو اس کا سنگ بنیاد شہر کے میئر سے کرانے جا رہا تھا۔ یہ اخبار اس کا سب سے بڑا ہتھیار تھا۔

اخبار کے اس ایڈیٹر کم پروپرائٹر کی کاروباری عقل بڑی تیز تھی۔ جب صوبے کے دوسرے اخباروں نے اس کے شہر میں دھاوا بولا تو اس نے اپنی تمام شاطرانہ چالوں سے ان کو تقریباً پست کر دیا۔ سب سے پہلے اس نے ہاکروں کے بچھے ہوئے جال پر قبضہ کیا۔ ہاکروں کو موپڈ (اسکوٹر) سے لے کر ٹیلی وژن جیسے تحفے بانٹے گئے۔ اسی چکر میں للن رائے ایک صحافی بن کر ابھرے تھے۔

Scanned with CamScanner

ان کے باپ بڑے ہاکر تھے اور یہ انھی کا اثر ورسوخ تھا کہ نئے اخباروں کو برسوں ان کے علاقوں میں ہاکر نہ مل سکے۔ ابتدا میں تو نئے اخباروں کو لگتا تھا کہ اس شہر میں ان کے اخباروں کی ترسیل مشکل ہے۔ اب دھیرے دھیرے ان کے پاؤں بھی جمنے لگے ہیں، حالانکہ اب بھی ہاکروں پر للن رائے کے اخبار کا ہی خاص اثر ہے۔ ہاکر بار بار لوگوں کے تقاضے پر ہی کوئی دوسرا اخبار دیتا ہے، نہیں تو للن رائے کا اخبار ہی ان کو پڑھنے کو ملتا ہے۔ برسوں ان اخباروں کے دفتروں میں پراسرار طریقے سے آگ لگتی رہی یا ان کے اخبار میں چھپی چھوٹی سی خبر پر کوئی طلبا تنظیم آ کر توڑ پھوڑ شروع کر دیتی اور پولیس دیر سے پہنچتی، یا رات گئے ڈیوٹی سے لوٹتے کسی نائب مدیر کی پٹائی ہوتی رہی۔ اب تو ان اخباروں نے بھی بہت سارے ہتھکنڈے سیکھ لیے ہیں مگر پھر بھی للن رائے کا ملٹی اسٹوری بلڈنگیں بنانے والا مالک ان پر بھاری پڑتا ہے۔

للن رائے کے شہر کے صحافیوں کو افسوس اس بات کا تھا کہ صوبائی دارالحکومت کی طرح ان کے یہاں دلالی کے بڑے بڑے مواقع نہیں تھے۔ وہاں کے صحافیوں کی وزیروں، مشیروں اور افسروں کے ساتھ گزاری جانے والی شاموں کی خبریں جب ان تک پہنچتیں، وہ حسد اور احساس کمتری میں ڈوبنے ترنے لگتے۔ ان کا شہر کہنے کو تو صوبے کے بڑے شہروں میں تھا، پر اس کے ساتھ سلوک پوری طرح قصباتی پن کا ہوتا تھا۔ ایک بوتل شراب دے کر افسر دس جگہ گاتا رہتا۔ ایک تھانیدار کو کماؤ جگہ لگوانے میں جتنا پیسہ ملتا، اس سے زیادہ شہر میں اس کا چرچا ہو جاتا۔ ابھی حال میں ضرور اس چلن نے زور پکڑا تھا کہ پریس کانفرنسیں ریستورنٹوں یا ہوٹلوں میں ہونے لگی تھیں، پر ان میں بھی شہر کا قصباتی ٹچا پن جھلکتا۔ اکثر تو پریس کانفرنس بلانے والے چائے سموسے پر ہی ٹرخا دیتے۔ بہت کم موقعوں پر راجدھانی کی طرح شراب میسر ہوتی۔ راجدھانی کی پریس کانفرنسوں میں ملنے والے سوٹ کے کپڑے، گھڑیاں اور ٹو اِن ون تو ابھی بھی اس شہر کے صحافیوں کے لیے حسرت و بھری خواہش تھی۔ ابھی تک اس شہر نے بس اتنی ترقی کی تھی کہ اب قلم یا سستی گھڑی تک بات پہنچنے لگی تھی۔

صوبے کی راجدھانی کے صحافیوں کی طرح اس شہر کے صحافیوں نے بھی اپنے اپنے بیٹ (beat) چن لیے تھے — خبروں اور دلالی کے بیٹ۔ ان میں پولیس سب سے زیادہ پسندیدہ بیٹ

Scanned with CamScanner

تھا۔ ہر صحافی کرائم رپورٹر بننا چاہتا تھا۔ اس بیٹ میں محنت کم اور مکھن زیادہ تھا۔ جرم کی زیادہ تر خبریں تو کنٹرول روم میں شام کو فون کرنے پر مل جاتیں۔ دن بھر کرائم رپورٹر تھانوں اور پولیس دفتروں کے چکر لگا کر کاجو اور مٹھائی کھاتے رہتے اور ایک آدھ مرغا بھی ڈھنگ کا پھنس جاتا تو اس کی پیروی کر کے دن بھر کی محنت وصول کر لیتے۔ ایک دو اصول پسند اور آدرش وادی قسم کے صحافیوں کو چھوڑ کر باقی سب کی شام کا انتظام ہو جاتا۔ سب کچھ یہاں مقرر کردہ اور طے شدہ طریقے سے چل رہا تھا۔ سمجھدار پولیس کپتان ایک ایک کرائم رپورٹر ایک ایک تھانے دار کے حوالے کر دیتا۔ وہ تھانے دار ہی اس کی بیوی بچوں کے لیے فلم یا سرکس کے پاس پہنچا آتا یا شام کو طے شدہ مقدار میں شراب اور مرغے کا انتظام کر دیتا۔ چھٹ بھیے کرائم رپورٹر جو پولیس کپتان تک نہ پہنچ پاتے، وہ چوکیوں یا تھانوں میں دھونی رمائے جم جاتے اور وہیں سے پھلتے پھولتے۔ للن رائے نے بھی شروع میں اسی بیٹ کی مانگ اپنے ایڈیٹر کے آگے رکھی تھی، پر ان کا ایڈیٹر اس پر قطعی راضی نہ ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ اس وقت اس کا ایک خاص چمچہ اس بیٹ میں لگا ہوا تھا اور پھر وہ للن رائے کی اس صلاحیت سے آج کی طرح واقف بھی نہیں تھا۔ اس نے للن کو پی ڈبلیو ڈی کا محکمہ الاٹ کر دیا۔ پہلے تو للن رائے نے کافی ناک بھوں چڑھائی، ہاتھ پاؤں مارے کہ پولیس ڈپارٹمنٹ مل جائے، مگر بعد میں جب انھوں نے اس محکمے میں قدم جمائے تو معلوم ہوا کہ یہاں بھی پولیس ڈپارٹمنٹ کی طرح چرنے کھانے کے لیے ایک وسیع میدان تھا۔

شروع شروع میں للن رائے کو کافی محنت کرنی پڑی۔ پی ڈبلیو ڈی یعنی پبلک ورکس ڈپارٹمنٹ ان کے لیے ایک دم نئی دنیا تھی، پر وہ وہاں جلد ہی ایک کامیاب صحافی مانے جانے لگے۔ ایک تو وہ بے حد محنتی تھے، دوسرے بچپن کی ٹریننگ کام آئی۔ اس پیشے میں کامیابی کے ساتھ آہستہ آہستہ تبدیل ہونے والی سواری، سائیکل، موپڈ اور اسکوٹر پر وہ تھر تھر کانپتی سردی یا سر چکرا دینے والی لو میں بارہ گھنٹے سے زیادہ کام کر سکتے تھے۔ دوسرے کامیابی کے گر انھیں ان ہی کے اخبار میں کام کرنے والے امرت لال گپتا نے سکھائے۔

امرت لال گپتا اخبار کی پولیس بیٹ کے وہی صحافی تھے جنھیں شروع میں ہٹانے کی کوشش للن رائے نے کی تھی اور بعد میں مایوس ہو کر ان سے دوستی گانٹھ لی تھی۔ گپتا جی زندگی میں کچھ بھی ادھار

رکھنے میں یقین نہیں رکھتے تھے۔ وہ دوست کے دوست اور دشمن کے دشمن تھے۔ مقامی تھانے سے انھیں روز ایک پاؤ شراب ملتی تھی۔ جب تک یہ انتظام جاری رہتا، ان کے تھانے میں امن وچین کا راج رہتا۔ جیسے ہی اس نظام میں کوئی رکاوٹ پیدا کرتا، ویسے ہی گپتا جی کا اخبار کچھ خاص طرح کی سرخیوں سے بھر جاتا۔ ان میں سے کچھ کے نمونے اس طرح تھے: ''تھانہ روپ نگر میں چوروں کی بن آئی، ڈاکو قصبہ لوٹتے رہے پولیس تھانے میں سوتی رہی''، یا ''دن دہاڑے تھانے میں بلاتکار۔'' بعد میں جب ان کی شراب پھر سے بندھ جاتی تو سرخیاں کچھ اس طرح ہو جاتیں: ''تھانہ روپ نگر میں پوری طرح امن چین''، ''رات بھر پولیس کی گشت سے چوروں کے حوصلے پست''، یا ''اب نہیں لٹے گی کسی ابلا کی عزت، روپ نگر تھانہ انچارج لوہا سنگھ کی للکار۔'' دراصل ان کی سرخیاں دیکھ کر ہی ان کے یار دوست بتادیتے تھے کہ آج کل پولیس اور امرت لال گپتا کی کیسی چھن رہی ہے۔

ان حضرت یعنی امرت لال گپتا نے ہی للّن رائے کو پیشہ صحافت کے گر سکھائے۔ ابتدائی دور میں جب للّن رائے ٹٹ پونجیا سائیکل پر سوار، اپنے چیچک زدہ چہرے پر ہرے اور کالے رنگ کے بیچ کے کسی رنگ کا چشمہ چڑھائے، اپنے چارخانے والے سفاری سوٹ کے ساتھ پی ڈبلیوڈی کے دفتر میں تشریف لائے تو افسروں اور بابوؤں نے انھیں کسی چڑی مار یا کرسے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ انھوں نے صحافیوں کے رعب داب اور اہمیت کو لے کر جو سپنے سجائے تھے، وہ چور چور ہونے لگے۔ وہ مایوسی اور دکھ کے سمندر میں ڈوبتے ابھرتے رہتے، اگر انھیں امرت لال گپتا کی ماہرانہ خدمات نہ ملی ہوتیں۔ کافی دکھ اٹھانے کے بعد وہ امرت لال گپتا کی پناہ میں آگئے۔

امرت لال گپتا نے سب سے پہلے للّن رائے کی ملاقات ایک ایسے جونیئر انجینئر سے کرائی جو پی ڈبلیوڈی میں مسلسل چلنے والی اقتدار کی جنگ میں مخالف کیمپ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے جو جو خبریں دیں، ان سے للّن رائے کی باچھیں کھل اٹھیں۔ کچھ زیر تعمیر عمارتوں، پلیوں اور سڑکوں کا انھوں نے چپکے چپکے معائنہ کیا، کچھ جگہوں کی تصویریں لیں، پھر دکھائے جوہر ان کی سرخیوں نے: ''ایک برسات نہیں جھیل پائے گی پرائمری اسکول کی عمارت، اپنے بچوں کو داخل کرنے سے پہلے والدین سو بار سوچیں گے''، ''انجینئر شرما کا کمال: سڑک بنی بعد میں، بہی پہلے''، ''حیرت انگیز مگر سچ: ایک بوری سیمنٹ میں ملا رہے ہیں چھبیس بوری بالو''، یا ''پی ڈبلیوڈی کا محکمۂ تعمیرات لوٹ کا اڈا بنا''۔ ان سرخیوں

کا جادو سر چڑھ کر بولا اور ایک دن بڑے صاحب نے للّن رائے کو بلا بھیجا۔ بند کمرے میں دونوں کے درمیان ڈیڑھ گھنٹے کی چوٹی کانفرنس ہوئی جس کے دوران ہر ملاقاتی کو چپراسی مسلسل ''صاحب بزی ہیں'' کہہ کر ٹرخاتا رہا۔ اس میٹنگ کے بعد جب للّن رائے باہر نکلے تو وہ اس نظام کا اٹوٹ انگ بن چکے تھے۔

کچھ ہی دنوں میں للّن رائے کو پی ڈبلیوڈی اتنا راس آیا کہ انھوں نے پولیس ڈپارٹمنٹ کے بارے میں سوچنا بند کر دیا۔ پی ڈبلیوڈی بیٹ نے گھر میں ان کی حیثیت بڑھا دی تھی۔ بیٹا صحافی ہو گیا ہے اور حاکم حکام اس سے ملنے آئیں گے، یہ سوچ کر ان کے باپ نے پاس پڑی سرکاری زمین گھیر کر دو کمرے بنوا ڈالے۔ صحافی جی کا گھر بن رہا ہے، یہ جان کر میونسپل کارپوریشن والے روکنے نہیں آئے۔ بالو، سریا، سیمنٹ وغیرہ پی ڈبلیوڈی کے بڑے صاحب نے الگ الگ جونیئر انجینئروں کے ذمے لگا دیں۔ اینٹ امرت لال گپتا نے ایک تھانے دار سے کہہ کر آدھے داموں بھٹے والوں سے دلا دی اور اس طرح خاندان اور پڑوسیوں پر للّن رائے کا رعب ودبدبہ جم گیا۔ جلدی ہی انھوں نے اپنے سب سے چھوٹے بھائی کو، جو چاقو زنی اور لڑکیاں چھیڑنے کے دو معاملوں میں جیل جا چکا تھا اور مستقبل قریب میں جس کا زیادہ وقت جیل میں گزرنے کے امکانات تھے، ٹھیکیداری میں لگوا دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس شعبے میں ترقی کر گیا۔

للّن رائے ہر بڑے صاحب کے لیے کام کی چیز ہوا کرتے تھے۔ موجودہ صاحب بھی ان کا طرح طرح سے استعمال کرتے تھے۔ اپنے مخالفین کے کیمپ کے لیے اخبار بازی کرانی ہو، شہر میں آئے ہوئے پبلک ورکس ڈپارٹمنٹ کے وزیر تعمیرات وترقی یعنی بڑے منتری کی پریس کانفرنس میں مخالف صحافیوں کو سدھانا ہو، کسی نیتا کو ہموار کرنا ہو یا بڑے صاحب کے کسی افسر کو خوش کرنے کے لیے اخباروں میں کوئی انٹرویو چھاپنا ہو، ہر موقع پر للّن رائے اپنی خدمات کے ساتھ حاضر ہوتے۔ موجودہ بڑے صاحب کا اعتماد تو کچھ زیادہ ہی انھیں حاصل ہو گیا تھا۔ صوبے کے کچھ لوگوں سے اثر ورسوخ کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا تھا، جنھیں وہ مستقلاً پیسہ بھیجتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی نہ ملتا تو وہ للّن رائے کو ہی پیسہ لے کر بھیج دیتے۔ للّن رائے کے اپنے سیاسی تعلقات بھی اس درمیان بن گئے تھے۔

اس آج کی ایمرجنسی میٹنگ میں ان کی شرکت کے پیچھے یہی سارے راز تھے۔

Scanned with CamScanner

روز کے معمول کے مطابق وہ گیارہ بجے پی ڈبلیوڈی کے دفتر میں داخل ہوتے۔ اس سے پہلے دس سے گیارہ تک کا وقت کچہری اور دوسرے سرکاری دفتروں کے سامنے چائے یا لسّی کی دکانوں پر بتاتے تھے۔ اکثر ان کے ساتھ امرت لال گپتا بھی ہوتا۔ روز ہی کوئی نہ کوئی جونیئر انجینئر یا ٹھیکیدار مل جاتا جو انھیں لسی، سموسے وغیرہ کھلاتا پلاتا۔ جب للّن رائے کی بیٹ کا کوئی مرغا نہ پھنستا تو امرت لال گپتا کسی داروغہ یا سپاہی کو پکڑ لیتا جو ان کے چائے پانی کا خرچ اٹھاتا۔ اس درمیان طرح طرح کے لوگوں سے ان کا انٹرویو چلتا رہتا اور وہ خبریں جمع کرتے رہتے۔ پھر دن بھر کے پروگرام کی آؤٹ لائن وہیں بیٹھے بیٹھے تیار کرتے۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی مٹر گشتی کے بعد وہ مگھئی پان کا جوڑا منھ میں دباتے اور اپنی اپنی بیٹ پر روانہ ہو جاتے۔ امرت لال گپتا کی منزل ہوتی کسی سینئر پولیس آفیسر کا دفتر یا کوئی تھانے دار، اور للّن رائے پی ڈبلیوڈی کے دفتر میں داخل ہوتے۔

آج اس معمول میں تھوڑی تبدیلی آئی۔ ابھی للّن رائے نے اپنا اسکوٹر چائے کی دکان کے باہر کھڑا کر کے اپنا چشمہ اتار کے اس امید سے پونچھنا شروع کیا ہی تھا کہ کوئی نہ کوئی واقف کار چائے پلانے والا یا امرت لال گپتا کہیں نہ کہیں سے انھیں دیکھ کر ان کی طرف آ جائے گا، تبھی بڑے صاحب کا ڈرائیور جانے کہاں سے ان کے سامنے آ ٹپکا۔

''آج بڑی دیر کر دی رائے صاحب۔ بڑے صاحب کب سے ڈھنڈوا رہے ہیں۔ چار بار ہمیں بھیج چکے ہیں۔''

للّن نے غور سے ڈرائیور کی طرف دیکھا۔ معاملہ کچھ سنگین لگا۔ ابھی مشکل سے سوا دس بجے تھے۔ بڑے صاحب اتنی جلدی دفتر آ گئے اور انھیں ڈھونڈ رہے ہیں، ضرور کوئی خاص بات ہے۔

''ہمیں کچھ نہیں پتا، بس بار بار صاحب ہمیں بھیج رہے ہیں آپ کو دیکھنے کو۔ ابھی آپ نہ ملتے تو گاڑی لے کر آپ کے گھر پہنچ جاتے ہم۔''

''اچھا... چلو... ایک جوڑا پان منھ میں دبا لیا جائے تو چلیں۔''

''آپ چلیں، ہم پان لگوا کر لا رہے ہیں۔ یہاں کھڑے رہیں گے تو ابھی آپ کو آپ کے چاہنے والے گھیر لیں گے، پھر نکلنا مشکل ہو جائے گا۔''

''ٹھیک ہے، پان لگوا کر آؤ، ہم چل رہے ہیں،'' للّن رائے نے کہا اور اسکوٹر اسٹارٹ کر کے

Scanned with CamScanner

سڑک کی دوسری جانب واقع پی ڈبلیوڈی کے دفتر کی طرف کچہری کی بھیڑ میں سے دھیرے دھیرے اسکوٹر نکالتے ہوئے بڑھ گئے۔

للن رائے جب بڑے صاحب کے کمرے کے سامنے پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ دروازہ بند تھا، مگر جس طرح لپک کر چپراسی نے دروازہ کھول کر اندر جانے کا اشارہ کیا، اس سے یہ صاف ظاہر ہو گیا کہ معاملہ کچھ خاص تھا اور ان کا انتظار ہو رہا تھا۔

اندر پھیلی ہوئی اداسی اور دکھ کو گھستے ہی سونگھا جاسکتا تھا۔ للن رائے نے بھی پورا معاملہ سمجھے بغیر منھ لٹکا لیا۔ انھوں نے یہ سوچ کر ضرور اطمینان کا سانس لیا کہ وہ بڑے صاحب کے لیے کتنے اہم ہیں کہ چار لوگوں کے ساتھ بند کمرے کی رازدارانہ میٹنگ میں صلاح مشورے میں ان کا بھی نمبر پڑتا ہے۔

کمرے میں بیٹھے لوگ ایک دوسرے سے سرگوشی میں باتیں کر رہے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی سب چپ ہو گئے۔ بڑے صاحب کی آدھے چاند کی شکل کی اور کافی حد تک شاندار میز کے بائیں جانب اسسٹنٹ انجینئر رضوان الحق، داہنی طرف جونیئر انجینئر دھورولال یادو اور سامنے بڑے بابو بیٹھے تھے۔ حالانکہ تینوں کے بازو والی کرسیاں خالی پڑی تھیں مگر للن رائے بڑے بابو کے قریب پڑی ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔

تھوڑی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ معاملہ کیا ہے؟ بے چینی سے للن رائے نے بوڑم کی طرح باری باری سب کی طرف دیکھا۔ کوئی نہیں بولا تو وہ اور زیادہ بے چین ہو گئے۔ انھیں کچھ نہیں سوجھا تو سامنے پلیٹ میں رکھے پان کے بیڑوں میں سے دو پان اٹھائے، اس کے پاس تمباکو میں سے رکھی ایک چٹکی تمباکو اٹھائی اور منھ میں ڈال لی۔

پان کھا کر للن رائے چونا کتھا اپنے بالوں میں پونچھ رہے تھے کہ صاحب نے اپنے سامنے پڑے ایک کاغذ کو ان کے سامنے سرکا دیا۔ یہ تبادلے کا حکم نامہ تھا جو صبح صبح ایک اسپیشل میسنجر لایا تھا۔

''بڑی شدھ ہندی ہے صاحب!'' للن رائے نے لوگوں کو ہنسانے کی کوشش کی، پر کوئی مسکرایا تک نہیں۔

مشکل سرکاری ہندی میں جو لکھا تھا، اسے پڑھنے میں للن رائے کو ضرور دقت ہوئی، پر سمجھنے

Scanned with CamScanner

میں نہیں۔ مطلب صاف تھا کہ بڑے صاحب یعنی شری کملا کانت ورما کا تبادلہ ڈپارٹمنٹ کے ہیڈکوارٹر میں ڈزائن سیل میں ہوگیا تھا اور انھیں فوری طور پر دفتر کے نمبر دو شری رشبھ چرن شکلا، اسسٹنٹ انجینئر، کو اپنی ذمے داریاں سونپنی تھیں۔ بٹوک چند اُپادھیائے، ایگزیکٹو انجینئر، کو ابھی آ کر رشبھ چرن شکلا سے اپنی ذمے داریاں لے کر اس ڈویژن کا ایگزیکٹو انجینئر بننا تھا۔ اتنا پڑھنے کے بعد للن رائے کی سمجھ میں آ گیا کہ معاملہ گمبھیر ہے اور وقت کم ہے۔

انھیں معلوم نہیں تھا کہ ابھی تک کیا پالیسی میدانِ کارزار کے لیے وضع کی جا چکی ہے اور کیا کیا فیصلے کیے جا چکے ہیں۔ اس پوری واردات میں ان کا کیا کردار ہوگا، اسے سمجھنے کے لیے انھوں نے کاغذ سامنے سے سرکایا اور بڑے صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ بے معنی سا لفظ منہ سے نکالا۔

''تو...''

''تو کیا؟... ایڈیٹر صاحب، آپ بتایئے، کیا کرنا ہے؟'' رضوان الحق نے پوچھا۔

اس کا مطلب، ان کی رائے کی اہمیت ہے۔ للن رائے سنجیدہ ہو گئے۔ رائے دینے سے پہلے کچھ اہم معلومات کا ہونا بھی ضروری ہے۔

''بٹوک چند اُپادھیائے کب تک آ رہا ہے؟''

''چل چکا ہے، آدھے ایک گھنٹے میں پہنچ رہا ہے۔''

''کیسے پتا؟''

''لکھنؤ فون کیا گیا تھا۔ اس کے دفتر سے پتا چلا کہ صبح کسی پرائیویٹ کار سے روانہ ہو گیا ہے۔ اب تو پہنچنے والا ہوگا۔''

''بڑے صاحب اتنا سویرے دفتر کیوں آ گئے؟''

''دھوکا دے کر بلایا گیا۔ ایس ای نے فون کیا کہ دس بجے وہ دفتر آئیں گے۔ یہاں آنے پر اسپیشل میسنجر کھڑا تھا۔''

''آرڈر رسیو کر لیا؟''

''صاحب نے نہیں کیا، پر رشبھ چرن سالے نے ڈسپیچر سے کروا یا ہے۔''

''اس حرام زادے رشبھ چرن سے تو میں نپٹوں گا۔ دفتر میں سالوں نے برہمن واد پھیلا رکھا

Scanned with CamScanner

ہے،'' دھورولال نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

بڑے صاحب کے سامنے تبادلوں سے پیدا شدہ ایسی صورت حال کئی بار آچکی تھی۔ ان کا آدھا دھیان اپنے ماتحتوں کی بات چیت پر تھا اور آدھا آگے کی حکمتِ عملی بنانے پر لگا تھا۔ بیچ بیچ مسکرا کر یا کچھ مذاقیہ جملے بول کر وہ اپنے کو مطمئن دکھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

''اب کیا کرنا ہے صاحب، جلدی فیصلہ کیجیے۔ نہیں تو بٹوک چند سالا کبھی بھی پہنچ سکتا ہے۔'' دھورولال یادو ایکشن میں یقین رکھتے تھے۔ اتنی لمبی میٹنگ کا دورانیہ اب انھیں اکتا دینے والا لگنے لگا تھا۔

''آپ نے جو کرنے کا فیصلہ کیا ہے، اسے ایڈیٹر صاحب کو بھی سنا دیجیے۔ بیچارے دیر سے آئے ہیں،'' بڑے صاحب نے چہل کی۔ بڑے بابو مسکرائے اور رضوان الحق ہنسنے لگے۔

دھورولال کو بھی مزہ آیا۔ انھوں نے اپنی خاص ادا میں للن رائے، صحافی کو سمجھایا۔ ''ایڈیٹر صاحب، اپنا تو کھلا کھیل فرخ آبادی ہے۔ لات کے دیوتا سے بات نہیں کرنی چاہیے۔ آنے دو بٹوک چند اُپادھیائے کو۔ پورٹیکو میں گاڑی رکتے ہی دوں گا دھنا دھن سو جوتے اور گنوں گا ایک۔ سالے نے جتنا پیسہ خرچ کیا ہوگا، لکھنؤ میں پیچھے کے راستے سب نکل جائے گا۔ بڑے صاحب، بس ایک بار ہاں کریں۔'' بات تو للن رائے کو بھی جمی۔ اگر کچھ دن پہلے یہ تجویز ان کے سامنے رکھی گئی ہوتی تو وہ کلکاری مار کر ہنستے اور اپنے چیچک زدہ چہرے پر شرارت بھری مسکراہٹ لا کر ایک آنکھ دباتے اور شرارتی انداز میں کہتے، ''گرو، آئیڈیا تو ٹھیک ہے، پر جوتا کڑوے تیل میں ڈبویا ہوا ہونا چاہیے۔'' مگر اس وقت وہ ایک صحافی تھے، اس لیے بس صرف استادانہ سنجیدگی سے مسکرائے۔

''چلیے، آپ لوگوں کو چھٹی ملی مجھ سے۔ سوچتے ہوں گے، بڑا پریشان کرتا تھا پاجی!'' بڑے صاحب نے اپنے کو مطمئن دکھانے کے لیے اوپری دل سے مذاق کرتے ہوئے کہا، مگر ان کا چہرہ دیکھ کر کوئی بھی شخص جو اُن کو قریب سے جانتا ہو، سمجھ سکتا تھا کہ ان کے اندر زور شور کے ساتھ کچھ پک رہا تھا۔

''آپ بھی کیسی بات کر رہے ہیں صاحب! اس حرام الدہر کے ساتھ ...'' بڑے بابو کی آواز رندھ گئی۔

''کام کرنے کا مزہ تو آپ ہی کے ساتھ آیا۔ آپ کو جانے نہیں دیں گے ہم،'' رضوان الحق نے اور زور دے کر کہا۔

''ہم تو صاحب لنٹھ تھے۔ آپ نے ہمیں جے ای بنا دیا۔ پہلی بار دھورولال یادو نے بھی کام کرنا شروع کر دیا۔ آپ گئے تو بٹوک چند کو چار جوتا مار کے پھر لنٹھئی شروع کر دیں گے۔'' دھورولال یادو نے بھی اپنی وفاداری کا اعلان کر دیا۔

بڑے صاحب نے چشمے کو ناک پر کھسکایا اور بولنے والوں کو غور سے تولا۔ سالے یہی سب ڈائیلاگ بٹوک چند کے سامنے بھی بیٹھ کر جھاڑیں گے۔ بڑی ذلیل دنیا ہے یہ! انھوں نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''رائے صاحب، آپ کو لکھنؤ کا مورچہ سنبھالنا پڑے گا،'' رضوان الحق نے کہا۔

''مجھے حکم چاہیے،'' ملکن رائے نے بڑے صاحب کی طرف دیکھا۔

''حق صاحب بتائیں گے کہ کسے کیا کیا کرنا ہے۔'' بڑے صاحب نے اس جنگ کا سپہ سالار حق صاحب کو مقرر کیا۔

''سب سے پہلے تو آپ ہی یہاں سے تشریف لے جائیے۔ آپ کو دھوکا دے کر یہاں بلایا گیا ہے، پر اب آپ کو بیمار پڑنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ بٹوک چند کو آسانی سے چارج نہیں ملنا چاہیے۔''

بڑے صاحب کے چہرے پر ہچکچاہٹ دیکھ کر حق نے چاپلوسی اور شربتی چاشنی میں بھگو کر اپنی زبان کا وار کیا،'' پھر آپ ایس ای صاحب کی مروّت میں پڑے۔ انھوں نے آپ کے لیے کیا کیا؟ جھوٹ بول کر دفتر بلا لیا۔ اس کا مطلب، انھیں بٹوک چند کے آرڈر کا علم تھا۔ چیف انجینئر کے دفتر سے حکم ملا ہوگا کہ آپ کا چارج سنبھال لے، تو جھوٹ بول کر آپ کو یہاں بلا لیا۔ تھوڑی دیر میں بٹوک چند یہاں پہنچ جائے گا، پھر آپ دیکھیے گا ایس ای صاحب بھی پیچھے پیچھے ہیں ہیں کرتے پہنچ جائیں گے۔ تب آپ کے پاس کوئی چارہ نہیں ہوگا، سوائے اس کے کہ چارج دیں۔ وقت کم ہے، آپ پہلے یہاں سے جائیے، تب ہم فیصلہ کریں گے کہ کیا کرنا ہے۔''

''وقت سچ مچ کم ہے،'' بڑے صاحب یعنی کملا کانت نے سوچا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایسا

Scanned with CamScanner

نہیں تھا کہ وہ اس بات کو سمجھ نہیں رہے تھے۔ اپنے ماتحتوں کی باتیں سنتے ہوئے وہ بولے، ’’ہاں، وقت بہت کم ہے۔‘‘ مگران کا دماغ مسلسل کام کر رہا تھا۔ دفتر میں آتے ہی وہ سمجھ گئے تھے کہ ان کے خلاف سازش ہوئی ہے۔ سپر نٹنڈنگ انجینئر پیارے لال نے صبح صبح ان کے گھر چپراسی بھیجا کہ وہ دس بجے دفتر آئیں گے، اور کوئی ضروری رپورٹ لکھنؤ بھیجنی ہے، اسی کے بارے میں بات کرنی ہے۔ انھوں نے فوراً فون سے ایس ای سے رابطہ کر کے معلوم کرنا چاہا کہ معاملہ کیا ہے، لیکن ان کا فون مسلسل بزی ملا۔ اب سمجھ میں آیا کہ اس کا رسیور ہی ہٹا دیا گیا ہوگا۔ اتنے سویرے دفتر پہنچنا اور ایس ای کا بھی ان کے دفتر آنا انھیں کھٹکا ضرور، لیکن یہ توقع نہیں تھی کہ وہاں پہنچنے پر انھیں تبادلے کا آرڈر تھما دیا جائے گا۔

اس توقع کے پس پردہ سب سے بڑی وجہ تو یہ تھی کہ کملا کانت ورما اپنے کو ایس ای پیارے لال کا خاص آدمی سمجھتے تھے اور سپر نٹنڈنگ انجینئر کے ساتھ تعلقات دوسرے ایگزیکٹو انجینئروں کے لیے حسد کا باعث تھے۔ ان تعلقات کی بنا پر ہی لوگ ان کی پیٹھ پیچھے طرح طرح کی باتیں کرتے تھے۔ انھیں ان باتوں کے بارے میں علم تھا لیکن اسے حاسدانہ اور نیچ رویہ سمجھ کر انھوں نے کبھی کسی کی پروا نہیں کی۔ انھیں پوری امید تھی کہ کبھی ان کے اوپر کوئی مصیبت آئی بھی تو پیارے لال سب سے پہلے انھیں آگاہ کریں گے۔ اس طرح دھوکا دے کر دفتر بلا لیے جانے کا تو انھیں سان گمان بھی نہ تھا۔ دوسرے اس وقت کمبھ میلے کی تیاریاں چل رہی تھیں۔ روز لکھنؤ طرح طرح کی خبریں منگائی جاتی تھیں۔ کئی مرتبہ تو دیر رات تک خبریں جمع کی جاتیں، لمبے چوڑے ڈرافٹ بنتے اور رات میں ہی جا کر ایس ای کے دستخط کرائے جاتے اور صبح ٹرین پکڑ کر کوئی بابو لکھنؤ روانہ ہوتا۔ مہینے میں دس دن سے زیادہ وہ اور سپر نٹنڈنگ انجینئر لکھنؤ میں رہ کر الگ الگ طرح کی میٹنگ میں شریک ہوتے۔ یہ ان کی محنت اور کوشش کا نتیجہ تھا کہ کمبھ میلے کا بجٹ پچھلے کمبھ سے ڈیوڑھا ہو گیا تھا۔

اس ساری محنت کا کیا یہی پھل انھیں ملنا چاہیے تھا؟ کملا کانت ورما نے اداس ہو کر سوچا۔ اس سالے پیارے لال سے تو وہ بعد میں نمٹیں گے۔ سالا ان کا نہیں ہوا تو دنیا میں کسی کا نہیں ہوگا۔ انھوں نے اس کے لیے دفتر کے سارے اصول توڑ دیے۔ پچھلے ایس ای جن ٹینڈروں کو خود منظور کرتے تھے، صرف ان پر ایک فیصد لیتے تھے؛ اس نے ڈویژن کی کیش بک دیکھ کر پورے کام پر ایک فیصد

لینا شروع کر دیا۔ دوسرے ایگزیکٹو انجینئروں نے مخالفت کی، پر کملا کانت ورما نے منظور کر لیا تو جھک مار کر انھیں بھی یہ صورت حال گوارا کرنی پڑی۔ اسی طرح پچھلا ایس ای ہر ڈویژن سے دو ہزار روپیہ مہینہ لیتا تھا، لیکن اس نے تو آتے ہی پانچ ہزار روپیہ کر دیا۔ پہلے بڑی ہائے توبہ مچی، پر کملا کانت نے یہاں بھی سب سے پہلے ہتھیار ڈال دیے؛ دوسرے ڈویژنوں کے انجینئروں نے پہلے تو کچھ دن تک اس کی مخالفت کی مگر پھر ان کو بھی جھکنا پڑا۔ ہر مہینے سپرنٹنڈنگ انجینئر پہلے ہفتے میں سب کی میٹنگ کراتا تھا، اسی دوران سبھی اپنا اپنا لفافہ بڑھا دیتے تھے۔ کئی مہینے تک ایس ای معمولی معمولی باتوں پر ان انجینئروں کو ذلیل کرتا رہا جنھوں نے کملا کانت ورما کی طرح لفافے میں پانچ ہزار رکھنا شروع نہیں کیا تھا۔ ان کے کاغذوں پر طرح طرح کے اعتراضات لگتے رہتے۔ آخر میں ایک ایک کر کے سب نے ہتھیار ڈال دیے۔ آپسی بات چیت میں وہ سب کملا کانت کو کوستے تھے کہ انھوں نے پورا ماحول بگاڑ دیا ہے۔

اتنا سب کرنے کے بعد پیارے لال نے ان کے ساتھ ایسا سلوک کیا، کمرے کے باہر نکلتے نکلتے انھوں نے درد بھرے انداز میں سوچا۔

ان کے کمرے کے باہر دفتر کا ماحول بے چینی اور پر اسراریت سے شرابور تھا۔ باہر آتے ہی وہ اپنی جیپ کی طرف بڑھے۔ مشکل سے دس قدم پر جیپ کھڑی تھی لیکن یہ دس قدم طے کرتے ہوئے انھیں لگا کہ جیسے پورا ایک جگ بیت گیا ہو۔ پتا نہیں یہ ان کا احساس تھا یا حقیقت، انھیں لگا کہ دفتر کے دروازوں اور کھڑکیوں سے آنکھیں چپکی ہوئی ہیں اور وہ سبھی انھیں گھور رہی ہیں۔ راستے میں دفتر کے ماتحتوں اور ٹھیکیداروں نے ہاتھ اٹھا کر سلیوٹ کے انداز میں سلام کیا اور وہ اپنے عام رویے سے ہٹ کر سر کی ہلکی جنبش سے انھیں جواب دیتے رہے۔ ان کے جیپ میں بیٹھتے ہی ڈرائیور نے گاڑی روانہ کر دی۔ پورے ماحول کا اثر اس پر بھی تھا۔ روز کی طرح ایک بار بھی اس نے منزل کے بارے میں نہیں پوچھا اور ہڑبڑاہٹ میں دوسرے گیئر میں گاڑی اٹھا دی۔ انجن نے دو تین بار جھٹکے کھائے، ڈرائیور نے کلچ دبایا تو ہلکی تھرتھراہٹ کے بعد گاڑی لے میں آ گئی اور دفتر کے گیٹ سے باہر نکل گئی۔

صوبائی ڈویژن، پی ڈبلیو ڈی، کے محکمۂ تعمیرات نام کے اس دفتر میں دوسرے کئی درجن سرکاری دفتروں کی طرح پہلے بھی کوئی کام نہیں ہوتا تھا، آج بھی نہیں ہوا۔ فرق صرف اتنا آیا کہ آج بابوؤں اور افسروں نے کام چوری کے ساتھ تحرل، پراسراریت اور سنسنی خیز ماحول میں دن بتایا اور دن کی ابتدا پر اسرار خبروں سے ہوئی۔

دفتر کا معمول تھا کہ سوا نو بجے اس کے دھول سے اٹے اور پان کی پیک سے بنے تجریدی آرٹ کی گیلری کا تاثر دینے والے برآمدوں میں چہل پہل شروع ہو جاتی۔ سوا نو بجے فراش نامی کوئی ملازم یکا یک وارد ہوتا تھا۔ اس کا کام تھا دفتر کے کمروں کے اندر کی میز کرسیوں کی صفائی۔ وہ آ کر دفتر کی کسی سیڑھی پر بیٹھ جاتا اور آس پاس کی سیڑھیوں اور دیواروں پر اپنے منھ میں بھرے تمباکو والے پان کی پیک سے کچھ فن پارے بکھیرتا۔ بیچ بیچ میں وہ ہوا میں منھ اٹھا کر کچھ مبہم سا بدبداتا۔ دفتر کی دیوار پر چھپر لگا کر چائے کی دکان کے جو مستقل خریدار تھے، وہ اس کی اس زیب و زینت سے مزین آراستہ و پیراستہ زبان کو خوب سمجھتے تھے کہ وہ اس دفتر کے چوکیدار نامی شخص کی خواتین سے اپنے خفیہ تعلقات اور رشتے جوڑ رہا تھا، جس کی خطا یہ تھی کہ اس وقت تک اس کو دفتر کے سارے دروازے کھلے رکھنے چاہیے تھے مگر اس کا کہیں پتا نہیں تھا۔ فراش کی باتوں سے یہ راز بھی افشا ہوتا تھا کہ چوکیدار کی نالائقی کی وجہ سے وہ اپنے فرائضِ منصبی ٹھیک طرح سے انجام نہیں دے پا رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ دفتر کے کمرے چماچم چمکتے رہیں، اور اس کے لیے ضروری تھا کہ چوکیدار اس کے دفتر پہنچنے تک سارے دروازے کھول رکھے۔ تھوڑی دیر کے بعد تو بابو لوگ آنے لگیں گے اور اس کے کیے دھرے پر پانی پھیریں گے ہی لیکن اس سے پہلے وہ اپنا فرض پورا ہی کر لینا چاہتا تھا۔ چوکیدار کے غائب ہونے کی وجہ سے اس کی یہ نیک خواہشات پوری نہیں ہو پا رہی تھیں۔ فراش کو جاننے والے جانتے تھے کہ اس کی یہ خواہش و جذبات اکیڈمک زیادہ تھے اور اکیڈمک ہونے کی وجہ سے سچائی سے ان کا کچھ لینا دینا نہیں

تھا۔ آج بھی یہی سب ہوا۔ آج بھی وہ تب تک بڑبڑاتا رہا جب تک چوکیدار آ نہیں گیا، اور جب چوکیدار نے آ کر کمرے کھولنے شروع کیے، وہ دفتر کی دیوار سے سٹی چائے کی دکان پر چلا گیا اور اس نے دن بھر میں دوسروں کے پیسوں سے پی جانے والی پچیس تیس پیالی چائے میں سے پہلی پیالی کا حکم سنایا۔

اس کے بعد چوکیدار نے ایک ایک کمرے کا دروازہ کھولنا شروع کر دیا اور ایک بار پھر فضا روز کی طرح نامعلوم خواتین کی شان میں کہے گئے قصیدوں سے گونج اٹھی۔ اس بار یہ خواتین فراش کے خاندان کی تھیں۔ چوکیدار کی باتوں کو سچ مانا جائے تو اس کی خوبصورت زبان سے نکلے ہوئے جملوں کا نتیجہ کچھ اس طرح تھا: یہ پورا دفتر کام چوروں سے بھرا ہوا ہے، فراش ان میں سب سے بڑا کام چور ہے؛ چونکہ سرکار نے فراش کی تنخواہ کافی کم رکھی ہے لہٰذا اس کے گھر کی عورتوں کو طرح طرح کے ایسے کام کرنے پڑتے ہیں جن کو بیان کر کے وہ اپنی زبان گندی نہیں کرے گا؛ یہ دفتر صرف بڑے صاحب اور چوکیدار کے بل پر چل رہا ہے اور، جیسا کہ زمانے کا چلن ہے، لوگ اس کی اہمیت نہیں سمجھ پا رہے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ اس درمیان اکا دکا بابو، ٹھیکیدار، دلال وغیرہ آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر چوکیدار کا لہجہ کچھ اور تیز ہو جاتا ہے، پر ان میں سے زیادہ تر اس کی بات سن کر اپنی قمیض سے دھول جھاڑنے لگتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ کسی تصوراتی مکھی اڑانے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

آج بھی اس دفتر میں دن کی شروعات روز کی طرح ہوئی۔

بابو لوگ آئے، اور حالانکہ انھیں دن کا کافی حصہ چائے کی دکان پر بتانا تھا، وہ اپنا جھولا، رومال یا تولیہ اپنی کرسیوں پر پھینک کر چائے کی دکانوں پر چلے گئے۔

کچھ دلال اور ٹھیکیدار آئے اور برآمدوں میں پان کی پچکاریاں مارتے ہوئے، کمروں میں جھانکتے اور ''اس ملک میں سالا کوئی کام نہیں کرتا'' جیسا کوئی خاموش جملہ دہراتے ہوئے چائے کی دکانوں پر چلے گئے۔

دو بجے اے ایک بلٹ موٹر سائیکل پر آئے۔ انھوں نے دفتر کے باہر بیچ سے موٹر سائیکل روکی، کلچ اور ایکسلریٹر کا کچھ ایسا کھیل کھیلا کہ انسان نامی جاندار سے خالی دفتر کی دیواریں اور چھت دیر تک تھرتھراتی رہیں اور پھر وہ ایک چائے کی دکان پر موٹر سائیکل لے کر اس انداز میں چڑھ گئے جیسے دور

وسطیٰ کا کوئی بگڑیل راجپوت سردار اپنی محبوبہ کے سوئمبر میں پہنچا ہو۔

قصہ کوتاہ یہ کہ روز کی طرح آج بھی ساری سڑکیں چائے کی دکانوں کی طرف جاتی تھیں۔

یہ چائے کی دکانیں دیش کے کسی بھی کونے میں، کسی بھی سرکاری دفتر کے سامنے اُگ سکتی تھیں، یہاں بھی اُگ آئی تھیں۔ یہاں چونکہ سرکاری دفاتر خاصی تعداد میں تھے، اس لیے دکانیں بھی کافی تعداد میں تھیں۔ یہ دکانیں رہائش اور لینڈ ریفارم جیسی سرکاری چِنتاؤں کا دائمی علاج تھیں۔ ان کا کلیدی رول تھا: جہاں بھی دو گز زمین ملے، اپنا چھپر ڈال لو۔ پھر اس میں چولھا، فرنیچر اور نل جیسی چیزیں اپنے آپ سما جائیں گی۔ چھپر کو ٹکانے کے لیے بانس، بلّی کے ساتھ ساتھ سرکاری چار دیواریاں بہتات سے تھیں۔ دکانوں کے لیے زمین جیسی بیکار چیز خریدنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ چاروں اطراف سرکاری زمینیں پسری پڑی تھیں۔

اپوزیشن پارٹی ٹھیک ہی کہتی ہے کہ ہماری سرکار بہری ہے، کیونکہ اگر وہ سن سکتی تو ان دکانوں سے دھما کا خیز آوازوں میں نشر ہونے والے یہ پیغامات ضرور سنتی: ''دیس میں زمینوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ جو زمین سرکاری ہے وہ زمین ہماری ہے۔''

صفائی، ہائی جین اور ان سے ملتے جلتے الفاظ مغرب نے اس لیے گڑھے ہیں کہ ویدوں جیسے عظیم گرنتھوں کے پڑھنے والے ہندوستانیوں کو بیچ بیچ میں شرمندہ کر سکیں؛ پر چونکہ شرمندگی ہماری قومی پالیسی کے خلاف ہے، اس لیے وہ بکتے رہتے ہیں اور ہم ان سے قرض لے کر ان کی بکواس کو مکھیوں، مچھروں اور تل چٹوں کے ساتھ ملا کر چائے کی پیالی میں سرو کرتے رہتے ہیں۔

سموسہ نام کی ایک قومی غذا اس ملک میں ہر کہیں دستیاب ہے، جس کے لیے ضروری خام مال کی پورے ملک میں افراط ہے۔ یہ پہلی قومی غذا ہے جس میں آلو کے ساتھ کشمیر سے کنیا کماری تک کی دھول اور لید ملائی جا سکتی ہے۔

سرکار اتنے اہم پیغاموں کو نظر انداز کرتی ہے لیکن ذمے دار شہری کے روپ میں دفتروں کے بابو، چپراسی اور فریادی اپنے دفتری وقت کا زیادہ تر حصہ چائے کی دکانوں پر بتاتے ہیں اور قوم کے نام نشر ہونے والے ان پیغاموں کو پورے غور سے سنتے رہتے ہیں۔

روز کی طرح بڑے بابو کی سائیکل مقررہ وقت پر دفتر میں داخل ہوئی۔ فراش نہ جانے کہاں

سے وارد ہو گیا۔ اس نے جھک کر نمسکار کیا اور سائیکل پکڑ لی۔ بڑے بابو نے نظر انداز کرنے والے انداز سے اسے دیکھا اور نمسکار کا جواب نہیں دیا۔ انھیں معلوم تھا کہ فراش نے پراویڈنٹ فنڈ سے قرض کے لیے درخواست دے رکھی ہے اور کاغذ بڑے بابو کے پاس ہے، اس لیے اس کے نمسکار کا جواب نہ دینا ہی مناسب ہے۔ فراش نے سائیکل ایسی جگہ کھڑی کر دی جہاں سے بیٹھے بیٹھے بڑے بابو اسے دیکھ سکیں۔ اس نے سائیکل میں تالا لگا کر چابی بڑے بابو کو دے دی۔ ربڑ کی زنجیر والا تالا بابو نے خود لگایا اور فراش کے لگائے تالے کو ہلا ڈلا کر اطمینان کیا کہ تالا ٹھیک سے لگا ہے کہ نہیں۔ پھر وہ اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

کمرہ خالی تھا۔ پہلے بڑے بابو بھی آتے ہی کرسی پر اپنا جھولا رکھ کر چائے کی دکان پر چلے جاتے تھے، پر بڑے بابو ہونے کے بعد سے نہیں جاتے ہیں۔ ان کے لیے چائے سموسہ یہیں آ جاتا ہے۔ دن میں ضرور تین چار بار وہ ٹھیکیداروں یا جونیئر انجینئروں کے اصرار پر ان دکانوں میں چلے جاتے ہیں۔ آتے ہی چائے کی دکان پر جانے سے دفتر کے ڈسپلن کی خلاف ورزی ہوتی ہے، ایسا ان کا ماننا تھا۔

آج بھی وہ خالی کمرے میں اپنی کرسی پر بیٹھے، اپنی سائیکل کو نہار رہے تھے۔ بار بار کسی بابو یا چپراسی کے اندر جھانکنے پر سامنے پڑی فائل کے صفحے الٹنے لگتے تھے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ ان کے اسی طرح وقت پر کرسی پر بیٹھنے سے آفس کا ڈسپلن سدھرے گا اور بابوؤں میں بھی اپنے اپنے فرائض کے تئیں ذمہ داری پیدا ہوگی۔ بابوؤں کی رائے اس معاملے میں بدقسمتی سے بالکل الٹی تھی، اس لیے روز کی طرح وہ اندر بیٹھے رہے اور بابو باہر دکانوں پر مٹر گشتی کرتے رہے۔ تبھی تھرتھری پیدا کرنے والے پراسرار واقعات کی شروعات ہوئی جن سے اگلے آنے والے چند دنوں تک اس دفتر کی زندگی اثر پذیر ہونے جا رہی تھی۔

ابھی دس بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے کہ دفتر میں بڑے صاحب کی جیپ داخل ہوئی اور پورٹیکو میں جا کر کھڑی ہو گئی۔

دفتروں میں بڑے صاحب لوگ دس بجے نہیں آتے؛ ان کے آنے کا وقت گیارہ ساڑھے گیارہ بجے شروع ہوتا ہے، کبھی کبھی دوپہر بعد بھی ہو سکتا ہے۔ خاص طور سے ایسے بڑے صاحبوں

Scanned with CamScanner

کے لیے جن کے کام میں دوروں کی گنجائش ہوتی ہے، دفتروں میں بیٹھنے کے وقت کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ اس دفتر کے بڑے صاحب کو بھی دورے کرنے پڑتے تھے، اس لیے ان کے دس بجے سے پہلے دفتر پہنچنے پر چھوٹا موٹا طوفان سا آ گیا۔

بڑے صاحب کے کمرے کو کھولنے اور صاف کرنے کا کام ان کا چپراسی کرتا تھا۔ وہ چائے کی دکان پر تھا۔ سب سے پہلے وہ بھاگا۔

صاحب نے اپنے دروازے کے سامنے کھڑے ہوکر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ان کا ڈرائیور باہر کی طرف دوڑ پڑا، پر آدھے راستے میں ہی چپراسی سے ملاقات ہوگئی۔ دونوں دوڑتے ہوے دروازے تک آئے۔ چپراسی نے تالا کھولا، ڈرائیور پردہ اٹھائے کھڑا ہو گیا اور بڑے صاحب اندر گھس گئے۔

بڑے بابو نے بڑے صاحب کو اندر جاتے ہوے دیکھا تو بغل میں ایک فائل دبائے ان کے کمرے کی طرف لپک لیے۔ ایک تو اپنے اندر کی بے چینی دور کرنے کا معاملہ تھا، دوسری طرف بڑے بابو یہ دکھانا چاہتے تھے کہ دفتر میں صرف وہ وقت سے آ کر اپنا کام شروع کر دیتے ہیں۔

بڑے بابو جب کمرے میں داخل ہوے تو چپراسی کمرے کے فرنیچر کی جلدی جلدی صفائی کر رہا تھا اور صاحب جیبوں میں ہاتھ ڈالے پنکھے کے نیچے کھڑے دھیمی دھیمی سیٹی بجا رہے تھے۔ سب کچھ پرسکون لگ رہا تھا۔ بڑے بابو کو دیکھتے ہی بڑے صاحب بڑے صاحب بن گئے۔ انھوں نے سیٹی بجانا بند کر دیا۔ جلد بازی میں صاف کی گئی کرسی پر ہاتھ پھیرتے ہوے بیٹھ گئے۔ بڑے بابو نے فائل سامنے رکھ دی، پر اسے پرے سرکاتے ہوے وہ بولے:

''ایس ای صاحب پہنچنے والے ہیں۔ آپ کے دفتر میں تو گیارہ بجے کام شروع ہوگا۔ جایئے ان سب کمبختوں کو چائے کی دکانوں سے کھدیڑ کر اندر کیجیے، کچھ کام دھام شروع کریں۔ کمبھ والے بابو سے کہیے کہ فائل مجھے دے جائے۔ شاید اسی بارے میں سرکار کو کچھ بھیجنا ہے۔''

عادت کے مطابق بڑے بابو 'بہت بہتر' جیسا کچھ بدبدائے اور باہر نکل آئے۔

باہر جو کچھ ان کے ساتھ ہوا، اس کے نتیجے میں وہ پانچ منٹ کے بعد اندر بھاگ کر پھر بڑے صاحب کے کمرے میں آ گئے۔

Scanned with CamScanner

بڑے بابو کی کرسی کے پاس جو آدمی کھڑا تھا، وہ ان کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے وہ جانتے تھے۔ وہ لکھنؤ ہیڈ آفس کا چپراسی تھا۔ پچھلے بیس سالوں سے وہیں تھا۔ وہاں کی ڈاک لے کر آتا تھا۔ اس کے دفتر میں آتے ہی افسروں سے لے کر بابوؤں تک اسے الگ الگ بٹھا کر ہیڈ آفس کی خبریں پوچھا کرتے تھے۔ اس کی اچھی آؤ بھگت بھی ہوتی تھی۔ پر وہ اتنی صبح کبھی نہیں پہنچا تھا۔ لکھنؤ سے آنے والی ریل گاڑی نو بجے تک آتی تھی۔ شہر میں اس کے دو ایک اڈے تھے جہاں وہ نہا دھو کر بارہ بجے تک آرام سے ڈاک لے کر آتا تھا۔ آج اتنی جلدی کیسے آ گیا؟ بڑے بابو کا ماتھا ٹھنکا۔

''کیا لائے سونے لال؟ اتنی جلدی آ گئے آج۔ کوئی ڈاک ہے کیا؟''

ہیڈ آفس کے چپراسی کو بھی مہمانِ خاص کا درجہ حاصل ہوتا ہے، یہ بات بڑے بابو نے اپنی لمبی نوکری میں سیکھ رکھی تھی، اس لیے ان کی آواز شہد جیسی مٹھاس لیے تھی۔

سونے لال تھا تو ہیڈ آفس کا مگر پچھلے بیس سال سے یہاں اس دفتر میں آ رہا تھا، اس لیے یہاں کے بابوؤں اور چپراسیوں سے اس کے گہرے مراسم قائم ہو چکے تھے۔ وہ جب اس دفتر کے ملازمین سے بات کرتا تو اس کی آواز میں تھوڑی اینٹھ ضرور ہوتی تھی مگر اس طرح کا اجڈ پن نہیں ہوتا تھا جو اس کی آواز میں بڑے بابو کو جواب دیتے وقت سننے والوں نے محسوس کیا۔

''اسے رسیو کر لیجیے بڑے بابو۔'' اس نے بڑے بابو کی طرف ایک لفافہ بڑھایا۔

سیل بند خاکی رنگ کا لفافہ بچھو کے ڈنک کی طرح ہوا میں جھولتا رہا۔ بڑے بابو کے لمبے دفتری تجربے نے انھیں چوکنا کر دیا۔ آگے بڑھانے کے بجائے انھوں نے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا۔

''بھیا، تم اس دفتر میں نئے ہو کیا؟ ڈاک تو ڈسپیچر کالیکا رسیو کرتا ہے۔ دے دو اسے۔'' بڑے بابو نے لجاجت سے کہا۔

''کالیکا ابھی آیا نہیں۔ اس دفتر میں سب سالے کام چور ہیں!'' سونے لال نے یہ بات اسی رعب داب سے کہی جسے ہیڈ آفس والے عموماً اپنے سر پر لادے چلتے ہیں۔ ''آپ ہی لے لیجیے بڑے بابو۔ دفتر کے بڑے تو آپ ہیں۔ سارا دفتر آپ چلاتے ہیں۔''

''نہیں بھیا، اس سے ڈسپلن بگڑتا ہے۔ سب کو اپنا اپنا کام کرنا چاہیے۔''

سونے لال نے بہت سمجھایا کہ اس دفتر میں ڈسپلن نامی شے ویسے بھی اتنی کم مقدار میں ہے، تو

ان کے لینے یا نہ لینے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا، پر بڑے بابو نہیں مانے۔ سوال اصول کا تھا۔ قومی مسئلوں پر بحث و مباحثہ کی طرح یہ گفتگو بھی بہت لمبی کھنچ سکتی تھی اور کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ختم بھی ہو جاتی، مگر موقع واردات پر اس بحث کا سب سے اہم کردار کالیکا بابو، ڈسپیچ کلرک، اچانک ٹپک پڑا اور اسے دیکھتے ہی بڑے بابو نے اصولی موقف اختیار کرتے ہوئے کالیکا سے وہ لفافہ رسیو کرنے کو کہا۔

''لیجیے کالیکا بابو آ گئے۔ رسیو کر لیجیے یہ کاغذ۔'' سونے لال نے لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس درمیان بڑے بابو اور کالیکا بابو کی آنکھوں میں نہ جانے کس قسم کے پیغامات کا تبادلہ ہوا کہ کالیکا بابو کو اچانک فطرت کی پکار سنائی دینے لگی۔

''بیٹھو سونے لال، چائے وائے پیو۔ ہم ابھی پیشاب کر کے آتے ہیں۔''

ایک مرتبہ پھر اصول اور قواعد و ضوابط کو لے کر بحث شروع ہو گئی۔ کالیکا پرساد چونکہ بڑے بابو کی طرح پرانی پیڑھی کا نہیں تھا، لہٰذا اس نے بیچارہ بننے سے انکار کر دیا۔ اس نے سونے لال کو بتایا کہ دفتر دس بجے شروع ہوتا ہے اور اگر وہ کئی گھنٹے سے مارا مارا پھر رہا ہے تو اس میں کالیکا پرساد کا قصور نہیں ہے۔ پھر اس نے بتایا کہ پیشاب کرنا ایک بنیادی حق ہے جسے آئین نامی کسی کتاب میں بھی درج کیا گیا ہے۔ لیکن سونے لال نے چونکہ اس کتاب کا مطالعہ ہی نہیں کیا تھا اس لیے اس نے یہ ماننے سے انکار کر دیا کہ ہیڈ آفس کے کاغذ سے پیشاب کرنا زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

بڑے بابو اپنی فطرت اور رویے کے مطابق بت بنے کھڑے رہے اور انھوں نے اس بحث میں دخل اندازی کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

یہ بحث بھی پہلی بحث کی طرح لمبی کھنچ سکتی تھی، مگر چونکہ اس میں نئی پیڑھی شریک تھی، اس لیے آوازیں کچھ اونچی ہو گئیں، اور اس لیے دوسروں کو بھی دخل اندازی کا موقع مل گیا۔

اس سلسلے میں رشبھ چرن شکل، اسسٹنٹ انجینئر، کی دخل اندازی فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ افسر ہونے کے ناطے اس نے مٹھاس اور رعب دونوں کا استعمال کرتے ہوئے کالیکا بابو کو سمجھایا کہ اسے لفافہ فوراً لے لینا چاہیے کیونکہ ہیڈ آفس کی ڈاک ہمیشہ اہم ہوتی ہے اور دو چار منٹ پیشاب روکنے سے اسے ڈائی بٹیس نہیں ہونے والی ہے۔ افسر کے بیچ میں پڑنے سے بڑے بابو تذبذب میں

پڑ گئے اور کالیکا بابو نے بھی یہ جھنجھناتے ہوئے کہ، ''اب صاحب کہہ رہے ہیں تو لے لیتے ہیں،'' لفافہ لے لیا اور سونے لال کی ڈاک بہی پر اپنے دستخط کر دیے۔

یہ تو بڑے بابو کی سمجھ میں بعد میں آیا کہ اسسٹنٹ انجینئر شکلا جی کا دس بجے ہی دفتر میں موجود ہونا اور بحث میں غیر جانبدارانہ رویہ جتاتے ہوئے بھی دخل اندازی کرنا، یہ سب باتیں محض یوں ہی نہیں تھیں جیسے اس وقت وہ ظاہر کر رہے تھے۔

اتنی بحث کے بعد رسیو کیے گئے لفافے میں کیا تھا، سب ہی یہ جاننے کے لیے بیتاب تھے۔ ڈسپیچر سیدھے لفافہ لے کر بڑے بابو کے پاس آ گیا۔ اسی درمیان بڑے صاحب کے دفتر میں ہونے کی خبر باہر چائے کی دکانوں تک پہنچ گئی تھی اور برآمدوں اور کمروں میں پان کی پیک کی بارش، شور شرابا، گالم گلوچ اور بھاگ دوڑ جیسی سرگرمیاں شروع ہو گئی تھیں، جن سے ایسا لگنے لگا تھا کہ دفتر میں کام شروع ہو گیا ہے۔

بڑے بابو نے اپنی بے چینی چھپاتے ہوئے لفافہ کھولا، کاغذ نکالا، اوپر کی دو تین سطریں پڑھیں اور پھر سے کاغذ لفافے میں ڈال دیا۔ ان کے ارد گرد کھڑے لوگوں کی بے چینی دھماکا خیز نقطے پر پہنچتی کہ بڑے بابو جھٹکے سے اپنی کرسی سے اٹھے اور بڑے صاحب کے کمرے کی طرف لفافے کے ساتھ لپک لیے۔

کافی دیر تک بڑے صاحب کے کمرے میں ان کی نظر میں جو معتبر تھے، ان کے ساتھ ایک لمبی میٹنگ چلتی رہی اور بڑے بابو کمرے سے باہر نہیں نکلے، مگر لفافے میں بند کاغذ میں کیا تھا، اسے جاننے کے لیے ان کے نکلنے کی ضرورت بھی نہیں پڑی۔

''لد گئے نا۔ بڑے تیس مار خاں بنتے تھے،'' بڑے بابو کی پیٹھ پھیرتے ہی سونے لال نے بیچ سے تھوکتے ہوئے کہا۔

''کون؟... کا بڑے بابو پھر گئے؟''

''نہیں جی، ای سسُر بڑے بابو کے لیے سونے لال اتنی دور سے سیل بند لفافہ لے کر نہیں دوڑیں گے۔ ارے تمھارے بڑے صاحب لد گئے۔ اب کی چیف صاحب خود لفافہ تھما کے بولے: سونے لال، سنبھل کے جانا، کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو، نہیں تو سالا پھر بھاگ جائے گا۔ جاتے ہی

آرڈر ریسیو کرا دینا۔ پچھلی بار کی طرح نہ ہو...''

سونے لال کو پچھلی بار کا قصہ سنانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ دفتر کے سبھی لوگ اس سے واقف تھے۔ پچھلی مرتبہ صاحب کے تبادلے کا حکم لے کر چپراسی سویرے ان کے گھر پہنچ گیا۔ اس کے لیے چائے بھیج کر صاحب پیچھے کی دیوار سے کود کر بھاگ گئے۔ کافی دیر کے بعد چپراسی کو بتایا گیا کہ صاحب تو پچھلی رات ہی اپنی بیمار ماں کو دیکھنے شہر کے باہر چلے گئے ہیں اور دو تین دن بعد ہی لوٹیں گے۔ گھر کے لوگ سرکاری کاغذ نہیں لیتے ہیں، اس لیے چپراسی جی بعد میں آئیں۔ تین دن بعد صاحب تبادلہ کینسل کرا کے لوٹے۔ جتنی دیر بڑے صاحب کے کمرے میں میٹنگ چلی، رشبھ چرن شکل کے کمرے میں دوسری اعلیٰ سطحی کمیٹی صلاح مشورے کے لیے چلتی رہی۔

اس میٹنگ کو دیکھ مورخین کو کردکن سے جھپٹ کر آتے ہوئے کسی ایسے صوبیدار کے دربار کا دھوکا ہو سکتا تھا، جسے آگرہ پہنچتے پہنچتے معلوم ہو جاتا ہے کہ دلّی میں اس کے آقا کو گدی ملنے والی ہے۔ دلّی سامنے ہے اور صوبیدار آگرہ میں اپنے خیمے گاڑ کر جشن کی تیاری شروع کرتا ہے۔ ایسے تمام لوگ جن کی وفاداریاں شک کے دائرے میں تھیں، دلّی دربار سے پہلے آگرہ دربار میں اپنی اپنی وفاداری کی قسمیں کھانے حاضر ہو جاتے ہیں۔

آج سب سے پہلے کالیکا بابو حاضر ہوئے۔ ''میں تو سرکار، آج بال بال بچ گیا۔ میں سمجھا ای سسُر سونے لال کوئی روزمرہ کی چٹھی لے کر آیا ہے اور بک بکا رہا ہے۔ وہ تو سرکار نے بچا لیا۔ سرکار ڈپٹ کر بولے کہ لے لو کالیکا، تو ہم نے لے لیا، نہیں تو ہم بیکار پھنستے'' کالیکا بابو نے کھیسیں نکالتے ہوئے جو کہا اس کا مطلب یہ تھا کہ انھیں غلط نہ سمجھا جائے۔ سونے لال سے کاغذ پہلے نہ لینے کے پیچھے ان کا فطرت سے پریم اکیلا سبب تھا۔ اگر انھیں معاملے کی گہرائی کا اندازہ ہوتا تو وہ فطرت کی پکار اَن سنی کر، خود ہی کاغذ پر جھپٹ پڑتے۔

سبھی کو معلوم تھا کہ نئے صاحب، بٹوک چند اُپادھیائے، اسسٹنٹ انجینئر رشبھ چرن شکل کے دور کے ساڑھو لگتے ہیں۔ پچھلا سارا عملہ ہی ان کے خلاف تھا۔ بابو لوگ انھیں نمسکار کرتے وقت ناک سے مکھی اڑاتے تھے۔ کوئی جونیئر انجینئر انھیں سامنے سے آتا دیکھتا تو اسے ساگ بھاجی کا حساب یاد آ جاتا اور وہ اس طرح بدبدانے لگتا کہ ریتی کال کے کوئی بھی اسے دیکھ کر سناٹے میں آ جائیں اور جس

طرح وہ رادھا کرشن کے ملن ملاپ کا اپنی شاعری میں اظہار کرتے، کہ شاعرانہ انداز بھی بنا رہے اور عقیدت میں بھی کمی نہ آئے، اسی طرح بابو لوگ بھی بدبدا کر شکل جی کو یہ یقین دہانی کراتے کہ ان کے دلوں میں ان کے لیے کتنی عقیدت اور محبت بھری ہے، اور مخالفین کو یہ جتایا جاتا کہ کمبخت بیوی اتنی لمبی فہرست تھما دیتی ہے کہ ہر بار شکلا جی کے سامنے پڑنے پر انھیں یاد کرنا پڑتا ہے کہ لسٹ میں کیا کیا ہے۔

آج منظر کچھ بدلا ہوا تھا۔ لوگوں کو جھک کر میز کے نیچے ان کے پیر تلاش کرنے میں دقت ہو رہی تھی، اس لیے انھوں نے اپنے پیر باہر نکال کر پھیلا دیے تھے۔ نائیلون کے موزوں کو نہ جانے کتنے ہفتوں سے دھوپ یا صابن کے درشن نہیں ہوتے تھے اس لیے جوتے سے باہر آتے ہی انھوں نے بدبو کے بھبکے حاضرین کی ناک پر مارے، مگر کمرے میں آنے والے چہروں پر انھیں چھوتے وقت گہری مسکراہٹ قائم رہی — وہ اقتدار کے اعلیٰ مقام پر تھے، اس لیے قابلِ احترام تھے۔

بیچ بیچ کچھ خبریں بھی شکلا جی ہوا میں پٹاخوں کی طرح چھوڑتے جاتے۔

''بس پہنچنے والے ہوں گے۔ ہمیں تو رات جگا کر دو بجے فون پر بتایا کہ صبح سات بجے چل رہے ہیں۔''

''اس بار بڑی احتیاط برتنی پڑی۔ ای سالا لالہ اصلی کا کُستھ کھوپڑی کا ہے۔ ذرا بھی بھنک لگتی تو اب تک لکھنؤ ہوتا۔ پچھلی بار کیا ہوا تھا، نہیں معلوم؟''

لوگوں کو پچھلی مرتبہ کیا ہوا تھا، اس کا پورا علم تھا لیکن پھر بھی کوئی بڑے صاحب کے گھر تبادلے کا آرڈر پہنچنے اور ان کا پیچھے کے دروازے سے نکل بھاگنے کا قصہ سنانے لگا۔

''اب کی چیف صاحب نے ایس ای صاحب کو لگا دیا ہے کہ اپنے سامنے چارج کرا دو۔ ایس ای صاحب پہنچ رہے ہوں گے۔''

اس درمیان مخالف کیمپ کی بھی میٹنگ شروع ہو گئی تھی۔ اُس میں پہنچنے والے ہر نئے فاتح کی خبر اس دربار میں پہنچ جاتی۔ اُن کے ساتھ مستقبل میں کس طرح کا سلوک کیا جائے گا، اس کا اعلان بھی دربار کرتا جاتا۔

''اس سالے رضوان الحق کو پہلی بار پتا چلے گا کہ اونٹ پہاڑ کے نیچے آتا ہے تو کیسا لگتا ہے۔

Scanned with CamScanner

سالے نے پوری نوکری مرغا کھلا کے کاٹ دی۔ میں نے بھائی صاحب سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اگر آپ کو میاں مکڑی کا مرغا کھانا ہے تو ہم سے نہیں پٹے گی۔ بھائی صاحب بولے کہ بھئی زندگی میں بہت مرغا کھالیا، اب کچھ دن ویجیٹیرین رہیں گے۔''

''بابو دھورو لال یادو بہت دنوں تک اوور سیری کر چکے۔ بھائی صاحب پھر انھیں بھینس چرانے بھیجیں گے۔ بھول گیا وہ دن جب اسی دفتر میں بھائی صاحب نے بچایا تھا، نہیں تو کب کا سسپنڈ ہو گیا ہوتا۔ سالے نے کملا ورما کی رجیم میں خوب پیسہ چیرا ہے۔ اب پتا چلے گا نوکری کہتے کسے ہیں۔''

''ای سالا کنوالکن رائے صحافت کے نام پر کلنک ہے۔ ہماری یہاں پرانی مثل ہے کہ بھومی ہار، ڈنڈے کا یار۔ ان سالوں کو جوتوں کی نوک پر رکھنا چاہیے، پر نہیں صاحب! کملا کانت تو اپنے بیڈروم میں گھسائے رہتے تھے۔ سب سے زیادہ بدنامی ان کی اس للنوا کے کارن ہوئی۔ پترکار ہے یا دلاّل؟ ایسے لوگوں کو تو بھائی صاحب اس دفتر میں نہیں گھسنے دیں گے۔''

بڑے بابو تو گھر کی مرغی ساگ برابر تھے۔ اس دربار کا نزلہ ان پر بھی گرا، پر وہ منصب داروں میں اتنی نچلی سیڑھی پر مانے گئے کہ بیچ بیچ میں ان کا ذکر آیا اور جن الفاظ میں آیا، انھیں سن کر ان جیسا دبو آدمی بھی اُبال کھا جاتا۔ پر وہ حاشیے پر یاد کیے گئے؛ ان کی حیثیت آزادانہ طریقے سے گالی کھانے کی بھی نہیں مانی گئی۔

پی ڈبلیو ڈی کے محکمۂ تعمیرات کے اسی دفتر میں صبح صبح سونے لال نامی ایلچی کے آنے، کالیکا بابو کے شروع شروع میں اس کا لفافہ لینے سے انکار کرنے اور بعد میں لے لینے سے جو پر اسراریت کا ماحول بنا تھا، وہ تو بڑے بابو کے لفافہ کھولنے سے ختم ہو گیا تھا، لیکن اب دھیرے دھیرے تھرتھری پیدا کرنے والی حالت میں کچھ تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ ہندی فلموں کی طرح یہاں سب کچھ پہلے سے طے شدہ نہیں تھا۔ اختتام کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ بٹوک چندا پادھیائے کو چارج مل بھی سکتا ہے، نہیں بھی مل سکتا ہے۔ انھیں چارج ملنے کے بعد بھی کملا کانت ورما حکم نامہ منسوخ کرا کے واپس بھی آ سکتے ہیں۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

باہر چائے خانوں سے لے کر اندر دفتر تک سب کو پتا چل گیا تھا کہ ایس ای صاحب پہنچنے

Scanned with CamScanner

والے ہیں۔ کملا کانت ورما کے کمرے میں میٹنگ ابھی جاری تھی۔ لوگ دم سادھے اس لمحے کا انتظار کر رہے تھے جب دونوں گروہوں کا آمنا سامنا ہوگا۔ دفتر کے لوگوں کو پیارے لال اور کملا کانت کے اندرونی تعلقات کے بارے میں علم تھا، اس لیے ان کی ملاقات کا انھیں بے چینی سے انتظار تھا۔

سب کو مایوسی ہوئی۔ سب نے دیکھا کہ کملا کانت ورما اپنے دفتر سے نکلے اور پوری کوشش سے چہرے پر اوڑھی گئی اطمینان اور غیر جانبداری کی چادر کے ساتھ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔

فوراً ہی ایگزیکٹو انجینئر کے کمرے سے بڑے بابو، رضوان الحق، دھورو لال یادو اور للن رائے نکلے۔ سب کے چہروں پر سنجیدگی کے آثار نمایاں تھے۔ انھیں پتا تھا کہ پورا دفتر انھی لوگوں کو دیکھ رہا ہے۔ ایک ایسا راز ان کے سینوں میں دفن تھا جسے دفتر سے لے کر چائے خانوں تک سبھی لوگ جانتے تھے، پر چونکہ سبھی لوگ انھیں دیکھ رہے تھے اس لیے انھوں نے اپنے چہرے لٹکا لیے اور سارے جہاں کا درد اپنے جگر میں لیے اپنی چالیں دھیمی کر لیں۔

بڑے بابو اپنے کمرے تک پہنچتے پہنچتے پھر سے پرانے، قابل رحم بڑے بابو بن گئے۔ فرق صرف اتنا آیا کہ بواسیر کا ان کا پرانا روگ تیز درد کی لکیروں کے روپ میں ان کے چہرے پر پچھاڑیں کھانے لگا۔ انھوں نے فائل کھولی اور اوراق پلٹتے ہوئے اس میں ان جذبات کے ساتھ ڈوب گئے کہ ''کوئی نرپ ہوئے ہمیں کا ہانی۔'' (کوئی راجہ بنے ہمارا کیا نقصان۔)

للن رائے نے اسکوٹر اسٹارٹ کیا اور دفتر سے باہر نکل گئے۔ پچھلے دو سالوں سے وہ دفتر میں بڑے صاحب کے آدمیوں میں جانے جاتے تھے۔ دفتر کے سارے افسر انھیں اپنے پاس بٹھا کر چائے پلاتے، بابو لوگ باہر سڑک پر گھیر کر بنارسی پان پیش کرتے اور چپراسیوں کی جماعت کھیسیں نکال کر سلام کرتی۔ آج انھوں نے غور کیا کہ گیٹ پر فراش ان کے اسکوٹر کے بغل سے اس طور پر سلام کر کے گویا مکھی اڑائی ہو، نکل گیا تھا۔ انھوں نے مکان کی دوسری منزل شروع کروا رکھی تھی۔ اسکوٹر بھی پرانا ہو گیا تھا، بغیر نئے کے کام نہیں چلے گا۔ چھوٹے بھائی کی ٹھیکیداری ابھی ابتدائی دور میں تھی۔ بہت ساری وجوہات تھیں جن سے کملا کانت ورما کا تبادلہ رکنا ضروری ہو گیا تھا۔ ان کے اندرونی خیالات دل میں اور چبھنے لگے۔

Scanned with CamScanner

رضوان الحق اور دھورو لال یادو کمرے سے نکلے تو ایک ساتھ، پر اپنی اپنی فطرت کے مطابق انھوں نے حرکتیں الگ الگ کیں۔ رضوان الحق پہلے ہی سے کم بولتے تھے، آج تو وہ اور بھی زیادہ خاموش ہو گئے تھے۔ وہ سر جھکائے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ روز سے تھوڑا سا ہی فرق آیا۔ رشبھ چرن شکل کے کمرے میں دربار چل رہا تھا۔ باہر دروازے پر ہی رک کر وہ کچھ بدبدائے۔ اندر والوں نے کمنٹری کی کہ مخالف کیمپ کا ایک مضبوط سردار اپنی وفاداری ظاہر کرنے کو جان بوجھ کر یہاں سے چلا گیا ہے۔ بدبداہٹ اتنی غیر واضح تھی کہ اگر کملا کانت کے کیمپ کا کوئی ممبر دیکھتا تو اسے سمجھایا جا سکتا تھا کہ رضوان الحق شکلا جی کی مادر پدر کر رہے ہیں۔

دھورو لال یادو نے دفتر کے برآمدے میں کسی ڈکارتے ہوئے سانڈ کی طرح ایک چکر لگایا۔ موافقت اور مخالفت ظاہر کرنے والے دونوں کیمپوں کے لوگ ان کے بارے میں کوئی حتمی رائے نہیں رکھتے تھے، اس لیے ان کے اس چکر لگانے کے دوران سب نے کوشش کی کہ ان کے سامنے نہ پڑیں۔ کھمبے، دروازے اور کھڑکیاں اُن سے چھپنے کی آئیڈیل جگہیں تھیں۔ غصہ ور وشوامتر کی طرح جب مخالف کیمپ کے کمرے کے دروازے پر انھوں نے اپنا پیر پٹکا تو ڈرامے کی زبان میں اسٹیج پر سناٹا چھا گیا۔ اس سے پہلے کہ خاموش کردار اس صدمے سے جانبر ہوں، وہ آگے بڑھ گئے۔ اپنے کمرے میں بیٹھے ضرور مگر ان کا دل کمرے کے فرنیچر کو الٹنے پلٹنے اور کاغذوں کو چندی چندی بنا کر فرش پر پھینکنے کے اپنے پسندیدہ کھیل میں نہیں لگا۔ وہ اٹھے اور کمرے کے باہر نکل گئے، کمرے کے ہی نہیں، دفتر کے باہر بھی نکل گئے۔

ہندی فلموں کے لحاظ سے یہ آئیڈیل سچویشن تھی۔ جس وقت دھورو لال یادو دفتر کے باہر نکل رہے تھے، ایک ایمبیسڈر کار دفتر کے گیٹ کے اندر آ رہی تھی۔ اس کے سامنے کی طرف لال رنگ کی ایک بڑی سی تختی لگی تھی، جس پر پیتل کے موٹے لفظوں میں "ایگزیکٹو انجینئر، محکمۂ تعمیرات" لکھا تھا۔ اگر دھورو لال یادو غصے میں بلبلاتے ہوئے زمین پر پڑے اینٹ پتھروں کے ٹکڑوں میں تصوراتی دشمنوں کی پرچھائیوں کو اپنے پیروں تلے روندنے کے خیالوں میں گم نہ ہوتے تو وہ خود دیکھ لیتے کہ کار کی پچھلی سیٹ پر سپرنٹنڈنگ انجینئر پیارے لال اور نئے ایگزیکٹو انجینئر بٹوک چندر اپادھیائے بیٹھے ہوئے تھے۔ اگر یہ تینوں کسی مسالا فلم کے کردار ہوتے تو اب تک ایک دھانسو گانے یا ڈھشم ڈھشم کی

صورت حال پیدا ہوگئی ہوتی، پر زندگی ہندی فلموں کے ڈھرے پر نہیں چلتی، اس لیے ہوا صرف اتنا کہ یادو جی اپنے پیروں سے کنکریاں اڑاتے ہوئے نکل گئے اور لال نیم پلیٹ والی کار دفتر کے پورٹیکو میں جا کر کھڑی ہوگئی۔

کار کے رکتے ہی دفتر کے چپراسیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ ایک نے دوڑ کر کار کا دروازہ کھول دیا اور دوسرا بڑے صاحب کے کمرے کی چق اٹھا کر کھڑا ہوگیا۔

پیارے لال بائیں طرف سے اور بٹوک چند کار کی داہنی طرف سے اترے۔ پیارے لال کے چہرے پر وہی سنجیدگی تھی جو کسی بھی سینئر افسر کے چہرے پر ایسے موقعوں پر ہونی چاہیے تھی۔ اس دفتر میں سبھی ان کے ماتحت تھے، اور ماتحتوں کے سلام دعا کا جواب دینا افسر کو زیب نہیں دیتا، نوکر شاہی کے اس سنہرے اصول کے مطابق وہ سر اٹھائے سیدھے چلتے رہے اور چپراسی کی اٹھائی ہوئی چق کو پار کرتے ہوئے ایگزیکٹو انجینئر کی تختی لگے کمرے میں داخل ہوگئے۔ بٹوک چند اُپادھیائے کو کوئی جلدی نہیں تھی، اس لیے وہ تھوڑا پیچھے رہ گئے۔

سب سے پہلے رشبھ چرن نے ان کے پیر چھوئے۔ ان کے منھ میں اتنے پان ٹھنسے تھے کہ مبارکباد کے طور پر جو بھی الفاظ پھوٹے، انھیں سن کر کسی کو بھی اونٹ کے بلبلانے کا دھوکا ہو سکتا تھا۔ اس کے بعد پیر چھونے اور پان پیش کرنے کی جو مبہوت کر دینے والی فضا وہاں چھائی ہوئی تھی، اسے دیکھ کر چائے کی دکانوں اور دفتر کے باہر کی سڑک پر موجود تماش بینوں کو یہ یقین ہوگیا کہ اس دفتر میں اگلے کچھ دنوں تک جمہوریت کے اہم ستون چاپلوسی، خوشامد خوری، اقربا پروری کی بنیادیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جائیں گی۔

بٹوک چند اس دفتر میں کئی حیثیتوں سے پہلے بھی رہ چکے تھے۔ مگر بڑے صاحب کی سی پوزیشن میں ان کا یہ پہلا قدم تھا، اس لیے انھوں نے اطمینان اور تکبر آمیز نگاہوں سے دفتر کے برآمدوں، کمروں اور اپنے اردگرد کے خوشامدی ماتحتوں کو دیکھا۔ اس وقت ان کے دل میں وہی خیالات آ رہے تھے جو نوکر شاہی کے کسی بھی پرزے کے دل میں اپنی نئی تقرری کے منظر کو دیکھ کر آتے ہیں۔

نیا افسر آتے ہی سب سے پہلے اپنے دفتر کی زبوں حالی پر دکھی ہوتا ہے جو اس کے سابق

افسروں کی نالائقی کی پیداوار ہوتی ہے۔ سب کچھ برباد ہو گیا، وہ تفکرانہ انداز میں سوچتا ہے۔ سابق افسروں کا بھونڈا جمالیاتی شعور اسے شرمندگی کے گہرے سمندر میں ڈبو دیتا ہے۔ کیسا پھوہڑ فرنیچر خریدا ہے اس نے کہ کمرے میں بیٹھنے کو دل نہ چاہے، اور پردے کتنے بھدّے ہیں، چیخ اور آنکھوں کو چبھنے والے۔ کیا سوچتے ہوں گے لوگ اس دفتر کے بارے میں! کوئی وقت سے نہیں آتا۔ سب کمبخت لوٹنے میں لگے ہیں۔ ہر طرف گڑبڑ ہے۔ خیر، اب میں آ گیا ہوں، سب ٹھیک کر دوں گا۔

ہندوستانی نوکر شاہی کی کلید شاید یہی ڈائنمک سوچ ہے۔ ضلعے میں نیا کلکٹر آتا ہے، لوگ دفتروں میں وقت سے آنا شروع کر دیتے ہیں۔ بابو رشوت اپنی میز پر بیٹھے بیٹھے نہیں لیتا بلکہ اٹھ کر پان کی دکان تک جانے لگتا ہے۔ کئی بار کچھ کاغذ بھی سچ مچ کے نکل جاتے ہیں۔ نیا پولیس کپتان آتے ہی پریس کانفرنس کرتا ہے اور اعلان کر دیتا ہے کہ اب وہ آ گیا ہے اس لیے ضلعے میں اب مجرم رہیں گے یا وہ۔ تھانوں میں پولیس عوام کی خدمت گذار بن کر رہے گی۔ بنگلوں اور دفتروں کے پردے بدل جاتے ہیں، فرنیچر کا زاویہ بدل جاتا ہے۔ کچھ ہی دنوں میں پنج سالہ منصوبوں میں دیے گئے خوبصورت پروگراموں کی طرح یہ اعلانات دم توڑ دیتے ہیں۔ بابو میز پر بیٹھے بیٹھے رشوت لینے لگتا ہے اور عوام پھر سے تھانوں میں مرغا بننے لگتے ہیں۔ پھر نئے افسر آتے ہیں، پھر سب کچھ ٹھیک ہونے لگتا ہے اور اس طرح ڈائنمزم برقرار رہتی ہے۔

بنوک چند نے دفتر کی دیواروں پر پڑی پیک اور برآمدوں میں جمی دھول پر مایوسی سے بھری نگاہ ڈالی۔ کتنا زوال آ گیا ہے اس دفتر میں! دو سال پہلے جب وہ یہاں سے گئے تھے تب تو حالات اتنے برے نہیں تھے۔ اچھا ہوا کہ وہ آ گئے، نہیں تو نہ جانے ابھی کیا ہوتا۔ انھوں نے دکھ اور اطمینان کے ملے جلے احساس سے سوچا اور پیچ سے اپنے منھ کی پیک دیوار پر ماری۔ وہ اور ان کے ساتھ چل رہی بھیڑ اب اس کمرے کے سامنے پہنچ گئی تھی جو بڑے صاحب کے طور پر ان کا کمرہ ہونے جا رہا تھا اور جس میں تھوڑی دیر پہلے پیارے لال نام کا باس گھس گیا تھا۔ چپراسی چق اٹھائے کھڑا تھا۔ پیک تھوکنے کے باوجود ان کے گلے اور منھ میں ابھی بھی اتنی پیک بھری تھی کہ وہ بس غوں غوں کی آواز میں ایسا کچھ کہہ پائے جس کا مطلب تھا کہ ان کے حمایتی، ان کے نقش قدم پر چلنے والے چاپلوس اور ماتحت اپنے اپنے کمروں میں جائیں، اور اب وہ آ گئے ہیں، اس لیے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اتنا

Scanned with CamScanner

کہہ کر وہ تیزی کے ساتھ کمرے میں گھس گئے۔

جیسا کہ ہمارے ملک کی ہندی فلموں کا رواج ہے کہ ایک ناٹک اور ایک کھل ناٹک کے ساتھ ایک چمچو ضرور ہوتا ہے جو اپنی حماقت آمیز حرکتوں اور باتوں سے اس کا دل بہلانے اور رازدارانہ قسم کے صلاح مشورے دینے جیسا کام کرتا ہے۔ بٹوک چند اُپادھیائے کے ساتھ ایک اور شخص اس کمرے میں گھس گیا جس کا نام رشبھ چرن شکل تھا اور جس نے کمرے میں گھستے گھستے پہلا فرض یہ نبھایا کہ پھسپھساہٹ بھری آواز میں بٹوک چند کو یہ مشورہ دے ڈالا: ''اس سالے سے ہوشیار رہیے گا بھیا، در حرامی ہے۔''

مشورہ مختصر اور دھیمے لہجے میں اس لیے تھا کہ جس آدمی سے ہوشیار رہنے کی بات کی جارہی تھی، وہ دس بارہ فٹ کی دوری پر بیٹھا میز پر پڑے بے ترتیب کاغذوں پر بظاہر اپنی نظریں گڑائے تھا مگر اس کی ساری توجہ ان کی حرکتوں پر تھی۔

دوری اور وقت نے بٹوک چند کو باادب ماتحت بنادیا تھا، اس لیے انھوں نے سامنے بیٹھے سپرنٹنڈنگ انجینئر پیارے لال کی شان میں قصیدے نہیں پڑھے، صرف اپنے پیک بھرے منھ کو گول کرتے ہوئے اپنی آنکھوں کے ذریعے انھوں نے صلاح دینے والے بہی خواہ کے تئیں جس احسان مندی کے جذبات ظاہر کیے، اس کو اس نے یوں لیا:

''اس جیسے چڑی مار بہت دیکھے ہیں بھائی، اس سے بھی نمٹ لیں گے۔''

کسی چھوٹے موٹے ملک میں صدارت یا وزارت عظمیٰ کی کرسی الٹنے کے بعد جیسی گہما گہمی پیدا ہوتی ہے، کچھ کچھ ویسی ہی اس دفتر میں ہوئی۔ کمرے میں پیارے لال کے سامنے بٹوک چند اور رشبھ چرن شکل بیٹھ گئے۔ شکل نے ہیڈ آفس سے سونے لال کے آنے، بڑے بابو اور ڈسپیچر کے درمیان ہونے والی کشمکش اور ڈاک لینے سے انکار کرنے اور بعد میں لے لینے، بڑے بابو کے بھاگ کر کملا کانت ورما کے پاس جانے اور پھر کملا کانت ورما کے کمرے میں چلنے والی میٹنگ اور اس کے بعد ان کے نامعلوم مقام پر فرار ہونے کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔ بیان ختم ہوتے ہی پیارے لال نے کہا، ''اب؟''

اس ''اب'' کے کئی مطلب تھے۔ پہلا مطلب تھا کہ اب کیا کیا جائے؟ دوسرا مطلب تھا کہ

Scanned with CamScanner

جب کملا کانت بھاگ ہی گئے ہیں تو کیا کیا جا سکتا تھا؟ شکلا نے پہلا مطلب نکالا اور وہی کہا جس کے لیے بٹوک چند انھیں اپنے ساتھ اندر لے آئے تھے۔

''اب کیا؟ بلائے ہیں سر بڑے بابو کو۔ چارج سرٹیفکیٹ پر دستخط ہو جائے۔ کملا کانت نہیں ہوں گے تو کیا چارج نہیں ہوگا؟''

اس کے بعد انھوں نے ہندوستانی روایات کے مطابق ایک محاورہ سنایا جسے پیارے لال نے بھی اپنے زمانہ طالب علمی میں پڑھا تھا اور جس کا مطلب تھا کہ اگر مرغا نہیں بولے گا تو کیا سورج نہیں نکلے گا۔

پیارے لال نے گھنٹی دبائی۔ چپراسی آیا۔ بڑے بابو کو بلا کر لانے کا حکم صادر ہوا۔

جتنی دیر میں بڑے بابو آئے، نوکر شاہی کی ان روایات پر گزارہ ہوتا رہا جس کے مطابق دل میں اٹھنے والے خیالوں اور منھ سے ادا ہونے والے جملوں میں کوئی گہرا رشتہ نہیں ہوتا۔ بٹوک چند نے کملا کانت ورما کے بارے میں کچھ جملے کہے، جنھیں سن کر پیارے لال نے ایسا منھ بنایا جیسے خبریں ختم ہونے سے پہلے محکمہ موسمیات کی پیش گوئی سن رہے ہوں۔

جانتے ہوئے بھی کہ یہ پیش گوئیاں غلط ہوں گی، انھیں سننا ایک عام ہندوستانی کی مجبوری ہے، اس لیے وہ بھی کان کھودتے رہے اور سنتے رہے۔

''سرکار کی یہی بات خراب لگتی ہے صاحب۔ بیچ سیشن میں تبادلہ کر دیا۔ بیچارے بچوں کی شامت آتی ہے۔ میں نے تو وائف سے کہہ دیا کہ بچے اب لکھنؤ میں ہی رہیں گے۔ روز روز کون اسکول بدلے گا۔''

''بیچارہ کملا کانت بڑا گاؤ (سیدھا) آدمی ہے۔ اس کی بیوی تو اس سے زیادہ گاؤ ہے۔ ہم دو بار ساتھ رہے۔ اتنے اچھے تعلقات رہے دونوں خاندانوں کے کہ لوگ جلتے تھے کالونی میں۔''

''میں نے چیف صاحب سے بہت کہا کہ مجھے مت ڈالیے اس پچڑے میں۔ میرا کلاس فیلو ہے کملا کانت، اس سے چارج لینے میں بہت برا لگے گا۔ پر نہیں مانے چیف صاحب، بولے، اپادھیائے جی، کمبھ کا معاملہ ہے، آپ ہی سنبھال سکتے ہو۔ پورے ڈپارٹمنٹ کی عزت داؤ پر لگی ہے، روز سی ایم پوچھتے ہیں۔''

Scanned with CamScanner

جب تک بڑے بابو نہیں آئے تب تک بٹوک چند اُپادھیائے بولتے رہے اور پیارے لال کان کھودتے رہے۔ بڑے بابو کے آنے میں دیر ہوئی تو کان کھودنا چھوڑ کر وہ دیوار پر رینگ رہی چھپکلی کو گھورنا شروع ہو گئے۔ اس یکطرفہ گفتگو میں انھیں نہ تو اپنا کوئی رول نظر آ رہا تھا اور نہ ہی انھوں نے کوئی دخل اندازی کی۔ آخر میں انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور بڑے بابو وارد ہوئے۔

''چارج سرٹیفکیٹ بن گیا، بڑے بابو؟'' پیارے لال نے پوچھا۔

بڑے بابو نے اپنے قابلِ رحم چہرے کو اور بھی قابلِ رحم بنا کر سوال پوچھنے والے کو ایسی سوالیہ نگاہوں سے دیکھا جیسے بھارت کی نیوکلیئر پالیسی کے بارے میں کوئی سوال پوچھا گیا ہو۔

''صاحب پوچھ رہے ہیں کہ چارج سرٹیفکیٹ ٹائپ ہو گیا کہ نہیں؟'' اتنی دیر کے بعد رشبھ چرن شکل کو اپنی وہاں موجودگی کا جواز ثابت کرنے کی ضرورت پڑی۔

''سرکار، مجھے چارج سرٹیفکیٹ کے لیے تو کوئی نہیں بولا۔''

''بڑے بابو، زیادہ قابلیت مت جھاڑیے!'' رشبھ چرن کے لیے خود پر قابو پانا پہلے بھی بہت مشکل ہوتا تھا، آج تو اور بھی مشکل ہو گیا۔ ''آپ کو معلوم نہیں کہ بڑے صاحب کا تبادلہ ہو گیا ہے؟ اتنی دیر جو میٹنگ کر رہے تھے، اس میں آپ کو نہیں بتایا کملا کانت ورمانے؟ نئے صاحب آ گئے ہیں اور آپ نے ابھی تک چارج سرٹیفکیٹ نہیں ٹائپ کیا۔''

رشبھ چرن اپنی آواز پر قابو نہ رکھ پاتے، اگر بڑے بابو کے چہرے سے پھسل کر ایک بار ان کی نگاہ بٹوک چند کی سخت نگاہوں سے نہ ٹکرائی ہوتیں۔ سپرنٹنڈنگ انجینئر کی موجودگی میں وہ کوئی تماشا نہیں کھڑا کرنا چاہتے تھے۔

''نہیں ٹائپ کیے ہو تو کرلائیے۔ ہیڈ آفس کا حکم نامہ تو آپ ہی کے پاس ہوگا۔ کملا کانت جی تو جاتے وقت لے نہیں گئے! اسی سے نمبر وغیرہ ڈال دیجیے گا۔ ایس ای صاحب کتنی دیر بیٹھیں گے؟ جلدی لے آئیے،'' بٹوک چند نے ملائمت سے کہا۔ بڑے بابو کچھ بدبدائے اور باہر نکل گئے۔

''بڑا گھاگھ ہے صاحب۔ جتنا اوپر اتنا نیچے!'' رشبھ چرن نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

''شکلا جی، آپ خود دیکھ لیجیے جا کر، نہیں تو دفتر والے نہ جانے کتنی دیر کریں۔ صاحب کے لیے کچھ چائے وائے بھجوا دیجیے گا۔''

بٹوک چند نے کہا تو رشبھ چرن اٹھ کر باہر نکل گئے۔ کمرے میں تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پیارے لال ابھی تک کچھ نہیں بولے تھے، صرف سنتے رہے تھے۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ زیادہ بولنے والا کہیں نہ کہیں غلطی ضرور کرتا ہے۔ غلطی کرنے کا موقع وہ اپنے مخالف کو ہی دینے میں یقین رکھتے تھے، اس لیے اکثر خود چپ رہتے تھے۔ آج بھی بولے تو بہت دیر سے بولے اور جو مقولے انھوں نے ادا کیے، ان کی غرض یہ تھی کہ بٹوک چند اُپادھیائے کچھ نہ کچھ غلطیاں کریں اور یہ اقتدار کی تبدیلی ہوئی تو کیسے ہوئی، اسے سمجھنے کا موقع دیں۔

''بھئی اپادھیائے جی، بڑا چیلینجنگ معاملہ ہے۔ کمبھ پر سب کی نظریں لگی ہیں۔ اگلے مہینے سے ہر ہفتہ چیف منسٹر ریویو کریں گے۔ ابھی بھی تیسرے چوتھے چیف صاحب کے یہاں پیشی ہوتی ہے۔ ویسے تو آپ کا پرانا تجربہ ہے، آپ کو کوئی دقت نہیں ہونی چاہیے۔ صبح چیف صاحب کا فون آیا تو میں نے کہہ دیا کہ آپ کو صحیح ہی چنا گیا ہے۔''

بٹوک چند نے آنکھوں ہی آنکھوں میں تولا۔ ہے سالا گھاگھ! اس سے آج ہی نمٹ لیا جائے نہیں تو بعد میں دکھی کرے گا۔ انھوں نے بھولے پن سے جو کچھ کہا، اس میں کچھ ٹھوس تھا، کچھ مائع اور کچھ گیس۔

ٹھوس، مائع اور گیس تمام مادوں سے بنا فارمولا انھی کا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ لیڈروں، ماتحتوں اور اپنے سے اونچے عہدیداروں سے باتیں کرتے وقت ہمیشہ وہی نہیں کہنا چاہیے جو سچ ہو۔ سچ تو گیس کی طرح ہوتا ہے جو سامنے والے سے چپکتا نہیں اور بھاپ کی طرح اڑ جاتا ہے۔ ٹھوس کے روپ میں کچھ نام چھوڑے جاتے ہیں جو اکثر راج نیتاؤں اور اعلیٰ عہدیداروں کے ہوتے ہیں۔ ہوشیاری صرف اتنی برتنی چاہیے کہ یہ نام ایسے ہوں جس سے صحیح غلط کی چھان بین سننے والا نہ کر سکے۔ انگریزی میں جسے نیم ڈراپنگ (name-dropping) کہتے ہیں، اس فن کو ہندوستانیوں نے انگریزوں سے بھی زیادہ خوبصورتی سے اپنالیا ہے۔ ٹھوس اور گیس کے علاوہ مائع کا استعمال موقعے کی مناسبت سے چہرے اور آنکھوں میں نمی لانے کے لیے کیا جاتا ہے۔ بٹوک چند نے تو اس فن میں اتنی مہارت حاصل کر رکھی تھی کہ وقتِ ضرورت ان کی آواز بھی رندھ سکتی تھی۔ کئی بار تو وہ رونے بھی لگتے تھے۔ اکثر وہ ایسی صورت حال پیدا کر دیتے کہ ان کا مخالف اگر مضبوط کلیجے کا نہ ہو تو اس کا بھی

Scanned with CamScanner

رونے کو دل چاہنے لگتا ہے۔

آج بھی انھوں نے اپنے فارمولے کو جم کر استعمال کیا۔

''میں نے تو سر، بہت منع کیا کہ مجھے مت پھنساؤ اس جھمیلے میں، پر اپنے چیف منسٹر کے سالے ہیں نا، وہی نوگڑھ والے ایم ایل اے۔ وہ پیچھے پڑ گئے۔ جب وہاں پوسٹڈ تھا تب سے ان سے میرے گھریلو تعلقات ہیں۔ بولے، اپادھیائے جی، آپ کے بنا کمبھ نہیں سنبھل پائے گا۔ اگر کچھ ہوگیا کمبھ میں، تو بڑی تھو تھو ہوگی۔ میں نے بہت انکار کیا مگر صاحب، بڑے آدمیوں کا معاملہ ہے۔۔۔''

بٹوک چند بولتے وقت پیارے لال کے چہرے پر نگاہیں گڑائے ہوئے تھے۔ ٹھوس کچھ اثر کر رہا ہے، پر ہے سالا گھاگھ، چہرے پر کوئی تاثر پیدا نہیں ہونے دے رہا ہے۔ ''چیف صاحب سے بھی میں نے ہاتھ جوڑے کہ سر، اب تو بڑھاپا آ رہا ہے، اب پہلے جیسی محنت نہیں ہو سکتی۔ آپ حکم دیں گے تو کیوں نہیں جاؤں گا؟ لیکن کچھ اونچ نیچ ہوگئی تو سفیدی پر کالک لگ جائے گی۔ لیکن نہیں مانے۔''

اس طرح انھوں نے کئی لوگوں کے حوالے دیے اور بتایا کہ کس طرح صوبے کے سامنے کمبھ نامی مشکل مسئلہ پیدا ہونے پر ان لوگوں نے بٹوک چند اپادھیائے نامی مہابلی کے سامنے یہ بیڑا رکھ دیا، اور کس طرح ہر بڑے آدمی کو انھوں نے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اس کے اہل ضرور ہیں مگر عمر نامی ایک رکاوٹ ایسی ہے کہ جس کے چلتے وہ اس بیڑے کو اٹھانے کے قابل نہیں ہیں۔ مگر سارے قصے کا خاتمہ اس ایک نکتے پر ٹکا تھا کہ جیسا کہ بڑے لوگوں کا قرینہ ہے، ان کے سارے دلائل ٹھکرا دیے گئے اور خواہش نہ رکھنے کے باوجود وہ یہاں آ گئے۔ لیکن اب جب وہ آ ہی گئے ہیں تو سب کچھ ٹھیک کر دیں گے اور بھگوان کی کرپا اور ایس ای صاحب کے آشیرواد سے جو کچھ ہوگا، اچھا ہی ہوگا۔

پیارے لال بول کچھ نہیں رہے ہیں، بس ان کے ٹھوس کے پیچھے چھپے سچ کو پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بٹوک چند کی پوسٹنگ کے پیچھے سی ایم اور چیف صاحب دونوں ہیں، پر سچائی اس طرح نہیں ہے جس طرح بٹوک چند بیان کر رہے ہیں۔ انھوں نے

Scanned with CamScanner

اڑتی پڑتی سن رکھی تھی کہ اس معاملے میں کافی لین دین ہوا ہے۔

جس سیاستدان کے بارے میں بٹوک چند نے چیف منسٹر کا سالا اور اپنا گہرا دوست ہونے کا اعلان کیا تھا، اس کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ بغیر نقد گنائے گھر کے باہر قدم نہیں نکالتا۔ بٹوک چند جب اپنی گہری دوستی کے دعوے کر رہے تھے، پیارے لال اس رقم کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے جو اس ہاتھ سے اُس ہاتھ میں پہنچی ہوگی۔

کمبھ کے سال ہر بار یہی ہوتا ہے۔ بڑی بڑی بولیاں لگتی ہیں، بڑے بڑے وارے نیارے ہوتے ہیں۔ اس سال بھی یہی ہوا تھا۔ پانچ چھ نام شروع سے ہی دوڑ میں تھے۔ پیارے لال کو اپنے کو بچائے رکھنے کی فکر لاحق تھی۔ ان کے عہدے کے لیے بھی کئی دعویدار تھے۔ وہ اپنے کو تو بچائے رکھنے میں کامیاب ہو گئے، پر کملا کانت ورما کو جانا ہی پڑا۔

کملا کانت ورما سے ان کی اچھی پٹ رہی تھی اور کمبھ میں پیارے لال یہی چاہتے تھے کہ کملا کانت بنے رہیں۔ پچھلے کچھ دنوں سے روز کسی نہ کسی کے آنے کی افواہ اڑتی تھی، پر کملا کانت بھی کیل کانٹے سے مضبوط تھے۔ پیارے لال اپنی کرسی بچانے میں اتنے مشغول رہے کہ انھیں کملا کانت کی فکر کرنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ ویسے بھی وہ جانتے تھے کہ کملا کانت کا ہٹانا آسان نہیں تھا۔

پچھلے ہفتے سے بٹوک چند اُپادھیائے کا نام چل رہا تھا۔ پیارے لال نے نام سنتے ہی سمجھ لیا تھا کہ اب مقابلہ سخت ہوگا۔ انھوں نے کملا کانت کو وارننگ بھی دے دی تھی۔ بٹوک چند کا شمار ڈپارٹمنٹ میں بڑے گھاگھ افسروں میں ہوتا تھا۔ کمبھ میں تعینات کرنے کے لیے بولی ہر بار بولی جاتی تھی مگر اس مرتبہ کے نیلام میں مقابلہ زیادہ سخت تھا۔ بیچ میں دو تین بار دیر رات گئے کملا کانت کی گھبرائی ہوئی آواز میں فون آتا اور وہ کسی تگڑے امیدوار کی خبر دیتے۔ پیارے لال کی اجازت لے کر وہ فوراً لکھنؤ روانہ ہو جاتے اور دو تین دن میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک کر کے لوٹ آتے۔

اس مرتبہ حالات اتنی تیزی سے رونما ہوئے کہ پیارے لال اور کملا کانت جیسے منجھے ہوئے کھلاڑی بھی حیران رہ گئے۔

بغیر کسی لگی لپٹی کے جو پیغام دیا گیا، اس کے مطابق رات ایک بجے چیف منسٹر نے کملا کانت کے تبادلے کے آرڈر پر دستخط کر دیے تھے۔ پبلک ورکس ڈپارٹمنٹ کے سیکرٹری نے یہ کام چیف

صاحب کو سونپا تھا کہ اس حکم نامے پر فوری کارروائی ہونی چاہیے، اور چونکہ بقول چیف صاحب کے وہ اپنے اور پیارے لال میں کوئی فرق نہیں سمجھتے، اس لیے یہ ذمے داری انھوں نے پیارے لال کو سونپی۔ حکم نامے کے مطابق محکمے کے سیکرٹری کو دوپہر بارہ بجے تک چیف منسٹر کو آرڈر کے متعلق رپورٹ دینی تھی۔ سیکرٹری نے چیف صاحب کو ساڑھے گیارہ بجے تک کا وقت دیا تھا، اس لیے چیف صاحب نے انھیں گیارہ بجے کا وقت دے دیا۔ چیف صاحب گیارہ بجے دفتر میں ان کے فون کا انتظار کریں گے۔

چیف صاحب کا حکم ملنے پر پیارے لال کو اپنے فرائض کی ادائیگی میں ذرا بھی دیر نہیں لگی۔ وہ دوسرے بہت سے نوکرشاہوں کی طرح گیتا میں دیے گئے پیغام سے کم اس پیغام کو نہیں سمجھتے تھے، کہ نوکری ان کے لیے مہابھارت کی جنگ سے کسی طرح کم نہ تھی۔ میدانِ جنگ میں باپ، بھائی، بہن، دوست، ساتھی، کوئی بھی رشتہ معنی نہیں رکھتا تھا اور ضرورت پڑنے پر کسی کا بھی قتل کیا جا سکتا تھا۔ کامیابی کی یہی شرط تھی۔ یہی راز تھا نوکرشاہی میں کامیابی کا۔

سب سے پہلے انھوں نے کملا کانت ورما کے گھر ایک چپراسی دوڑایا اور انھیں دس بجے دفتر پہنچنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد اپنے فون کا رسیور اتار کر نیچے رکھ دیا۔ انھیں معلوم تھا کہ کملا کانت وجہ جاننے کے لیے فون کریں گے اور یہ سوچ کر کہ ان کا فون خراب ہے، ان کے دل میں کمبھ کا خیال آئے گا۔ آج کل کمبھ کے بارے میں مسلسل ہیڈ آفس خبریں منگائی جا رہی تھیں۔ یہ ضرور تھا کہ سپرنٹنڈنگ انجینئر کے اپنے دفتر میں آنے کی بات کچھ عجب لگے گی مگر ان کے درمیان جو تعلقات قائم تھے، وہ ایسے تھے کہ کملا کانت کو اپنے خلاف سازش کا شک نہیں ہو سکتا۔

یہی ہوا۔ دفتر آ کر ہی کملا کانت کو پتا چل پایا کہ ان کے خلاف سازش ہوئی ہے۔

پیارے لال کا بس چلتا تو وہ کملا کانت کو ہی اس عہدے پر برقرار رکھتے مگر انھیں دھوکا دے کر بلانے اور بنوک چند کو چارج دلانے پر انھیں افسوس بھی نہیں تھا۔

یہاں سارے کردار بے دلی سے اپنا اپنا رول ادا کر رہے تھے۔ بنوک چند بے دلی سے دھڑا دھڑ جھوٹ بول رہے تھے۔ پیارے لال بے دلی سے سن رہے تھے اور سچ پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس سے پہلے انھوں نے اسی حربے سے کملا کانت کو چھلنے کی کوشش کی تھی۔ باہر رشبھ چرن

Scanned with CamScanner

شکل یہی بے دلی دکھاتے اور جتاتے ہوئے، بابوؤں اور جونیئر انجینئروں کو بتا رہے تھے کہ بھیا نے تو صاف صاف منع کر دیا تھا، وہ تو چیف صاحب نے بہت سمجھایا اور ساتھ میں ایس ای صاحب کو بھیجا، نہیں تو بھیا چارج تھوڑے ہی لیتے۔

اور اسی بے دلی سے اسٹیج پر بڑے بابو نمودار ہوئے۔

''لے آئے بڑے بابو؟''

''ہاں سر۔''

''لائیے۔''

ٹیپکل سرکاری زبان والے چارج سرٹیفکیٹ کی دس سے زیادہ کاپیاں بٹوک چند کے سامنے رکھ دی گئیں۔ وہ ایک ایک سطر کو بغور پڑھتے اور دستخط کرتے اور بڑے بابو دستخط کے بعد ایک ایک ورق کو ہٹاتے رہے۔

جیسا کہ رشبھ چرن شکل نے اس ناٹک کی ابتدا میں ہی انھیں مشورہ دیا تھا کہ بڑے بابو نام کے اس کردار پر انھیں ذرا بھی بھروسا نہیں ہے، اس لیے پوری لاپروائی دکھاتے ہوئے بھی انھوں نے دستخط نامی چڑیا بیٹھاتے ہوئے کاغذ پر تحریر پوری عبارت تقریباً پڑھ لی۔

''ٹریژری کی کاپی نہیں دی بڑے بابو؟''

''دی ہے سر۔'' بڑے بابو نے چارج سرٹیفکیٹ کے نیچے جن لوگوں کو کاپیاں بھیجی جا رہی تھیں، ان کی فہرست کے نویں نمبر پر انگلی رکھ دی۔

بٹوک چند نے سرسری نگاہ ڈالی۔

''اسٹیٹ بینک کو کاپی نہیں گئی!''

''ہاں... یہ غلطی ہو گئی سر۔ ابھی ایک اور کاپی ٹائپ کرلاتا ہوں۔''

''میرے دستخط بھی بینک کو بھجوا دیجیے۔''

''ابھی بینک کی کاپی ٹائپ کراؤں، اسی کے ساتھ آپ کے دستخط والا کاغذ بھیجتا ہوں۔''

بڑے بابو چلے گئے۔ بٹوک چند نے فاتحانہ انداز سے پیارے لال کی طرف دیکھا۔

''اس دفتر میں بڑی صفائی کی ضرورت ہے سر۔ سب سالے گھاگھ اکٹھے ہو گئے ہیں۔ یہ بڑا

Scanned with CamScanner

بابو میرے ساتھ پہلے بھی رہا ہے۔ پچھلی بار تو میں نے ہی ہٹوایا تھا۔ اب بتایئے، سالے تیس سال سے نوکری کر رہے ہیں اور بینک کو چارج سرٹیفکیٹ کی کاپی بھیجنا بھول گئے۔ ارے صاحب، ذرا سا چوک جائیں تو لو، بہرائچ والا قصہ ہو گیا۔"

نوکر شاہی میں ہر موقعے کے لیے موزوں کوئی نہ کوئی قصہ رہتا ہے۔ بٹوک چند نے اس موقعے پر بہرائچ والا قصہ سنایا۔ اس قصے کے مطابق انھی جیسے بھولے بھالے ایک افسر نے اس بڑے بابو جیسے بدمعاش بابو پر بھروسا کر کے چارج سرٹیفکیٹ پر دستخط کر دیے۔ اس کاغذ کی کاپی سب کو گئی، پر اسٹیٹ بینک کو نہیں گئی، لہٰذا اس کا سابق افسر اگلے کافی دنوں تک چیک کاٹ کے ٹھیکیداروں کے بھگتان کرتا رہا۔ بعد میں جب تک پتا چلا اور پچھتاوے کی صورت حال نئے افسر کے سامنے پیدا ہوئی، تب تک اس محاورے کے سے حالات بن گئے تھے جس میں چڑیا کے کھیت چگ جانے کے بعد پچھتاوے کے بے سود ہونے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

بٹوک چند کے پاس کسی بھی گھاگھ افسر کی طرح اور بھی بہت قصے تھے۔ اگر بڑے بابو نے کلکٹر کے نام کاپی جاری نہ کی ہوتی تو وہ بلند شہر والا قصہ سناتے، اور اگر ٹریژری کے نام کاپی نہیں گئی ہوتی تو سنانے کے لیے بلیا والا قصہ ہوتا۔

قصہ کوتاہ یہ کہ سنانے کے لیے بٹوک چند کے پاس بہت سارے قصے تھے اور پیارے لال کچھ بھی سننے کے لیے بہت بے چین نہیں تھے۔

جتنی دیر میں بٹوک چند نے اپنا قصہ ختم کیا، پیارے لال کی ٹیلی فون پر گھومتی انگلیوں نے لکھنؤ میں چیف انجینئر سے فون ملا لیا۔

"ہاں سر، چارج ہو گیا سر۔ کملا کانت نے تو چارج دیا نہیں سر، پر میں نے بٹوک چند کو چارج دلا دیا سر۔۔۔۔ نہیں سر، پتا نہیں چلا سر۔ کملا کانت کو تبادلے کا پتا نہیں چلا سر۔ وہ تو دفتر آ کر بھاگ گیا سر۔ میں ڈھنڈوا رہا ہوں سر۔۔۔۔ ٹھیک ہے سر، مہربانی سر۔"

پیارے لال فاتح کی مانند اٹھے۔ انھیں سونپا گیا کام کامیابی سے سرانجام پا گیا تھا۔

"اچھا بھائی اپادھیائے جی، بیسٹ آف لک! سنبھالیے اپنا راج پاٹ،" انھوں نے کچھ اس طرح آشیرواد دیا جیسے مہارشی وشوامتر کسی راجکمار کو بے خوف رہنے کا پیغام دے رہے ہوں۔

Scanned with CamScanner

بٹوک چند نے بھی ایک فرمانبردار شاگرد کی طرح اپنے گرو جی کی عزت افزائی میں جو کلمات ادا کیے، ان کا مفہوم کچھ اس طرح تھا کہ وہ قابل اور محنتی تو پہلے ہی سے تھے، بس گرو کرپا کی ضرورت تھی۔ اپنی لمبی کامیاب نوکری کے دوران پہلی بار ایک صحیح رہنما پیارے لال کے روپ میں ملا ہے، اس لیے ان کی کامیابی میں کوئی شک نہیں ہے۔ وہ آ گئے ہیں اور سب کچھ ٹھیک کر دیں گے۔

وہ آ گئے ہیں اور سب کچھ ٹھیک کر دیں گے، یہ جملہ انھوں نے پیارے لال کے جانے کے بعد اپنے خیر خواہوں اور اپنے حامیوں کی بھیڑ کے سامنے بھی کہا پیارے لال کو جو پورٹیکو میں کھڑی ان کی کار تک پہنچا کر ان کے واپس اپنے کمرے میں آنے پر موجود تھے۔

کمرے میں وہ سارے لوگ تھے جنھیں پچھلے کئی سالوں میں اس دفتر میں ستایا گیا تھا۔ اہلیت رکھتے ہوئے بھی انھیں ان جگہوں پر نہیں رکھا گیا جہاں سرسوتی کی لکشمی سے بھینٹ ہوتی ہے۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو پچھلے دور میں بھی بھاری پلڑے پر تھے، کماؤ جگہوں پر تھے اور اس تبدیلی کے بعد بھی انھی جگہوں پر برقرار رہنا چاہتے تھے۔ وہ یہ بتانے آئے تھے کہ پچھلی بار تو انھیں اپنے سینوں پر پتھر رکھ کر پیسہ کمانا پڑا تھا، کام کرنے کا مزہ تو اب آئے گا۔ اس بھیڑ میں ٹھیکیداروں، دلالوں، صحافیوں، پیشہ ور چاپلوسوں اور اس طرح کے تمام طبقوں کے نمائندے پان کے پڑوں کے ساتھ حاضر تھے۔ یہ ہر تبدیلی کے بعد اسی طرح کمرے میں حاضر رہا کرتے تھے۔

کئی سالوں کے بعد بڑے صاحب کے کمرے میں پیر چھونے کی روایت پھر آ گئی۔ لوگوں کو میز کے نیچے گھس کر پیر چھونے پڑ رہے تھے، اس لیے بٹوک چند نے پیر باہر نکال کر ایک اسٹول پر رکھ دیے۔ لوگ آتے ہی پیر چھوتے تھے اور پان کی پڑیاں آگے بڑھا دیتے تھے۔ بٹوک چند اپنے گول ٹھنسے ہوئے منھ میں ایک بیڑا اور ٹھونس لیتے۔

''صاحب، اب آپ آ گئے ہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

بٹوک چند کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ خود بھی بیچ بیچ میں اعلان کرتے جا رہے تھے کہ وہ آ گئے ہیں تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

''پترکاروں نے تو اس دفتر میں آنا بند کر دیا تھا۔ وہی لکھنوا بیٹھ کر دلالی کیا کرتا تھا۔ چلیے اب آپ آ گئے ہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا،'' شہر سے چھپنے والے انگریزی اخبار کے نمائندے نے

کہا۔

''ہاں صاحب، آپ کے دفتر کا تو سارا نظام ہی چوپٹ ہو گیا تھا۔ پتا لگا لیجیے جو کوئی باضمیر اور عزت نفس رکھنے والا صحافی یہاں آتا ہو۔ اب سب ٹھیک ہو جائے گا،'' کھدر دھاری نیتا نے کہا۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا،'' ٹھیکیداروں نے کہا۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا،'' دلالوں نے کہا۔

بابوؤں، چپراسیوں، برآمدوں، کرسیوں، چائے خانوں غرض کہ جن جن کی آواز شری بٹوک چندا/پادھیائے، ایگزیکٹو انجینئر، یعنی دفتر کے بڑے صاحب تک پہنچ سکتی تھی، سب نے پورے یقین کے ساتھ کہا کہ اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

بٹوک چند نے بھی مجلس برخاست کرنے سے پہلے کہا کہ اب وہ آ گئے ہیں اس لیے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

اس طرح محکمۂ تعمیرات کے اس دفتر میں دن بھر ''سب ٹھیک ہو جائے گا''، ''سب ٹھیک ہو جائے گا'' کی آوازیں گونجتی رہیں اور روز کی طرح آج بھی کوئی کام نہیں ہوا۔

Scanned with CamScanner

اس سڑک کے دونوں طرف بابوؤں کی قتل گاہیں بکھری ہوئی تھیں۔

سڑک کو سڑک کہنا کافی حد تک رسم نبھانے جیسا تھا۔ اس پتلی، دبلی، مریل سڑک پر چلنے کے سوا سبھی کام بآسانی کیے جاسکتے تھے۔ سرکاری ریکارڈ میں سڑک کے نام سے جو چیز درج تھی، اسے شوچالیہ (پاخانے) اور مترالیہ (پیشاب خانے) جیسے نام سے پکارا جاسکتا تھا۔ دونوں پٹریاں اور آدھی سڑک ملک کے بے روزگاری اور رہائش جیسے مسئلوں کو حل کرنے میں استعمال ہو رہی تھیں۔ عشق ومحبت کے کھیل سے لے کر فوجداری تک اور بھی کئی قومی سطح کی سرگرمیاں تھیں جو اس سڑک پر ہی سرانجام پاتی تھیں۔ ان سب کے علاوہ یہ سڑک چلنے کے بھی کام آتی تھی۔ یہی سب سے زیادہ حیرت انگیز بات تھی جو صرف ہمارے ملک میں ہی ممکن ہے۔

اسی سڑک کے دونوں جانب دور دور تک دفتروں کی قطاریں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان دفتروں میں ایسی مخلوق پائی جاتی ہے جسے بابو کہتے ہیں اور جس کے بارے میں محققین کا کہنا ہے کہ اسے میکالے نامی ایک انگریز دانشور نے دریافت کیا تھا۔ دراصل کولمبس اور واسکوڈی گاما کی دریافت کے بعد یہ سب سے اہم دریافت پائی جاتی ہے، اور جیسا کہ ان دونوں کی دریافتوں کے ساتھ ہوا کہ ان کے مرنے کے بعد بھی ان کی دریافتیں دنیا میں برقرار ہیں، اسی طرح میکالے کی دریافت اس کے بعد بھی ہمارے بیچ پھل پھول رہی ہے۔

افسروں کے کرنے کے لیے اس ملک میں بہت سارے کام ہیں۔ انھیں دورے کرنے پڑتے ہیں، اپنے سے بڑے افسروں کو خوش رکھنا پڑتا ہے، لنچ پر جانا پڑتا ہے اور کافی وقت باتھ روم میں رہنا پڑتا ہے۔ اتنی ساری مصروفیتیں ہوتی ہیں کہ وہ دفتر میں بیٹھ نہیں پاتے۔ بابوؤں کو دفتر میں اتنا بیٹھنا پڑتا ہے کہ وہ کسی کام کے لائق نہیں رہتے۔ کبھی کبھی کسی فائل کی قسمت اچھی ہوتی ہے۔ بابو اسے

Scanned with CamScanner

نوٹنگ ڈرافٹنگ کر کے، سجا سنوار کر لے آتا ہے اور افسر اس میں ایک ایبسٹریکٹ قسم کی پچی کاری کرتا ہے۔ اسے کچھ لوگ چڑیا بیٹھانا کہتے ہیں اور کچھ لوگ دستخط کرنا۔

بابو کی دنیا کی سب سے اہم چیز فائل ہوتی ہے۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ فائل بابو کے لیے بنی ہے یا بابو فائل کے لیے۔ اتنا کہا جاسکتا ہے کہ بغیر فائل کے بابو کا تصور نہیں کیا جاسکتا ہے اور یہ لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان فائلوں کے بارے میں یہی بھی کہا گیا ہے کہ انھیں بابو لکھتے ہیں اور بابو ہی پڑھتے ہیں۔ ہندی ادب میں تو کئی بار بابو کے مرنے کے بعد اس کی روح انھی فائلوں میں بھٹکتی ہوئی پائی گئی ہے۔ کئی لکھنے والوں نے رات کے سناٹے میں ان فائلوں سے اٹھتی ہوئی عجیب دردناک کراہیں بھی سنی ہیں۔ انھیں وہ ان مردہ بابوؤں کی کراہیں مانتے ہیں جن کی جوانیاں اور وقت سے پہلے آئے بڑھاپے ان فائلوں میں دفن ہیں۔ بعض وقت تو ایسا بھی ہوا ہے کہ زندگی بھر پنشن بنانے والے بابو کی روح اپنی پنشن کے چکر میں اس سیکشن میں بھٹکتی ہوئی پائی گئی۔

محکمۂ تعمیرات کے اس دفتر میں بھی سب کچھ دوسرے دفتروں کی طرح ہی تھا۔ بابو بھی دوسرے دفتروں کی طرح تھے۔ وہ روز دیر سے آتے تھے، آتے ہی چائے کی دکانوں پر چلے جاتے تھے، چائے پی کر پان کھاتے تھے، دونوں کے پیسے کسی ٹھیکیدار سے دلواتے تھے، واپس دفتر آ کر گپ لڑاتے تھے اور پھر چائے کی دکان پر چلے جاتے تھے۔ ان کے ذمے دوسرے دفتروں کی ہی طرح یہاں بھی اتنی مصروفیتیں تھیں کہ وہ ہر وقت مصروف رہتے تھے۔ دوسرے دفتروں کی طرح یہاں بھی ایک پیشاب خانہ تھا جس کے دروازے پر ''صرف افسروں کے لیے'' لکھا تھا۔ اس لیے یہاں بھی بابو پیشاب جیسے عمل کے لیے اس سڑک پر واقع بہت سارے دفتروں کی چاردیواری میں سے کسی ایک کا انتخاب کرتے تھے۔

بابوؤں کے بیٹھنے کے لیے دو ہال نما کمرے تھے۔ ان میں طرح طرح کی چیزیں تھیں۔ لکڑی، لوہے اور سیمنٹ کو ملا کر بنی ہوئی ایک چیز تھی جسے کرسی کہتے ہیں۔ اگر کسی اسکولی بچے کو اس کو دکھا کر اس پر مضمون لکھنے کو کہا جائے تو وہ اس کی دو خصوصیات ضرور لکھے گا۔ پہلی تو یہ کہ اس میں دو سے لے کر چار تک ٹانگیں ہوتی ہیں۔ ایک ٹانگ اس لیے نہیں ہوتی کیونکہ ایک ٹانگ پر یہ زیادہ دیر کھڑی نہیں رہ سکے گی۔ جن کرسیوں کی صرف ایک ٹانگ بچتی ہے، ان کے نیچے اینٹیں لگا کر دوسری، تیسری

اور چوتھی ٹانگ کی کمی پوری کر لی جاتی ہے۔ دوسری خاص بات یہ ہے کہ کرسی نام کی اس چیز پر بابولوگ بیٹھتے ہیں۔ وہ ان پر اس لیے بیٹھتے ہیں کہ جب تک ان کی اور دفتروں کی دریافت ہوئی، تب تک زمین پر بیٹھنے کا چلن ختم ہو چکا تھا۔ جب کبھی بابولوگوں کا من ان کرسیوں کی بچی کھچی ٹانگوں کو توڑنے کا چاہتا ہے، وہ مار پیٹ میں بھی ان کا استعمال کر لیتے ہیں۔ کئی بار سرکار خوش ہو کر زیادہ بجٹ دے دیتی ہے یا افسروں کا دل کمیشن سے بیزار ہو جاتا ہے تو کچھ نئی کرسیاں آ جاتی ہیں۔ پر انھیں دیکھ کر بابوؤں کو گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔ انھیں لگتا ہے کہ ان کا کلچر ختم کرنے کی یہ بھیانک سازش کی جا رہی ہے، اس لیے وہ نئی کرسیوں کے بینت بلیڈ سے کاٹ دیتے ہیں۔ اگر کسی کولیگ کا سر پھوڑنے کا من نہیں کرتا تو کمرے کا فرش توڑنے کے لیے ان کرسیوں کا استعمال کر لیتے ہیں۔ ایک بار جب کرسی چار سے تین یا دو والی ٹانگوں کی ہو جاتی ہے تو اس پر بیٹھنے بھی لگتے ہیں۔

بابوؤں کے کمرے میں کرسی خاندان سے متعلق ایک چیز اور ہے جسے میز کہتے ہیں۔ اس کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ اس کی چار ٹانگیں ہوتی ہیں۔ پر ان دونوں کمروں میں کافی مشکل سے ایسی کوئی چیز تلاش کی جا سکتی ہے جس کی چاروں ٹانگیں دھرتی کو چھو رہی ہوں۔ ٹانگوں میں کیا رکھا ہے، ایسا ماننے والے بابوؤں نے چپراسیوں سے منگوا کر اینٹوں کے سہارے ان میزوں کو کھڑا کر رکھا ہے۔ میزوں پر فائل نامی چیزیں ڈھیر تھیں۔ وزن کم نہ ہو جائے اس لیے فائلوں کے علاوہ دھول بھی ان پر کافی مقدار میں جمی تھی۔ میزوں کے علاوہ فائلیں فرش پر بھی تھیں۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ زیادہ تر فائلیں فرش پر ہی تھیں۔ فائلوں میں دبے اہم کاغذات کے بارے میں دفتر کے چپراسی اتنے فکرمند تھے کہ فرش کی کبھی صفائی نہیں کرتے تھے، اس لیے فرش پر بھی فائلوں کے علاوہ دھول کی تہیں جمی تھیں۔

کمروں میں جہاں جہاں جگہ ہو سکتی تھی، وہاں لکڑی یا لوہے کے بڑے ڈھانچے کھڑے کر دیے گئے تھے۔ جب فرش پر جگہ نہیں بچتی تھی تو بابولوگ اس میں بھی فائلیں رکھ دیتے تھے۔ وہ انھیں الماری کہتے ہیں۔ اگر کبھی یہ عمارت منہدم ہوئی اور آرکیالوجی ڈپارٹمنٹ کو زمانے کے تعین کا کام سونپا گیا تو یقیناً انھیں یہ طے کرنے میں دقت ہوگی کہ اس جگہ دفتر پہلے بنا تھا یا پہلے وہاں الماری رکھ کر اس کے چاروں طرف دفتر بنا دیا گیا تھا۔ ان الماریوں کو رکھنے کے بعد ہٹایا نہیں گیا تھا، اس

لیے اکثر کوئی پرانی فائل تلاش کرنی ہوتی تو بابو لوگ انھیں نیچے تلاش کرتے۔

بابو، کرسی، میز، الماری اور فائل نام کے یہ ان پانچ عناصر سے جو چیز بنتی ہے، اس کو دفتر کہتے ہیں۔ ایک دانشور نے کہا تھا کہ ایک بار قائم ہو جانے کے بعد دفتر اپنے لیے کام خود ہی پیدا کر لیتا ہے۔ کام کرنے کے لیے کاغذ نامی چیز استعمال ہوتی۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے، اس پر بابو کچھ لکھتے ہیں اور بابو ہی تحریر کی ہوئی چیز کو، اگر پڑھنے کے لائق ہے تو، پڑھتے ہیں۔ اس کاغذ کا تھوڑا حصہ سرکار دیتی ہے۔ سرکار کے دیے ہوئے کاغذ سے دفتر کا کام نہیں چل سکتا اس لیے اس کا بڑا حصہ افسروں اور بابوؤں کے گھر چلا جاتا ہے اور وہاں ان کے بچوں کی تعلیم کی ترقی میں کام آتا ہے۔ بغیر کاغذ کے دفتر کا کام نہیں چل سکتا اور بغیر کام کیے سرکاری عملہ رہ نہیں سکتا، اس لیے وہ عوامی مدد نامی اس پروگرام کا سہارا لیتے ہیں، جو ہندوستانی نوکر شاہی کے کل پرزوں میں تیل پانی دینے کے لیے سب سے زیادہ ضروری ہے۔ الگ الگ محکمے اپنے رابطے میں آنے والے عوام سے الگ الگ طریقوں سے تعاون مانگتے ہیں۔ مثلاً تھانے پر رپٹ لکھانے جانے والے کو قوم کے نام پر ایک دستہ کاغذ، تھوڑی سیاہی یا قلم تحفہ میں دینے کے لیے کہا جاتا ہے۔ کئی بار یہ بھینٹ چوری گئے سامان کی قیمت سے زیادہ ہوتی ہے، اس لیے بہت سارے لوگ رپٹ لکھانے میں دلچسپی نہیں دکھاتے۔ اکثر کاغذ کی بربادی بچانے کے لیے تھانے والے ہی رپٹ نہیں لکھتے۔ اس دفتر نے بھی کاغذ کی قومی ملکیت کی کمی کو پورا کرنے کے لیے طے کر رکھا تھا کہ جس کا کام ہو، وہ اپنا کاغذ خود لائے؛ اس کے علاوہ مزید کاغذ بھی لائے تاکہ دفتر میں کام کرنے والے لوگوں کے بچوں کی تعلیمی سرگرمیاں متاثر نہ ہوں۔

کاغذوں کو فائلوں میں رکھتے ہیں۔ فائلوں میں اس لیے رکھتے ہیں کیونکہ ابھی تک کاغذوں کو غائب کرنے کا اس سے بہتر طریقہ ایجاد نہیں ہوا ہے۔ بابوؤں کی نئی پیڑھی اس معاملے میں کچھ مختلف سوچ رکھتی ہے۔ اس پیڑھی کے بابو کاغذوں کو اپنی میز، کرسی یا الماری کے نیچے بھی رکھتے ہیں۔ پہلے ان فائلوں کو لال فیتے سے باندھتے تھے۔ لال فیتے سے فائلوں کو باندھنے کا مطلب تھا کہ اب اگلی دو تین پیڑھیوں تک ان کے آرام میں کوئی خلل نہیں ڈالے گا۔ اسی سے زبان کو ایک نیا لفظ ملا: ''لال فیتہ شاہی''۔ ہمارے ملک کے بعض چیف منسٹروں کو یہ لفظ پسند نہیں آیا، اس لیے انھوں نے لال کی جگہ ہرے، پیلے، گلابی جیسے دوسرے رنگوں کے فیتے استعمال کرنے کا حکم دے دیا۔ اس طرح لال

Scanned with CamScanner

فیتہ شاہی ختم ہوگئی اور کاغذ دوسرے رنگوں کے فیتوں کے نیچے دفن ہونے لگے۔

دفتروں کی بہترین کارکردگی کا اندازہ ان کاغذات کے نپٹارے سے لگایا جاتا ہے۔ اس دفتر کا بابو بھی دوسرے دفتروں کے بابوؤں کی طرح کاغذوں کے نپٹانے میں خاص دلچسپی رکھتا تھا۔ ہر کاغذ کو بابو پہلے سونگھتا تھا، پھر تول کر دیکھتا تھا اور پھر اس کے مستقبل کا تعین کرتا تھا۔ بابو کے ہاتھ میں آتے ہی کاغذ کے روئیں روئیں سے کچھ ایسے سُر پھوٹتے تھے جنھیں صرف وہی پکڑ پاتا تھا۔ کچھ کچھ نظم کے اس مصرعے کی طرح ہوتے تھے جس میں پرندے کو ہی پرندے کی زبان جاننے والا بتایا گیا ہے۔ شروع کے ایک دو مصرعے پڑھتے ہی بابو سمجھ جاتا ہے کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس کے بعد کاغذوں کا نپٹارا شروع ہو جاتا ہے۔ 'اشد ضروری'، 'فوری'، 'کانفیڈنشل' جیسی بھاری بھرکم صفتوں سے دبے کاغذ بابو کی کرسی، میز یا الماریوں کے نیچے پہنچ جاتے ہیں۔ کچھ زیادہ خوش قسمت ہوتے ہیں تو کسی فائل کے اندر سما جاتے ہیں۔ کچھ نئی عمر کے بابو ابھی تک کاغذ سے ناؤ یا ہوائی جہاز بنانے کے کھیلوں کے شوق سے چھٹکارا نہیں پا سکے، اس لیے کچھ کاغذ بیچ بیچ میں ہوا میں اڑتے نظر آتے ہیں۔ دن بھر بابوؤں کو چائے پکوڑوں سے جوجھنا پڑتا ہے، اس سے بھی کاغذوں کے نپٹارے میں آسانی ہوتی ہے۔ چائے والے کا چھوکرا بابوؤں کو سموسے، پکوڑے دینے کے لیے ان کے سامنے کا کاغذ کھینچ کر اُس پر تیل ٹپکاتی کھانے کی چیز رکھ دیتا ہے۔ اس طرح دن میں جتنی بار وہ آتا ہے، اتنے کاغذوں کا نپٹارا قطعی ہے۔

شام ہوتے ہوتے بابو مطمئن ہو جاتا ہے کہ ہندوستانی نوکر شاہی کے آدرش پرزے کی مانند اس نے دن بھر کڑی محنت کی ہے اور اسے ملے زیادہ تر کاغذوں کو نپٹایا جا چکا ہے۔ اب وہ بچے کھچے ان کاغذوں پر توجہ مرکوز کرتا ہے جن پر کچھ وزن رکھا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وزن لفظ کا استعمال بھی بابوؤں کے زبان و ادب کے تئیں محبت کا ہی ثبوت تھا۔ اکثر وہ سامنے کھڑے فریادی سے کاغذ لے کر اس کا کچھ اس طرح معائنہ کرتا ہے جیسے اس میں لکھی ہوئی زبان یونانی یا لاطینی ہو۔ پھر وہ کاغذ کو ایک طرف رکھ دیتا ہے اور دوسری کسی فائل میں سر گڑا کر پورے منظر سے غائب ہو جاتا ہے۔ فریادی اگر اس کی یکسوئی میں خلل ڈالنے ہونے کی کوشش کرتا ہے تو وہ سخت غمزدگی کا تاثر چہرے پر لا کر اسے بتاتا ہے کہ ملک ایک بڑے بحران سے گزر رہا ہے اور ابھی جس فائل میں وہ غرق ہے، اگر اسے فوراً نہیں

Scanned with CamScanner

نپٹایا گیا تو یہ بحران مزید شدت اختیار کر سکتا ہے۔ فریادی تھوڑی دیر بعد وہ سوال پوچھتا ہے جس کا جواب دینا نوکرشاہی کے کسی بھی پرزے کے لیے انتہائی دشوار ہے۔ فریادی اپنے کاغذ کے مستقبل کے بارے میں جستجو ظاہر کرتے ہوئے جاننا چاہتا ہے کہ اس پر کارروائی کب تک ممکن ہے۔ اس پر بابو پراسرار دنیا میں ڈوبے کسی فلسفی کی طرح جواب دیتا ہے کہ کارروائی آج بھی ہو سکتی ہے، اگلے سال بھی ہو سکتی ہے، یا پھر معاملہ آنے والی پیڑھیوں پر بھی ٹالا جا سکتا ہے۔ فریادی اگر دفتروں میں مستقل آنے جانے والا ہے تو اسے اس کاغذ پر کیا کارروائی ہو رہی ہے، یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگتی؛ پر اگر کوئی نیا آدمی ہو تو اسے ضرور دقت ہوتی ہے۔ اس کے علم کے در تبھی کھلتے ہیں جب کوئی چپراسی یا دوسرا بابو اسے اشارے سے الگ بلا کر کسی اَن دیکھی آندھی کا حوالہ دیتا ہے جو اس کے کاغذ کو اڑائے لیے جا رہی ہے۔ اگر کاغذ مضبوطی سے اپنے مقام پر قائم نہیں رہے گا تو اس پر کارروائی کیونکر ممکن ہے؟ پھر فریادی کو صلاح دی جاتی ہے کہ وہ اپنے کاغذ پر وزن رکھے۔ فریادی فوراً سمجھ جاتا ہے اور ریزرو بینک آف انڈیا کے گورنر کے دستخط شدہ کاغذ کے کچھ وزنی ٹکڑے پہلے والے کاغذوں کے اوپر یا نیچے رکھے جاتے ہیں۔

لالہ بابو کو نئی پیڑھی کے بابوؤں سے جو بے شمار شکایات ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ پہلے کے بابو بڑی شائستگی سے وزن رکھواتے تھے۔ اکثر یہ کام باہر کسی چائے کی دکان یا بابو کے گھر پر اختتام پذیر ہوتا تھا۔ اگر دفتر میں کرنا بھی پڑے تو میز کے نیچے ہاتھ ڈال کر لے لیتے تھے۔ متعلقہ بابو چاروں طرف جھینپ کر دیکھتا تھا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ باقی بابو ایسے موقعوں پر فائلوں میں اپنا سر گڑا لیتے تھے تاکہ ان کے ساتھی کو کوئی پریشانی نہ ہو۔ پر نئے زمانے کے بابوؤں نے تو ساری شرم و حیا گھول کر پی لی ہے۔ وہ کھلے عام لین دین کرتے ہیں۔ اپنے منھ سے خود ہی بتا دیتے ہیں کہ کاغذ بڑا ہلکا ہے اور اس پر وزن رکھنا پڑے گا؛ کتنا وزن رکھنا پڑے گا، یہ بھی بتا دیتے ہیں، اور اکثر اونچی آواز میں وزن کا مول تول بھی کرتے ہیں۔

شام تک سارے وزنی کاغذوں کو اکٹھا کر کے بابو انھیں سندر سندر فائلوں میں سجا لیتا ہے، پھر اپنے علم کے سارے خزانے اس پر انڈیلتے ہوئے نوٹنگ ڈرافٹنگ کرتا ہے۔ یہ نوٹنگ ڈرافٹنگ نوکرشاہی کا سب سے جمالیاتی پہلو ہے۔ اس کے بارے میں یہ روایت بھی ہے کہ اسے سب سے

Scanned with CamScanner

نچلے عہدے والا بابو تیار کرتا ہے اور اوپری سیڑھیوں پر بیٹھے تمام عہدیدار اپنے اپنے طریقے سے اس کو آراستہ و پیراستہ کرتے چلتے ہیں۔ جن فائلوں میں افسر کی دلچسپی ہوتی ہے، ان کے بارے میں بابو کو بتادیا جاتا ہے اور وہ اسی حساب سے نوٹنگ کر کے لے آتا ہے۔ جن کے بارے میں اسے اوپر سے کوئی اشارہ نہیں ملتا، ان میں وہ وزن کے مطابق نوٹنگ کرتا ہے۔ نوکر شاہی میں بھائی چارے کے جذبات کچھ اس قدر مضبوط ہوتے ہیں کہ نیچے سے بھیجی گئی تجویز اوپر تک چلتی چلی جاتی ہے اور منظور ہو کر لوٹ آتی ہے۔ ''بابو لکھتے ہیں اور بابو پڑھتے ہیں'' والی کہاوت کے مطابق افسر صرف چڑیا بیٹھاتے ہیں۔

ہر افسر نوکری شروع کرتے ہی جان جاتا ہے کہ اسے اور کچھ کرنا ہو یا نہ کرنا ہو، پر دستخط بہت کرنے ہوں گے۔ اس لیے وہ اپنے دستخط کا ایک انیشل (initial) ایجاد کرتا ہے، جسے چڑیا کہتے ہیں۔ فائلوں میں بٹھائی جانے والی چڑیوں پر علم طیور رکھنے والوں کا دھیان ابھی تک نہیں گیا ہے، اس لیے ان کی شکل صورت، ذات برادری کے بارے میں کوئی سنجیدہ کام نہیں ہوا ہے۔ مستقبل میں اگر کبھی کسی محقق نے کام کیا تو اسے معلوم ہوگا کہ ان پرندوں کی بھی بہت ساری قسمیں ہیں۔ صبح دفتر کھلنے پر بٹھائی گئی چڑیا شام کو دفتر بند ہوتے وقت کی چڑیا سے مختلف ہے۔ اچھے موڈ کی چڑیا کا سائز برے موڈ کی چڑیا سے چھوٹا ہوتا ہے۔ کمیشن کی خوشبو بکھیرنے والی فائل پر بیٹھی چڑیا چہکتی نظر آتی ہے اور سوکھے کاغذوں پر بیٹھی ہوئی مریل۔ ہمارے ملک میں جس طرح کے موضوعات پر تحقیق ہو رہی ہے، اسے دیکھتے ہوئے مستقبل قریب میں اس بات کی پوری امید کی جاتی ہے کہ یونیورسٹیوں میں کسی دن اس انتہائی اہم موضوع پر بھی تحقیق کا کام شروع کر دیا جائے گا۔

ہال نما ایک کمرے میں بڑے بابو عرف لالہ بابو کی سلطنت پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ہال کے بیچ میں ایک بڑی میز کے پیچھے بیٹھتے تھے۔ برسوں سے، جب وہ بڑے بابو بھی نہیں بنے تھے، یہ میز یہیں رکھی تھی۔ انھوں نے صرف اتنا کیا کہ میز کا زاویہ اس طرح کر دیا کہ اس کے پیچھے بیٹھ کر انھیں باہر کھڑی اپنی سائیکل دکھائی دیتی رہے۔ چونکہ یہ بڑے بابو کی میز تھی اس لیے اس کی چاروں ٹانگیں سلامت تھیں اور اس پر ایک کپڑا بچھا ہوا تھا، جس کے لیے بڑے بابو اور فرّاش آپس میں باتیں کرتے وقت میز پوش لفظ کا استعمال کرتے تھے۔ اس کپڑے کے رنگ کے بارے میں بابوؤں کی رائے میں ہم

Scanned with CamScanner

آہنگی نہیں تھی۔ بتایا جاتا ہے کہ لالہ بابو جب نئے نئے بابو بن کر اس کمرے میں بیٹھنے آئے تھے، اس وقت کے ہیڈ کلرک بچھی بابو نے ان سے ایک نوٹ شیٹ تیار کرا کے ٹیبل کور خریدنے کی اجازت لی تھی۔ اس وقت جو کپڑا خرید کر آیا تھا، اس کا رنگ ہرا تھا۔ پچھلے بیس سالوں میں اس پر اتنی دھول اور سیاہی جمع ہوئی تھی کہ ہرا رنگ پورے کپڑے میں کہیں کہیں کچھ دھبوں کی شکل میں موجود تھا۔ کپڑا اتنی جگہ سے نچا کھچا تھا کہ اس کی لمبائی چوڑائی کے بارے میں بھی بابوؤں کی آپس میں مختلف رائے تھی۔

اس میز کے پیچھے بیٹھ کر لالہ بابو اپنا چشمہ ناک پر نیچے کر کے اپنی سلطنت کا جائزہ لیتے تھے۔ آج بھی وہ بیچ بیچ میں چشمے کو نیچا کر کے سامنے بیٹھے بارہ بابوؤں، ان کی میزوں کو گھیر کر کھڑے ٹھیکیداروں اور دلالوں کو دیکھ رہے تھے۔ آج صورت حال کچھ مختلف تھی۔ آج کا یہ دیکھنا صرف عادتاً نہیں تھا۔ آج کا دیکھنا کچھ کچھ اس گھبرائے ہوئے آدمی کا ردعمل ظاہر کر رہا تھا جو پوری طرح غیر جانبدار ہونے کا ناٹک کرتا ہوا، سامنے والوں کے چہرے سے یہ بھانپنے کی کوشش کرتا ہے کہ کہیں اس کا مذاق تو نہیں اڑایا جا رہا ہے۔

کل دفتر میں بالائی سطح کی تبدیلی رونما ہوئی تھی۔ سبھی کو معلوم تھا کہ بڑے صاحب کملا کانت ورما اور بڑے بابو کے تعلقات کیسے تھے۔ یہ بھی سب کو معلوم تھا کہ نئے بڑے صاحب بٹوک چند سے ان کی نہیں پٹتی۔ بٹوک چند نے آنے کے بعد بڑے بابو کو طلب کر کے کیا کیا کہا، اس کے بارے میں بھی مرچ مسالا لگا کر چاروں طرف باتیں پھیلائی جا چکی تھیں۔

جس طرح طلسماتی کہانیوں میں دیو کی جان طوطے میں بستی تھی، اسی طرح دفتروں کی جان بڑے صاحب نامی مخلوق میں بستی ہے۔ اگرچہ دفتروں میں سب کچھ کافی حد تک روٹین ہو چکا ہے اور بڑے صاحبوں کے آنے جانے سے کچھ بنیادی فرق نہیں پڑتا، پھر بھی کسی پرانے بڑے صاحب کے تبادلے یا نئے نئے بڑے صاحب کے آنے پر چھوٹا موٹا زلزلہ تو آ ہی جاتا ہے۔ ایگزیکٹو انجینئر کملا کانت ورما کے جانے اور بٹوک چند اُپادھیائے کے آنے پر یہی ہوا۔ لنچ کے پہلے کا پورا وقت دفتر کی دیواروں، چپراسیوں، بابوؤں اور ماتحتوں نے، محاورے کی زبان میں نہیں بلکہ سچ مچ، دم سادھے کسی انہونی کے اندیشے میں بتایا۔

بڑے صاحب کی بدلی کو صرف ایک دن ہوا تھا۔ بٹوک چند کو دفتر کے لوگ پہلے سے جانتے

Scanned with CamScanner

تھے لیکن انھوں نے کوئی جوکھم لینا مناسب نہیں سمجھا۔ آج دس بجے تک سارے بابو دفتر میں آ گئے تھے۔ آنے پر انھیں کمرے کھلے بھی ملے۔ آ کر وہ فوراً چائے کی دکانوں پر نہیں گئے بلکہ انھوں نے اپنے سامنے رکھی فائلوں میں کچھ لکھا بھی۔ بٹوک چند بھی سوا دس بجے آ گئے۔ انھوں نے بھی کچھ فائلوں پر دستخط کیے۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے دفتر میں جو کچھ ہوا، اسے دیکھ کر کچھ پرانے دلال، یہ سوچ کر کہ وہ کسی دوسرے دفتر میں چلے آئے ہیں، باہر بھاگ گئے۔ باہر سے بورڈ پر ایک بار پھر دفتر کا نام پڑھ کر وہ واپس اندر آئے۔ پر یہاں یہ سب کچھ بہت دیر تک نہیں چل سکتا تھا۔ لنچ تک دفتر میں زندگی واپس اپنی پٹڑی پر لوٹ آئی۔ تب تک بالائی سطح پر تبدیلی کا ایک دور ختم ہو چکا تھا۔ واقعات کچھ اس طرح رونما ہوئے کہ انھیں دیکھ کر کسی کو بھی ان چھوٹے موٹے ممالک کی یاد آ سکتی تھی جہاں ابھی بھی دورِ وسطیٰ ٹھہرا ہوا تھا اور جہاں اقتدار کی منتقلی کے لیے اسی طرح کے طریقے مقبول عام تھے۔ ایک حکمران سلطنت چھوڑ کر بھاگ گیا تھا؛ تختِ حکمرانی پر دوسرا آدمی قابض ہو کر طاقت کے دلالوں سے ان کی اسنادِ وفاداری بٹور رہا تھا۔

روز کی طرح آج بھی آدھے گھنٹے کا لنچ بریک آدھے گھنٹے کی جگہ تین گھنٹے تک چلا۔ ایک بجے سے لے کر چار بجے تک آج بھی افسر اور بابو لنچ لیتے رہے۔ فرق صرف اتنا آیا کہ روز اس دوران سارے کمرے خالی ہو جایا کرتے تھے۔ آج افسر کسی نہ کسی بہانے بڑے صاحب کے کمرے میں اکٹھے ہو گئے اور بابو بھی آتے جاتے رہے۔ بٹوک چند پہلے بھی اس دفتر میں رہ چکے تھے اور لوگوں کو معلوم تھا کہ انھیں کچوریاں اور مگھئی پان ایک سو بتیس نمبر کے تمباکو کے ساتھ پسند تھے، اس لیے پورے تین گھنٹے تک ان کے کمرے میں یہی سب پہنچتے رہے۔ صورت حال کچھ کچھ ایسی تھی کہ اگر ارد گرد کی چیزوں کو غائب کر کے ان کی کوئی تصویر کھینچی جاتی تو یہی لگتا کہ کوئی کچوری کا دکاندار کسی دفتر کی میز اٹھا لایا ہے اور اس پر کچوری کے ساتھ ساتھ پان بھی رکھ کر بیچ رہا ہے۔

دراصل پان اور کچوری کے ساتھ ساتھ اپنی وفاداریاں بھی پیش کی جا رہی تھیں۔ جیسے ہی کوئی نیا صاحب اندر پہنچتا، اس کی آسانی کے لیے بٹوک چند اپنا کوئی ایک پیر آگے پیچھے کرنے لگتے۔ اس کے قریب آتے آتے پیر ایسی پوزیشن میں پہنچ جاتا کہ نووارد کو ہوا میں ایک خاص زاویے پر اپنا ہاتھ لہرانا پڑتا، اور پان ٹھنسے منھ سے خاص قسم کی "غوں... غوں..." کی صدا یہ صاف ظاہر کرتی کہ

عقیدت قبول کر لی گئی ہے۔ اس عمل میں رکاوٹ صرف دو صورتوں میں پڑتی۔ پہلی تو تب جب کوئی گستاخ منصب دار پیروں کو ہلانے ڈلانے جیسے آسان اور عقلمند کو اشارہ کافی جیسے فعل کے باوجود، صرف ہاتھ جوڑ کر نمستے جیسی فارمیلیٹی تک محدود رہتا اور معاملے کو اسی طرح نپٹانے کی کوشش کرتا۔ ایسی صورت حال میں نوکر شاہی میں آنے کے بعد بھی پڑھی ہوئی نصابی کتب میں درج مشہور شاعر بھوشن کی شاعری کے ان بندوں کی یاد آنے لگتی ہے جن میں شواجی کو اورنگ زیب کی طرف سے عزت و تعظیم نہ دیے جانے پر شواجی کے ردعمل کی بھرپور للکار ہے۔ وقت بدل گیا تھا اور بٹوک چند فوری حساب کتاب کے بجائے مستقبل میں نمٹ لینے پر زیادہ یقین رکھتے تھے، اس لیے اپنی شان میں گستاخی کرنے والے کے یعنی ہلکے پھلکے نمستے پر ٹرخانے والے کا جواب وہ بہت نرمی سے مسکرا کر دیتے۔ صرف انھیں قریب سے جاننے والے ہی اس کڑکتی ہوئی بجلی کی کوند کو محسوس کر پاتے جو سیکنڈ کے معلوم نہیں کتنے ہزارویں پل کی سرعت سے ان کی آنکھوں کو خیرہ کرتے ہوئے غائب ہو جاتی۔ منھ سے نکلنے والی آوازوں میں بھی اتنا خفیف فرق ہوتا کہ صرف سمجھنے والے ہی سمجھ پاتے کہ وہ بظاہر دکھائی دیتی لاپروائی کے پیچھے یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ نمستے نامی روش اپنانے والا جان بوجھ کر ایسا کر رہا ہے یا اپنی بیوقوفی سے ہی صحیح سگنل نہیں پکڑ پا رہا ہے۔

دوسری صورت حال آس پاس بیٹھے لوگوں کے لیے عجب کشمکش کی ہوتی مگر بٹوک چند جی محظوظ ہوتے تھے، اس لیے نوکر شاہی کے سنہری اصول کے مطابق سبھی لوگ لطف اٹھاتے تھے، یعنی راجہ ہنسا تو سب ہنسے۔

اس صورت حال کے مطابق منھ میں بٹوک چند سے بھی زیادہ پان ٹھونسے ہوئے کوئی مصاحب دروازے سے داخل ہوتے ہی بٹوک چند کے چرنوں کی طرف لپکتا۔ راہ کی تمام رکاوٹوں سے نہ گھبرانے والا ویر بہادر کی طرح راستے میں پڑنے والی کرسیوں اور ان پر بیٹھے اونچے درجے کے لوگوں کو ہلاتا، جھنجھوڑتا، اس بڑی رکاوٹ کے سامنے پہنچ جاتا جسے میز کہتے ہیں اور جس کے پیچھے دو چرن کمل اپنی پوزیشن بدل بدل کر اسے اسی طرح اپنی طرف متوجہ کر رہے ہوتے ہیں جس طرح ہندی فلموں کی ہیروئن اپنے نیم عریاں جسم کی نمائش کر کے اسے ہیرو کی توجہ کا مرکز بنانا چاہتی ہے، اور ہیرو کی طرح وہ بھی ہیروئن کو حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔

Scanned with CamScanner

میز کے سامنے کھڑے ہو کر وہ کئی امکانات پر غور و فکر کرتا ہے۔ ایک خیال کے مطابق اسے میز پر چڑھ کر دوسری طرف کود جانا چاہیے اور قدموں کی دھول لیتے ہوئے واپس اسی عمل سے پھر گزرنا چاہیے۔ دوسرے خیال کے مطابق یوں ہو سکتا ہے کہ وہ جمناسٹک نام سے جانی جانے والے اس طریقے کا سہارا لے جس کے درشن زیادہ تر ہندوستانیوں کو ٹیلی وژن پر ہوتے رہتے ہیں اور جس میں تمام دوسرے کھیلوں کی طرح ہر اولمپک کے پہلے میڈل جیتنے کے منصوبے باندھے جاتے ہیں اور ہر اولمپک کے بعد ان منصوبوں کو بستۂ خاموشی میں باندھ کر رکھ دیا جاتا ہے تا کہ اگلے اولمپک میں پھر کھولنے پر یہ اسی طرح چمچماتے ہوئے نکلیں۔ یہاں پر اس راستے کو آزمانے والے کو ہندوستانی اور مغربی امتزاج کو مدنظر رکھتے ہوئے اس طرح کی کسرت کرنی پڑتی ہے کہ اس میں دونوں رنگ برقرار رہیں۔ وہ پہلے میز کے سامنے کھڑے ہو کر سامنے کی طرف جھکتا ہے اور ہاتھ اِدھر اُدھر پھینک کر پیر چھونے کی کوشش کرتا ہے۔ پیر چونکہ میز کے نیچے ہیں اور وہ بٹوک چند کے پان ٹھنسے منھ سے ''غوں... غوں...'' جیسی آوازوں کو ''بس ہو گیا... بس ہو گیا...'' جیسا کچھ ماننے سے انکار کر دیتا ہے، اس لیے اب وہ میز پر لیٹ کر سلیوٹ والی پوزیشن بناتے ہوئے ڈنڈوت کرنے لگتا ہے۔ ہوائی جہاز کی شکل میں لیٹا ہوا اس کا جسم دھیرے دھیرے غوطہ خوری کی شکل میں آ جاتا ہے۔ اس میں پچھلے دونوں پیر اوپر اٹھ جاتے ہیں اور دونوں ہاتھ اور سر نیچے جھک جاتے ہیں۔ اس پوری اٹھا پٹک کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسے وہ چرن مل جاتے ہیں جو کئی دنوں سے نہ بدلے جانے والے گندے نائلون کے موزوں میں لپٹے مرے ہوئے چوہے جیسی بدبو چھوڑتے جوتوں سے باہر آ چکے تھے اور اب جنھیں چھو کر کسی بھی چمچے کو اپنے آنے والے برسوں کی کامیابی کا پورا یقین ہو جاتا ہے۔

پیر چھونے کا ایک طریقہ اور بھی ہے۔ بٹوک چند کی میز کے داہنے، بائیں کرسیوں پر بیٹھے چمچوں نے میز اور دیوار کے بیچ دونوں طرف کا چپہ چپہ گھیر رکھا ہے۔ پر اپنے ارادے کا پکا اور آخری مقصد کا خواہش مند ان تمام قدغنوں کو توڑتا ہوا، سب کو دھکیلتا ہوا، پیروں کو کچلتا ہوا اور کمیشن ہی جن کی زندگی کا واحد مقصد ہو، ایسے افسروں کی خریدی کرسیوں کی مضبوطی کا امتحان لیتا ہوا، کہیں نہ کہیں سے راستہ نکال لیتا ہے اور بٹوک چند کے چھوئے جانے لائق پیروں تک پہنچ جاتا ہے۔

آج بھی آنے والے اپنی اپنی عقیدت کے مطابق ان تمام متبادلوں میں سے کسی ایک کا سہارا

Scanned with CamScanner

لیتے جارہے تھے۔ وہ آتے اور میز پر لگے ہوئے پکوریوں اور پانوں کے ڈھیر کے بیچ ایک دو لفافے اور رکھ دیتے، پھر پیر چھونے کا عمل شروع کرتے اور اس کے بعد اپنی منصب داری اور حیثیت کے مطابق کرسی لے لیتے۔ کرسیاں بھری ہوئی تھیں، اس لیے کئی بار انھیں ایک طرف کھڑا ہونا پڑتا۔ ایسے میں وہ باتیں کرتے کرتے کنکھیوں سے پورے کمرے کا جائزہ لیتے رہتے اور جیسے ہی کوئی کرسی خالی ہوتی، اس پر جھپٹ پڑتے۔ کسی بڑے منصب دار کے آنے پر چھوٹے منصب دار اپنی کرسی خالی کردیتے۔ بڑا منصب دار ہاتھ اور منھ کے اشاروں سے ''رہنے دو، رہنے دو،'' کہتا ہوا اس پر بیٹھ جاتا۔

''ہم بھی ہیں دربار کے،'' یہ ثابت کرنے کے لیے کچھ لوگوں نے منھ میں گنجائش سے زیادہ ہی پان ٹھونس لیے تھے۔ کمرے میں گھسنے کے بعد مالک کے تئیں وفاداری ظاہر کرنے کے لیے وہ لوگ میز پر پڑے پانوں میں سے دو ایک بیڑے اور منھ میں ڈال لیتے۔ پان کے چھینٹوں کی خوبصورتی سے پہلو میں بیٹھے لوگوں کو شرابور کرتے ہوئے، زبان اور ابلاغ کا ایسا حیرت انگیز رشتہ پیش کرتے جسے دیکھ سن کر بڑے سے بڑا ادیب بھی بغیر واہ واہ کیے نہ رہ سکے۔ ان کی زبان استعاراتی اور غیر استعاراتی آوازوں کے درمیان جھولتی رہتی۔ بغیر جملہ ادا کیے محض ان آوازوں کی بنیاد پر بہت کچھ کہہ ڈالتی۔ مثلاً کوئی ایک صاحب اپنی ٹھوڑی پر بہہ رہی پیک کو پونچھتا ہوا منھ پینتالیس ڈگری کے اینگل میں تھوڑا اوپر اٹھاتا ہوا کہتا:

''صا... غوں... غوں... اب آپ... غوں... غوں... غوں... اب... غوں ... ٹھیک ہو... غوں...''

بٹوک چند یا کمرے میں بیٹھے لوگوں کو سمجھنے میں دقت نہیں ہوتی کہ اس غوں... غوں... جملے کے پیچھے بولنے والے کی اس دفتر کی موجودہ حالت زار کے لیے فکر جھلک رہی ہے اور ساتھ ہی اس کو یہ اطمینان بھی ہے کہ اب اس دفتر کے سنہرے دور کا آغاز ہونے جارہا ہے۔ اس لیے پورا جملہ وہ سمجھ جاتے ہیں کہ ''صاحب، آپ آگئے ہیں، اب سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

اس کے جواب میں بٹوک چند بھی اپنا منھ تھوڑا اوپر اٹھاتے جس سے پیک کی پھوہار سیدھے سامنے والے کے منھ پر نہ پڑے بلکہ تھوڑی فضا میں چکر لگاتے ہوئے تمام حاضرین و سامعین کو بھگو سکے۔ پھر غوں... غوں... سے ملی جلی گفتگو جیسی کوئی چیز ان کے منھ سے بھی پھوٹتی... ''ہاں...

Scanned with CamScanner

غوں... غوں... آ گیا... اب غوں... غوں... ہو... غوں''...

ان آوازوں کی کڑیاں جوڑنے میں بھی سامعین کو کوئی زیادہ وقت نہیں ہوتی۔ وہ جملہ پورا کر لیتے ہیں ''ہاں، اب میں آ گیا ہوں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

لنچ تک جو سناٹا بابوؤں کے کمرے میں چھایا تھا، وہ لنچ شروع ہوتے ہوتے ٹوٹ گیا۔ ایک مرتبہ پھر بابوؤں نے کام کرنا شروع کر دیا۔ آج فرق صرف اتنا ہوا کہ کوئی بابو اس تین گھنٹے کے لنچ کے دوران دفتر سے دور نہیں گیا۔ چائے کی دکانوں پر بھی وہ زیادہ دیر نہیں ٹھہرے۔ ان کے لیے چائے سموسے یہیں آتے رہے۔ دلال آتے رہے، فرش پر پان کی پیک تھوکی جاتی رہی، 'فوری' یا 'اشد ضروری' کی مہر لگے کاغذ بتی بن کر ناک یا کان کھجلاتے رہے اور بابو لوگ ایک دوسرے کی ماں بہن کرتے رہے۔ غرض یہ کہ ابتدائی صدمے سے جانبر ہو کر دفتر میں پھر سے ضروری کام ہونے لگے۔

کوئی زور سے ہنستا تو بڑے بابو کنکھیوں سے دیکھنے لگتے۔ کوئی کھانستا کھنکھارتا تو بڑے بابو کا چشمہ ناک پر سرک آتا۔

مشکل کی اس گھڑی میں بڑے بابو کو اپنا پرانا وقت بڑی شدت سے یاد آتا رہا۔ پہلے کے بابو کتنی عزت کرتے تھے اپنے سے اونچے عہدیداروں کی۔ اسی سیٹ پر کبھی بابو بیٹھتے تھے، مجال تھی کہ کوئی بابو ان کی موجودگی میں اونچی آواز میں بول دے، ہنسنے کی بات تو دور رہی۔ آج مشکل گھڑی میں ان کا رواں رواں یہی دعا کر رہا تھا کہ سامنے بیٹھے بابو پھر سے پرانے بابو بن جائیں اور نظم وضبط نام کے لفظ کی اہمیت ان کے دلوں میں کچھ اس طرح بیٹھ جائے کہ وہ اقتدار کی منتقلی سے گھائل بڑے بابو کی طرف دیکھ کر آنکھ مٹکا نا یا ہوا میں فقرے اچھالنا بند کر دیں۔

صبح سویرے مانگی گئی دعاؤں اور تمناؤں کی طرح بڑے بابو کی یہ خواہشات بھی بیچ بیچ سازشوں کی چٹانوں سے ٹکرا کر ٹوٹتی جا رہی تھیں۔ بڑے بابو فائل میں سر گڑائے کوئی تصوراتی سنجیدہ حل اس مسئلے کا تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ زبان وادب اور جمالیاتی شعور سے بھرپور نمونہ ان کے کانوں سے ٹکراتا: ''خوب پادتا تھا سالا ہوا میں... اب ہوئی بتی بند۔''

بڑے بابو مسئلے میں اور گہرے ڈوب جاتے، پر ان کے نہ سن پانے کا بہانہ زیادہ دیر نہ چل پاتا۔ بابو لوگ پھس سے ایسے ہنستے کہ اور کہیں پہنچے نہ پہنچے، ہنسی بڑے بابو تک ضرور پہنچ جائے۔

Scanned with CamScanner

بڑے بابو چشمہ ناک پر سرکا کر چاروں طرف دیکھتے۔ تب تک ہنسنے والے بابوؤں کی فائلوں میں اچانک کچھ سنجیدہ قسم کے مسئلے پیدا ہو جاتے۔ وہ فائلوں میں آنکھیں گڑا لیتے۔ آنکھ کے اس لحاظ کو بڑے بابو اچھا مانتے ہیں، پر مشکل یہ ہے کہ بابو لوگ فائلوں میں آنکھیں ضرور گڑا لیتے ہیں مگر ان کے ہونٹوں پر خاص طرح کی مسکراہٹ تیرتی رہتی ہے۔

بابوؤں میں ہر دفتر میں دو گروپ ہوتے ہیں۔ یہاں بھی تھے۔ مطمئن گروپ میں وہ بابو تھے جنھیں کیمپ کلرک یا پری آڈٹ کلرک بننے کا موقع ملا تھا۔ انھی جگہوں پر وہ سب کچھ حاصل ہوتا تھا جسے بابوؤں کی زبان میں ترمال کہا جاتا ہے۔ اسسٹنٹ انجینئروں سے متعلق ٹیم کیمپ کلرکوں کو ہر پے منٹ میں ایک فیصد اور ڈویژنل اکاؤنٹنٹ سے جڑے پری آڈٹ کلرک کو آدھا فیصد ملتا ہے۔ باقی پورے دفتر میں ایک فیصد بنتا تھا، اس لیے فطری بات تھی کہ بابو لوگ کیمپ یا پری آڈٹ کلرک بننے کے لیے مار دھاڑ کرتے رہتے تھے۔ دوسرا گروپ غیر مطمئن لوگوں کا تھا جن میں وہ لوگ شامل تھے جنھیں سوکھی جگہ پر رکھا گیا تھا۔

بڑے بابو کو افسوس اس بات کا تھا کہ پھبتیاں کسنے والوں میں مطمئن گروپ کے لوگ بھی تھے، بلکہ وہی بڑھ چڑھ کر بول رہے تھے۔ اپنے کو موجودہ تبدیلی میں غیر جانبدار دکھانے کا یہ سب سے آسان طریقہ تھا جسے شاید بابوؤں نے ملک کے سیاستدانوں سے سیکھا تھا۔

وقفے وقفے سے لالہ بابو کو بڑے صاحب کے کمرے میں طلب کیا جاتا رہا۔ آج تو انھیں رشبھ چرن شکل بھی اپنے کمرے میں بلا لیتا تھا۔ بڑے بابو اداس چہرہ لیے جاتے اور حکم نوٹ کر کے واپس آجاتے۔ آکر وہ کسی بابو کو حکم پاس کر دیتے اور پھر فائل میں سر گڑا لیتے۔ انھیں پتا تھا کہ رشبھ چرن انھیں صرف بے عزت کرنے کے لیے اور دفتر میں اپنی حیثیت جتانے کے لیے جلا رہا تھا؛ پر افسر تو افسر ہے، وہ ہر بار بھاگتے ہوئے جاتے اور ڈانٹ کھا کر اپنے چہرے سے ذلت کے چھینٹے جھاڑتے چلے آتے۔ افسر کی انھوں نے ہمیشہ عزت کی ہے، اور شکلا تو اس بدلے ہوئے ماحول میں اونچی چیز ہو گیا تھا۔

ہر بار بڑے بابو جب اٹھ کر جاتے یا واپس لوٹتے، انھیں لگتا کہ بابوؤں کو کھنکھارنے کی بیماری آج کچھ زیادہ ہی ستا رہی ہے۔ کئی بار کسی بابو کو دیکھ کر انھیں دھوکا ہوتا کہ وہ کسی ٹوتھ پیسٹ کے

Scanned with CamScanner

اشتہاری کیلنڈر کو دیکھ رہے ہیں۔

بابو روز کی طرح چلا چلا کر باتیں کر رہے تھے، فحش مذاق کر رہے تھے، دلالوں سے جھگڑ رہے تھے اور قہقہوں کے ساتھ اس بات کو ثابت کرنے میں لگے تھے کہ اور کچھ ہو نہ ہو، اپنا ملک پھیپھڑوں کی طاقت کے معاملے میں کسی طرح کم نہیں تھا۔ بڑے بابو کی مشکل یہ تھی کہ انھیں ہر قہقہہ اور لطیفہ اپنے کو نشانہ بنا کر کیا گیا محسوس ہوتا تھا۔ چاروں طرف سے آنے والے شور وغل کی آوازیں ان کے کان تک پہنچتے پہنچتے اپنی آواز بدل دیتی تھیں اور بڑے بابو کے کان میں داخل ہوتیں تو کچھ اس طرح کا نشریاتی اثر مرتب کرتیں۔

''سالا کیسا بگلا بھگت بنا بیٹھا ہے۔ اب پتا چلے گا۔''

''چوٹے نے مجھے کیمپ کلرک لگوایا تو کیسا احسان جتایا تھا، سب سے بتاتا پھرتا تھا، پر یہ نہیں بتاتا تھا کہ روز شام کو جب سبزی کا جھولا مجھے تھما دیتا ہے، اس کے ساتھ پیسہ کبھی نہیں دیتا ہے۔ اب پتا چلے گا۔''

''خوب کملا کانت ورما کا گو اٹھاتا تھا، اب پتا چلے گا۔''

''اب پتا چلے گا'' کچھ کچھ اس طرح ہر جملے کے ساتھ چپاں ہو گیا تھا کہ لوگ بولیں چاہے کچھ، لالہ بابو کو شاستریہ سنگیت کی طرح اس کی ٹیک ہمیشہ ''اب پتا چلے گا'' پر ٹوٹتی سنائی دیتی۔ گھپلا تب ہوا جب کیشیئر بابو نے اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے پوچھا، ''لالہ بابو، مہاشوراتری گزیٹڈ ہالیڈے ہے یا رسٹرکٹڈ؟''

لالہ بابو کے کان تک جو جملہ پہنچا اس کی ٹیک ٹوٹی ''اب پتا چلے گا'' پر۔

اپنے مزاج کے خلاف لالہ بابو جھنجھلائے اور اپنے رویے کے برعکس انھوں نے تلخ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا، ''کیا پتا چلے گا؟ کسی بیے کی نوکری کرتے ہیں کیا؟''

کیشیئر بابو نے اچانک اس رویے پر گڑبڑا کر انھیں دیکھا۔ لالہ بابو کو بھی لگا کہ ان کی آواز غیر ضروری طور پر کچھ اونچی ہو گئی تھی۔ وہ تھوڑا ہچکچائے اور انھوں نے کیشیئر بابو کو پھر سے سوال دہرانے کو کہنے کی کوشش کی، پر اس کی ضرورت نہیں پڑی۔ دو آوازیں ایک ساتھ گونجیں۔

''بھیا ابھی تو پہلا دن ہے۔ صرف اونچا سنائی دینے لگا ہے... آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا!''

Scanned with CamScanner

''مہا شوراتری لوکل ہالیڈے ہے، کیشیئر بابو۔''

لالہ بابو کے سامنے پچھلی فائل کے کھلے ہوئے اوراق میں چھپی مشکل اور مشکل لگنے لگی۔ وہ تیرھویں بار اسے پڑھنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس مرتبہ بھی اس کے سارے الفاظ دھندلے لگ رہے تھے۔

بڑے صاحب کے چپراسی نے دفتر کے کمروں میں گھوم گھوم کر اطلاع دینی شروع کردی کہ شام کو ساڑھے چار بجے بڑے صاحب اپنے کمرے میں میٹنگ کریں گے۔ سارے افسران اور باقی سبھی کو اس میں شریک ہونا ہے۔

بابوؤں نے بھنبھنانا شروع کردیا۔ پانچ بجے کون سا وقت ہے میٹنگ کرنے کا۔ صبح دس بجے سے چائے سموسے کھاتے کھاتے، اپنے پھیپھڑوں کی طاقت کا مظاہرہ کرتے کرتے اور کاغذوں کو جہاز یا ناؤ بناتے بناتے بابو اس وقت تک بری طرح تھک جاتے تھے۔ سرکاری قواعد کے مطابق دفتر پانچ بجے تک ہوتا ہے، پر ہر سرکاری اصول کی طرح یہ اصول بھی توڑنے کے لیے بنا تھا۔ اس لیے چار بجے کے بعد بابوؤں کے جانے کا سلسلہ شروع ہوجاتا تھا۔ اپنی بیویوں سے اکتائے اور جھگڑا کرکے نکلے ہوئے بابوؤں کو اچانک گھر کسی سنہرے خواب کی طرح پکارنے لگتا۔

ہر نیا بڑا صاحب آنے کے بعد میٹنگ کرتا ہے۔ میٹنگ افسروں اور بابوؤں کو یہ بتانے کے لیے ہوتی ہے کہ انھوں نے بہت حرام خوری کرلی؛ اب چونکہ نئے صاحب تشریف لاچکے ہیں، اس لیے انھیں کام بھی کرنا پڑے گا۔ بولنے والا دفتر میں وقت کی پابندی، ایمانداری، فائلوں پر جلد از جلد کارروائی اور دفتر میں آنے والے عام لوگوں کے ساتھ اخلاق کے رویے پر زور دیتے تھے۔ مقرر اور سامعین کے درمیان اسی میٹنگ کے دوران ون ڈے کرکٹ میچ چلتا رہتا ہے۔ مقرر باؤنسر، گگلی اور یارکر کی جھڑی لگادیتا ہے۔ سامعین جانتے ہیں کہ سرکاری نوکری میں وکٹ تو گرتا ہی نہیں، اس لیے وہ وکٹ کی فکر چھوڑکر گیند بازی کے زبردست حملوں سے اپنا جسم بچانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ دراصل جو بھاری بھرکم امیدیں، تمنائیں مقرر اُن سے کرتا ہے، ان سے کچھ بنتا بگڑتا تو ہے نہیں، صرف کچھ دیر کے لیے سننے والوں کو وہ امیدیں اور تمنائیں تھوڑا غمگین کردیتی ہیں جو ان سے وابستہ کی جارہی ہوتی ہیں۔ پرانے گھاگھ سامعین کا دل بھی تھوڑی دیر کے لیے بے چین ہوجاتا ہے کہ وہ اب

تک وقت سے دفتر نہ آ کر، رشوت لے کر یا عوام کو دھتکارتے ہوئے، ضروری سرکاری کاغذوں پر رکھ کر سموسے اور پکوڑے کھا کر کتنا گھناؤنا جرم کر رہے تھے۔ بعض کمزور دل والے نوکر شاہی کے پرزوں کی تو آنکھیں بھی نم ہو جاتی ہیں۔ کبھی کبھی کسی مدراسی فلم کا منظر ابھر آتا ہے۔ ادھر مقرر نے دفتر میں آنے والے عوام سے افسروں اور بابوؤں کی بدسلوکی کا ذکر کیا کہ سامنے بیٹھے سننے والوں میں سے کچھ نے سسکیاں بھریں۔ مقرر کا جوش بڑھتا ہے اور وہ وقت سے دفتر آنے کی اہمیت والے سبجیکٹ کو نپٹانے لگتا ہے۔ سامنے بیٹھے سامعین میں سے کئی لوگوں کے منھ لٹک جاتے ہیں۔ کچھ بھولے قسم کے مقرر اتنے جوش میں آ جاتے ہیں کہ انھیں لگنے لگتا ہے کہ اب تک بہت ہوا، پر اب ان کی تقریر دفتر کو پٹری پر لا ہی دے گی۔ وہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ان کی قیادت کی ضرورت ان کے ڈپارٹمنٹ کو تھی، وہ مل گئی ہے اور اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ خیالات انھیں اور بولنے پر اکساتے ہیں اور وہ بولتے بولتے جھاگ پھینکنے لگے ہیں۔

سامعین میں سے زیادہ تر لوگ ایسے منظر ناموں سے اکتائے ہوئے حقیقت پسند مصوری کے نقادوں کی طرح اپنا دھیان مقرر کی تقریر سے زیادہ غیر متعلق موضوعات پر لگاتے رہتے ہیں۔ ادھر مقرر نے ایمانداری کی تان چھیڑی، ادھر بھنبھناہٹ شروع ہوئی: ''اب سالا کمیشن بڑھائے گا۔'' مقرر نے عوام کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی اپیل جاری کی کہ ایک بابو نے دوسرے کے کان میں، سنسکرت کے ڈراموں کے متھالوجیکل کہانیوں کی طرح جنھیں سامنے بیٹھے ناظرین بخوبی سن سکتے ہوں سرگوشی کی: ''بیٹا! اب جو ٹھیکیدار آئے، اس سے ہاتھ جوڑ کر کہنا: آیئے جیجا جی۔''

دنیا کو چند روزہ اور فانی ماننے والے رشی منیوں نے اگر کسی بڑے صاحب کی پہلی اسٹاف میٹنگ دیکھی ہوتی تو ان کی سمجھ میں آ جاتا کہ سب سے کم دیر تک ٹکنے والی چیز اس دنیا میں بڑے صاحب کی تقریر کا اثر ہے۔ باہر نکلتے نکلتے ماتحت اپنی فائل، قمیض یا چپل جس طرح جھاڑتے ہیں، اس سے اس بات کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا کہ بڑے صاحب کا کوئی ذرہ بھی ان سے چپکا رہ گیا ہو۔

ساڑھے چار بجتے بجتے بڑے صاحب، یعنی بنوک چند اُپادھیائے، کا کمرہ اسٹاف میٹنگ کے لیے تیار کر دیا گیا۔ کرسیاں جو آڑی ترچھی تھیں، انھیں طریقے سے لگا دیا گیا۔ چاپلوس ماتحتوں اور

Scanned with CamScanner

دلالوں نے پورے کمرے میں پان اور کچوری کے دونے پھینک رکھے تھے، انھیں چپراسی باہر پھینک آیا۔ کمرے میں کرسیاں کم تھیں اس لیے دفتر کے دوسرے کمروں سے ٹین، پلاسٹک، لکڑی، جس چیز کی بھی کرسیاں چار پیروں پر کھڑی تھیں، لاکر لگادی گئیں۔ دو یا تین پیروالی کرسیاں اس لیے چھوڑ دی گئیں کہ انھیں بیلنس کرنے کے لیے اینٹیں لانی پڑتیں اور چپراسی اس بیگار کے لیے پُر جوش نہیں تھے۔ سب سے پیچھے دو تین بنچیں لگادی گئیں۔ سب کچھ کسی پارسی تھیٹر کے ناٹک کی طرح رونما ہوا۔ ساڑھے چار بجتے بجتے بٹوک چند اُپادھیائے گمبھیر ہو گئے۔ ان کے درباری کمرے کو کسی میدانِ جنگ کی طرح درہم برہم کر کے چھوڑ گئے تھے۔ چپراسیوں نے کمرے کو ٹھیک ٹھاک کیا۔ بٹوک چند نے کمرے سے اٹیچڈ باتھ روم میں جا کر خوب کلی غرارے کیے، پان تھوکنے کی کوشش کی۔ فرق صرف اتنا آیا کہ ان کے گلے سڑے مسوڑھوں اور پیلے دانتوں کے علاوہ ہونٹوں کے کوروں تک سے یہ صدا آنے لگی کہ اس پورے غیر حساس علاقے میں پان ہی واحد حساس جز و تھا۔ منھ دھو کر بٹوک چند سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئے۔ انھوں نے قطعی فیصلہ کیا کہ وہ میٹنگ میں آنے والے ماتحتوں کے نمستے کا جواب نہیں دیں گے اور پوری میٹنگ کے دوران پان نہیں کھائیں گے۔ پہلے فیصلے پر تو وہ میٹنگ شروع ہونے سے لے کر اختتام تک جمے رہے، مگر دوسرا فیصلہ انھوں نے تقریر شروع کرنے سے پہلے ہی توڑ دیا۔ منھ دھو کر آنے کے بعد پانچ سات منٹ تک وہ خلا میں گھورتے رہے، کرسی پر چپکے کھٹملوں کو مارتے ہوئے یا سامنے رکھے ہوئے پرانے اخبار کی خبروں کو چاٹتے ہوئے پان کی طلب کو دبائے رکھنے کی کوشش کرتے رہے، مگر زیادہ دیر تک وہ اپنے حوصلے کو برقرار نہیں رکھ سکے۔ انھوں نے پان سے بھرا لفافہ اٹھایا اور واپس میز پر رکھ دیا، پھر لفافہ اٹھایا اور دو بیڑے نکال کر اپنے منھ میں ٹھونس لیے۔

پانچ بجتے ہی کمرہ دھیرے دھیرے بھرنے لگا۔ ماتحت اندر گھستے اور آنکھ یا سر ہلا کر سلیوٹ کرتے رہے۔ اپنے ارادے کے مطابق بٹوک چند نے کسی کو جواب نہیں دیا۔ وہ لگاتار خلا میں گھورتے رہے اور اپنے ماتحتوں کو یقین دلاتے رہے کہ بہت سے سنجیدہ مسائل ہیں جن پر ان کا فوری دھیان دینا ضروری ہے، سلام و نمستے جیسی حقیر باتوں میں وہ اپنا وقت ضائع نہیں کر سکتے۔ وہ خلا میں گھورتے رہے اور ان لوگوں کے نام اپنے ذہن میں درج کرتے رہے جو ان کی بے خودی کا فائدہ اٹھا

کر بغیر نمستے وغیرہ کیے بیٹھتے جا رہے تھے۔

دس پندرہ منٹ میں کمرہ پوری طرح بھر گیا۔ بٹوک چند نے خلا پر ٹکی اپنی نظریں لوگوں پر ڈالیں۔ کمرے میں دو ہندوستان تھے۔ ایک میں صاف ستھرے کپڑے پہنے، چکنے گالوں اور باہر کو نکلے پیٹوں والے افسر تھے جو بٹوک چند کے داہنے بائیں بیٹھے تھے۔ دوسرے ہندوستان میں بیٹھے بابو لوگ تھے، جن کی قمیضوں کے کالر گندے تھے، ٹھوڑیوں پر بالوں کے گچھے تھے اور جن کے پیٹ اور گال دونوں ہی پچکے ہوئے تھے۔

بٹوک چند نے داہنے، بائیں اور سامنے ہر طرف دیکھا۔ کچھ لوگوں نے ان کے شیریں دہن سے نکلے الفاظ نوٹ کرنے کے لیے قلم ہاتھوں میں لے کر ڈائری کے ورق کھول رکھے تھے۔ ایسے لوگوں کے چہروں کا معائنہ کرتے وقت ان کی نگاہوں میں کچھ چمک آئی۔ جو لوگ بغیر کاغذ قلم کے تھے، انھوں نے اپنی طرف اٹھتی نگاہوں میں ایک تپش سی محسوس کی۔ ان میں سے کچھ نے اپنے قلم نکال لیے اور ڈائری کی کمی پوری کرنے کے لیے اپنے ہاتھ کی فائل الٹی کر اس کے کور پر ہی تجریدی آرٹ کے نمونے بنانے لگے۔

بٹوک چند نے اپنی تقریر اسی طرح شروع کی جس طرح کوئی بڑا صاحب کرتا ہے؛ ماتحت اسی طرح جھیلنے لگے جس طرح کسی دفتر کے ماتحت جھیلتے ہیں۔

سب سے پہلے بٹوک چند نے بتایا کہ وہ اس دفتر کے لیے نئے نہیں ہیں۔ ''یہی تو رونا ہے!'' بڑے بابو نے سوچا۔ ''پچھلی بار بچ گئے تھے بچو، اس بار نہیں بچو گے،'' سکسینہ جونیئر انجینئر نے اپنے سامنے رکھے کاغذ پر چوہے دان اور چوہے کی تصویر ختم کرتے ہوئے نیچے کیپشن کے طور پر لکھا۔

پھر بٹوک چند نے ڈپلومیسی کی زبان استعمال کرتے ہوئے چاشنی بھرے لفظوں میں یہ بتانے کی کوشش کی کہ وہ یہاں پر تعینات سبھی افسروں اور دیگر لوگوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ سامعین نے ہوا میں تیرتی سریلی مٹھاس بغیر وقت ضائع کیے ذہن سے کھرچ ڈالی، جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ وہ یہاں موجود سارے بدمعاشوں کی نس نس سے واقف ہیں اور انھیں بھولا سمجھنے کی بھول نہ کی جائے۔

اس کے بعد وہ اس موضوع پر آ گئے جو ہندوستانی نوکر شاہی میں اپنے ماتحتوں کو بھاشن دینے

Scanned with CamScanner

کے لیے سب سے کارآمد مانا جاتا ہے۔ انھوں نے ''زندگی میں ایمانداری کی افادیت اور اہمیت'' جیسے موضوع پر بولنا شروع کیا اور تب تک بولتے چلے گئے جب تک انھیں یہ احساس نہیں ہو گیا کہ اچانک ان کے سامنے بیٹھے سامعین کے بیچ کھانسنے، کھنکھارنے یا جسم کے مختلف حصوں سے مختلف قسم کی آوازیں آنے کا مقابلہ شروع ہو گیا ہے۔ یہ صورت حال جان بوجھ کر پیدا کی گئی تھی یا دیر تک ایک ہی پوزیشن میں بیٹھے رہنے کا نتیجہ تھی، یہ جاننے کے لیے ان کی بے چین آنکھیں کمرے کا جائزہ لینے لگیں۔ جس حصے پر ان کی نگاہیں پڑتیں، وہاں سناٹا چھا جاتا تھا مگر دوسرے حصے میں پہنچتے ہی پہلی طرف سے پھر سے آوازیں اپنی ترنگ ہوا میں بکھیرنے لگتیں۔

اس کے بعد بٹوک چند نے جلدی جلدی وقت کی پابندی پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے بتایا کہ سرکار نے بہت سوچ بچار کرنے کے بعد دفتروں کے کھلنے کا وقت دس بجے مقرر کیا ہے۔ یہ وقت انگریز جیسی عقلمند قوم نے طے کیا تھا اور اسی لیے اس کے راج میں سورج کبھی نہیں ڈوبتا تھا۔ چونکہ عام آدمی کو بھی یہ وقت معلوم ہو گیا ہے، اس لیے وہ ٹھیک دس بجے دفتر آجاتے ہیں، اور اسی لیے افسروں اور بابوؤں کو بھی ٹھیک دس بجے دفتر پہنچ جانا چاہیے۔ ان لوگوں کو نہ صرف وقت پر دفتر آنا چاہیے بلکہ وہاں بیٹھ کر کام بھی کرنا چاہیے۔ پھر انھوں نے دن بھر چائے پینے اور سموسے کھانے سے ہونے والے نقصانات پر بھی روشنی ڈالی۔ دوسرے تمام صلاح مشوروں کی طرح اس مشورے کو بھی سننے والوں نے سنجیدگی سے لیا اور ان کے لٹکے چہروں نے مقرر کو مطمئن کر دیا کہ دوسرے دن سے اس دفتر میں لوگ وقت سے آئیں گے، اور نہ صرف وقت سے آئیں گے بلکہ وہاں بیٹھ کر کام بھی کریں گے۔ اس کے علاوہ وہ دفتر میں آکر وہ جو کچھ کریں، کم سے کم سموسے نہیں کھائیں گے۔

اور بھی بہت سے موضوعات تھے جن پر دیر تک اور تفصیل سے بٹوک چند بولنا چاہتے تھے۔ وہ بولتے بھی، مگر انھیں لگا کہ اچانک کمرہ شاستریہ سنگیت کے اسٹیج میں تبدیل ہو گیا ہے۔ ولمبت اور دُرت دونوں میں ناک، گلے اور جسم کے روئیں روئیں سے اتنی آوازیں نکلنے لگیں کہ ان کے جیسے گھاگھ آدمی کے لیے بھی یہ سمجھنا مشکل ہو گیا کہ اس میں کتنا فطری ہے اور کتنا جان بوجھ کر یہ کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ دن بھر سموسے پکوڑے کھاتے رہنے سے پیدا شدہ ہواؤں کی زد میں پورا ماحول تھا، اور یہ ہوائیں پوری دھما کاخیزی کے ساتھ گھوم رہی تھیں۔ بٹوک چند نے کئی بار سوچا کہ یہ ساری تقریر بند

Scanned with CamScanner

کر کے وہ اب صرف ماحول کی آلودگی پر لیکچر دیں اور ''صحت مند جسم میں صحت مند دماغ'' پر ہی سامعین کی معلومات میں اضافہ کریں، مگر یہ موضوع ان کے سرکاری فرائض کی فہرست میں شامل نہیں تھا، اس لیے انھوں نے اپنے اوپر قابو رکھا اور اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنی تقریر کا اختتام کچھ یوں کیا کہ اب وہ آگئے ہیں، اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔

تقریر ختم ہوتے ہی زیادہ تر سننے والے نکل بھاگے۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے کسی کانجی ہاؤس کا گیٹ ٹوٹ گیا ہو اور کئی دن سے اس میں بند بھوکے پیاسے جانوروں کو اچانک آزادی اور ہری گھاس دکھائی دینے لگی ہو۔ بابو لوگ اس قدر تھک چکے تھے کہ اپنی عادت کے خلاف، اپنا روٹین بھول کر، بغیر کسی کو گالی دیے، بغیر اونچی آواز میں بولے، بغیر قہقہے لگائے، بس دفتر کے گیٹ سے کسی نہ کسی طرح باہر نکل گئے۔ انھیں ڈر لگ رہا تھا کہ بڑے صاحب کا چپراسی انھیں ایک بار پھر اندر نہ بلالے اور ایک بار پھر تقریر کا سلسلہ شروع نہ ہو جائے۔ وہ اپنی سائیکلوں، اسکوٹروں، رکشوں، پیروں، غرض یہ کہ جو بھی سواری ملی اس پر بھاگ نکلے۔

دفتر بند ہونے کا وقت ہو گیا۔ دفتر میں تالا لگانے کے لیے باہر چوکیدار اونگھتے ہوئے اُن چاپلوس مصاحبوں کے جانے کا انتظار کر رہا تھا جو میٹنگ ختم ہونے کے بعد ایک بار پھر بڑے صاحب کو گھیرے ہوئے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس مرتبہ سبھی کھڑے تھے اور دن کی رہی سہی کسر پوری کر رہے تھے۔ نہ جانے کہاں سے جادو کی طرح ان کے ہاتھوں میں پان کے بِیڑے اُگ آئے تھے جن میں سے نکال نکال کر پان وہ وقفے وقفے سے بڑے صاحب کو پیش کرتے جا رہے تھے جنھیں بٹوک چند اپنے پھیلے سے پھولے ہوئے گالوں میں ٹھونستے جا رہے تھے۔ خاص طور سے وہ لوگ جو صبح چوک گئے تھے یا جنھیں اندیشہ تھا کہ ان کا سلام پوری طرح قبول نہیں ہوا ہے، وہ بڑھ بڑھ کر اپنی وفاداریوں کی علامت کے طور پر پان پیش کرتے جا رہے تھے۔

Scanned with CamScanner

کملا کانت ورما جس بڑے دفتر کے ہال نما کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے، اس کے برآمدوں اور دروازوں پر ایک جملہ موٹے موٹے الفاظ میں لکھا تھا: ''براہ کرم تبادلوں کے بارے میں بات نہ کریں۔'' وہاں موجود ہر شخص صرف تبادلوں کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ کسی کو کسی کا تبادلہ کروانا تھا اور کسی کو کسی کا رکوانا تھا۔ اس کمرے میں کھچاکھچ لوگ بھرے تھے اور سامنے ایک گھومتی ہوئی کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص کو ایک ساتھ مخاطب کر رہے تھے۔ سامنے والا شخص اپنے چہرے پر گہری مسکراہٹ لیے صبر وضبط اور ہمدردی کی ایسی تصویر بنا بیٹھا تھا جیسے انسان کے روپ میں بھگوان ہو۔ ایک ساتھ کئی لوگوں کی باتیں سن رہا تھا، بیچ بیچ میں انھیں ہنسا رہا تھا اور خود بھی قہقہے لگا رہا تھا۔ وہ ایک ساتھ کئی لوگوں کی درخواستیں پکڑتا، ان پر کچھ لکھتا اور اپنے پی اے کو پکڑا دیتا۔ تقریباً سبھی کو ایک جملہ سننے کو ملتا:

''ہو جائے گا... لکھ دیا ہے... آپ گھر جائیے۔ آرڈر پہنچ جائے گا۔''

کاغذ کے پی اے کے ہاتھوں میں پہنچتے ہی کاغذ دینے والے پی اے کے پاس لپکتے۔ پی اے کے ہاتھ اور ہونٹ ساتھ ساتھ چل رہے ہوتے۔ وہ ہاتھوں کے کاغذوں کو تہہ لگا کر ایک فائل میں لگاتا جاتا اور اس کے ہونٹ جو کچھ بدبداتے رہتے، اس کا مطلب یہ نکالا جا سکتا ہے کہ اب تو صاحب نے لکھ دیا ہے، اب گھر جا کر موج کرو، آرڈر خود ہی پہنچ جائے گا؛ پر درخواست دینے والے جانتے تھے کہ آرڈر ایسے نہیں پہنچتا، وہ پہلے بھی ایسے جملے سن چکے تھے، اس لیے وہ وہیں منڈلاتے رہتے۔

کملا کانت یہی منظر کئی بار دیکھ چکے تھے۔ وہ سارے شور شرابے سے بے خبر، صرف ایک ہی مقصد کو لے کر پہلو بدل رہے تھے۔ وہ کسی طرح ایسی جگہ پر بیٹھنا چاہتے تھے جہاں سے گھومنے والی کرسی کے اتنے قریب پہنچ سکیں کہ ان کا مخاطب فوراً ان کی دسترس میں ہو۔ کرسی دوڑ کے اصول کے

Scanned with CamScanner

مطابق جیسے ہی کوئی کرسی آگے خالی ہوتی، اس پر وہ جھپٹ پڑتے۔ اس دوڑ میں ان کے علاوہ بھی کئی لوگ تھے، اس لیے احتیاط برتنی پڑ رہی تھی۔ کوئی اپنی درخواست ہاتھ میں لے کر کھڑا ہوتا کہ یہ لوگ فوراً ہوشیار ہو جاتے۔ جیسے ہی اس کا ایک قدم آگے بڑھتا، پیچھے سے کوئی جھپٹ کر اس کی کرسی ہتھیا لیتا۔ ایک آدھ مرتبہ تو ایسا بھی ہوا کہ درخواست دہندہ گھومتی کرسی کو مصروف دیکھ کر واپس اپنی کرسی بیٹھا تو اس نے اپنے کو کسی کی گود میں پایا۔

پرانی کہاوت ہے کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ کملا کانت پوری طرح اس پر یقین رکھتے تھے اور انھیں بھی تین گھنٹے کے صبر کا میٹھا پھل ملنے والا تھا کہ کمرے میں ہنگامہ ہو گیا۔

ہوا کچھ ایسے کہ گھومنے والی کرسی کے سامنے دو کاغذ ایک ساتھ پہنچے۔ اس نے دونوں پر لکھ دیا کہ آرڈر جاری کر دیے جائیں، پر اچانک ایک کاغذ والے کی نگاہیں دوسرے کاغذ پر پڑ گئیں۔ یہ تو شور و غل سے معلوم ہوا کہ ایک کاغذ کسی کو کسی جگہ پر ایک سال اور رکھنے سے متعلق تھا اور دوسرا اسی جگہ پر تعینات شخص کو ہٹا کر دوسرے کو وہاں تعینات کرنے کی سفارش تھی۔ پہلے کاغذ کے ساتھ دو لوگ تھے اور دوسرے کے ساتھ تین۔ ان پانچ لوگوں نے ایک ساتھ زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔ ایک بار تو کمرے میں بیٹھے لوگ سہم کر چپ ہو گئے اور گھومنے والی کرسی کے چہرے سے بھی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

گھومنے والی کرسی نے سمجھانے کی کوشش کی کہ دونوں اپنے ہیں، چلو دونوں کو وہیں رکھ دیتے ہیں۔

ایک لمحے کو لگا کہ معاملہ سلجھ گیا ہے۔ دونوں گروپوں کی آوازیں دھیمی پڑ گئیں۔ پھر یکایک اس گروپ کو جو پہلے سے اس جگہ قابض تھا جس کے لیے جھگڑا ہو رہا تھا، یہ احساس ہوا کہ اسے اس کماؤ جگہ پر کسی دوسرے سے حصے داری کرنی پڑے گی۔ اس گروپ کے تین لوگ تھے۔ انھوں نے اپنی آنکھ، کان، ناک جیسے اعضا کا کشادہ دلی کے ساتھ استعمال کیا اور کمرہ پھر ایک دم چل پوں سے بھر گیا۔ دوسرا گروپ جس میں دو لوگ تھے اور جس نے احسان کرنے کے انداز میں، کہ چلیے آپ نے کہا تو مان لیتے ہیں، اپنی آواز دھیمی کر لی تھی، فوراً چوکنا ہو گیا۔ اس نے اپنے ملک کے اس پارلیمانی نظام سے متاثر ایک ایسے حل کو تلاش کر لیا جس کے مطابق اگر آپ کے پھیپھڑوں میں طاقت

Scanned with CamScanner

ہے تو آپ کوئی بھی سیاہ وسفید کر سکتے ہیں۔ اس گروپ کے دونوں جنگجوؤں کے پھیپھڑے کچھ زیادہ ہی مضبوط تھے، اس لیے دوسرے گروپ کے ان سے بھی بڑے جنگجو جب چلاتے چلاتے کھانسنے کھنکھارنے لگے، تب بھی وہ چلاتے رہے، اور تب تک چلاتے رہے جب تک گھومنے والی کرسی پر بیٹھے محترم، جنھیں لوگ منتری جی کے لقب سے مخاطب کر رہے تھے، اچانک اپنی کرسی سے اٹھ کر اندر کی طرف نہیں کھسک گئے۔

منتری جی کے اندر لپکنے کی وجہ بظاہر کسی فوری اندیشے کا حل نکالنا تھا مگر جب وہ کافی دیر تک باہر نہیں آئے، تب لوگوں کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ چاہتے تھے کہ مسئلہ اپنا حل خود تلاش کر لے۔ یہ وہ نایاب نسخہ تھا جس کے بل پر ہمارے ملک کے بعض اونچے طبقے والے لوگ سالہا سال سرکاریں چلاتے ہیں۔ کسی مسئلے کے پیدا ہونے پر شتر مرغ کی طرح گردن ریت میں گڑا لینے سے کچھ وقت کے بعد مسئلہ خود ہی اپنا حل تلاش کر لیتا ہے۔ مگر یہاں یہ نسخہ نہیں چلا اور منتری جی کو باہر نکلنا پڑا۔

ہوا کچھ ایسے کہ دونوں گروپ کا بحث مباحثہ اس نقطۂ عروج پر پہنچ گیا جہاں پہنچنے کی امید ایسے موقعوں پر کی جا سکتی ہے۔

اس گروپ نے جو کماؤ جگہ پر بیٹھا تھا، اچانک یہ اعلان کر دیا کہ اگر اسے اس جگہ سے ہٹایا گیا تو وہ اس کی برادری کے جو ہزاروں لاکھوں ووٹرز تھے، وہ چپ نہیں بیٹھیں گے اور آنے والے انتخابات میں منتری جی کو اس بے انصافی کا سبق ضرور سکھائیں گے۔

دوسرے گروپ نے اس سے بھی اونچی آواز میں اعلان کیا کہ بہت ہو چکی لوٹ۔ آخر کوئی حد ہوتی ہے۔ ایک ہی آدمی کیوں اس جگہ پر رہے؟ اگر فوراً وہاں ان کے آدمی کو نہیں رکھا گیا تو ان چوبیس گاؤوں میں منتری جی کا گھسنا محال ہو جائے گا جہاں ان کی برادری کی اکثریت ہے۔

کمرے میں بیٹھے ہر آدمی کو لگا، معاملہ گمبھیر ہے اور اپنی قومی عادت کے مطابق لوگ بیچ بچاؤ کرنے لگے۔

ایک تجویز یہ آئی کہ دونوں کو وہیں رکھ دیا جائے اور کرسی کا علاقہ وار بٹوارا کر دیا جائے۔ ایک آدمی لوٹ کر داہنا علاقہ چرے، دوسرا بایاں۔ اس تجویز کو پہلے سے تعینات والے گروپ نے ٹھکرا دیا۔

Scanned with CamScanner

دوسری تجویز آئی کہ چھ مہینے تک ابھی پہلے سے تقرر والے گروپ کو رہنے دیا جائے، بیچارے کو کئی لڑکیوں کی شادی کرنی ہے۔ اسے دوسرے گروپ نے نامنظور کر دیا— اسے بھی تو بال بچے پالنے تھے۔

یہ سلسلہ کافی دیر تک چلتا رہا۔ تجویزیں آتی گئیں اور نامنظور ہوتی گئیں۔ منتری جی آنے والے حالات کے اندیشوں میں گھرے کوئی حل تلاش کرنے کی کوشش میں چھپے رہے۔ لوگ کرسیوں پر پسر گئے۔ پی اے نے آنے والی انتخابی مہم میں کارآمد ثابت ہونے والے لوگوں کے لیے چائے منگادی۔ چائے دوسروں نے ہڑپ لی اور کارآمد لوگوں کے لیے اور چائے آ گئی۔ کچھ لوگ باہر گئے اور ان کی جگہ پر دوسرے لوگ آ گئے۔ سب کچھ اسی طرح چل رہا تھا جس طرح راج کاج میں چلنا چاہیے۔

کملا کانت اس طرح کی صورت حال کئی مرتبہ جھیل چکے تھے۔ ابھی نہیں معلوم کتنی دیر یہ چلے گا۔ انھوں نے سوچا، جھپکی لے لیں۔ وہ نہ جانے کتنی دیر تک سوئے کہ سپنا دیکھنے لگے۔ سپنے میں انھوں نے دیکھا کہ جس کمرے میں وہ بیٹھے تھے، وہ ایکا یک میدانِ جنگ میں تبدیل ہو گیا ہے۔ لوگ بحث کرنے کے لیے صرف منھ کا نہیں بلکہ ہاتھ پیروں کا بھی استعمال کرنے لگے ہیں۔ کوئی کسی کے خاندان کی خواتین کے بارے میں قصیدے پڑھ رہا ہے تو کوئی دوسرے کے جسم پر کرسیاں پٹک کر توڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میدان جنگ کے ایک بانکے کو جب کوئی کرسی نہیں ملی تو اس نے کملا کانت کی کرسی ہلانے کی کوشش کی۔ کملا کانت نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں تو معلوم ہوا کہ وہ کوئی خواب نہیں دیکھ رہے ہیں بلکہ کمرہ واقعی اس دھماچوکڑی کی وجہ سے اپنی اصل سیٹنگ کھو چکا تھا۔ ہر شے درہم برہم تھی، لنگڑی ہوئی کرسیاں ایک دوسرے کا منھ دیکھ رہی تھیں۔

ہوا کچھ ایسے کہ دونوں جانب کے بحث مباحثے سے اکتا کر کچھ لوگوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ انھوں نے بھی اعلان کر دیا کہ منتری جی پر انھی دونوں گروپوں کا حق نہیں بنتا ہے، انھوں نے بھی انتخابات میں منتری جی کے پسینے پر اپنا خون بہایا ہے، اس لیے اگر ان دونوں سے متعلق آج کوئی نتیجہ خیز صورت حال سامنے نہیں آتی ہے تو دونوں جانب کے لوگ انتظار کریں اور بیٹھیں۔ دوسرے لوگوں کے کاغذ پر آرڈر ہو جانے تک منتری جی ان لوگوں کا بھی بھلا کر دیں گے۔

Scanned with CamScanner

ایسے موقعوں پر جو ہو سکتا تھا وہی ہوا۔ دونوں جانب کے جنگجوؤں میں صلح ہوگئی اور انھوں نے دوسرے لوگوں کے خلاف محاذ کھول دیا۔ ان میں سے ایک گروپ پچھلے سات دن سے راجدھانی میں پڑا تھا اور اسے اب جا کے منتری جی سے ملنے کا موقع ملا تھا۔ دوسرا دس دن سے زیادہ دھول پھانکنے کے بعد یہاں تک پہنچا تھا۔ یہ بات دوسری ہے کہ یہ دھول اس گروپ نے شہر کے سب سے عالیشان ہوٹل میں پھانکی تھی۔ اس گروپ کے ایک شخص کو چھوڑ کر، جس کی جیب سے اس دھول کا بل ادا ہو رہا تھا، باقی دونوں جانب کے لوگوں کو کوئی خاص فکر لاحق نہیں تھی کہ یہ معاملہ اگلے کچھ دن تک اور کھنچ جائے، پر ان دونوں کے کمزور پڑتے ہی بل والا انھیں کچھ ایسی چیزیں یاد دلا دیتا جس سے ان کی آوازیں پھر تیز ہو جاتیں۔ دونوں گروپ اڑ گئے کہ پہلے ان کا فیصلہ ہو جائے۔ دوسروں کا اتفاق اس پر تھا کہ یہ دونوں چپ چاپ بیٹھ جائیں اور پہلے اور سب کا کام ہو جائے، تب ان کی بات سنی جائے۔

منتری جی رات کو دورے پر جانے والے تھے اور پھر اگلے کچھ دنوں تک ان کے درشن نہیں ہوتے، اس لیے کوئی بھی اپنے معاملے کو بعد کے لیے نہیں ٹالنا چاہتا تھا۔ بحث کا خاتمہ اس جنگ کے بعد ہو سکتا تھا، اور یہی ہوا۔

مگر اس جنگ کا ایک فائدہ بھی ہوا۔ کملا کانت نے جب آنکھیں کھولیں تو منتری جی اپنے اندیشوں اور ڈر سے نکل کر کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔

منتری جی کے کمرے میں داخل ہوتے ہی نہ جانے کہاں سے ان کا چپراسی، شیڈو وغیرہ بھی آ موجود ہوئے۔ انھوں نے کرسیاں ٹھیک کر دیں۔ لوگ پھر ان پر بیٹھ گئے اور ان کے ہاتھوں میں پھر کاغذ لہرانے لگے۔

کملا کانت نے ایسی کرسی ہتھیالی جس پر بیٹھا آدمی ہاتھ میں اپنا کاغذ لے کر کھڑا ہو گیا تھا اور یہ منتری جی کے ٹھیک پہلو میں تھی۔ کھڑے آدمی کو لگا کہ ابھی نمبر دیر میں آئے گا، اس لیے وہ واپس کرسی پر بیٹھ گیا؛ کرسی پر کیا، کملا کانت کی گود میں بیٹھ گیا۔ وہ کچھ دیر اس امید میں بڑبڑاتا رہا کہ کملا کانت کرسی چھوڑ کر اٹھ جائیں گے، پر بے شرمی کی اس لڑائی میں کملا کانت جیت گئے۔ وہ آدمی اٹھ کر میز پر پوری طرح جھک گیا اور تب تک کھڑا رہا جب تک اس کا کاغذ منتری جی کے ہاتھ سے پی اے تک نہیں چلا گیا۔ پھر وہ پی اے کی طرف چلا گیا۔

اس درمیان دونوں جنگی بیڑے پھر سے اپنے پرانے اعلانات دہرانے لگے جن کے مطابق پچھلے انتخابات میں انھوں نے منتری جی کے لیے اپنا خون پسینہ ایک کر دیا تھا، پر اس مرتبہ لگتا ہے منتری جی ان کے علاقے میں نہیں گھس پائیں گے۔ ٹھیک ہے، اب ملاقات الیکشن میں ہوگی۔ انھوں نے بار بار باہر جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو، مگر اپنی کرسی پر جمے بیٹھے رہے۔

منتری جی دوسروں کے کاغذات پر دستخط کرتے رہے اور دونوں جنگجو گروپوں کو ہنسانے کے لیے لطیفے سناتے رہے جس پر ان کے پی اے اور چپراسی تو خوب ہنسے مگر لڑنے والوں نے ہنسنے سے انکار کر دیا۔ آخر میں منتری جی نے اپنے پی اے کے کان میں کچھ کہا، رہنماؤں نے اپنے پیروکاروں کے کانوں میں کچھ کہا، پیروکاروں نے اپنے ساتھ آنے والوں کے کانوں میں کچھ کہا، پھر دونوں گروپوں کے ایک ایک آدمی نے منتری کے کان میں کچھ کہا اور پھر منتری نے اپنے پی اے کے کان میں کچھ کہا۔ کافی دیر تک وہ صورت حال جاری رہی جسے زبان کے استاد کانا پھوسی کہتے ہیں۔ اس دوران لوگ اپنے کاغذ بھی بڑھاتے رہے اور منتری جی ان درخواستوں پر دستخط بھی کرتے رہے۔ ایک آدھ بار ایسا بھی ہوا کہ کانا پھوسی کرتے ہوئے منتری جی نے درخواست دہندہ کے ہاتھ پر دستخط کر دیے۔ پھر دونوں ہنس دیے اور منتری جی نے اس کے کاغذ پر بھی دستخط کر دیے۔

کانا پھوسی ہمارے ملک کی قومی روایت ہے۔ پارلیمنٹ سے لے کر ڈپلومیسی تک اس کی خوبصورتی دکھائی دیتی ہے۔ کانا پھوسی شروع ہوئی اور کملا کانت نے اطمینان کا سانس لیا۔ انھیں لگا کہ اب معاملہ طے ہو گیا ہے اور انھیں کچھ کہنے کا موقع مل جائے گا۔ معاملہ سچ مچ طے ہونے کے کگار پر تھا۔ منتری کا پی اے دونوں گروپ کے لوگوں کو اندر ایک کمرے میں لے کر چلا گیا۔

کملا کانت کچھ مایوس ہو گئے۔ دراصل اندر کے کمرے میں وہ جانا چاہتے تھے۔ اندر کا کمرہ چھوٹا تھا، پر بڑے فیصلے وہیں ہوتے تھے۔

منتری جی تیزی سے کاغذوں کا نپٹارا کرنے لگے۔ کملا کانت سمجھ گئے کہ وہ اب اندر کمرے میں جانے کے لیے اٹھیں گے۔ وقت کم تھا اور ''مت چوکو چوہان'' کی طرز پر انھوں نے کچھ تیر چھوڑے۔ یہ تیر منھ، انگلیوں اور آنکھوں کی مدد سے کچھ اس طرح چھوڑے گئے کہ وہ تجریدی آرٹ کے نقادوں کے لیے ایک پُراسرار نیا ماڈل پیش کر سکتے تھے۔ تھوڑا کہنا، زیادہ سمجھنا اور کئی بار منھ سے

Scanned with CamScanner

کچھ نہ کہنا، صرف آنکھوں اور انگلیوں سے مطلب ادا کر دینا۔ منتری جی اور کملا کانت کے درمیان جو گفتگو ہوئی اگر اس کی تعریف ممکن ہے تو اسی طرح کی جائے گی۔ ایک دوسرے سے ڈیڑھ فٹ کے فاصلے پر بیٹھے دونوں فریقوں کی بات چیت کچھ اس طرح تھی:

کملا کانت نے کاغذوں پر دستخط کرتے ہوئے منتری جی کو کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے جو کچھ دیواروں سے کہا، اس کا مطلب سمجھنے والوں کے لیے صاف تھا، کہ خادم آپ سے الگ نہیں ہے۔ جیسا حکم دیں گے، تعمیل ہوگی۔

منتری جی نے سامنے پڑے کاغذ پر آرڈر کچھ زیادہ لمبا لکھا اور وہی تاثر قائم رکھا جو کملا کانت کے کمرے میں داخلے اور ان کی موجودگی کو نظر انداز کرنے والا تھا۔ انھوں نے قلم چلاتے چلاتے ہوا میں نہ جانے کسے مخاطب کیا کہ پچھلے انتخابات میں اطلاع دینے کے باوجود لوگ دکھائی نہیں دیے اور اب درشن دے رہے ہیں۔

کملا کانت نے کچھ نامعلوم دشمنوں کو کوسا جنھوں نے بار بار کوشش کے باوجود انھیں منتری جی سے ملنے نہیں دیا تھا اور منتری جی کی سیوا کی بے پناہ خواہش اپنے دل میں لیے ہوئے ہر بار انھیں واپس لوٹنا پڑا تھا۔

کملا کانت نے انڈین ریلویز اور روڈ ویز کے ٹائم ٹیبلوں کو پڑھنا شروع کر دیا۔ انھوں نے بتایا کہ فلاں دن جب فلاں ٹرین سے وہ منتری جی کی کوٹھی کے لیے روانہ ہوئے تو ٹرین اپنی عادت کے مطابق کتنے گھنٹے لیٹ تھی اور ان کے پہنچنے کے بس تین منٹ پہلے منتری جی اپنی کوٹھی سے انتخابی مہم والے علاقے کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ منتری جی کے چہرے پر کوئی تاثر نہ دیکھ کر انھوں نے پھر بتانا شروع کیا کہ فلاں تاریخ فلاں شخص کے ساتھ وہ روڈ ویز کی بس سے وقت پر گھر سے روانہ ہوئے لیکن جیسا کہ منتری جی جانتے ہیں کہ روڈ ویز کی کوئی بس راستے میں بغیر مسافروں کے دھکا لگائے اپنی منزل پر نہیں پہنچتی، یہ بس بھی راستے میں ایک بار پنکچر ہوئی، ایک بار اس کا بریک فیل ہوا اور ایک بار ایسی پوزیشن میں پہنچ گئی جسے منتری جی چاہیں تو الٹنا کہہ سکتے ہیں۔ ان مراحل سے گزر کر جب وہ ان کی کوٹھی پر پہنچے تو وہ صرف چار منٹ پہلے ہوائی اڈے کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔

اس غم بھری داستان کی تفصیلات کے باوجود ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اگلے کاغذ پر اور لمبا

Scanned with CamScanner

آرڈر لکھنے لگے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ زبان کے سخت الجھاؤ میں ڈوبے ہوئے تھے اور ایک بار بھی سر اٹھا کر کملا کانت کی طرف دیکھا تو ان کی زبان وادب کا ستیاناس ہو جائے گا۔

کرسی پر منتری جی کے پچھلے حصے نے کچھ ایسی حرکتیں کیں کہ کملا کانت سمجھ گئے کہ شاید اب وہ اٹھنے ہی والے ہیں۔ کمرے میں موجود لوگوں میں بھی ہل چل مچ گئی۔ وہ سارے گھومنے والی کرسی کے اردگرد کھڑے ہو گئے۔

وقت کم تھا۔ کملا کانت نے اب منھ کے ساتھ ہاتھوں اور انگلیوں کا بھی استعمال کرنا شروع کر دیا۔ ابلاغ کا یہ طریقہ زبان کی حدوں کو توڑنے کے لیے ہوتا ہے۔ ادب میں ابھی تک اس کا استعمال نہیں ہو سکا ہے، اس لیے بار بار ابلاغ کے مسئلے کی بات ہوتی رہتی ہے۔

کملا کانت نے کہنیاں مضبوطی کے ساتھ منتری جی کے سامنے میز پر ٹکائیں۔ اپنے منھ کو گول گول گھمایا، آنکھوں میں خاص طرح کی چمک پیدا کی اور اپنی انگلیوں کو ایک دوسری پر اس طرح رگڑا کہ اس سے سکّوں کے کھنکنے کی یاد آنے لگی۔ ان ساری علامتوں کے ساتھ انھوں نے زبان وادب کا ایک اور جملہ استعمال کیا: ''میں آپ سے الگ تھوڑے ہوں۔ جو حکم دیں گے، تعمیل ہو گی۔''

جس وقت یہ جملہ کہا گیا، منتری جی کے سر، کندھوں، ہاتھ، سامنے کی میز اور کرسیوں پر ہر طرف لوگ لدے ہوئے تھے۔ وہ ایک ساتھ بول رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں الگ الگ رنگوں، شکلوں اور جھنڈیوں جیسے کاغذ لہرا رہے تھے۔ اس مچھلی بازار میں لوگوں کی بھیڑ کے بیچ میں اتنی مضبوطی سے اتنی جگہ بناتے ہوئے کہ ان کے کہنی پر ٹکے سر میں موجود آنکھیں سامنے بیٹھے منتری جی کی آنکھوں سے مکالمہ کر سکیں، ان کی انگلیاں اس طرح کی حرکت کرتی رہیں کہ منتری جی کی آنکھوں کو کسی بینک میں نوٹ گننے کا دھوکا ہو سکے اور گول گول گھومتے ہوئے ہونٹوں سے نکلا جملہ سرگوشی اور شور کے بیچ اتنی آواز پیدا کر سکے کہ سامنے والا سن بھی لے اور اَن سنا ہونے کا دھوکا بھی پیدا کر سکے۔ انھوں نے جو آخری جملہ کہا، اس کا اثر یہ ہوا کہ منتری جی نے اپنے پی اے کے کانوں میں کچھ کہا۔ پی اے کملا کانت کی طرف بڑھا، پر تب تک کملا کانت چھوٹے کمرے کی طرف بڑھ چلے تھے۔ جب وہ چھوٹے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر اندر بیٹھنے کے لیے جگہ تجویز کر رہے تھے، تب پی اے نے ان کے کان میں کہا کہ وہ اس کمرے میں بیٹھ جائیں، جسے کملا کانت نے بڑی کشادہ دلی سے منظور

Scanned with CamScanner

کرلیا اور جواب میں پی اے کے کان میں کچھ ایسا کہا کہ وہ خوش ہوگیا۔ مسکراتا ہوا پی اے واپس گیا اور کملا کانت نے ایک صوفے پر آٹھویں آدمی کے طور پر اپنا وجود ٹکایا۔ وہ انڈین ریلویز کی اس فلاسفی پر یقین رکھتے تھے جس کے مطابق کسی سیٹ کو اگر آپ اپنی پیٹھ سے چھلا دیں تو وہ کھینچ کر اتنی بڑی ہوجاتی ہے کہ آپ اس پر بیٹھ بھی سکتے ہیں۔

کمرے میں پہلے سے بیٹھے ہوئے لوگ دونوں جنگجو گروپوں کے تھے۔ باہر کی تلخیاں کچھ کم ہوگئی تھیں اور وہ لوگ ہنس ہنس کر ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ دراصل پورے کمرے میں صرف دو ہی لوگ تناؤ کی صورت حال سے دوچار تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے تبادلے ہونے یا نہ ہونے کی بنا پر تھوڑی دیر پہلے مہابھارت ہوئی تھی۔ ان کے ساتھ جو لوگ تھے، وہ مست تھے۔ مستی ان کے ہونٹوں سے پان کی پیک یا منھ سے کھٹی ڈکاروں کی شکل میں نکل رہی تھی۔ وہ پچھلے کچھ دنوں سے اس تناؤ میں مبتلا دو لوگوں کو چر رہے تھے اور مست تھے۔ دراصل وہ ایک ایسی مخلوق تھے جن کا جنم ہی دوسروں کی سیوا کے لیے ہوتا ہے۔ سال بھر طرح طرح کے دکھیارے ان کی پناہ میں آتے رہتے ہیں، جن میں کسی کو تبادلہ کروانا ہوتا ہے، کسی کو تبادلہ رکوانا ہوتا ہے، کسی کا لائسنس یا پرمٹ اٹکا پڑا ہوتا ہے، تو کسی کو کسی مقدمے میں مدد چاہیے ہوتی ہے۔ وہ ان تمام دکھیاروں کا دکھ درد دور کرتے ہیں اور مست رہتے ہیں۔

یہ مست لوگ ایک ہی پیشے سے وابستہ تھے، اس لیے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ وہ کئی بار ایک ساتھ کسی معاملے کی پیروی کے لیے اس چھوٹے کمرے میں بیٹھے تھے۔ دراصل وہ ان وکیلوں کی طرح تھے جو الگ الگ مقدموں میں ایک دوسرے کے خلاف یا ساتھ کھڑے ہوتے ہیں اور پھر باہر کچہری کی کینٹین میں ساتھ ساتھ چائے پیتے ہیں اور گپیں لڑاتے ہیں۔ مست لوگ ایک دوسرے سے مذاق کرنے لگے اور قہقہے لگانے لگے۔

مست لوگوں کی مستی سے ان کے دونوں موکل دکھی ہوگئے۔ جب کوئی قہقہہ لگتا، وہ لوگ گھبرا کر اپنے پیروکاروں کو دیکھتے۔ انھیں لگتا کہ قہقہوں کی جھیل میں ان کے پیسے اور امیدیں ڈوبتی جارہی ہیں۔

کملا کانت اس وقت آرام سے اپنے صوفے پر بیٹھنے کی جگہ بنا چکے تھے مگر انھیں اچانک لگا

کہ یہ جگہ میدان جیتنے کے لیے مناسب نہیں ہے۔ اگر چہ کمرہ چھوٹا تھا مگر اس میں بھی سب سے آخر میں بیٹھنا مناسب نہیں تھا۔ انھیں کسی نہ کسی طرح منتری جی کے پاس والے صوفے پر جگہ چاہیے تھی۔

کمرہ خاصا چھوٹا تھا۔ ایک چھوٹا سا دیوان منتری جی کے لیے دیوار سے بالکل قریب کر کے رکھا گیا تھا۔ اس کے سامنے ایک سنٹرل ٹیبل تھی اور ٹیبل کے دونوں طرف ایک لمبا صوفہ رکھا تھا۔ اس صوفے پر آرام سے تین تین لوگ بیٹھ سکتے تھے، پر جس صوفے پر کملا کانت بیٹھے تھے، اس پر آٹھ لوگ بیٹھ چکے تھے۔ سامنے والے پر بھی سات لوگ تھے۔ کمرے میں آنے پر پتا چلا کہ ان دو جنگجوؤں کے علاوہ اور بھی کئی لوگ تھے جن کے فیصلے اس چھوٹے کمرے میں ہو سکتے تھے اور وہ پہلے سے وہاں تھے۔

کملا کانت کو محسوس ہوا کہ منتری جی کے آنے سے پہلے انھیں دیوان کے پاس پہنچ جانا چاہیے۔ وہ اٹھے اور باہر آ گئے۔

باہر کملا کانت کو منتری جی کا چپراسی دکھائی دے گیا۔ وہ کملا کانت کو جانتا تھا اور کملا کانت اسے جانتے تھے۔ کملا کانت نے تپاک سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اس کے بال بچوں کا حال چال پوچھا۔ ہر ہندوستانی کی طرح اس نے بھی اپنے خاندان کی ذمے داری بھگوان پر ڈال رکھی تھی، اس لیے اس نے اوپر کی طرف نظر اٹھا دی۔ کملا کانت نے اسے دونوں لڑکوں کے لیے مٹھائی کھانے کو دس دس روپے کے نوٹ دیے۔ اس نے نوٹ اطمینان سے اپنی اچکن کی جیب میں رکھتے ہوئے یہ معلومات فراہم کی کہ اس کے تین لڑکے ہیں۔ کملا کانت نے اسے بتایا کہ بچے تو بھگوان کی برکت ہوتے ہیں اور اس بات کی شکایت بھی کی کہ اس نے تیسرے بیٹے کے جنم کے بارے میں پچھلی ملاقات پر نہیں بتایا تھا۔ چپراسی نے بتایا کہ پچھلی ملاقات پر، جو نہ اسے یاد تھی کہ کب ہوئی تھی اور نہ کملا کانت کو، انھیں بتایا تو تھا کہ اس کی بیوی امید سے ہے۔ کملا کانت نے اپنی یادداشت کمزور ہونے کی شکایت کی اور ایک دس کا نوٹ نکال کر چپراسی کو تھما دیا۔ چپراسی نے اپنے سترہ سال کے تیسرے بیٹے کے لیے بھی مٹھائی خریدنے کی حامی بھری اور پیسے جیب میں رکھ لیے۔

اس کے بعد چپراسی نے جو کمال دکھایا، اسے دیکھ کر کوئی بھی شرط لگا سکتا تھا کہ سیکریٹریٹ میں آنے کے پہلے وہ ضرور کسی سرکس میں کام کرتا رہا ہوگا۔ اس نے اس ٹھسا ٹھس بھرے ہوئے کمرے

Scanned with CamScanner

میں منتری جی کے دیوان کے ٹھیک پہلو میں ایک کرسی رکھ دی۔ اس کی وجہ سے یہ ضرور ہوا کہ اس نے دو لوگوں کے پیروں کی انگلیاں کچل دیں، ایک کے سر کی مضبوطی کی جانچ کی اور تھوڑی دیر تک ہوا میں اس طرح لٹکا رہا کہ یقین کے ساتھ یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ کسرت دکھا کر کمرے میں بیٹھے لوگوں کو انٹرٹین کر رہا ہے یا پھر صوفوں کے اوپر بیٹھے کچھ لوگوں کو ان کے نیچے دھکیل کر وہاں کچھ جگہ بنانا چاہتا ہے۔

کرسی نصب کرنے سے زیادہ مشکل تھا اس پر کملا کانت کو نصب کرنا۔ کرسی جیسے ہی رکھی گئی، اس پر بیٹھنے کے لیے دو لوگ لپکے۔ کملا کانت پیچھے رہ گئے اور آگے بیٹھے ہوئے ایک صاحب اس پر بیٹھ گئے۔ کملا کانت نے بے بسی کے انداز میں چپراسی کو دیکھا۔ اس کی جیب میں مٹھائی کے لیے پڑے تین نوٹ کچھ اس طرح پھڑ پھڑائے کہ چپراسی کی زبان پر سرسوتی کا واس ہو گیا۔ چپراسی نے اس شخص کو غلیظ گالیاں دیں۔ اس کرسی پر بیٹھنے والا شخص دو ہی جملوں کی مار سے سہم کر واپس صوفے پر آ گیا۔ وہ منتری جی کے حلقے میں ضرور تھا مگر چپراسی تو سیکریٹریٹ نامی عمارت کا اٹوٹ انگ تھا۔ جب منتری جی نہیں تھے تب بھی وہ یہیں تھا اور جب منتری جی نہیں رہیں گے تب بھی وہ یہیں رہے گا۔

کملا کانت نے کرسی پر بیٹھ کر ایک بار پھر کمرے کا جائزہ لیا۔ منتری جی کے چپراسی کے کرسی خالی کرا کے انھیں بٹھا دینے سے ان کا رتبہ بڑھ گیا تھا۔ کمرے میں بیٹھے لوگ انھیں رشک، تعریف اور حسد کے ملے جلے جذبات سے دیکھ رہے تھے۔ کملا کانت کو لگا کہ یہ سب حقیر لوگ ہیں جن سے آنکھیں ملانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اس لیے وہ سامنے والی دیوار کو گھورنے لگے اور ان کا دماغ ایک الگ طریقے کا محاذ کھولنے میں غرق ہو گیا۔

کمرہ کسی پارسی تھیٹر کا منظر پیش کر رہا تھا جس میں کردار خود کلامی والے اصول کے مطابق رازدارانہ اور احمقانہ ذاتی گفتگو اس امید پر زور زور سے بول بول کر کر رہے ہوں کہ بولنے والے کے علاوہ اسٹیج پر موجود کوئی کردار نہیں سن رہا ہے۔ کمرے میں ٹھنسے ہوئے لوگ ایک ساتھ بول رہے تھے، زور زور سے بول رہے تھے اور الگ الگ موضوعات پر بول رہے تھے۔ ایک دوسرے کو کاٹتی اور پچھاڑتی ہوئی یہ آوازیں دیواروں سے ٹکراتیں، صوفوں پر رینگتیں، زمین پر چت پڑ جاتیں اور ان کانوں تک پہنچ ہی جاتیں جن کے لیے وہ بولی گئی ہوتیں۔ اس پورے ماحول میں صرف کملا کانت یکسوئی، بے خودی کے عالم میں بیٹھے تھے۔ بھیڑ میں ان کا کوئی پیروکار نہیں تھا، اس لیے انھیں وہاں

Scanned with CamScanner

بیٹھے سبھی لوگ اوچھے لگ رہے تھے، یہاں تک کہ ان کی گفتگو پر دھیان دینا بھی اوچھاپن تھا، اس لیے وہ صرف سامنے تکتے رہے اور گفتگو میں صرف انھی اجزا کو سمیٹتے رہے جس میں منتری جی کے آنے والے چند دنوں تک راجدھانی اور اس کے باہر کے دوروں کی خبریں پوشیدہ تھیں۔

کمرے میں منتری جی داخل ہوئے اور جیسا کہ ہونا تھا ہوا، آوازیں دم توڑ گئیں۔ لوگ کھڑے ہو گئے۔ جس کمرے کے متعلق تفصیلات بیان کرتے وقت یہ کہا جاتا کہ اس میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی، اس میں منتری جی نہ صرف داخل ہو گئے بلکہ بغیر ہاتھوں پر اٹھائے، اپنے پاؤں سے چل کر دیوان تک پہنچ بھی گئے اور بیٹھ گئے۔

''ہاں... بتایئے!''

یہ منتری جی کا تکیۂ کلام تھا۔ انھیں جاننے والے جانتے تھے کہ اس کا کوئی مطلب نہیں ہے، اس لیے کسی نے کچھ نہیں بتایا۔

منتری جی نے دیوان پر پڑے تولیے کے ٹکڑے سے اپنے چہرے سے کسی تصوراتی چیز کو پونچھنا شروع کر دیا۔ کمرے میں بیٹھے لوگوں میں سے کچھ کھانسے کھنکھارے، کچھ نے اپنے جسم کے پچھلے حصوں کو ہلا ڈلا کر اطمینان کیا کہ ہوا میں لٹکے ہوئے نہیں ہیں اور فرنیچر کے زمرے میں آنے والی کسی چیز پر ٹکے ہوئے ہیں۔ جن کے کام تھے، انھوں نے بیچارگی سے اپنے مہنگے پیروکاروں کی طرف دیکھا اور انھیں طرح طرح کے اشاروں سے بولنے پر اکسانے کی کوشش کی۔ منتری جی نے تولیہ واپس دیوان پر رکھتے ہوئے ایک مرتبہ پھر کہا:

''ہاں... تو بتایئے!''

کسی نے کچھ نہیں بتایا۔

تھوڑی دیر تک کمرہ بے معنی باتوں سے گونجتا رہا۔ لوگوں نے منتری جی کو علاقے میں بارش کے بارے میں بتایا، سڑکوں کی مرمت میں ہونے والی تاخیر پر اپنے غصے کا اظہار کیا، فصلی کیڑوں کے متعلق اپنی اپنی معلومات پر تبادلۂ خیال کیا۔ منتری جی دلچسپی سے سنتے رہے اور بیچ بیچ گفتگو میں اپنی شرکت پر زور دیتے ہوئے کچھ ٹکڑے لگاتے رہے۔

سبھی جانتے تھے کہ منتری جی دنیا کی تمام چیزوں میں بغیر دلچسپی کے دلچسپی دکھا سکتے تھے۔

Scanned with CamScanner

منتری جی بھی جانتے تھے کہ لوگ یہاں بارش، فصلی کیڑوں یا سڑکوں پر باتیں کرنے نہیں آئے تھے۔ وہ بیچ بیچ ٹیک کی طرح کہتے رہے:

''اور بتایئے... صاحب!''

کسی نے کچھ نہیں بتایا اور یہ صاف ظاہر ہوگیا کہ کوئی بھی پہلے کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ سب کو امید تھی کہ دوسرے چلے جائیں گے اور صرف وہ رہ جائیں گے تب اپنی بات اکیلے میں کرنے کا موقع انھیں ملے گا اور وہ اپنی بات کہیں گے۔

طے تھا کہ ایسا وقت آسانی سے نہیں آنے والا تھا۔

منتری جی نے اپنی بائیں جانب بیٹھے شخص کو دیکھا اور مسکرائے۔ منتری جی کے دائیں بیٹھے اور سامنے بیٹھے لوگوں کے لیے بھی یہی عمل دہرایا۔ انھیں بھی ''کوئی ادھار نہیں رکھنا چاہیے'' کے اصول کے مطابق اپنے دانت دکھادیے۔ پھر منتری جی نے کملا کانت ورما کی طرف دیکھا۔ کملا کانت پہلے ہی مسکرادیے، اس لیے منتری جی نہیں مسکرائے۔ وہ اٹھے اور اس چھوٹے کمرے سے بھی چھوٹے ایک دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ یہ چھوٹا کمرہ اس چھوٹے کمرے کا اٹیچڈ باتھ روم تھا اور نئے آرکی ٹیکچرل آرٹ کی طرح ہر اہم کمرے کے ساتھ جڑا رہتا ہے۔

منتری جی نے جاتے جاتے اپنے جسم کے نہ جانے کس حصے سے کون سا اشارہ کیا کہ ان کے پیچھے پیچھے کملا کانت بھی اٹھ کر دوسرے اور چھوٹے کمرے میں چلے گئے۔

دراصل اس کھیل میں بولنے سے زیادہ اشاروں کی اہمیت تھی۔ کملا کانت پرانے کھلاڑی تھے، اس لیے وہ ایک ساتھ سامنے والے کے ہاتھ، ناک، آنکھ، کان، زبان سب پر نظر رکھتے تھے۔ منتری جی نے اٹھتے اٹھتے اپنے سر کو جیسے جھٹکا اور پھر ہوا میں لہرایا، اسے صرف کملا کانت ہی سمجھ سکتے تھے۔

اندر واش بیسن اور کموڈ کے بعد جو جگہ بچتی تھی، وہ بس اتنی تھی کہ اس میں کملا کانت اور منتری جی ایک دوسرے سے لگ بھگ سٹ کر کھڑے ہوسکیں۔ سامنے کے واش بیسن پر لگے شیشے میں ان کے چہرے کچھ بگڑے ہوئے سے نظر آرہے تھے۔ اس کمرے میں پہلی بار وہ کوئی ڈیل کر رہے تھے، اس لیے کملا کانت بیچ بیچ میں کو آئینے میں دیکھ کر لگتا کہ ان کے علاوہ بھی کمرے میں کوئی ہے۔ وہ

Scanned with CamScanner

تھوڑی دیر کے لیے سہم جاتے مگر منتری جی کے لیے یہ کمرہ پرانا گوشۂ گفتگو تھا، اس لیے وہ بڑے آرام سے بات کر رہے تھے۔

دونوں مذاکرات کاروں کے درمیان جملے انتہائی مختصر اور سرگوشی کے ساتھ ادا ہو رہے تھے۔ اکثر ایک ہی جملے کو بار بار دہرایا جاتا۔

''میں آپ سے باہر تھوڑے ہی ہوں۔ جو حکم دیں گے، ہو جائے گا۔''

''بھئی جو موقعے پر غائب ہو جائے، اس کا کیا بھروسا؟''

''جو حکم دیں گے، ہو جائے گا۔''

''پر موقعے پر غائب ہو گئے۔''

''میں آپ سے باہر تھوڑے ہوں۔ جو حکم...''

تھوڑی دیر میں چھوٹا غسل خانہ بامبے اسٹاک ایکسچینج میں تبدیل ہو گیا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ بولیاں اونچی آواز کی جگہ نیچی آواز میں لگ رہی تھیں:

''پچیس۔''

''نو۔''

''پچیس۔''

''میں آپ سے باہر تھوڑے ہوں... چلیں دس...''

''بائیس۔''

''جو حکم دیں گے، بعد میں کر دیں گے... دس، اس بار۔''

''اس بار حکم... بیس سے کم نہیں۔''

ایک آواز جوشیلی ہو کر ڈانٹ رہی تھی، دوسری عاجزی سے گڑگڑا رہی تھی۔

دونوں آوازیں ایک دوسرے کو تول رہی تھیں، پرکھ رہی تھیں اور دکانداری کے اصولوں کے مطابق بیسٹ بارگین کرنا چاہ رہی تھیں۔

اچانک جوشیلی آواز نے اپنے ہاتھ کو کچھ اس طرح سے جھٹکا جس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس نے اپنے اوپر سے مکھی اڑائی ہے اور یہ بھی کہ گڑگڑاتی ہوئی آواز اب باہر نکل جائے۔

Scanned with CamScanner

کملا کانت نے مان لیا کہ کوئی مکھی اڑائی گئی ہے۔

''بارہ کردیں سر۔اگلی بار جو حکم دیں گے ہو جائے گا۔''

''بیس سے ایک کم نہیں۔''

منتری جی نے اس بار دکانداری کا وہ داؤ کھیلا جس سے کملا کانت ایک دم چت ہوتے ہوتے بچ گئے۔انھوں نے پیروں اور دھڑ کو اس طرح ہلایا کہ وہ اب چلنے والے ہیں۔دکانداری کا پرانا اصول دہرایا گیا کہ لینا ہو تو لو، ورنہ ہم دکان بڑھاتے ہیں۔کمرے میں اتنی جگہ نہیں تھی کہ منتری جی کچھ کر سکتے ،مگر ان کے قدم کی لے کچھ یوں ڈگمگائی جس سے کچھ ایسا لگا کہ وہ کموڈ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ان کا ہاتھ بھی اپنے پاجامے کے ازار بند کی طرف جانے لگا تو کملا کانت گھبرائے۔انھیں لگا کہ منتری جی کہیں کموڈ پر بیٹھ نہ جائیں۔انھوں نے گھبرا کر منتری جی کو تقریباً گھسیٹ لیا۔

''ایک موقع اور دیں سر... آپ سے الگ تھوڑے ہی ہوں... بارہ کردیں... پھر آگے اور دیکھ لیں گے...''

''اٹھارہ سے کم نہیں۔نہیں دینا ہے تو...''

منتری جی پھر کموڈ کی طرف چلے۔

''چلو سر آپ کی بھی بات رہ جائے اور میرے بچوں کے پیٹ پر بھی لات نہ پڑے... پندرہ کردیتے ہیں۔''

''آپ بھی انجینئر صاحب، بنیوں کی طرح بات کرتے ہیں۔چلیے سولہ ٹھیک ہے۔اس کے بعد تو موقعے پر آپ دکھائی نہیں دیں گے۔''

''ہیں ہیں... آپ بھی سر مذاق کرتے ہیں۔آپ سے الگ کب رہا ہوں میں۔وہ تو...''

کملا کانت نے ایک بار پھر انڈین ریلویز اور روڈویز کو کوسنا شروع کردیا جنھوں نے پچھلی مرتبہ چاہتے ہوئے بھی انھیں منتری جی کی سیوا کا موقع نہیں دیا تھا۔پر منتری جی نے ہاتھ کے اشارے سے انھیں روک دیا۔

کملا کانت نے سودے کی دوسری شرائط بھی، مثلاً انھیں کب تک تبادلہ رکنے کا آرڈر مل جائے

Scanned with CamScanner

گا اور بدلے میں طے شدہ رقم کہاں پہنچانی ہوگی، ابھی طے کرنے کی کوشش کی مگر منتری جی کو دیر ہو رہی تھی، باہر بیٹھے لوگوں کو طرح طرح کی باتیں بنانے کا موقع مل رہا تھا، اس لیے وہ کملا کانت سے یہ کہہ کر کہ وہ شام کو ان کی کوٹھی پر آئیں، واقعی کموڈ کی طرف بڑھ گئے۔

کملا کانت سیدھے سر اٹھائے چھوٹے کمرے سے باہر نکل آئے۔ انھیں اس طرح منتری جی کے پیچھے اندر جاتے پھر باہر آتے ہوئے دیکھ کر بیٹھے ہوئے لوگوں نے حسد سے دیکھا۔ ان میں سے کچھ نے انھیں بڑی عزت سے نمسکار بھی کیا، مگر کملا کانت بغیر دائیں بائیں دیکھے باہر آ گئے۔

باہر چپراسی کھڑا تھا۔ کملا کانت نے اس مرتبہ پھر اسے دونوں لڑکوں کو پان کھلانے کے لیے دس دس کے نوٹ دیے۔ چپراسی نے یاد دلاتے ہوئے پھر بتایا کہ اس کا ایک لڑکا اور بھی ہے۔ کملا کانت نے پھر جیب میں ہاتھ ڈالا، پر اس درمیان بات چیت میں چپراسی نے انکشاف کیا کہ رات میں صاحب کی کوٹھی پر اس کی ڈیوٹی نہیں ہے۔ کملا کانت نے جیب سے ہاتھ نکال لیا۔ وہ کچھ بڑبڑائے، جس کا صاف مطلب چپراسی نے یہ نکالا کہ وہ پرلے درجے کا مورکھ ہے، اگر کچھ دیر بعد اپنی رات کی ڈیوٹی کے بارے میں بتاتا تو کملا کانت اس کے تیسرے لڑکے کی مٹھائی کے پیسے نہ مارتے۔

چپراسی سے نپٹنے کے بعد کملا کانت نے پی اے کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں۔ پی اے برابر کے کمرے میں آج ملے ہوئے کاغذوں کی چھنٹائی کر رہا تھا اور انھیں الگ الگ فائلوں میں لگاتا جاتا تھا۔ اس کے اردگرد چھوٹی سی بھیڑ تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے کاغذوں پر منتری جی نے آرڈر تو جاری کر دیے تھے مگر انھیں یقین نہیں تھا کہ کاغذ اپنی منزل تک پہنچیں گے۔ وہ پی اے سے گھر کے کاغذوں کو لفافوں میں رکھوا رہے تھے اور ان پر لکھے گئے پتوں کو دیکھ کر اطمینان کا سانس لے رہے تھے کہ لفافے صحیح منزل پر پہنچ جائیں گے۔

کملا کانت بھیڑ میں ایک ایسی جگہ کھڑے ہو گئے جہاں سے پی اے کے سر اٹھانے پر ان کی آنکھ سے آنکھ مل سکتی تھی۔

پی اے نے کاغذوں کو نپٹاتے ہوئے سر اٹھایا اور اس کی آنکھیں کملا کانت کی آنکھوں سے ٹکرائیں۔ آنکھوں کا آپس میں نہ جانے کن مکالموں کا تبادلہ ہوا کہ پی اے نے ایک دم سے

ہڑبڑاہٹ دکھاتے ہوئے اپنی کرسی سے اٹھنے کی کوشش کی۔ آدھا اٹھتے اٹھتے وہ واپس کرسی پر گر گیا، پر اس کی ہڑبڑاہٹ نے لوگوں کو احساس دلا دیا کہ کملا کانت کوئی اہم شخصیت ہیں۔ بھیڑ نے تھوڑی جگہ بنا دی اور کرسیوں پر بیٹھے لوگوں میں سے ایک کھڑا ہو گیا۔

''بیٹھیں سر۔''

کملا کانت بیٹھ گئے۔

''دیکھ رہے ہیں سر، دم مارنے کی فرصت نہیں۔''

''بھئی، سرکار تو آپ لوگوں کے بل پر چل رہی ہے۔ منسٹر لوگوں کے پاس کہاں وقت ہے...''

کملا کانت نے پچھلے کئی سالوں سے مختلف پی اے لوگوں کے سامنے کہے گئے جملوں کو پھر سے دہرایا۔ ہر پی اے کی طرح یہ پی اے بھی خوش ہو گیا۔

''ارے... نہیں سر۔ ہم تو خادم ہیں۔ جو حکم ہوتا ہے، بجا لاتے ہیں۔''

اس جملے کی مخالفت میں کئی آوازیں ابھریں۔ جتنے لوگ اپنے کاغذوں کے انتظار میں کھڑے تھے، سب نے بیک آواز ہو کر اعلان کیا کہ سرکار تو پی اے صاحب ہی چلا رہے ہیں۔ منتری جی تو سیدھے سادھے آدمی ہیں، ان سے کسی کاغذ پر لکھوا لو۔ لکھا ہوا ہوتا تبھی ہے، جب پی اے صاحب چاہتے ہیں۔

پی اے نے پھر کچھ کہنے کی کوشش کی، پر ایک بزرگ شخص نے اسے جھڑک دیا۔ جب اس نے کہا تو پی اے کو ماننا پڑا کہ واقعی سرکار چلانے میں اس کا بھی بڑا کنٹری بیوشن ہے۔

بات چیت کا نتیجہ یہ نکلا کہ پی اے کی انگلیاں کچھ اور تیزی سے چلنے لگیں۔

''بس سر... تھوڑے کاغذ رہ گئے ہیں۔''

''نہیں نہیں... آپ آرام سے نپٹا لیجیے۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔''

کملا کانت آرام سے کرسی پر پسر گئے۔ انھیں پتا تھا کہ انھیں جلدی ہو بھی تو کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بھیڑ میں موجود زیادہ تر لوگ منتری جی کے انتخابی حلقے سے تھے۔ پی اے انھیں چھوڑ کر کملا کانت سے باتیں نہیں کر سکتا تھا۔ ڈھنگ سے باتیں کرنے کے لیے بھیڑ کا چھٹنا بھی ضروری تھا۔

Scanned with CamScanner

تھوڑی دیر میں صاف ظاہر ہو گیا کہ بھیڑ آخر تک نہیں چھٹنے والی۔ جتنے لوگ ہٹتے تھے، اس سے زیادہ اس میں جڑتے جا رہے تھے۔

اچانک پی اے اٹھا اور کمرے کے ایک کونے میں چلا گیا۔ اس نے آواز دے کر بھیڑ میں سے ایک آدمی کو اپنے پاس بلا لیا۔ کملا کانت سمجھ گئے کہ اب انھیں بات کرنے میں آسانی ہوگی۔

دراصل پی اے نے لوگوں کو نپٹانے کے گر منتری جی سے ہی سیکھے تھے۔ اس نے کسی کو ایک کونے میں نپٹایا، کسی کو دوسرے کونے میں لے گیا۔ کوئی دروازے پر کھڑا کھڑا نپٹ گیا، کسی کو اس کی کرسی سے نہیں اٹھنے دیا گیا اور وہیں اس کا کام تمام کر دیا گیا۔ پی اے اس وقت دورِ وسطیٰ کے کسی فاتح کی طرح گشت کر رہا تھا۔ کمرہ ہلدی گھاٹی یا پانی پت جیسا کوئی میدان تھا اور اس کے ہاتھ، کان، ناک اور آنکھیں ہتھیار کی طرح چل رہی تھیں۔

اس دھما چوکڑی میں کملا کانت کو بھی موقع مل گیا۔

وہ دونوں تھوڑی دیر کے لیے ایک کونے میں نصب ہو گئے۔

کملا کانت نے ایسے موقعے کے لیے ایک لفافہ پہلے سے جیب میں تیار کر رکھا تھا۔ انھوں نے سب سے پہلے اسی کو نکالا اور پی اے کی قمیض کی اوپری جیب میں اسے سرکا دیا۔ انھوں نے پی اے کو بتایا کہ وہ عمر میں ان سے چھوٹا ہے اور یہ تو ان کا حق بنتا ہے کہ اس کی بیوی کو جو کملا کانت کی بہو ہوئی، دیوالی پر ساڑی پہنائیں۔ چونکہ وہ جلدی میں ساڑی لانا بھول گئے اور عورتوں کو اپنی پسند کی ساڑی خریدنے کا موقع دینا چاہیے، اس لیے وہ ساڑی کی قیمت دے رہے ہیں۔ انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ لفافہ سیدھے بہو کے ہاتھ میں پہنچ جانا چاہیے۔ پی اے نے بھی بتایا کہ اس کی بیوی کتنی بار کہہ چکی تھی کہ بھائی صاحب بہت دنوں سے گھر نہیں آئے، اس بار ملیں تو ضرور گھر آنے کو کہنا۔ اس کا بہت دل چاہتا ہے کہ وہ انھیں اپنے ہاتھ کی گرم گرم پکوڑیاں کھلائے۔ کملا کانت نے وعدہ کیا کہ اگلی بار راجدھانی آئے تو ضرور اس کے گھر آئیں گے اور بہو کے ہاتھ کی گرما گرم پکوڑیاں بھی کھائیں گے۔

کملا کانت نے بتایا کہ منتری جی نے تو ہاں کر دی ہے، پر اب آرڈر کرانا تو پی اے کے ہی بس میں ہے۔ شام کو وہ منتری جی کی کوٹھی پر پہنچ رہے ہیں۔ پی اے نے معذرت کی کہ شام کو تو اسے

کسی ضروری کام سے کسی اور جگہ جانا ہے۔ کملا کانت کو اچانک کچھ یاد آیا۔ انھوں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک اور لفافہ نکالا۔ ان کی بیوی کو پی اے کے لڑکے کی شرارتیں خوب یاد تھیں۔ انھوں نے بچے کے لیے موپڈ خریدنے کو کہا تھا، پر کملا کانت کو وقت نہیں ملا، اس لیے اس کی قیمت لفافے میں رکھ کر لے آئے تھے۔ پی اے نے لفافہ جیب میں رکھتے ہوئے بتایا کہ لڑکا بھی آنٹی کو کتنا یاد کرتا ہے۔

بہر حال، کملا کانت جی کا مسئلہ ہے تو پی اے اپنا ضروری کام چھوڑ کر بھی منتری جی کی کوٹھی پر پہنچ جائے گا۔ منتری جی رات دس بجے والی گاڑی سے باہر جا رہے ہیں، اس لیے کملا کانت آٹھ بجے تک کوٹھی پر آ جائیں۔ پی اے وہیں ملے گا۔

اس کے بعد سیکریٹریٹ نام کی اس عمارت میں کرنے کے لیے کچھ نہیں بچا؛ وہ باہر نکل آئے۔

باہر املی کے گھنے اور بڑے درخت کے نیچے بینگنی رنگ کی پتلون، ہری قمیض اور کالے چشمے میں کھڑے شخص نے انھیں دیکھ کر ایک پیلے رنگ کے رومال سے اپنا منھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ حالانکہ وہ اس گندے رومال سے یہ حرکت نہ بھی کرتا تب بھی کملا کانت وہیں جاتے، پر چونکہ طے یہی ہوا تھا اور رنگ برنگے جھنڈے والا شخص بچپن میں جاسوسی فلموں کا بہت شوقین تھا، اس لیے اس نے پوری سنجیدگی سے لائن کلیئر کا اشارہ دیا۔

''بور تو نہیں ہوئے رائے صاحب! منتری جی نے...''

''شی... شی...'' للّن رائے نے دھیرے سے انگلی ہونٹوں پر رکھی اور ایک طرف کو بڑھ لیے۔ اس بار ان کی گردن میں ایک بھورے رنگ کا رومال تھا۔ اشارہ صاف تھا۔ چپے چپے پر دشمن کے آدمی بکھرے ہوئے تھے، اس لیے وہاں بات کرنا ٹھیک نہیں تھا۔

کملا کانت نے دائیں، بائیں منظرنامے کا جائزہ لیا۔ املی کے درخت کے نیچے کھانے پینے کی اشیا پر تبادلہ خیال کے ذریعے قومی یکجہتی جیسے اہم موضوع پر سیمینار ہو رہا تھا۔ چھولے بھٹورے، اڈلی ڈوسا اور رس گلے سے لے کر فروٹ سلاد جیسی ملک کے مختلف حصوں میں پائی جانے والی ڈشیں وہاں اس گھنے درخت کے سائے تلے سرو ہو رہی تھیں۔ قومی و آفاقی سرمایہ یعنی مکھیاں، دھول اور پیڑ پر بیٹھے پرندوں کی بیٹ ان کھانے کی اشیا میں وافر مقدار میں تھیں۔ ان سارے پکوانوں کو بھکوسنے کے لیے بابو، چپراسی، نیتا، دلال اور فقیر تھوک میں تھے اور بیچنے کے لیے گندگی اور منافع ہی جن کی زندگی کا واحد

مقصد ہو، ایسے دکاندار تھے۔ ان میں دشمن کے جاسوس کون ہیں، یہ جاننا کملا کانت کے لیے تھوڑا مشکل تھا؛ وہ یہ ضرور جان گئے کہ ان میں سے دشمن کے جاسوس کون نہیں ہیں۔ وہ یوں کہ سامنے ایک آدمی الٹا اخبار پڑھ رہا تھا کہ اس کا آدھا چہرہ چھپا رہے، اس نے انھیں دیکھ کر اخبار اپنی ناک تک چڑھالیا۔ کملا کانت سمجھ گئے کہ الٹا اخبار پڑھنے والا آدمی دھورو لال یادو ہے۔

معاملہ کافی پراسرار تھا۔ آگے آگے بھورا رومال گردن میں ڈالے للن رائے، ان سے دس قدم پیچھے کملا کانت اور ان سے دس قدم پیچھے دھورو لال یادو۔ تقریباً پچاس گز آگے جا کر سیکریٹریٹ کے گیٹ کے باہر نکلتے ہوئے للن رائے ایک گلی میں مڑ گیا۔ جس جگہ گلی ختم ہوتی تھی، وہاں کی دیواروں پر بڑی فراغت کے ساتھ چھوٹے باتھ روم کی حاجت پوری کی۔ وہاں سے آگے جانے کی گنجائش نہیں تھی، اس لیے للن رائے کھڑے ہو گئے۔ دھیرے دھیرے کملا کانت اور دھورو لال بھی قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ للن رائے نے بھورا رومال جیب میں ڈالا، کالا چشمہ آنکھوں سے اتار کر پونچھا اور بڑبڑاتے ہوئے دو تین جملے کہے۔ ان جملوں کے مطابق اس مرتبہ بڑے شاطر دشمن سے پالا پڑا ہے۔ چپے چپے پر پھیلے اس کے آدمی ان پر نگاہیں رکھے ہوئے ہیں۔ دشمن کا کوئی ایجنٹ یہاں پر بھی پیشاب کر کے گیا ہے اور انھیں فوراً اس علاقے سے نکل بھاگنا چاہیے اور ریلوے اسٹیشن کے گیٹ نمبر تین پر ملنا چاہیے۔ اس کے بعد للن رائے واپس مڑے اور تیز قدموں سے واپس چل دیے۔ ان کا چشمہ ان کی آنکھوں پر تھا اور گردن پر نیلا رومال آ گیا تھا۔ ان کے پیچھے پیچھے باقی دونوں بھی گلی سے نکل بھاگے۔

اسٹیشن کی چائے کی دکان پر للن رائے اور دھورو لال نے جو خبریں دیں، ان میں سے کچھ کملا کانت کے لیے مایوس کن تھیں اور کچھ حوصلہ افزا۔ پہلی خبر یہ تھی کہ اپنے کیمپ کا ایک سپہ سالار پالا بدل کر دشمن کے پالے میں چلا گیا ہے۔ رضوان الحق نے پہلے دن ہی رشبھ چرن شکل کے گھر کباب بھجوائے اور دوسرے دن دفتر کھلنے سے پہلے صبح صبح رشبھ چرن اسے لے کر بٹوک چند کے یہاں گیا تھا۔

''جانے دو سالے کو...'' کملا کانت نے کہا۔ ''ایک بار تبادلہ رکنے کے بعد مرغ مسلم لے کر ادھر آ جائے گا۔''

Scanned with CamScanner

دوسری خبر اچھی تھی۔ ان دونوں نے منتری کے پی اے کوشک کے گھر کا پتا معلوم کرلیا تھا۔

کملا کانت نے اتنی اہم تحقیق پر للن رائے کی پیٹھ ٹھونکی۔ پھر انھوں نے انھیں بتایا کہ کس طرح سے منتری جی کی آنکھیں انھیں دیکھتے ہی بھر آئیں اور کتنی دیر تک وہ ان کا ہاتھ تھامے بیٹھے رہے۔ جب انھوں نے کہا کہ ورما جی، آپ کا تبادلہ تو دھوکے میں ہو گیا، بدمعاش بٹوک چند نے مجھ سے جھوٹ بول کر فائل پر دستخط کروالیا تو ان کی آنکھیں ٹپ ٹپ چونے لگیں۔ منتری جی تو اسی وقت تبادلہ روکنے کا آرڈر ٹائپ کرا رہے تھے، پر وہ تو ٹائپ رائٹر میں کچھ گڑبڑی آ گئی۔ آج رات منتری جی نے کوٹھی پر بلایا ہے، وہیں آرڈر کی کاپی مل جائے گی۔

''تب تو گرو جی، ہو جائے آج...'' للن رائے نے کلکاری ماری۔ خبر نے انھیں گرو گمبھیر جاسوس سے واپس دلال صحافی بنا دیا۔ ان کی خواہش تھی کہ جب قلعہ فتح ہو ہی گیا ہے تو پھر جشن بھی لگے ہاتھوں منا لیا جائے۔ وہ راجدھانی میں اس طرح کے کاموں کے سلسلے میں آتے رہتے تھے، اس لیے یہ بھی جانتے تھے کہ کس سطح پر جشن کہاں منایا جاتا ہے۔ انھوں نے دو تین ہوٹلوں کا نام لیا مگر کملا کانت نے ان کی حوصلہ شکنی کی۔ منتری جی آج ہی دورے پر نکل جائیں گے، اس لیے انھیں فوراً ان کی کوٹھی پر پہنچنا تھا۔

للن رائے اور دھورو لال یادو بھی حکم نامے کی حوالگی کے منظر کے چشم دید گواہ بننا چاہتے تھے مگر کملا کانت کی رائے تھی کہ دشمن بڑا چوکنا ہے، پورے شہر میں اس کے ایجنٹ بکھرے ہوئے ہیں۔ ضروری تھا کہ للن رائے اور دھورو لال جیسے منجھے ہوئے جاسوس شہر کا چکر لگاتے ہوئے ہوٹل پہنچیں۔

وہ براہ راست منتری جی کی کوٹھی جا رہے ہیں۔ وہاں سے آرڈر لے کر ہوٹل آ جائیں گے۔

اس کے بعد للن رائے نے کالا چشمہ آنکھوں پر چڑھایا، اپنے رنگ برنگے رومالوں کو تہہ کر کے جیب میں رکھا اور ایک رکشے پر بیٹھ گئے۔ دھورو لال یادو نے بھی ایک اخبار خریدا اور دوسرے رکشے پر بیٹھ کر اسے الٹا پڑھنے لگے۔ جیسا کہ طے تھا، کملا کانت ورما نے منتری جی کی کوٹھی کے لیے ایک تیسرا رکشا طے کرلیا۔

کملا کانت منتری جی کی کوٹھی پر جب پہنچے تو وہاں صرف اتنے لوگ تھے کہ آسانی سے اسے ویران کہا جا سکتا تھا۔ دراصل اس کوٹھی کی رونق یا ویرانی سے ہی پتا چلتا تھا کہ منتری جی کوٹھی میں

براجمان ہیں یا کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ چمچوں، ملاقاتیوں اور کام کرنے والوں کی ایک بھیڑ تھی، جو منتری جی کے کوٹھی میں داخل ہوتے ہی نہ جانے کہاں سے پانچ سات منٹ کے اندر ہی نمودار ہو جاتی تھی۔ اسی طرح منتری جی کی کار کوٹھی کے باہر نکلتی اور یہ بھیڑ پھر یکایک کسی تہہ خانے میں سما جاتی۔ کوٹھی سونی پڑی تھی۔ اس کا مطلب، منتری جی ابھی نہیں آئے ہیں۔

گیٹ پر ایک سنتری اکتاہٹ اپنے چہرے پر لیے کھڑا تھا۔ اسے پار کرنے کے بعد ایک مالی پھلواری میں کام کرتا دکھائی دیا۔ دن بھر کی تھکن کے بعد وہ کہیں بیٹھ کر ستانا چاہتے تھے۔ برآمدے میں کچھ کرسیاں پڑی تھیں، وہ اُدھر ہی بڑھ گئے۔

کرسی پر ایک چپراسی نیم خوابی کی حالت میں پڑا تھا۔ اس نے آنکھیں آدھی کھول کر کملا کانت کی طرف دیکھا۔ کملا کانت نے بھی بے پروائی دکھاتے ہوئے اسے تولا۔ آدمی کام کا نہیں، اس لیے انھوں نے اس کے بچوں میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی اور دل ہی دل میں خوش ہوئے کہ ان کی اندر کی جیب میں پڑے لفافوں میں ایک کم ہونے سے بچ گیا۔

یہ ایک بڑی سی کوٹھی تھی جس میں بہت سارے کمرے تھے، بہت بڑا لان تھا، پیچھے ڈھیر سارے سرونٹ کوارٹر تھے۔ لوگوں کو اس کی طاقت کا احساس تھا اس لیے وہ چھوٹے بڑے گروپوں میں اس کے گلیاروں، برآمدوں اور کمروں میں آہستگی سے باتیں کرتے تھے۔ یہاں قہقہے لگانے پر کوئی پابندی تو نہیں تھی لیکن قہقہے تبھی لگ سکتے تھے جب کوٹھی کا مالک قہقہے لگاتا تھا۔ زیادہ تر اہم فیصلے یہاں ہوتے تھے اس لیے سمجھدار لوگ سیکریٹریٹ نہیں جاتے تھے۔ وہ صرف منتری جی کے موڈ، موجودگی، بھیڑ بھاڑ یا دوستوں دشمنوں کی وہاں موجودگی جیسی باتوں کا پتا لگاتے رہتے تھے اور صحیح وقت پر صحیح چوٹ کرنے کے ارادے سے یہاں فوراً نمودار ہوتے۔

اس کوٹھی میں رہنے والے بدلتے رہتے تھے۔ کئی مرتبہ یہ تبدیلی بڑی جلدی جلدی ہوتی تھی اور کئی بار برسہا برس تک ایک ہی شخص اس میں رہتا چلا جاتا۔ ہر تبدیلی کے ساتھ کوٹھی کے پردے، فرنیچر وغیرہ بدل جاتے۔ جیسے ہی نیا شخص اس کوٹھی میں رہنے کے لیے آتا، وہاں پہلے رہنے والوں کے جمالیاتی شعور، چیزوں کے انتخاب پر ناک بھوں چڑھاتا۔ سرکار کا ایک ڈپارٹمنٹ ان کوٹھیوں کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ اس کا بڑا افسر پہنچ کر نئے رہنے والے کو بتاتا کہ کوٹھی کے قالین، فرنیچر، پردے اس کی

پسند اور حیثیت سے بہت کمتر درجے کے ہیں؛ کوٹھی کو فوراً نئے سامان کی ضرورت ہے۔ کوٹھی کا نیا مالک فوراً اس سے اتفاق کرتا۔ محکمے کے ذمے دار افسر نئے مالک کی بیوی کو بازار لے جاتے اور اس کی پسند کے صوفے اور قالین خریدے جاتے۔ پردوں کے کپڑے اور صوفوں کے کور درزی کو سلنے کو دیے جاتے۔

اس پوری کارروائی کا ایک حصہ یہ بھی تھا کہ آنے والے چند دنوں تک اخباروں میں چھپتا رہتا کہ فلاں منتری نے اپنی کوٹھی اور دفتر کی سجاوٹ پر عوام کی گاڑھی محنت کی کتنے لاکھ کمائی کو بے دردی سے خرچ کیا۔ یہ معلومات بھی انھیں دیکھ بھال کرنے والے محکمے سے ہی ملتی تھی۔ بہت سے لوگوں کو تو نئے شخص کے آنے کی خبر بھی اسی خبر سے ملتی۔ یہ خبریں اتنے تواتر سے چھپتیں کہ محکمہ موسمیات کے بلیٹن کی طرح انھیں بھی لوگ سنجیدگی سے نہیں لیتے تھے۔

فرنیچر کے ساتھ کوٹھیوں کے چپراسی، پی اے بھی نئے مالکوں کے ساتھ بدل جاتے۔ جمع ہونے والی بھیڑ کی بولی اور لطیفوں کو سن کر بتایا جا سکتا تھا کہ کوٹھی میں رہنے والا کس علاقے سے تعلق رکھتا ہے۔ کچھ معاملوں میں جمہوریت نے یکسانیت بھی پیدا کردی تھی۔ مثلاً ہر علاقے کا دلال کرتا پاجامہ پہننے لگا تھا، ہر محکمے کا افسر قمیض پینٹ پہنتا تھا اور ہر علاقے کا کسان مڑا تڑا کرتا اور پھٹی بنیائن پہنتا تھا اور منتری کے سامنے اپنی درخواست رکھتے وقت ہکلاتا تھا۔

اس کوٹھی میں رہنے والا بھوجپوری علاقے کا تھا، اس لیے ہر تیسرا آدمی کھینی ملتا ہوا دکھائی دے جاتا تھا۔ کملا کانت کے بازو میں بیٹھے چپراسی نے اپنی ہتھیلی پر رگڑ کر کھینی ملی اور دو تین بار تالی بجانے کے انداز میں اپنے دائیں ہاتھ کو بائیں پر مارا تو ہوا میں تیرتے ہوئے تمباکو کے ذرات نے انھیں ایک دم چوکنا کردیا۔ چپراسی نے رگڑنے کے بعد اپنا بایاں ہاتھ ان کے سامنے بڑھا دیا۔ کملا کانت گھبرائے کہ کہیں انھیں لینا نہ پڑے۔ انھوں نے جھٹ سے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور تب تک سوتے رہے جب تک انھیں یہ یقین نہیں ہوگیا کہ چپراسی نے پوری کھینی دانتوں کے بیچ دبالی ہوگی۔ ایک بار وہ پھنس چکے تھے۔ ان کے محکمے کے ایک پرانے منتری جی کھینی کھانے کے اتنے شوقین تھے کہ ان کا پی اے ہر دس پندرہ منٹ کے بعد کھینی بنا کر لاتا اور ان کے سامنے پیش کرتا۔ وہ پھر وہاں موجود ہر شخص کے سامنے کھینی بڑھا دیتے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر کوئی مرد کھینی نہیں کھا سکتا تو اس کی

Scanned with CamScanner

مردانگی پر ڈنکار۔ ایسے مردوں کے بارے میں ان کے پاس بہت سارے لطیفے تھے جنھیں وہ خوب کھل کر سنایا کرتے تھے۔ ان لطیفوں پر سب سے زیادہ کھینی نہ کھانے والوں کو ہنسنا پڑتا تھا۔ ایک مرتبہ کملا کانت کا کام اتنا بڑا تھا کہ انھوں نے بھی کھینی کھالی۔ کام تو ہو گیا، پر کافی دیر تک وہ ان منتری جی کے لطیفے سن کر روتے رہے۔ ان کا سر چکراتا رہا اور اپنے اوپر پوری طرح سے قابو رکھنے کی کوشش کرتے کرتے آخر میں وہ بھی منتری جی اور ان کے چمچوں کی طرح شاندار قیمتی سرکاری قالین پر پچ پچ کر کے تھوکنے لگے۔

بہر حال خطرہ ٹل چکا تھا، اس لیے کملا کانت نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ وہ بے دلی سے اس چپراسی کو دیکھتے رہے جو کھینی منھ میں دبا کر پھر اونگھنے لگا تھا۔ اچانک انھوں نے دیکھا کہ چپراسی کی مونچھوں کا بایاں حصہ کچھ پھڑ پھڑایا۔ پھر داہنے حصے نے بھی ویسی ہی حرکت کی۔ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور تیز تیز سانس لیں۔ جنگل میں جیسے جانور ہوا سونگھ کر آنے والی آفت کا پتا لگا لیتے ہیں، کچھ کچھ ویسا ہی ردعمل تھا اس کا۔ اس نے ست، کاہل اور نیند میں ڈوبے چوپائے کی طرح اپنا جسم توڑا اور ایک دم سے کھڑا ہو گیا۔

کملا کانت سمجھ گئے، منتری جی آنے والے ہیں۔

چپراسی ہی کی طرح دوسرے لوگوں کے بھی ردعمل ہوئے۔

سنتری اچانک چوکنا ہو گیا اور کسی تصوراتی گائے کو ہانکنے لگا۔

مالی نے ایک دم سے لان میں گھاس، پتوں وغیرہ کی تلاش شروع کر دی اور یہ پکا ارادہ کیا کہ آج وہ انھیں اکھاڑ کر ہی دم لے گا، چاہے آدھی رات ہی کیوں نہ ہو جائے۔

کوٹھی کے کیمپس میں نہ جانے کہاں سے بھیڑ نظر آنے لگی۔

کملا کانت بھی برآمدے سے نکل کر لان میں آ گئے اور ایسی جگہ پر کھڑے ہو گئے جہاں منتری جی کی نظر کار سے اترتے ہی سیدھی ان پر پڑے۔

اس کوٹھی کے لیے یہ عام بات تھی۔ لوگ ہوا سونگھ کر بتا سکتے تھے کہ منتری جی کب جانے والے ہیں، کب آنے والے ہیں۔ پورے شہر میں پھیلے ہوئے دلالوں اور درخواست گذاروں کو یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ اب منتری جی کوٹھی پہنچ رہے ہیں۔ ان کے پہنچنے کے چند منٹ پہلے ایک کار رکتی اور

Scanned with CamScanner

اس سے چند دلال اترتے۔ پھر کچھ رکشے اور چھوٹے دلال اور ملاقاتی اترتے۔ ملاقاتی رکشے کا کرایہ چکاتے اور دلال جھپٹتے ہوئے گیٹ کے اندر چلے جاتے۔ کچھ اور کاریں آتیں۔ بڑے دلال سنتری کو ڈپٹ کر کار کو اندر لے جانے کی کوشش کرتے۔ جن کے رعب میں سنتری آ جاتا، وہ اندر کار سمیت چلے جاتے اور جن کے رعب میں سنتری نہ آتا، وہ کار سڑک پر آڑی ترچھی کھڑی کر کے اندر بھاگتے؛ انھیں صرف یہ دیکھنا ہوتا کہ کار اس طرح کھڑی کی جائے کہ سڑک پر آنے والے ٹریفک میں ضرور رکاوٹ پڑے۔

اس پورے منظر نامے میں رفتار کی بڑی اہمیت تھی۔ لوگ بھاگتے ہوئے آتے اور اندر گھس جاتے۔ دھیمی رفتار والے رکشوں کے رکتے رکتے ان کے حوصلے پست نہ ہو جائیں، یہ سوچ کر وہ اپنی رفتار اتنی تیز کرتے کہ جس کا کام ہوتا، اسے چھوڑ کر دوڑتے ہوئے اندر چلے جاتے۔ جس کا کام ہوتا، وہ بھی لشتم پشتم، پیسے رکشے والے کو تھما، اندر بھاگتا۔ اندر کے لوگ لان سے بھاگ کر ملاقاتیوں کے کمرے تک جاتے، پھر وہاں سے بھاگ کر گیٹ پر آ جاتے۔ لوگوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اگر ملک کو ترقی کرنی ہے تو تیز رفتاری ضروری ہے۔

اس درمیان اچانک ایک کار ریڈ لائٹ جلاتی بجھاتی تیز رفتاری سے گیٹ پر پہنچتی۔ سنتری تیزی سے گیٹ کھولتے اور کار باہر سے بھی تیز رفتاری سے اندر گھستی۔ پورٹیکو میں پہنچ کر ڈرائیور زور سے بریک مارتا اور لوگ یقین سے کہہ سکتے تھے کہ منتری جی آ گئے ہیں۔ ایک چپراسی کود کر اگلی سیٹ سے اترتا اور پھرتی سے پچھلا دروازہ کھولتا اور کھڑا ہو جاتا۔ منتری جی بھی تیزی کے ساتھ اتر کر اندر کی طرف لپکتے۔ اگر کوئی پردیسی، جو اس ماحول سے پوری طرح ناواقف ہو، اس منظر کو دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ ملک کے سامنے کوئی بہت ہی سنگین صورت حال پیدا ہو گئی ہے اور اندر کوئی ایسا ہنگامی اجلاس منعقد ہونے والا ہے جس میں اگر منتری جی بروقت نہ پہنچے تو کوئی اہم فیصلہ بیچ اُدھر میں اٹکا رہ جائے گا۔

یہ بات اور ہے کہ اس پردیسی کو حیرت ہوتی جب وہ یہ دیکھتا کہ اتنی تیز رفتاری سے آنے کے بعد منتری جی اپنی بیٹھک کے بیچوں بیچ بچھے صوفے پر پالتھی مار کے بیٹھ گئے ہیں اور آرام سے دو گلاس ٹھنڈا پانی پینے کے بعد ملاقاتیوں کی بھیڑ سے گھرے ہوئے، بغیر کسی ہڑبڑاہٹ کے تبادلوں، کوٹوں، پرمٹوں اور ٹھیکوں کی درخواستوں پر احکامات جاری کر رہے ہیں۔

Scanned with CamScanner

آج بھی یہی ہوا۔ جیسے ہی منتری جی کی کار پورٹیکو میں رکی اور جھپٹتے ہوئے چپراسی نے دروازہ کھولا، کملا کانت نے اپنے کو ایک ایسی جگہ مرکوز کرنے کی کوشش کی جہاں سے منتری جی کو اترتے ہی سیدھے وہ دکھائی دے جائیں، پر ان کی یہ چھوٹی سی خواہش پوری ہونے سے پہلے روندی گئی۔ روندنے والے پاؤں ان کے اردگرد ہی کھڑے تھے، پر کار رکتے ہی وہ سب لپک کر اس کے چاروں طرف اس طرح کھڑے ہوگئے کہ منتری جی کی تیزی کو برقرار رکھنے کے لیے ان کے محافظوں کو دھکم دھکا کرنا پڑا۔

منتری جی کو یہ دھینگا مشتی پسند تھی۔ اگر کسی دن ان کی کار رکنے پر بھیڑ ان کے کار کے دروازے پر دھینگا مشتی نہ کرتی تو وہ اداس ہو جاتے۔ انھیں لگتا کہ ان کے جانے کے دن قریب آ گئے ہیں۔ ان کے محافظ اس بات سے بخوبی واقف تھے، اس لیے اکا دکا لوگوں کو بھی کھینچ کھینچ کر ہٹاتے اور منتری جی کے راستے سے تصوراتی بھیڑ کو ہٹانے کے لیے ہاتھ پیر چلاتے۔

آج بھی منتری جی بھیڑ کے بیچ سے دھکم دھکا کرتے ہوئے اپنی بیٹھک کی طرف بڑھے۔ چالیس پچاس آدمیوں کی بھیڑ میں سے ہر کوئی اپنا چہرہ دکھانے کو بیتاب تھا۔ لوگوں کے ہاتھوں میں درخواستیں لہرا رہی تھیں۔ کچھ کے ہاتھوں میں ہار بھی تھے۔ کچھ لوگ پیر چھونے کے لیے لپک رہے تھے۔ چپراسیوں اور گن مین نے کچھ لوگوں کو کالر پکڑ کر پیچھے کھینچا، کچھ کو کہنیوں سے رگیدا، اور ہاتھوں کا گھیرا بنا کر منتری جی کو برآمدے کی طرف لے چلے۔ سب کچھ اتنا درہم برہم تھا کہ منتری جی خوش ہوگئے اور ایک چوڑی مسکراہٹ ان کے چہرے سے چپک گئی۔

کملا کانت کی سمجھ میں آ گیا کہ وہاں کھڑے کچھ ہونے والا نہیں تھا، اس لیے وہ بھی گھسٹتے ہوئے بھیڑ کا حصہ بن گئے۔

اندر بیٹھک میں سیکریٹریٹ والا ڈراما شروع ہو چکا تھا۔ منتری جی ایک دیوان پر پالتھی مار کر بیٹھ گئے۔ بڑے سے کمرے میں کئی صوفہ سیٹ اور کرسیاں پڑی تھیں۔ لوگوں نے ان کی طاقت کا امتحان لینا شروع کر دیا۔ ہر کرسی کے بینت پر ایک آدمی اور ہتھوں پر دو دو لوگ لٹکے ہوئے تھے۔ صوفوں کے اسپرنگوں سے غمناک سُروں کی لہریں بیچ بیچ اٹھ رہی تھیں اور کئی مرتبہ تو ایسا لگتا تھا کہ کوئی کرسی یا صوفہ دو ہتھڑ مار کر رو رہا ہے۔

Scanned with CamScanner

منتری جی جس دیوان پر بیٹھے تھے، اس کے سامنے کا ایک قالین پوری طرح سے بھر گیا تھا۔ اس پوری بھیڑ کا مقصد ایک ہی تھا— ہوا میں لہراتے، ٹائپ کیے یا ہاتھ سے لکھے فول اسکیپ کاغذ کسی طرح سے منتری جی کے ہاتھوں تک پہنچانا؛ منتری جی کی کاغذ پڑھنے کی کوشش میں ہال میں گونج رہی آوازوں کے درمیان چلّا کر اپنی آواز سے مدد کرنا، اور ان سے کاغذ کے حاشیے پر کچھ لکھوا کر پی اے کی تلاش میں باہر لپکنا۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے وہاں لوگ جو کچھ کر رہے تھے، اسے کسی باہری ملک میں ٹکٹ لگا کر سرکس کی طرح بھی دکھایا جا سکتا تھا۔

ہوتا کچھ ایسے کہ جیسے ہی منتری جی کے ہاتھ سے ایک کاغذ سرکتا، سامنے بیٹھے لوگوں میں سے تین چار ایک ساتھ اٹھ کر ان کی طرف لپکتے۔ ان کے علاوہ صوفوں پر بیٹھے لوگوں میں سے بھی کچھ یہی حرکت کرتے۔ بیچ میں بیٹھے کھڑے لوگوں کے ہاتھوں، پیروں کی انگلیوں کا جمپنگ پلیٹ فارم کی طرح استعمال کرتے ہوئے وہ جس طرح منتری جی کے سامنے پہنچتے، اسے ہوا میں تیرنے سے لے کر رسّی پر چلنے تک کچھ بھی نام دیا جا سکتا تھا۔

ایک کاغذ منتری جی کے ہاتھوں میں پہنچ جاتا۔ دوسرے کاغذ والے داہنے بائیں جھک کر کھڑے ہو جاتے، ایک دو سامنے ہی اُکڑوں بیٹھ جاتے۔ اکثر یہ اندازہ لگانا مشکل ہوتا کہ کاغذ کس کا ہے۔ اگر منتری جی کا قلم رکتے ہی کاغذ کا مالک جھپٹ کر اسے چھین نہ لیتا تو زیادہ اندیشہ اس بات کا ہوتا کہ منتری جی سامنے اکڑوں بیٹھے کسی دوسرے آدمی کو کاغذ تھما دیں۔

کملا کانت ایسی جگہ کی تلاش میں لگ گئے جہاں کھڑے ہونے پر منتری جی سے ان کی آنکھیں ٹکرا سکیں۔ جلد ہی انھیں ایسی جگہ مل بھی گئی۔ وہ خوش ہو گئے۔ پر ان کی خوشی اس دنیا کی مانند بے ثبات ثابت ہوئی۔ کسی سخت دل، بے وفا ہیروئن کی طرح منتری جی کی آنکھیں ان کی آنکھوں سے ٹکرائیں ضرور اور انھوں نے ہر بار دل پھینک عاشق کی طرح اپنے پورے دانت دکھا دیے مگر اُن بے رحم آنکھوں میں جان پہچان اور تعارف کی کوندھ ایک بار بھی نہیں لپکی۔ وہ غمگین ہو گئے۔ انھیں ہندی فلموں کے ہیرو کی طرح ایک کامیڈین کی سخت ضرورت تھی جو انھیں ہیروئن کے حرم تک لے جا سکے۔ انھوں نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ تلاش بے سود ثابت ہوئی۔ کہاں گیا ان کا کامیڈین؟

Scanned with CamScanner

وہ باہر برآمدے میں آ گئے۔ جس پی اے کی بیوی بچوں کے لیے اتنے فکر مند تھے، وہ کمبخت کہیں نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ انھوں نے پوری کوٹھی کا چکر لگایا۔ زیادہ تر لوگ اندر بیٹھک میں ٹھنسے ہوئے تھے۔ باہر کار کے پاس کچھ چپراسی اور سپاہی کھڑے تھے۔ کار میں سامان رکھا جا رہا تھا۔ انھیں یاد آیا کہ منتری جی کو آج رات کہیں باہر جانا تھا۔ وقت بہت کم تھا۔ انھوں نے چاروں طرف دیکھا۔

''اپنے کوشک صاحب کہاں ملیں گے؟''

جس چپراسی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انھوں نے پوچھا تھا، اس نے بیچ سے زمین پر تھوک دیا۔

کملا کانت گھبرا کر اچھل پڑے۔ یہ وہی چپراسی تھا جس کے بیوی بچوں کا حال انھوں نے نہیں پوچھا تھا۔ انھوں نے اس بری گھڑی کو یاد کیا جب ان کے دل میں ایک لفافہ بچانے کی بات آئی تھی۔ یہ موقع نہیں تھا جب وہ اس کے بچوں کے بارے میں سوچتے۔ انھوں نے پھر چاروں طرف دیکھا۔ وہ خوش ہو گئے۔ وہ چپراسی بھی وہاں تھا جس کے دو لڑکوں کو مٹھائی کھانے کے لیے کملا کانت نے دن میں سیکریٹریٹ میں دس دس روپے دیے تھے۔ اگرچہ کملا کانت نے اس کے تیسرے لڑکے کے لیے کچھ نہیں کیا تھا پھر بھی آدمی شریف نکلا۔ اس نے ترس کھانے والی مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ''کوشک بابو اُس پیچھے والے برآمدے میں ہیں۔''

کملا کانت پیچھے کی طرف لپک لیے۔ کوٹھی کچھ اس طرح بنی تھی کہ اس کے چاروں طرف برآمدے تھے۔ برآمدوں کی بھول بھلیوں میں کملا کانت کوشک بابو نامی اس پی اے کو تلاش کر رہے تھے جسے تیزی کے ساتھ بڑھتے ہوئے اس ڈرامے میں مڈل مین کا کردار ادا کرنا تھا اور ان کے تقریباً بگڑے ہوئے کام کو پھر سے بنوانا تھا۔ وقت کم تھا اور منتری جی کبھی بھی اپنی گاڑی میں بیٹھ کر ہوائی اڈے کے لیے پھر سے روانہ ہو سکتے تھے۔

کملا کانت تقریباً دوڑنے لگے۔ برآمدوں میں بھی لوگ کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھیں ابھی اندر منتری جی کے کمرے میں جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ بیچ بیچ میں ان میں سے کچھ اندر جا کر منتری جی کو اپنی صورت دکھا آتے تھے۔ یہ لوگ چار چار پانچ پانچ کے جھنڈ میں کھڑے ہو کر اس انداز میں کھسر پھسر کر رہے تھے جس میں اگر سو گز سے زیادہ آواز نہ پہنچے تو اسے

Scanned with CamScanner

سرگوشی کا نام دیا جا سکتا تھا۔ کیبنٹ ڈویژن میں تبدیلی ہونے جا رہی تھی جس میں منتری جی کو بہت ہی اہم محکمہ مل سکتا تھا؛ منتری جی نے اپنے سیکرٹری کو کمرے میں بند کر کے اس پر چپل اٹھالی تھی؛ بہت سارے تبادلے تھے جن پر احکامات منتری جی نے جاری کر دیے تھے مگر نوکرشاہی کی طرف سے ان پر عمل درآمد نہیں ہو رہا تھا؛ منتری جی کے ضلعے کا پولیس کپتان ان کے کارکنوں کو آپس میں لڑانے کی چال چل رہا تھا... وغیرہ۔

کملا کانت کو یہ سب باتیں غیر دلچسپ لگ رہی تھیں۔ دانت کے درد میں تڑپتے مریض کی طرح ان کا دھیان دنیا کی کسی چیز کی طرف نہیں تھا۔ لوگوں سے بچتے ٹکراتے، انھوں نے اپنے مسیحا کو تلاش ہی کر لیا۔

کوشک بابو ایک کھمبے کی آڑ میں دو لوگوں سے باتیں کر رہے تھے اور ان کی باتیں واقعی سرگوشی کے زمرے میں آتی تھیں۔ کملا کانت تقریباً ان سے سٹ کر کھڑے ہوئے تھے لیکن کچھ سن نہیں پا رہے تھے۔ کوشک بابو نے انھیں زور سے گھور نہ دیا ہوتا تو وہ اب تک ان کے بیچ میں گھس گئے ہوتے۔ کھڑے کھڑے ان کا صبر جواب دے چکا تھا۔ ان لوگوں کی کھسر پھسر ختم ہی نہیں ہو رہی تھی۔

''اچھا...'' کوشک بابو نے ایسے کہا جیسے مکھی اڑا رہے ہوں اور پھر کھسر پھسر شروع ہو گئی۔

کملا کانت کو لگ رہا تھا کہ دن بھر کی ان کی محنت پر پانی پھر گیا۔ ایک بار منتری جی نکل گئے تو پھر سے پوری قواعد کرنی پڑے گی۔

برآمدے میں کھڑے لوگوں میں کچھ ہل چل ہوئی۔ کملا کانت روہانسے ہو گئے۔ ''صاحب نکل رہے ہیں۔''

''ابھی کیسے نکلیں گے؟'' کوشک بابو نام کے ان کے مسیحا نے پھر انھیں گھورا۔

''جہاز کا ٹائم ہو گیا ہے،'' کملا کانت منمنائے۔

''جہاز کا کوئی ٹائم نہیں ہوتا۔ جب منتری جی پہنچیں گے تبھی اس کا ٹائم ہوگا۔''

اس کا کوئی جواب کملا کانت کے پاس نہیں تھا۔ وہ تب تک بے یار و مددگار سے کھڑے رہے جب تک سامنے چل رہی سرگوشی اونچی آواز میں ''نمستے... ملتے رہیے... کام ہو جائے گا... نشا خاطر رہیے...'' جیسے اطمینان بخش الفاظ میں بدل نہیں گئی۔

''آیئے! کہاں رہ گئے تھے آپ؟''

کملا کانت نے ممیاتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی کہ وہ شام سے اب تک کیا کر رہے تھے، لیکن ان کے آگے لپکتے ہوئے کوشک بابو تب تک اس کمرے کے دروازے کے اندر گھس گئے جس میں منتری جی کا دربار اپنے آخری مراحل میں داخل ہو چکا تھا۔

منتری جی کھڑے ہو گئے تھے اور کمرے میں بھرے لوگوں نے ان کے لیے راستہ بنانا شروع کر دیا تھا۔ یہ راستہ بنانا اس طرح تھا جس میں ہر آدمی دوسرے کو بغل میں دھکیلتا ہوا خود کو منتری جی کے سامنے پیش کر رہا تھا۔ اس دھکاپیل میں منتری جی دو قدم آگے ایک قدم پیچھے چل رہے تھے۔ ساتھ ساتھ وہ کاغذوں پر دستخط کرنے سے لے کر اپنا پیر چھونے والوں کو آشیرباد دینے تک کا کام کرتے جا رہے تھے۔

کوشک بابو بغل تک پہنچ گئے۔ منتری جی نے انھیں دیکھا اور انھیں یاد آیا کہ انھیں جہاز پکڑنا ہے۔

''کوشک جی، آپ میرا جہاز چھڑوائیں گے۔ اب تک کہاں تھے؟''

''نہیں سر، ابھی تو کافی وقت ہے۔ سامان گاڑی میں رکھ دیا گیا ہے۔''

''بھئی مجھے ہڑبڑاہٹ پسند نہیں ہے۔ بعد میں اخبار والوں کو مسالا ملتا ہے کہ میری وجہ سے جہاز لیٹ ہو گیا۔''

''جہاز عوام کا ہے۔ آپ بھی عوام کا کام کر رہے ہیں۔ تھوڑا انتظار کرلے گا تو کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا۔''

''نہیں بھئی، مجھے یہ سب پسند نہیں ہے۔ میرے آئیڈیل تو پنڈت نہرو رہے ہیں، وقت کی پابندی تو کوئی ان سے سیکھے...''

کوشک کو پتا تھا کہ منتری جی اب کون سا قصہ سنائیں گے۔ منتری جی کے پاس الگ الگ موضوعات پر الگ الگ قصے تھے۔ اس نے اتنا وقت منتری جی کے ساتھ گزارا تھا کہ اگر وہ درمیان میں قصہ بتاتے بتاتے بھول جاتے تو وہ خود قصہ یاد دلا دیتا تھا۔ آج بھی منتری جی بتا رہے تھے کہ فلاں شہر کی میٹنگ میں انھوں نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا تو انھوں نے گھڑی بند دیکھی۔

Scanned with CamScanner

پنڈت جی کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔ انھوں نے کسی سے صحیح وقت نہیں پوچھا؛ جیسے ہی پنڈت جی اسٹیج پر چڑھے اور جیسے ہی ان کے قدم آگے بڑھے، اس اعلان کے ساتھ منتری جی نے اپنی گھڑی ملالی۔

کوشک جھوم جھوم کر یہ قصہ سناتا رہا۔ اس نے صرف تین سو ستر ہویں بار منتری جی کو یاد دلایا کہ میٹنگ ختم ہونے کے بعد پنڈت جی کو انھوں نے یہ جملہ سنایا تو انھوں نے خوب زور زور سے ٹھٹھے لگائے۔ منتری جی نے تعریفی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور زور سے ہنسے۔ ان کے اردگرد کھڑے خوشامدی، ملاقاتی اور فریادی بھی زور زور سے قہقہے لگانے لگے۔ لوگ بھول گئے کہ منتری جی کو ہوائی جہاز پکڑنا تھا اور انھیں دیر ہو رہی تھی۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا، پلک جھپکتے ہوا اور اس کھیل کے ماہر جانتے تھے کہ ایسا صرف کوشک ہی کر سکتا تھا اور اسی لیے منتری جی پچھلے بیس سالوں سے اسے اپنے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔

منتری جی ملاقاتیوں کے بیچ سے ہو کر اپنی کار کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ ایک ساتھ مسکراتے، ہاتھ جوڑ کر نمستے کرتے اور فریادیوں کے کاغذوں پر کچھ لکھتے جانے کا کام کرتے جا رہے تھے۔ ان کے محافظ اور چپراسی لوگوں کو دھکا دیتے ہوئے ان کے لیے راستہ بنا رہے تھے۔ اسی درمیان کوشک نے منتری جی کے کان میں کچھ کہا۔ منتری جی چلتے چلتے کچھ بدبدائے جسے کوشک کے علاوہ جن لوگوں نے سنا، انھیں لگا کہ منتری جی اپنے من پسند دیوتا کا جاپ کر رہے ہیں۔ کوشک نے چلتے چلتے ہی کملا کانت کے کانوں میں کچھ کہا اور منتری جی کے کار میں بیٹھتے ہی دروازہ بند کر کے ڈرائیور کی بغل والی سیٹ کا دروازہ کھول کر کار میں گھس گیا۔

کملا کانت نے کار کے چلنے کا انتظار نہیں کیا۔ وہ بھیڑ کو دھکیاتے دیتے ہوئے باہر نکل آئے۔ کام ہو گیا تھا، پر جب تک آرڈر ہاتھ میں نہ آ جائے، راجدھانی میں کام ہوا نہیں مانا جاتا۔

دوسرے دن صبح صبح کملا کانت کوشک کے گھر پہنچ گئے۔ کوشک ابھی سویا ہوا تھا۔ اس کی بیوی نے دروازہ کھولا۔ اس نے اجنبیت سے انھیں دیکھا اور دروازہ اُٹکا کر کھڑی رہی۔ کملا کانت نے ''ہیں... ہیں...'' کرتے ہوئے بتایا کہ وہ تو گھر کے آدمی ہیں۔ کوشک صاحب اگر سو رہے ہیں تو وہ انتظار کر لیں گے۔ دروازے کی آڑ میں کھڑی عورت کے نہ ہٹنے پر انھوں نے کچھ مذاقیہ انداز میں کہا کہ کل اپنی بہو کی ساڑی کے لیے انھوں نے کوشک کو جو روپے دیے تھے، بہو آج ہی ان سے اپنی

پسند کی ساڑی لے آئے، نہیں تو مردوں کا کیا بھروسا، کہیں اور خرچ کر ڈالیں۔

اس پر عورت کے چہرے پر کھنچا تناؤ کچھ ڈھیلا پڑا اور وہ ایک کنارے ہٹ گئی۔ کملا کانت اندر گھس گئے اور جو پہلی کرسی انھیں خالی دکھائی دی، اس پر انھوں نے قبضہ کر لیا۔

عورت ایک گلاس پانی لے آئی۔ اس کے چہرے کا تناؤ اب تک ختم ہو گیا تھا۔

''میں تو چائے پیوں گا بھورانی۔''

چہرے پر تناؤ پھر کھنچ گیا۔

''کل غلطی سے میں نے صرف ساڑی کا پیسہ کوشک صاحب کو دیا۔ ہوٹل پہنچ کر پتا چلا کہ تمھاری دیدی نے پیٹی کوٹ اور بلاؤز کے لیے جو پیسے دیے تھے، وہ تو میری جیب میں ہی رہ گئے۔''

کملا کانت نے اپنی جیب سے ایک لفافہ نکالا۔

''رہنے دیجیے بھائی صاحب، یہ اٹھیں گے تو ناراض ہوں گے۔'' عورت نے ایک قدم پیچھے ہٹنے کا ناٹک کیا۔

''بھئی تم مجھے ڈانٹ کھلاؤ گی۔ گھر جا کر تمھاری دیدی سے کیا کہوں گا؟ ساڑی کے پیسے دے آیا اور پیٹی کوٹ بلاؤز کوشک بھائی کے ذمے چھوڑ آیا؟ نا بابا... مجھے نہیں کھانی ڈانٹ...'' وہ قہقہہ مار کر ہنسے۔

چہرے کا تناؤ ختم ہو گیا تھا۔ عورت نے لفافہ ہاتھ میں تھامتے تھامتے کہا، ''آپ مجھے ڈانٹ کھلوائیں گے۔'' اور چائے بنانے چلی گئی۔

کملا کانت پھر کھل کر ہنسے اور تب تک ہنستے رہے جب تک ان کی ہنسی کا مقصد پورا نہیں ہو گیا۔ قہقہوں سے ٹوٹی نیند کی جھنجھلاہٹ لیے کوشک اندر کمرے سے ادھر نکل آیا۔

''اٹھ گئے کوشک صاحب؟ رات دیر سے سوئے شاید۔ منتری جی کا پلین لیٹ ہو گیا تھا کیا؟''

کوشک نے اپنے کرتے کی آستین سے آنکھوں کی کیچڑ صاف کی اور ٹھنڈے لہجے سے جو خبریں دیں ان کے مطابق وہ روز دس بجے کے بعد اٹھتا ہے، منتری جی کا پلین بالکل رائٹ ٹائم سے اڑا، اور سرکاری دفتر دس بجے کے بعد ہی کام کاج شروع کرتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

آخری خبر کملا کانت کے لیے تھوڑی تکلیف دہ تھی۔ اسی درمیان کوشک کی بیوی چائے لے کر آ گئی۔ انھوں نے اپنی تکلیف کا اظہار کیے بغیر چائے لے لی اور جھجکتے ہوئے کہا، ''بھئی کوشک صاحب، ہمارے لیے تو جہاں آپ ہیں، وہیں دفتر ہے، اور آپ جب اٹھ گئے تبھی سرکاری کام شروع ہو گیا۔''

کوشک پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بغیر اپنی جھنجھلاہٹ چھپائے آستین سے کیچڑ صاف کرتا رہا اور کملا کانت ''بے شرمی کامیابی کی سب سے بڑی سیڑھی ہے'' کے اصول کے مطابق چائے سڑکنے کے ساتھ اخبار بھی پڑھنے لگے۔

''میں ابھی فریش ہو کر آتا ہوں،'' بدبداتے ہوئے کوشک اندر چلا گیا۔

اسی بیچ بلاؤز اور پیٹی کوٹ کے پیسوں کی چمک سے پکوڑیاں بھی بن کر آ گئیں۔

کوشک جب غسل خانے سے نکل کر واپس آیا تو دفتر کے کام شروع کرنے کا وقت ہو گیا تھا۔

''ہاں سر، بتائیں، کیا کرنا ہے... کیسے کرنا ہے؟''

کملا کانت نے کچھ نہیں بتایا۔ انھیں پتا تھا کہ راجدھانی میں بات کی شروعات ایسے ہی ہوتی ہے۔

کوشک نے اخبار کا ایک ورق لے کر اس پر آنکھیں گڑا لیں۔ خبریں دیکھتے دیکھتے اس نے کہا:

'' کیسے کرنا ہے... کیا کرنا ہے؟''

''کرنا کیا ہے... کمبھ ایک دم سر پر ہے... سارا کام پچھڑ رہا ہے۔ بعد میں میلے میں کچھ ہو گیا تو آپ لوگ میری گردن پکڑیں گے۔ میرا آرڈر دلوایئے۔ میں فوراً بھاگوں۔ اب تک تو پانٹون پلوں کا ٹینڈر کھل جانا چاہیے تھا۔ سڑکوں کا کام بھی شروع ہو...''

کوشک نے کمبھ میلے کے کاموں کی فہرست میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔ اس نے پھر اخبار میں سر گڑا لیا۔

کملا کانت سمجھ گئے کہ انھوں نے جلد بازی کر دی۔ سالا پورا گھاگھ ہے۔ ایسا دکھا رہا ہے جیسے کوئی بھک منگا سامنے بیٹھا گڑگڑا رہا ہو۔ انھوں نے بھی اپنی نگاہیں اخبار میں گڑا دیں اور پڑھتی ہوئی

Scanned with CamScanner

خبروں کو پھر سے پڑھنے لگے۔

''ہاں تو سر جی، کیا کرنا ہے؟''

کملا کانت نے کچھ نہیں بتایا کہ کیا کرنا ہے۔ انھیں اچانک چار بار پڑھی ہوئی خبر بے حد اہم لگنے لگی۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبے اسے پانچویں بار پڑھنے لگے۔

''کیا مل گیا سر؟ کوئی خاص خبر؟''

''نہیں... ایسا کچھ خاص نہیں۔'' کملا کانت نے اخبار سے سر اٹھایا۔ اب سالا پٹری پر آیا۔

''صاحب سے کچھ بات ہوئی آپ کی؟''

''ہوئی تھی ہوائی اڈے جاتے وقت۔ مل جائے گا آپ کا آرڈر بھی۔ پریشان کیوں ہیں؟''

''نہیں، پریشانی کچھ نہیں... بس کئی دن ہو گئے راجدھانی میں پڑے پڑے... کمبھ ایک دم سر پر آ گیا ہے اور...''

کوشک نے کمبھ کا تھا شروع ہوتے ہی آنکھیں موند لیں۔ کمبھ شروع ہونے والا ہے اور ابھی تک سڑکیں بننی نہیں شروع ہوئیں، پانٹون کا ٹینڈر نہیں نکلا یا میلے کے علاقے میں مٹی کی بھرائی ابھی تک نہیں شروع ہوئی تو آگے کام کیسے ہوگا... یہ ساری باتیں وہ چودھویں بار سن رہا تھا، چار بار کملا کانت کے منھ سے اور دس بار بٹوک چند اپادھیائے کے منھ سے، اس لیے اگر کملا کانت بھول جاتے تو وہ یاد دلا دیتا کہ ابھی چھتناگ کی طرف کی زمین کو برابر کرنے کا کام بھی شروع نہیں ہوا۔ بنارس، بہار یا بنگال سے آنے والی گاڑیاں پارک کہاں ہوں گی؟ پر کملا کانت نہیں بھولے۔ انھیں اور بھی بہت سی چیزیں یاد تھیں لیکن کوشک کا صبر جواب دینے لگا۔ وہ اب سیدھی بات پر آ گیا۔ ''صاحب نے راستے میں کہا تھا کہ آپ سے سیکریٹریٹ میں بات ہو گئی ہے۔ مجھے آپ نے بتایا نہیں کہ کیا بات طے ہوئی ہے؟''

کملا کانت نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا۔ سالا پھر گھا گھ پنا کر رہا ہے۔

''بات کیا کوشک صاحب... میں نے تو کہہ دیا، ہم آپ سے باہر تھوڑے ہی ہیں، جو حکم ہوگا وہ ہو جائے گا۔''

''آپ کو باہر کا کون سمجھتا ہے... آپ تو اپنے ہیں۔ پچھلی بار چناؤ میں نہیں دکھائی دیے تب

Scanned with CamScanner

بھی ہم تو آپ کو اپنا ہی مانتے سمجھتے رہے۔'' کوشک منتری جی کی غیر موجودگی میں ہمیشہ ''ہم'' کہتا تھا جس سے سامنے والا اسے اور منتری جی کو ایک جان ہی سمجھے۔

کملا کانت نے چونک کر دیکھا۔ کمبخت مہین ڈھنگ سے باتیں کر رہا ہے۔ کل دن میں تو اس موضوع پر بات ہو چکی تھی۔ کچھ اور بڑھانے کا ارادہ ہے کیا؟ انھوں نے ایک مرتبہ پھر تفصیل سے انڈین ریلویز اور روڈ ویز کے ٹائم ٹیبل کے بے معنی پن پر روشنی ڈالنی شروع کر دی۔ جب وقت کی پابندی نہیں کرنی تو چھاپتے کیوں ہیں؟ انھوں نے بتایا کہ کس طرح وہ ہر بار منتری جی کو کچھ منٹوں کے فرق سے مس کرتے رہے۔ ایک بار تو پکا ارادہ کر لیا تھا کہ وہ انتخابی حلقے میں جا کر ہی منتری جی کے چرن کملوں پر عقیدت کے پھول نچھاور کر آئیں لیکن وہ تو وائف کو کالرا ہو گیا۔ انھوں نے تو کہا بھی کہ آپ ہو آیئے، منتری جی گاڑھے وقت میں کتنا کام آتے ہیں، نہیں جائیں گے تو دشمنوں کو کہنے کا موقع مل جائے گا کہ جب کام پڑا تو منھ چھپانے لگے، لیکن میں نے ہی سوچا کہ سیریس حالت میں وائف کو چھوڑ کر جانے میں کچھ الٹا سیدھا ہو گیا تو کسے منھ دکھائیں گے۔ اور پھر منتری جی کو اگر پتا چل گیا کہ ان حالات میں آئے ہیں تو ضرور ڈانٹیں گے۔

کوشک کو اچانک لگا کہ کمرے میں مکھیاں زیادہ ہو گئی ہیں۔ وہ اخبار کو تلوار کی طرح استعمال کرتے ہوئے ان کا قلع قمع کرنے لگا۔ کملا کانت جب یہ تفصیلات بیان کر رہے تھے کہ کیسے ایک بار کڑی دھوپ میں وہ منتری جی کے بنگلے پر پہنچے اور یہ معلوم ہوا کہ وہ ابھی ابھی نکل گئے ہیں تو انھیں غش آتے آتے بچا، کوشک نے مکھی مار مہم روکتے ہوئے دھیرے سے کہا:

''اندر آ جاتے۔ میں تو ہوتا ہی۔ ٹھنڈا پانی پلا دیتا۔''

کملا کانت نے اپنا بیان بند کر کے آنکھیں موند لیں۔ کمبخت پوری چمڑی ادھیڑے بغیر نہیں چھوڑے گا۔ انھوں نے دل ہی دل میں حساب لگایا، منتری جی کے علاوہ ابھی اسے کتنا دینا پڑے گا!

وہ تب تک آنکھیں موندے رہے جب تک کوشک کی بیوی کی آواز نہیں سنائی دی۔

''آپ تو بھائی صاحب، سو گئے۔ پکوڑیاں ٹھنڈی ہو گئیں۔ میں تو گرم لے آئی۔'' اس نے ٹھنڈی پکوڑیاں سامنے سے ہٹا کر گرم پکوڑیوں کی پلیٹ سامنے رکھ دی۔

''بس کرو بہورانی۔ صبح صبح کتنا کھا گیا۔''

Scanned with CamScanner

کملا کانت کو لگا کہ دوسری پلیٹ کو ہاتھ لگاتے ہی ایک اور ساڑی کا حق بن جائے گا۔

''ہاں تو سر جی، واپس جانے کا کیا پروگرام بنایا؟''

''ہمارا پروگرام تو آپ کے حکم پر ہے کوشک جی۔ جب آپ کہہ دیں گے، اپن روانہ ہو جائیں گے۔'' کملا کانت نے قہقہہ لگایا، پر کوشک نے یہ ماننے سے انکار کر دیا کہ کملا کانت کا جملہ کوئی ایسا لطیفہ تھا جس پر ہنسا جا سکے۔ اس نے ایک بار پھر اپنے ہاتھ کے اخبار کو مکھی مار وہم میں لگا دیا۔

کملا کانت کو اچانک یہ پوری کارروائی بڑی دلچسپ لگنے لگی۔ انھوں نے ایک بار نشانہ ٹھیک لگنے پر کوشک کی تعریف کی، دو بار چوک جانے پر افسوس کا اظہار کیا اور ایک بار تھوڑی دوری پر بیٹھی ہوئی مکھی کی طرف اشارہ کیا۔ کوشک نے ہاتھ کا اخبار زمین پر پھینک دیا۔

''ہاں تو سر جی، کیا حکم ہے؟''

سر جی یعنی کملا کانت، چپ چاپ بیٹھے رہے۔

''سر جی، دفتر بھی جانا ہے۔''

''آج تو منتری جی نہیں ہیں، آج کیا جلدی ہے؟''

''اجی ہمیں کہاں فرصت . . . '' کوشک نے تفصیل بتانا شروع کی کہ منتری جی رہیں نہ رہیں، اسے تو وہی دس بجے دفتر جانا ہوتا ہے اور رات آٹھ بجے تک وہیں سڑنا پڑتا ہے۔ اس کی بیوی نے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا، ''کئی بار کہہ چکی ہوں کہ دفتر میں اپنا بستر بھی لے جایا کرو، رات میں بھی گھر آنے کی کیا ضرورت ہے۔'' اس پر کملا کانت نے اسے نصیحت کی کہ مردوں کا کوئی بھروسا نہیں، اسے کوشک کو اتنی چھوٹ نہیں دینی چاہیے۔ کوشک اور اس کی بیوی ہنسے تو کملا کانت نے کوشک کی بیوی کو بتایا کہ سرکار کا کام تو کوشک صاحب کے سہارے چلتا ہے۔ منتری جی تو بیچارے کس قدر مصروف رہتے ہیں؛ یہ تو اس کے پتی ہیں جس کی وجہ سے سرکار میں کچھ کام ہو رہا ہے اور عوام کو تھوڑی بہت راحت مل رہی ہے۔

کوشک کا من پسند موضوع شروع ہو گیا تھا۔ وہ کرسی پر ادھ لیٹا ہو گیا اور اس نے اپنی بیوی کو بتایا کہ سر جی تو پرانے مہربان ہیں اور آدمی پہچانتے ہیں۔ کام وہ ضرور جم کر کرتا ہے اور سرکار بھی اسی کے دم پر چل رہی ہے، پر سب کچھ کملا کانت جیسے بزرگوں کی مہربانی اور آشیرباد کا پھل ہے۔

Scanned with CamScanner

کملا کانت نے یہ تو مانا کہ وہ بزرگ ہیں اوران کی نیک خواہشات ہمیشہ کوشک کے ساتھ ہیں، پر اگر کوشک میں اتنی خوبیاں نہ ہوتیں تو کیا منتری جی اس پر اتنا اعتماد کرتے؟ اب ان کے تبادلے کو ہی لے لیا جائے۔ کون شخص اعتماد کیے بغیر اپنے پی اے کو سولہ سونپنے کا حکم دے گا؟

سولہ سنتے ہی کوشک کی بیوی کو لگ گیا کہ اب کچھ گمبھیر سرکاری کام کا وقت آ گیا ہے۔ اس نے اچانک دیکھا کہ دوسری بار کی پکوڑیاں بھی ٹھنڈی ہو گئی ہیں۔ وہ تیسری بار گرم پکوڑیاں لانے کے ارادے کا اعلان کرتے ہوئے اٹھی۔

''سر جی، سولہ کا کیا چکر ہے؟ صاحب تو مجھے کہہ گئے تھے کہ آپ بیس لے کر آئیں گے۔''

''آپ بھی کوشک صاحب، خوب مذاق کرتے ہیں۔'' کملا کانت اس اصول کے مطابق ہنسے کہ اپنے مخالف کو چت کرنے کے لیے دلائل سے زیادہ مفید قہقہے ثابت ہوتے ہیں۔

کوشک نے ان سے بھی تیز قہقہہ لگایا۔ اس کا اس بات پر یقین تھا کہ اگر آپ مخالف سے تیز آواز میں ہنس سکتے ہیں تو آپ اسے زیادہ آسانی سے زیر کر سکتے ہیں۔

''منتری جی نے خود مجھ سے سولہ کہا تھا۔''

''مجھے بیس لینے کو بولا۔''

''سولہ۔''

''بیس۔''

ایک بار پھر اسٹاک ایکسچینج کی گہما گہمی شروع ہو گئی۔ کملا کانت نے ری پلے کی طرح سیکریٹریٹ میں منتری جی اور ان کے درمیان باتھ روم میں پیش آنے والے واقعات کی ایک پوری جائزہ رپورٹ دہرانا شروع کی۔ کوشک نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے ہی وہ تفصیل سے گزر کر بیس سے سولہ پر سودا طے ہونے پر پہنچے، کوشک نے آنکھیں کھول دیں۔

''سر جی، مہنگائی بہت بڑھ گئی ہے۔''

کملا کانت نے انفلیشن کی رفتار کو اتنا تیز ماننے سے انکار کر دیا جس میں ایک رات میں پچیس فیصد مہنگائی بڑھ جائے۔ کوشک نے انھیں یقین دلانے کی کوشش کی کہ مہنگائی تو اس سے بھی زیادہ تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ دن دونی رات چوگنی والی کہاوت، کوشک کے مطابق، دانشوروں نے

مہنگائی کو ہی ذہن میں رکھتے ہوئے ایجاد کی ہے۔

مہنگائی کا ذکر چلا تو کوشک کی بیوی بھی بحث مباحثے میں شریک ہو گئی۔ ہمارے ملک میں مانا جاتا ہے کہ مہنگائی کا تعلق صرف اور صرف چولھے ہانڈی سے ہے، اس لیے جیسے ہی اس کے کان میں بحث کا یہ حصہ پڑا، وہ تلی پکوڑیاں آگ کے رحم و کرم پر چھوڑ کر وہاں پہنچ گئی۔

''اب بھائی صاحب، مہنگائی کی کیا بات کریں... ہر طرف آگ لگی ہے۔ کل جو لوکی ڈیڑھ روپے کی لائی تھی، آج آپ کے آنے کے پہلے وہی مجھے سوا دو کی دے گیا سبزی والا۔ موا ایک پیسہ کم کرنے کو راضی نہیں ہوا۔''

کملا کانت نے لوکی کے اس تازہ بھاؤ کی تفصیل میں کوئی زیادہ دلچسپی نہیں دکھائی۔ انھوں نے اس تفصیل میں پوشیدہ جذبات کو فوراً محسوس کر لیا۔ کوشک جس مہنگائی کی بات کر رہا تھا، وہ دراصل منتری جی کی نہیں، اس کی اپنی مہنگائی تھی۔ سالا چارا اپنے لیے مانگ رہا ہے۔ انھوں نے سوچا پیچ سے زمین پر تھوک دیں، پر گول گول منھ بنانے کے بعد وہ تھوک نگل گئے اور مسکرانے لگے۔

ایک بار پھر وہ لمبی بحث چھڑ گئی جو ایسے موقعوں پر چھڑا کرتی ہے۔ کملا کانت نے کوشک کو بتایا کہ وہ انھیں گھر کا آدمی سمجھے، کہ وہ اس سے باہر تھوڑے ہی ہیں، کہ وہ ہمیشہ کوشک کے لیے کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہے ہیں اور آگے بھی کرتے رہیں گے، کہ وہ منتری ونتری کسی کو نہیں جانتے کیونکہ وہ تو آتے جاتے رہتے ہیں اور کوشک ایک ابدی حقیقت ہے، اس لیے ان کے لیے تو کوشک کا حکم سر آنکھوں پر، اور سب سے آخر میں یہ کہ کمبھ کا کام شروع ہوا تھا کہ ان کا تبادلہ ہو گیا۔ ابھی ٹینڈر ڈالنے کی تاریخیں بھی طے نہیں ہوئی ہیں، کھلنے کی بات تو دور رہی۔ آج کل ٹھیکیدار اتنے پاجی ہو گئے ہیں کہ صرف کرسی کو سلام کرتے ہیں۔ جیسے ہی ان کا تبادلہ ہوا، جنھوں نے ایڈوانس دیے تھے، انھوں نے واپسی کا تقاضا کرنا شروع کر دیا ہے۔ اب وہ واپس جائیں گے تو پھر کچھ نہ کچھ کوشک کے لیے بھی کریں گے۔

کوشک نے ان کا مستقبل میں کچھ کرنے کا ارادہ اسی طرح سنا جس طرح غریب بستی کے لوگ الیکشن کے قریب آنے والی تقریروں میں اپنی حالتِ زار سدھرنے کے نعرے اور اعلانات سنا کرتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

اس نے بھی تفصیل سے بتایا کہ وہ تو ہمیشہ سے ہی کملا کانت جی کو اپنا بڑا بھائی سمجھتا رہا ہے۔ جب پچھلے الیکشن میں وہ منتری جی کے بلانے پر بھی نہیں آئے تب مخالفین نے کس قدر منتری جی کے کان بھرنے کی کوشش کی تھی کہ کملا کانت اس افواہ کی وجہ سے اپنا منہ نہیں دکھا رہے ہیں کہ منتری جی اس الیکشن میں ہارنے والے ہیں اور اگر جیتے بھی تو پارٹی انھیں منتری نہیں بنائے گی۔ وہ تو کوشک ہی تھا جس نے منتری جی کے دل میں ان کی طرف آئی نفرت کو نکال پھینکا اور ان کی وفاداری پر کوئی شک وشبہ نہ کیا جائے اس کے لیے سرتوڑ کوشش کی۔ کل بھی کملا کانت ہی کو دیکھ کر منتری جی نے تو کوشک کے کان میں کہہ دیا تھا کہ انھیں جانے کو بول دیا جائے، پر کوشک نے ہی ان کی خوشامد کی تھی کہ ایک بار کملا کانت جی کی بھی سن لیں۔ منتری جی کے دربار میں وہ ہمیشہ کملا کانت جی کی بڑائی اور بھلائی کا دھیان رکھتا ہے، ان کے فائدے کی بات کرتا ہے، مگر وہ کیا کرے، مہنگائی اتنی بڑھ گئی ہے کہ آدمی کا جینا مشکل ہو گیا ہے۔

مہنگائی کی رٹ پر بات ختم ہوتے ہی کملا کانت کو ایک بار پھر یاد آیا کہ کوشک ان کا چھوٹا بھائی ہے اور چھوٹے بھائی کی گرہستی میں مدد کرنا ان کا فرض نہیں بلکہ اس کا حق ہے۔ وہ کہیں بھاگے تو جا نہیں رہے ہیں، ہمیشہ کام آئیں گے۔ کوشک کو اس میں کوئی مضائقہ نہیں تھا، پر مہنگائی سارے رشتے گڈمڈ کرنے پر تلی تھی۔

کملا کانت کی سمجھ میں آ گیا کہ کسی پچھڑے علاقے کی انتخابی مہم میں سرگرداں عوام کی طرح کوشک بھی ہوشیار ہو گیا ہے اور اب صرف تسلی سے بات آگے نہیں بڑھنے والی۔ انھوں نے ہتھیار ڈال دیے اور وہ جملہ کہہ گئے جس کا کوشک کو انتظار تھا:

''ہاں تو بتائیے کوشک صاحب، کیا کرنا ہے؟ کیسے کرنا ہے؟''

''کیا کرنا ہے؟'' کے جواب میں کوشک نے جو بتایا، اس سے ایک بار وہی لمبی بحث چھڑ گئی جس میں کملا کانت کو بار بار بتانا پڑا کہ وہ تو گھر کے آدمی ہیں اور کہیں بھاگے تھوڑے ہی جا رہے ہیں اور کوشک کو ہر بار بڑھتی ہوئی مہنگائی کی یاد آتی رہی۔ کافی چخ چخ کے بعد یہ طے ہوا کہ کوشک کو کملا کانت منسٹر کے سولہ لاکھ کے علاوہ پچاس ہزار اور دیں گے۔

''کیسے کرنا ہے؟'' پر کملا کانت کے بار بار یہ کہنے کے باوجود کہ وہ ان لوگوں سے الگ نہیں

Scanned with CamScanner

ہیں اور جو طے ہوا ہے، کردیں گے، ایک بار آرڈر مل جائے تو سب ہو جائے گا، کوشک نے صاف کردیا کہ منتری جی کہہ گئے ہیں کہ پہلے سارا پیسہ کوشک کے پاس پہنچادیا جائے، پھر وہ محکمے کے سیکرٹری کو فون کرکے آرڈر جاری کرنے کے لیے کہیں گے۔

کملا کانت تھوڑی دیر میں ہی سمجھ گئے کہ پیسہ جذباتیت کا سب سے بڑا دشمن ہے، اس لیے انھوں نے دیر تک یہ دہائی نہیں دی کہ وہ ان لوگوں سے الگ نہیں ہیں، باہر والے نہیں ہیں، گھر کے آدمی ہیں۔ یہ طے ہوا کہ وہ دوپہر لنچ کے وقت سارا پیسہ لے کر کوشک کے گھر آجائیں گے اور کوشک بھی دوپہر میں تھوڑی دیر کے لیے دفتر چھوڑ کر گھر آجائے گا۔

کملا کانت جب کوشک کے گھر سے نکلے، ان کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ وہ راجدھانی روانہ ہونے سے پہلے جتنا سوچ کر چلے تھے، تقریباً اتنے میں ہی معاملہ طے ہو گیا تھا، بلکہ کچھ بچ بھی گیا تھا۔ انھوں نے پندرہ سے بیس لاکھ میں معاملہ نپٹانے کی سوچ رکھی تھی اور بات سولہ لاکھ میں بن گئی۔ پچاس ہزار کوشک کو دینے پڑ رہے تھے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ کوشک کو خوش رکھنا منتری جی کو خوش رکھنے سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ انھوں نے حساب لگایا کہ وہ دس لاکھ ساتھ لے کر چلے تھے، باقی ساڑھے چھ لاکھ کا انتظام راجدھانی میں کرنا تھا۔ راجدھانی میں بہت سے ایسے لوگ تھے جن سے ان کے ایسے تعلقات تھے کہ وہ اس رقم کا انتظام کر سکتے تھے، پر معاملہ اتنا نازک تھا کہ وہ ہر کسی کے پاس اس خبر کے ساتھ نہیں جا سکتے تھے کہ ان کا تبادلہ رک رہا ہے۔ انھیں زیادہ دیر تک سر کھپانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ ان کے دو مہرے وہاں موجود تھے۔ ان میں دھورو لال یادو تو بہت کام کا نہیں تھا: اس سے کوشک کے ہاتھ پیر تڑوائے جا سکتے تھے پر پیسے کا انتظام نہیں کروایا جا سکتا تھا۔ اس کے مقابلے میں للن رائے زیادہ کارآمد ثابت ہو سکتا تھا۔ وہ راجدھانی کے چکر لگاتا رہتا تھا اور انھیں پوری امید تھی کہ وہ شہر میں اس رقم کی کہیں نہ کہیں سے جگاڑ ضرور کر دے گا۔ کوشک کے گھر سے نکل کر کملا کانت للن رائے اور دھورو لال یادو کی تلاش میں نکل پڑے۔

Scanned with CamScanner

کمرے میں وہی موضوع چل رہا تھا جو ایسے کسی کمرے میں چل سکتا تھا، یعنی زمانے کو کوسا جا رہا تھا۔ چونکہ یہ بھرے پیٹ اور اگھائے لوگوں کا جماؤ تھا، اس لیے باتیں زمانے میں آگ لگانے والی مہنگائی کو لے کر نہیں ہو رہی تھیں۔ زمانے کا ایک دوسرا پہلو آج کی تشویش کا موضوع تھا۔ لوگ اس بات کو لے کر دکھی تھے کہ رشوت لینے دینے جیسے معاملے میں اخلاقیات کا احساس ختم ہوتا جا رہا ہے۔

اوسط ہندوستانی کی طرح ہر شخص کے پاس تجربات کا نہ ختم ہونے والا خزانہ تھا اور اوسط ہندوستانی کی ہی طرح ہر شخص اس خزانے کو لٹانے کے لیے بے چین تھا۔ کئی پیڑھیاں وہاں جمع تھیں اور اس طرح کئی پیڑھیوں کے تجربات وہاں جمع تھے۔

پرانے لوگوں نے ایسی ایسی کہانیاں سنائیں جن پر نئی پیڑھی کے لوگوں کی آنکھیں محاورے کے مطابق کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ مثلاً ''کیا زمانہ تھا صاحب، ایک بار نوٹ گن آیئے، پھر بے فکر ہو جایئے۔ یہ نوٹ گنوانے والے کی ذمے داری ہو جاتی تھی کہ آپ کے گھر آپ کا کاغذ پہنچ جائے۔''

''ارے صاحب، نوٹ گننے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ آپ ایک بار زبان ہلا دیجیے، پھر آپ کا کام ختم۔ کام کرنے والے کو پتا ہے کہ کام ختم ہو جانے کے بعد مال اپنے آپ پہنچ جائے گا۔''

''بھائی، پرانے لوگوں کی وفاداری کی بات ہی کچھ اور تھی۔ میرے پڑوس میں ایک ریٹائرڈ ڈپٹی صاحب رہتے ہیں۔ ان سے سنیے پرانے قصے۔ ایک مرتبہ کسی تھانے سے جلد بازی میں انھیں اپنی روانگی لکھوانی پڑی۔ شراب کا ٹھیکیدار اپنے کسی رشتے دار کے یہاں باہر گیا ہوا تھا۔ اس سے ہر مہینے سو روپے ملتے تھے۔ انھوں نے مان لیا کہ اس مہینے کا پیسہ بٹے کھاتے میں گیا۔ لیکن صاحب، پرانے لوگوں کی کیا بات . . . ایک دن کیا دیکھتے ہیں کہ گھر کے سامنے ایک رکشہ رکتا ہے اور ایک نوجوان اترتا ہے۔ ڈپٹی صاحب برآمدے میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ چشمہ نیچے کر کے نوجوان

کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ نہیں پہچان پاتے۔ کیسے پہچانتے؟ کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ تو جب نوجوان اندر آتا ہے، تب معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسی شراب کے ٹھیکیدار کا بیٹا ہے جس کے اوپر سو روپے کا قرض چھوڑ کر ڈپٹی صاحب چلے آئے تھے، اور اس کا ٹھیکیدار باپ جب تک زندہ رہا، انھیں تلاش کرتا رہا اور آخر میں مرتے مرتے اسے یہ ذمے داری سونپ گیا کہ وہ داروغہ جی کی امانت انھیں سونپ کر باپ کا قرض چکائے۔ کلجگ کے باوجود بیٹے نے اپنا دھرم نبھایا اور ڈھونڈتے ڈھونڈتے پتا لگا ہی لیا کہ داروغہ ترقی پاتے پاتے ڈپٹی ایس پی ہو گئے تھے اور پھر ریٹائر ہو کر اس شہر میں رہنے لگے ہیں۔ ڈپٹی صاحب نے نوجوان کا دیا ہوا لفافہ کھولا تو اس میں ملکہ وکٹوریہ کی فوٹو والا کڑک نوٹ ملا۔ آج کل کا کاغذ تو تھا ہی نہیں کہ تڑ مڑ جاتا۔۔۔''

سامعین نے سنسکرت ناٹکوں کے کرداروں کی طرز پر ''دھنیہ! دھنیہ!'' کے نعرے لگائے۔ کچھ ٹھیکیدار بیٹے کی فرمانبرداری پر نثار ہو رہے تھے تو کچھ اس کی اخلاقی قدروں کی داد دے رہے تھے۔ دونوں موضوعات پر لوگوں کے سامنے ڈھیر سارے تجربات تھے اور کچھ دیر تک کمرے میں ایک ساتھ کئی لوگ بولتے رہے۔ کبھی کسی رشوت دینے والے کی ایمانداری کا تذکرہ کمرے پر چھا جاتا تو کبھی رشوت لینے والے کو زمین بوس کر کے فرمانبردار بیٹا جوتے، لات پر رکھ لیتا۔

کمرہ چونکہ کوشک صاحب کا تھا اور اس میں سمائے یا ٹھنسے قصہ گو کسی نہ کسی کام سے وہاں موجود تھے، اس لیے ظاہر تھا کہ جب انھوں نے ایک قصہ چھیڑا تو سب چپ ہو گئے۔ قصے کی تمہید کچھ اس طرح تھی کہ انھوں نے بھی زمانے کے زوال پذیر ہوتے جانے پر کچھ دردناک جملے سنائے اور پھر سیدھے قصے پر آ گئے۔

''اب مجھ سے نام مت پوچھیے گا، پر مجھے سیتاپور کے ایک تعلقہ دار نے یہ آپ بیتی سنائی تھی۔ ہوا کچھ ایسا کہ ان کی اپنے پڑوسی تعلقہ دار سے ٹھن گئی۔ تھوڑا زمین کا معاملہ تھا اور زیادہ ناک کا۔ سو ہوئی مقدمے بازی۔ نچلی عدالتوں سے ہوتا ہوا مقدمہ اودھ ہائی کورٹ پہنچ گیا۔ جن جج صاحب کے یہاں مقدمہ تھا، ان کی شہرت کچھ ایسی تھی کہ چاندی کی جوتی سے کچھ بھی کرا لو۔ تو صاحب، سیتاپور والے تعلقہ دار نے ملنے کی جگت بھڑائی اور گن آئے پورے ایک لاکھ روپے۔ سستی کا زمانہ تھا۔ اس وقت ایک لاکھ آج کے بیسیوں لاکھ کے برابر تھے۔ روپیہ گننے کے بعد بے فکر ہو کر بیٹھ گئے۔ ایک دن

Scanned with CamScanner

اڑتی پڑتی خبر ملی کہ دوسرے تعلقہ دار نے بھی کسی وکیل کے ذریعے ایک لاکھ بھجوا دیے ہیں۔ بیچارے کے کاٹو تو خون نہیں۔ بھاگتے پڑتے پہنچ گئے جج صاحب کی کوٹھی پر۔ بڑی مشکل سے ملاقات ہوئی۔ بولے، حضور، مائی باپ، خادم کچھ اور رقم لے کر آیا ہے، قبول کی جائے۔ جانتے ہیں جج صاحب نے کیا جواب دیا؟ جج صاحب نے کہا کہ اب تو دونوں پلڑے برابر ہیں... ناؤ کیس ول بی ڈسائیڈڈ آن میرٹ۔''

زور کا قہقہہ لگا اور ایک بار پھر لوگوں نے انگریز بہادر کے راج کی تعریف کی کہ تب کے جج صاحبان اتنی منصفانہ طبیعت کے ہوتے تھے۔ آج تو رشوت خور بھی بے ایمان ہو گئے ہیں۔

اودھ ہائی کورٹ والا قصہ سناتے وقت کوشک کی نگاہ جس چہرے پر گڑی تھی، اس پر پہلے سے ہی مردنی چھائی ہوئی تھی، قصہ ختم ہوتے ہوتے وہ اور مرجھا گیا۔ مرجھائے چہرے والے نے اندر ہی اندر اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ دونوں پلڑوں کو برابر کرنے کے لیے کتنا بڑا باٹ رکھنا پڑے گا۔ بات پھیل چکی تھی کہ کملا کانت نے تبادلہ رکوانے کے لیے بیس لاکھ خرچ کیے تھے۔ اس نے آرڈر نکلواتے وقت دس دیے تھے، اسی طرح ابھی گیارہ بارہ اور دینے پڑیں گے۔ لوگوں کے قہقہوں کے درمیان اس دکھی اُداس چہرے نے، جس کا نام بٹوک چند اُپادھیائے تھا، ان کا ساتھ دینے کی کوشش کی، لیکن ہنسی کو دیکھ کر دھوکا ہوا کہ وہ رو رہے ہیں۔

کوشک کا کمرہ کئی دنوں تک سونا رہنے کے بعد آوازوں سے جھنجھنا رہا تھا۔ منتری جی آج تیسرے پہر لوٹنے والے تھے اس لیے تمام فریادی اور ان کے پیروکار لوٹ آئے تھے۔ یہ لوگ صوبے کے الگ الگ علاقوں سے آئے تھے۔ وہ اپنے اپنے علاقوں کی بولیاں بول رہے تھے۔ فریادی دھوتی بنیائن سے لے کر سفاری سوٹ تک میں تھے، پیروکار کھادی کے کرتے پاجاموں میں۔ عموماً فریادی کے لباس اور انداز کا اثر پیروکاروں کی پوشاک پر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ دھوتی بنیائن والے کا پیروکار ملگجے پاجامے کرتے میں تھا تو سفاری سوٹ پہنے اور نمبروں والا بریف کیس لیے ہوئے فریادی کا پیروکار کڑا اکلف لگا پولیسٹر کھادی کا کرتا پاجامہ زیب تن کیے تھا۔

کمرے میں نیا داخل ہونے والا ہر شخص پہلا سوال ایک جیسا ہی کر رہا تھا، اس لیے ہر تھوڑی دیر بعد کوشک جیسے ہی نو وارد سارس کی طرح اپنی گردن بڑھاتا تو اس کا تھوبڑا دیکھے بغیر سوال سے

Scanned with CamScanner

پہلے جواب دے دیتا:

''صاحب تین بجے تک آ جائیں گے!... نہیں۔ لنچ کے لیے گھر نہیں جائیں گے... سیدھے سیکریٹریٹ آئیں گے...''

آنے والوں میں نوے فیصد کو وہ چہرے سے پہچانتا تھا۔ پیروکار بھی پرانے تھے۔ برسوں سے وہ انھیں دیکھ رہا تھا۔ پہلے دوسرے منتری کے ساتھ تھا تب بھی یہ وہاں آتے تھے؛ آج ان منتری کے ساتھ ہے اور یہاں بھی وہ آ رہے ہیں۔ ان کا پورا نام تو شاید ہی کسی کو یاد ہو، لیکن شرما جی، ورما جی، خان صاحب یا ترپاٹھی جی جیسے سرنیم سبھی کو یاد تھے۔ اس کی کامیابی کا راز بھی یہی تھا کہ اس نے کبھی کسی شرما جی کو ورما جی کہہ کر نہیں پکارا۔ ہاں، اس نے اپنی آسانی کے لیے کچھ ترتیب ضرور مقرر کر رکھی تھی، جیسے سارے برہمن اس کے لیے پنڈت جی تھے اور جہاں اسے کسی کے بارے میں شک ہوتا، وہ اسے سر، جناب کہہ کر پکارتا اور تب تک سر، جناب وغیرہ کے لقب پر ہی زور دیتا جب تک اسے سامنے والے کو پکارنے لائق کوئی لفظ نہ مل جاتا۔

''آرام سے بیٹھیے، پنڈت جی، صاحب سیدھے یہیں آئیں گے۔''

''لنچ ونچ کہاں کرتے ہیں...''

کوشک نے جسے بیٹھنے کے لیے کہا تھا، وہ کچھ وی آئی پی نظر آ رہا تھا، کیونکہ کوشک نے اسے بیٹھنے کی دعوت دینے کے ساتھ ہی اپنی پیٹھ کو کرسی سے کچھ اونچا کرنے کی کوشش کی تھی اور تھوڑا ہی اٹھا تھا کہ پنڈت جی نے ہوا میں ہاتھ اس طرح ہلایا جیسے اگر تھوڑی دیر بھی ہو گئی تو کوشک کھڑا ہو جائے گا۔

پنڈت جی کے ساتھ اس وقت بارہ لوگوں کی بھیڑ تھی۔ ان میں سے کچھ فریادی نظر آ رہے تھے اور کچھ ان کے جونیئر۔ وہ جونیئر پیروکاری کے پیشے کی سیڑھیاں چڑھنے کی ٹریننگ لے رہے تھے۔ وہ الگ الگ عمر کے تھے، پر سب کی پوشاک ایک ہی جیسی تھی۔ کھدر کا لمبا کرتا اور الگ الگ پائینچے والے پاجامے۔ جوان شاگردوں کی خاص انداز میں تراشی ہوئی ڈاڑھیاں تھیں اور ادھیڑ عمر والوں کے چہروں پر دو دو تین تین دن تک ڈاڑھی نہ بنانے سے اُگی ہوئی کھچڑی کھونٹیاں تھیں۔ کچھ کے کندھوں پر گاندھی آشرم کے جھولے لٹکے تھے اور کچھ کے ہاتھوں میں چمڑے کے بریف کیس نما

Scanned with CamScanner

بیگ تھے۔ ہاں ایک قدر مشترک یہ کہ سب کے جھولوں میں کاغذ ٹھنسے تھے جن پر الگ الگ قسم کی درخواستیں تھیں۔

شاگردوں کو ہلکے پھلکے شکار خود کرنے کی اجازت تھی۔ وہ اپنے جھولوں میں چھوٹے موٹے تبادلے یا کوٹے پرمٹ کی درخواستیں رکھے ہوئے تھے۔ کسی سپاہی یا کسی پٹواری یا کسی میونسپل کارپوریشن کے منشی کے تبادلے ان کے علاقے میں آتے تھے۔ اسی طرح مٹی کے تیل کے کوٹے یا سستے غلے کی دکان کے کینسل ہوئے لائسنس کی بحالی کی لڑائی وہ خود لڑ لیتے تھے۔ پنڈت جی کسی تجربہ کار استاد کی طرح اکھاڑے کے باہر بیٹھ کر اپنے پٹھوں کو پدرانہ شفقت بھری نظروں سے نہارتے رہتے تھے۔ صرف جب کوئی چیلا سامنے بیٹھے افسر کی عدم برداشت اور درشت روئی کے نشانے سے گھبرا کر ان کی طرف مایوسی سے دیکھتا، تبھی معاملے کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے دخل اندازی کرتے۔ انھوں نے اپنے چیلوں کو سکھا رکھا تھا کہ مقدمہ کمزور ہو تو وکیل کی آواز کا اتار چڑھاؤ دلائل پر بھاری پڑ جاتا ہے۔ ان کے چیلے اتار میں کم، چڑھاؤ میں زیادہ یقین رکھتے تھے، اس لیے اکثر کسی چیلے کے کمزور پڑتے ہی سارے کے سارے اتنی زور زور سے چلانے لگتے تھے کہ نوے فیصد معاملات میں سامنے بیٹھا افسر گھبرا کر کچھ نہ کچھ لکھ دیتا تھا۔

آج لگتا ہے کوئی بڑا کام تھا، اس لیے پنڈت جی اپنی پوری فوج لے کر آئے تھے۔

چیلوں نے پنڈت جی کے واسطے کرسی خالی کرانے کے لیے پورے کمرے پر دھاوا بول دیا۔ کمرے میں کرسیاں کم تھیں اور سبھی بھری ہوئی تھیں۔ چیلے نادر شاہ کی فوج کی طرح جھپٹے۔ انھوں نے کرسی پر بیٹھے لوگوں کا طرح طرح سے امتحان لیا۔ کرسیوں کے ہتھے، پائے اور ان پر بیٹھے ہوئے لوگوں کے ہاتھ کندھے... سبھی کچھ کو اکھاڑنے کی بھرپور کوشش کی۔

امتحان بٹوک چند اُپادھیائے کا بھی ہوا، مگر وہ ایسی صورت حال سے گزرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ اس سے نکلنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ خود اعتمادی قائم رکھتے ہوئے سامنے والے کو بھنگے، کیڑے مکوڑے کی حیثیت سے ہی دیکھنا چاہیے، اس لیے جب ایک چیلے نے ان کی کرسی جھنجھوڑتے ہوئے انھیں آگاہ کیا: ''پنڈت جی ہیں، پنڈت جی،'' تو انھوں نے دروازے کے اوپر کونے میں جالا بناتی ہوئی مکڑی کو پوری دلچسپی سے دیکھنا شروع کر دیا، اور جب دوسرے چیلے نے سرگوشی کی کہ بہرائچ کے

ایم ایل اے ہیں، تب تک وہ جالا دیکھنے میں اتنے محو ہو چکے تھے کہ اگر چیلا آگے نہ بڑھ گیا ہوتا تو وہ جالا بننے کے پورے عمل کے بارے میں اس کی معلومات میں اہم اضافہ کرنے لگتے۔

وہاں کرسیوں پر بیٹھے کچھ لوگوں میں اتنی خود اعتمادی نہیں تھی۔ ایک تو چیلوں کو جھپٹتے دیکھ کر ہی گھبرا کر کھڑا ہو گیا، اس کی کرسی پر پنڈت جی براجمان ہو گئے۔ دوسرے نے آدھا کھڑا ہو کر بیٹھنے کی کوشش کی تو اسے پتا چلا کہ اس کی کرسی کھینچ لی گئی تھی اور اگر بروقت اسے پتا نہ چل جاتا تو وہ اب تک ڈنڈوت والی پوزیشن میں ہوتا۔ اس کی کرسی پر ایک چیلا بیٹھ چکا تھا۔ تیسرے انتہائی کمزور خود اعتمادی والے شخص کو گھسیٹ کر اٹھا دیا گیا اور دو چیلے اس کی کرسی آدھا آدھا شیئر کرنے لگے۔

''اور سنائیے کوشک جی،'' پنڈت جی نے کوشک سے کہا لیکن اس کے سننے کی پروا نہ کر کے چاروں طرف نظر گھما کے اس شخص کو تلاش کرنے لگے جس کے کام کے لیے وہ چیلوں کی اتنی بڑی فوج لے کر چڑھائی کرنے آئے تھے۔ اس کمرے کے ماحول سے بھونچکے، سفاری سوٹ میں ملبوس ایک ادھیڑ عمر کے شخص نے اپنی گھبراہٹ چھپانے کے لیے ہاتھ میں لیے بریف کیس کو ہلانا ڈلانا شروع کر دیا۔

''ارے کپور صاحب، ادھر آ جائیے۔''

پنڈت جی نے پاس بیٹھے چیلے کو اشارہ کیا۔ چیلے نے اپنے برابر والے کو دیکھا مگر وہ خود اعتمادی سے بھرپور انداز میں پان مسالا کھا رہا تھا۔ اسے بے فکری سے پان مسالا کھاتے دیکھ کر چیلا ہی اٹھ گیا۔ وہاں کپور صاحب نام کے شخص نے قبضہ جما لیا۔

''کوشک جی، انھیں نہیں پہچانتے! ارے بھئی کپور صاحب ہیں۔ کل کے اخبار میں پورا سپلیمنٹ تھا۔ کوریا کی کمپنی کے ساتھ مل کر کار کی فیکٹری لگا رہے ہیں۔ کل اسی میں تو پی ایم آ رہے ہیں۔ سی ایم بھی جائیں گے ہی۔ مجھ سے بولے، پی ڈبلیو ڈی منسٹر کے بغیر تو فنکشن ادھورا رہ جائے گا۔ انھیں مہمان خصوصی بنانا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا، چلیے ابھی طے کرائے دیتے ہیں۔ اپنے منتری جی انکار نہیں کریں گے۔ میں سوچتا تھا کہ منتری جی صبح والی فلائٹ سے آ رہے ہیں۔ کپور صاحب، جلدی تو نہیں ہے؟ تھوڑی دیر انتظار کر لیں۔''

''جلدی تو نہیں ہے، پر شام کو مل لیتے ہیں کوٹھی پر...''

Scanned with CamScanner

کپور صاحب اور پنڈت جی کی آنکھوں نے آپس میں جو باتیں کیں، اسے دیکھ کر کوئی بھی سمجھدار آدمی کہہ سکتا تھا کہ منتری جی کے ساتھ کپور صاحب کی ملاقات کوٹھی پر ہی ہونا مناسب تھی؛ لیکن کوشک نے اشارہ سمجھنے سے یکسر انکار کر دیا۔ اس نے سامنے پڑے کاغذوں پر کچھ لکھتے لکھتے کہا:

''آج تو منتری جی خالی نہیں ہیں۔ دس بجے تک تو کیبنٹ ہے، پھر حلقے کے ایک آدمی کے لڑکے کے جنم دن میں... وہاں سے ایک شادی...''

''آپ بھی کوشک صاحب... آپ کو پتا ہے کپور صاحب کتنی مشکل سے ہمارے صوبے میں کارخانہ لگانے کے لیے تیار ہوئے۔ خود سی ایم نے دسیوں بار انھیں فون کیا، ان کے گھر گئے، مجھے لگایا، تب کہیں جا کر ہم لوگ کپور صاحب کو تیار کر پائے کہ وہ اس صوبے میں کارخانہ لگائیں، اور آپ کے منتری جی کو فرصت نہیں ہے کہ...''

''پر آج تو کیبنٹ ہے...''

''ہو چکی صوبے کی ترقی...''

''پھر جنم دن...''

''اسی لیے پچھڑے ہوئے ہیں...''

''وہاں سے شادی...''

''بھاڑ میں گئی شادی... یہاں صوبے کی ترقی کا سوال ہے اور آپ کو مونڈن اور شادی کی پڑی ہے۔'' پنڈت جی اپنے اس روپ میں آ رہے تھے جس کے لیے وہ صوبے کی راجدھانی میں مشہور تھے۔

اس درمیان ان کے چیلوں نے گرو کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔ گرو نے نہ جانے کیا پیغام نشر کیا کہ چھوٹے سے کمرے میں گھمسان کا رن چھڑ گیا۔

چیلوں کی فوج کسی دورِ وسطیٰ کے طریقہ جنگ کے تحت کام کرتی تھی۔ ایک تجربہ کار سپہ سالار کی طرح پنڈت جی پہلے اپنی پیدل فوج کو آگے بڑھاتے تھے۔ پیدل فوج کا مطلب ان سپاہیوں سے تھا جو صرف اپنی آواز کا استعمال کرتے۔ پیدل سپاہی ناکام ہونے لگتے تو گھڑ سوار آگے بڑھتے تھے۔ یہ طرح طرح کے ہتھیاروں سے لیس دشمن پر ٹوٹ پڑتے۔ اکثر ان کا سب سے زیادہ اور گہرا

Scanned with CamScanner

اثر چھوڑنے والے ان کے جوتے چپل ہوتے۔

پنڈت جی کے پاس توپ خانہ بھی تھا، پر اس کا استعمال وہ سیکریٹریٹ یا لیجسلیٹیو اسمبلی کے احاطے میں نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے بہت سے چیلوں کو لائسنس والے ہتھیار دلوا رکھے تھے، اور ان کے بہت سے چیلے کاغذی خانہ پری میں یقین نہیں رکھتے تھے، اس لیے بلا لائسنس ہتھیار رکھتے تھے۔ ان کے وہ چیلے جن کے پاس لائسنس والے ہتھیار تھے، وہ قومی یکجہتی کی جیتی جاگتی مثال تھے، اس لیے ان کے لائسنس بھی ناگالینڈ، منی پور سے لے کر ہریانہ تک نہ جانے کن کن صوبوں کے بنے ہوئے تھے۔ پنڈت جی کے مخالفین ان کے توپ خانہ بریگیڈ پر قتل، اغوا کے الزامات لگاتے رہتے تھے، لیکن پنڈت جی نے اعلان کر رکھا تھا کہ عوام کی عدالت سب سے بڑی عدالت ہے اور جب تک وہ وہاں مقدمہ نہیں ہارتے تب تک انھیں مجرم نہیں مانا جاسکتا؛ اور عوام کی عدالت میں وہ پچھلے پچیس سال سے تو جیت ہی رہے تھے۔

آج بھی پہلا حملہ ان کی پیدل فوج نے کیا۔ ایک ساتھ پھیپھڑوں کی طاقت کا الگ الگ عرض وطول میں استعمال کرتے ہوئے کئی چیلے جھپٹے۔

''بابوؤں نے اس ملک کا ستیاناس کر رکھا ہے...''

''پنڈت جی کہاں کہاں سے لوگوں کی خوشامد کر کے صوبے کی ترقی کے لیے لائیں اور ان کے پاس ملنے کا وقت...''

''وقت کیسے نہیں ہے... نوٹ گننے کا وقت ہے... ترقیاتی کاموں...''

''سالے... مادر...''

کوشک نے گھبرا کر چاروں طرف مدد کے لیے دیکھا۔ اس کا تجربہ بتاتا تھا کہ ایسے موقعوں پر سامنے بیٹھے لوگ اندھوں، گونگوں اور بہروں کا رول ادا کرنے لگتے ہیں۔ اس نے منمنانا شروع کر دیا:

''شام کو کیبنٹ ہے...''

''بھاڑ میں گئی کیبنٹ، صوبے کی ترقی...''

''پھر شادی...''

''شادی کی ماں کی... صوبہ ایسے ہی پچھڑا رہے گا...''

Scanned with CamScanner

''برتھ ڈے۔''

''رنڈی کا ناچ نہیں ہے کیا؟ ... اسی طرح ہوگا انڈسٹریلائزیشن؟ ایسے ہی لگیں گے کارخانے؟''

''پر میں نے منع کب کیا پنڈت جی؟ ... میں تو کہہ رہا تھا کہ کیبنٹ جانے سے پہلے آپ کوٹھی پر آ کر مل لیں... میری بات تو پوری سنتے نہیں آپ لوگ، بس چلانے لگتے ہیں۔''

کوشک کے اس بدلے ہوئے رویے کے پس پردہ نہ تو صوبے کے غیر ترقی یافتہ ہونے کا دکھ تھا، نہ اس کو دور کرنے کی کوئی خواہش تھی، بلکہ اس کی چھٹی حس بیدار ہوگئی تھی اور مستقبل قریب میں دی جانے والی دھمکی کی آہٹ اس نے سن لی تھی۔ چاروں طرف بچاؤ کے لیے نظریں دوڑاتے وقت اس نے پنڈت جی کے ایک چیلے کو ہاتھ میں چپل اُلٹتے پلٹتے دیکھ لیا تھا۔ اس کے تجربے نے اسے بتا دیا کہ تھا کہ چپل میں کوئی خرابی نہیں ہے بلکہ مخالف سمت سے اب اپنی پیدل فوج کی مدد کے لیے گھڑسواروں کو میدان میں اتارے جانے کا وقت آ گیا ہے۔

کوشک کے رویے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ کمرے کا ماحول بھی اپنی پہلی حالت پر لوٹ آیا۔ ہاتھ میں چپل لے کر الٹ پلٹ کر دیکھنے والے کو یقین ہوگیا کہ اس کی چپل میں کوئی خرابی نہیں ہے، اس لیے اس نے اسے واپس پہن لیا۔ پھیپھڑوں کی زور آوری دکھانے والے چیلے سرگوشی کرنے لگے۔ پنڈت جی جو پورے اس کامیاب دور میں صرف مسکرا رہے تھے، پہلو میں بیٹھے ہوئے کپور نام کی مخلوق کے چہرے پر اپنے لیے عزت و وقار، دکھ اور کچھ کچھ غیر یقینی صورت حال کے ملے جلے تاثرات کو دیکھ کر نوے درجے کے زاویے سے زیادہ کچھ ہونٹ اور کھینچ کر مسکرانے لگے۔

''ارے میں جانتا ہی تھا کہ کوشک صاحب تو گھر کے آدمی ہیں۔ ملاقات تو ہوگی ہی۔ تم لوگ بیکار چل پوں مچا رہے ہو۔'' پنڈت جی نے چیلوں کی طرف دیکھ کر کسی تصوراتی شخص کو ڈانٹا۔ ''پھر ان کے منتری جی بھی صوبے کی ترقی کے لیے کتنے فکرمند رہتے ہیں!''

پنڈت جی اپنے پسندیدہ موضوع پر آ گئے۔ دیر تک وہ صوبے کے پچھڑے پن کا رونا روتے رہے۔ جب انھوں نے بتایا کہ صوبے میں سڑکیں نہیں ہیں، تو ان کے چیلوں نے کچھ ٹھیکیداروں کی درخواستیں آگے بڑھا دیں جن پر کوشک نے متعلقہ انجینئروں کے نام کچھ لکھ دیا۔ پنڈت جی نے یاد

Scanned with CamScanner

دلایا کہ ان کے علاقے میں غریبوں کو مٹی کا تیل نہیں مل رہا ہے؛ اس پر ان کے ایک چیلے نے فوراً اپنے جھولے میں سے ایک درخواست نکالی جس میں اس کے کسی آدمی کو مٹی کے تیل کی دکان کا لائسنس جاری کرنے کی گزارش تھی، لیکن پھر یہ سوچ کر درخواست اس نے واپس جھولے میں رکھ لی کہ یہ تو پی ڈبلیوڈی کے منسٹر کے پی اے کا کمرہ ہے، تیل کی دکان کی درخواست دوسرے منسٹر کے کمرے میں دی جانی تھی۔

اب کمرے میں اس موضوع پر تبادلہ خیال ہونے لگا جو کرپشن کے بعد سیکریٹریٹ کا سب سے اہم اور پسندیدہ موضوع تھا، یعنی صوبے کا غیر ترقی یافتہ ہونا۔ سب کے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ تھا اور سبھی کہنے کے لیے بے قرار تھے، اس لیے جلدی ہی وہ وقت آ گیا جب سبھی لوگ کچھ نہ کچھ کہنے لگے۔

جس آدمی نے سیتاپور کے تعلقہ دار کا قصہ سنایا تھا، کوشک نے اس سے پرزور اصرار کیا۔

''ارے بھائی، اپنے پنڈت جی کو تو وہ قصہ سناؤ... ارے وہی جس میں فیصلہ میرٹ پر ہوتا ہے...''

کمرے میں قہقہہ لگا۔ پنڈت جی نے شوق سے دیکھا۔ سیتاپور والا قصہ شروع ہوا تو بٹوک چند کا منھ اور لٹک گیا۔ وہ ایک مرتبہ پھر دل ہی دل میں حساب لگانے لگے کہ مقدمے کا فیصلہ میرٹ پر نہ ہو، اس کے لیے انھیں اور کتنا خرچ کرنا پڑے گا۔ انھوں نے شروع میں دس دیے تھے۔ اڑتی پڑتی خبر تھی کہ کملا کانت بیس دے کر گیا ہے۔ یہ خبر کملا کانت کے گرگوں نے ہی اڑائی تھی۔ رات کی بس سے جب بٹوک چند راجدھانی کے لیے روانہ ہو رہے تھے تو بس اڈے کی پان کی دکان پر رضوان الحق نہ جانے کہاں سے ٹپک پڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی بٹوک چند نے اخبار کے پیچھے اپنا چہرہ چھپانے کی کوشش کی لیکن تھوڑی دیر میں ہی انھیں پتا چل گیا کہ ایسی کسی حرکت کا کوئی فائدہ نہیں۔ رضوان الحق نے بچپن میں کھوکھو ضرور کھیلا ہوگا تبھی تو جیسے ہی وہ ''مصیبت ٹلی'' والے انداز میں پان کی دکان کے پیچھے سے باہر نکلے، نہ جانے کہاں سے ٹپک کے رضوان الحق نے ''کھو...'' کہہ دیا۔ یہ بات اور تھی کہ اس ''کھو'' کی گونج ''بڑے صاحب نمستے'' جیسی سنائی دی۔

''نمستے... نمستے... حق صاحب، پان کھانے نکلے ہیں؟''

"ہاں سر، پرانی عادت ہے۔ کھانا کھانے کے بعد ٹہلنے نکلتا ہوں... بغیر پان کھائے کھانا پچتا ہی نہیں۔ آپ کیسا لیں گے؟ سادہ... یا زردہ...؟"

بٹوک چند نے مری ہوئی آواز میں جو کچھ کہا، وہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ سادے یا زردے والے پان کی جگہ کوئی رس گلے کا بھی آرڈر ہو سکتا تھا۔ وہ چپ چاپ رضوان الحق کو پان والے کو زردے والے پان کا حکم سناتے دیکھتے رہے۔ جب وہ زردے کی خوبیاں بیان کر رہا تھا تو وہ بجھے بجھے دل سے آنے جانے والی بسوں کے نمبر پڑھ رہے تھے اور یہ اندازہ لگا رہے تھے کہ یہ کمبخت کب ٹلے گا اور کب وہ سامنے کھڑی لکھنؤ والی بس پر لپک کر چڑھ جائیں گے۔

رضوان الحق نے گرگٹ سے بھی زیادہ تیزی سے رنگ بدلا۔ جس دن انھوں نے چارج لیا، اسی دن رات کو رضوان الحق کے یہاں سے کبابوں سے بھرا ٹفن کیریر پہنچا تھا۔ انھیں دن کی پوری خبر تھی۔ دن میں دفتر میں کملا کانت ورما کے کمرے میں جو بیٹھک ہوئی، اس میں رضوان الحق بھی موجود تھا۔ انھوں نے پہلے تو کباب لے کر آئے چپراسی کو ڈانٹ کر واپس جانے کو کہا، پھر یہ سوچ کر کہ دشمن کے کیمپ کا ایک آدمی ٹوٹ کر آیا ہے، کچھ تو معلومات ہی دے گا، کباب رکھ لیے۔ دوسرے دن صبح رشبھ چرن رضوان کو لے کر ان کے بنگلے پر آیا تو ہتھیار ڈالنے کی شرطیں پکی ہو گئیں۔ رضوان سے ہی کملا کانت کے لکھنؤ روانگی اور مہمات سر کرنے کی ساری خبریں ملی تھیں۔ یہی رضوان آج ان کے اوپر جاسوسی کر رہا ہے۔ اس کا مطلب صاف تھا کہ آج کملا کانت کے واپس گدی پر قابض ہونے کے بعد رضوان اپنی ساری وفاداریاں اس کے دربار میں پیش کر آیا تھا اور اب یہاں سے سیدھے وہ ان تمام معلومات کے ساتھ کملا کانت کے گھر جائے گا کہ بٹوک چند لکھنؤ روانہ ہو گئے ہیں۔

"بڑے صاحب، لکھنؤ جا رہے ہیں کیا؟"

"نہیں... نہیں..." بٹوک چند نے گھبرا کر اپنی نگاہ لکھنؤ والی بس سے ہٹالی۔

پان لیتے لیتے انھوں نے رضوان الحق کو آنکھوں ہی آنکھوں میں تولا۔ کتنا پتا ہے اس بدمعاش کو؟ کیا یہ جانتا ہے کہ کملا کانت نے راجدھانی میں اپنا تبادلہ رکوا لیا ہے؟ اُس کی ناک کا بال تھا یہ۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کو معلوم نہ ہو کہ کملا کانت لکھنؤ سے چل چکا ہے اور اب الٰہ آباد پہنچنے والا ہوگا۔

اچانک بٹوک چند کا ماتھا ٹھنکا۔ ایسا تو نہیں کہ کملا کانت الٰہ آباد پہنچ گیا ہو۔ انھوں نے آنکھیں

جھپکاتے ہوئے سامنے والے کو تولا۔ ان کی نگاہوں کے وار نے رضوان الحق کو تھوڑا گڑبڑا دیا۔

ہوں، تو یہ معاملہ ہے! بٹوک چند کو اچانک لگا کہ لکھنؤ جانے والی بسیں لمبے وقفے سے چلتی ہیں اور نہ جانے کتنا وقت لیتی ہیں۔ پر ابھی تو بس سے زیادہ ضروری تھا کہ کملا کانت کے اس جاسوس کو یہاں سے دفع کیا جائے۔ اس نے آتے ہی اسے بھیجا ہوگا، میری اگلی چال کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے۔ پان تو بہانہ تھا۔

''اصل میں وائف کے ایک ممیرے بھائی ہیں بریلی میں۔ ان کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ ان کی طبیعت کچھ سیریس ہے۔ وائف بنارس میں ہیں۔ میں نے کہا، چلی جاؤ، پر صاحب، لیڈیز کہاں مانتی ہیں۔ مجھے ہی جانا پڑ رہا ہے۔ کام تو آپ جانتے ہی ہیں، کتنا لدا ہوا ہے۔ پر وہ پرانی مثل ہے نا کہ ساری خدائی ایک طرف، جورو کا بھائی ایک طرف...''ہنسی کا دور تھمتے ہی بٹوک چند نے کئی طریقوں سے اشارہ کیا کہ وہ چلا جائے، مگر اس نے جو کچھ کہا، اس کا مطلب یہ تھا کہ ماتحت کا فرض بنتا ہے کہ وہ اپنے صاحب کو گاڑی میں چڑھا کر ہی گھر کا رخ کرے۔ پھر گھر جلدی جا کر رضوان الحق کرے گا بھی کیا؟ فیملی، یعنی رضوان الحق کی بیوی، آج کل یہاں ہے نہیں۔ اس کی بیوی کہاں ہے، اس میں بٹوک چند کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ چھٹکارے کی کوئی صورت نہیں تھی، اس لیے وہ چپ چاپ رضوان الحق کو رائے بریلی والی بس میں اپنا سامان چڑھاتے دیکھتے رہے۔ لکھنؤ والی بس روانگی کے لیے تیار تھی مگر اب کیا بھی کیا جا سکتا تھا! غنیمت تھا کہ انھوں نے سالے کو رائے بریلی میں بتایا، بنارس میں نہیں۔ لکھنؤ والی بسیں رائے بریلی ہو کر جاتی تھیں۔ تھوڑی مشکل ضرور ہوگی، پر رائے بریلی اتر کر پھر لکھنؤ کی بس پکڑ لیں گے۔

بٹوک چند نے کنڈکٹر سے ٹکٹ خریدتے ہوئے رضوان الحق کو دیکھا۔ لکھنؤ والی بس حرکت کر رہی تھی۔ کمبخت ابھی چلا جائے تو وہ سامان اتار کر اس بس میں چڑھ سکتے ہیں، پر رضوان الحق انھیں بس میں بیٹھا کر، آخری بار پان کھلا کر جب اترا، تب تک لکھنؤ کی بس کو گئے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی اور بٹوک چند کے صبر کا پیمانہ اتنا لبریز ہو گیا تھا کہ اپنی بردباری برقرار رکھتے اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بھی ان کے منھ سے نکل ہی گیا: ''کملا کانت کب آئے؟''

''جی...ج...ج...'' اس کا جواب سننے سے زیادہ بٹوک چند کی دلچسپی رضوان الحق کا چہرہ

Scanned with CamScanner

دیکھنے میں تھی۔ انھیں زیادہ دیر یہ حرکت بھی نہیں کرنی پڑی تھی۔ جلد ہی بس چل پڑی۔

کمرے میں زور کا قہقہہ لگا، تب بٹوک چند کو پتا چلا کہ سیتا پور والے زمیندار کا قصہ ختم ہو گیا تھا۔ لوگ مقدمے کے میرٹ پر دیے جانے والے فیصلے کے خیال سے ہی اس قدر لطف اندوز ہو رہے تھے کہ بیان سے باہر۔ ہندوستانی ادب کی پرانی روایات یہاں بھی زندہ تھیں۔ لوگ غیر حقیقی، تصوراتی امکانات پر ہنس رہے تھے۔ مقدمے کا فیصلہ میرٹ پر بھی ہو سکتا ہے، یہ انھیں ہنسانے کے لیے بہت تھا۔ کوئی اور دن ہوتا تو بٹوک چند بھی ہنستے، پر یہاں تو انھیں ایسا لگ رہا تھا کہ قصہ انھی کے لیے سنایا جا رہا ہے۔ پتا نہیں یہ ان کا وہم تھا یا حقیقت کہ انھیں قصے کے دوران لگاتار کوشک کی آنکھیں اپنے اوپر گڑی نظر آ رہی تھیں۔

کوشک کمرے میں بیٹھے بیٹھے جو معلومات بیچ بیچ میں لوگوں کو فراہم کر رہا تھا، اس کے مطابق منتری جی تین بجے ہوائی اڈے پر پہنچیں گے اور وہاں سے سیدھے سیکریٹریٹ آئیں گے۔ اس کے بعد والی خبریں مبہم تھیں۔ کسی کو اس نے بتایا کہ شام کی کیبنٹ میٹنگ چار بجے سے ہے، کسی کو چھ بجے سے۔ کیبنٹ کے بعد شادی، جنم دن، مونڈن وغیرہ کی خبریں کچھ اس طرح گڈمڈ ہو گئی تھیں کہ وہاں موجود کوئی بھی آدمی وثوق سے ان کے وقت، جگہ، یا میزبان کے بارے میں تعین کرنے سے قاصر تھا۔ بٹوک چند کے لیے ضروری تھا کہ منتری جی کا صحیح پروگرام انھیں معلوم ہو، تبھی اگلے مورچے کے بارے میں سوچا جا سکتا تھا۔ اتنی بھیڑ میں کوشک سے براہ راست کسی قسم کی معلومات حاصل کرنا نہایت مشکل تھا۔ وہ صرف اس کے سامنے بیٹھے مسکراتے رہ سکتے تھے یا سیتا پور والے قصے پر ہنسنے کی کوشش کر سکتے تھے، مگر اس سے تو کام نہیں چل سکتا تھا نا۔ وقت کم تھا، اگر دو تین دن کے اندر کملا کانت کی جگہ پھر سے ان کی تقرری نہیں ہوئی تو پھر ان کی واپسی مشکل ہوتے ہوتے ناممکن ہو جائے گی۔ یہاں بیٹھے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ باہر نکل آئے۔

کمرے کے باہر چوڑا گیلری نما برآمدہ تھا۔ برآمدہ ایک وسیع و عریض عمارت کو سانپ کی کنڈلی کی طرح اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھا۔ باہر تیز تپش تھی اور اندر ایر کنڈیشنڈ کمرے کی ٹھنڈک کچھ اس طرح پگھلی کہ بٹوک چند سٹپٹا کر اندر کی طرف بھاگے۔ اس بار وہ جس کمرے میں گھسے، وہ کچھ چھوٹا تھا اور اس میں دو بابو ٹائپ رائٹروں پر کچھ کھٹ کھٹ کر رہے تھے۔ کمرے میں ایک چھوٹی سی

تپائی پر جوٹھے کپ، گلاس اور پلیٹیں پڑی تھیں۔ ایک کونے میں ایک واٹر کولر تھا جس کی ٹونٹی سے پانی کی پتلی سی دھار بہہ رہی تھی۔ دونوں بابوؤں کے سامنے تین چار کرسیاں پڑی تھیں جن پر اس وقت کوئی بیٹھا نہیں تھا۔ جیسا کہ اس عمارت کا دستور تھا، بٹوک چند بغیر کسی تکلف کے ایک پر بیٹھ گئے۔ مگر خلافِ دستور ایک بات ہوئی۔ بابوؤں میں سے ایک انھیں دیکھ کر مسکرایا۔ خلافِ دستور دوسری بات یہ ہوئی کہ اس بابو نے انھیں چائے کے لیے پوچھا۔

بٹوک چند بغیر کسی طرح کی حیرت کا اظہار کیے چہرے پر مسکراہٹ لائے اور بابو کو تولتے رہے۔ وہ کم وبیش اس عمارت کے مستقل مسافر تھے اور یہ طے تھا کہ بابو ان سے کہیں نہ کہیں ٹکرایا ضرور ہے، پر کہاں؟ انھوں نے اپنے دماغ پر زور ڈالا۔

بابو نے جس چپراسی کو چائے کے لیے کہا تھا، اس نے اس گتھی سے انھیں نجات دلا دی۔

یہ تو وہی چپراسی تھا جو اندر کوشک کے بلانے پر آ جا رہا تھا۔ وہ جس کمرے میں گھسے تھے، وہ منتری جی کے اسٹاف کا ہی کمرہ تھا۔ منتری جی چونکہ بہت ہی اہم منتری جی تھے، اس لیے ان کے اسٹاف کو دو کمرے ملے ہوئے تھے۔ ایک میں کوشک کا راج پاٹ پھیلا ہوا تھا اور دوسرے میں باقی اسٹاف بیٹھتا تھا۔ کوشک کا کمرہ منتری جی کے کمرے سے ملا ہوا تھا اور بہت ہی اہم شخصیات کو چھوڑ کر، دوسرے سارے آنے والوں کو منتری جی سے ملنے سے پہلے اس کے کمرے سے ہو کر جانا پڑتا تھا۔ اس کا کمرہ منتری جی کی غیر موجودگی میں ملاقاتیوں کے لیے ویٹنگ روم کا کام بھی دیتا تھا۔ اس چھوٹے کمرے میں بھی بٹوک چند دوبار آئے تھے، پر آج باہر کی گرمی کی مار نے ان کی یادداشت کو کچھ اس طرح پگھلا کر رکھ دیا تھا کہ انھیں اپنی یادوں کو سمیٹنے میں کچھ دیر لگی۔

چیف منسٹر لوگ جب کابینہ بناتے ہیں تو کچھ کیبنٹ منسٹر مقرر کرتے ہیں۔ ان کیبنٹ منسٹروں کی مدد کے لیے کچھ اسٹیٹ منسٹر یا ڈپٹی منسٹر مقرر کر دیے جاتے ہیں۔ یہ جونیئر منسٹر اپنے سینئر منسٹروں کی مدد کے لیے بے قرار رہتے ہیں، پر کیبنٹ منسٹر اپنی مدد آپ کا نعرہ لگاتے لگاتے اس میں اس قدر یقین کرنے لگتے ہیں کہ وہ اپنے چھوٹے بھائیوں کو تکلیف نہیں دینا چاہتے، لہٰذا سکریٹریوں کو حکم جاری ہو جاتا ہے اور چھوٹے منسٹروں کے پاس فائلیں پہنچتی ہی نہیں ہیں، سیدھے بڑے منسٹر کے پاس چلی جاتی ہیں۔ چھوٹے منسٹر شروع شروع میں افسروں پر رعب گانٹھنے کی کوشش کرتے ہیں، پھر چیف منسٹر

Scanned with CamScanner

کے پاس روتے گاتے جاتے ہیں اور آخر میں ہار کر اپنے کمرے میں، دکھی ہو کر، اپنے دلالوں، مصاحبوں اور چمچوں کے بیچ، گھومنے والی کرسی پر بیٹھ کر اپنے منسٹر یا چیف منسٹر کو کوستے رہتے ہیں۔ ان کے گرد سننے والوں کا جماؤ کبھی کم نہیں ہوتا کیونکہ فائلیں بھلے ہی ان کے پاس نہ پہنچیں، چائے سموسوں کی ترسیل میں کبھی کوئی رکاوٹ نہیں پڑتی۔ کئی بار سرکاری خزانہ خالی ہونے کی دہائی دے کر چیف منسٹر یا کیبنٹ منسٹر چائے سموسوں کی ترسیل کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں، پر اسٹیٹ منسٹر چائے سموسے بند ہوتے ہی ''سموسہ نہیں تو فائل بھیجو'' کا ایسا اجتماعی شور برپا کرتے ہیں کہ چیف منسٹروں کو یہ زیادہ فائدہ مند سودا لگنے لگتا ہے کہ اسٹیٹ منسٹروں کو چائے سموسوں کی سپلائی لائن پھر سے جوڑ دی جائے۔

اسٹیٹ منسٹروں کی ہی طرح چھوٹے موٹے بابوؤں کا بھی ایک دبا کچلا طبقہ ایسا ہوتا ہے جو اسسٹنٹ پی اے کا کام کرتا ہے اور پی اے لوگوں کو ملائی کھاتے دیکھ کر ان کی ہانڈیاں پھوڑنے کے فراق میں رہتا ہے۔ یہ لوگ بھی ملک کے ان بدقسمت لوگوں میں ہوتے ہیں جو کام کرنے کے لیے بے چین رہتے ہیں، پر ان کے آقا انھیں کام نہیں دینا چاہتے۔ یہ لوگ صبح سویرے دفتر آجاتے ہیں اور رات تک وہیں جمے رہتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے منتری جی کے ارد گرد کا چکر بھی لگا آتے ہیں۔ کئی بار منھ کھول کر الہ دین کے چراغ کے جن کی طرح ''کام... کام...'' چلّانے لگتے ہیں۔ اس پر بھی بات نہیں بنتی کیونکہ جن کے پاس تو یہ آپشن بھی ہوتا ہے کہ اگر الہ دین اسے کام نہ دیتا تو وہ اسے کھا جاتا، لیکن ان بدقسمت بابوؤں کے پاس ایسی کوئی تدبیر نہیں ہوتی۔

بٹوک چند سمجھ گئے کہ وہ ایک ایسی ہی بدقسمت مخلوق کے پاس بیٹھے ہیں جس کے روئیں روئیں سے ''کام... کام...'' کی آوازیں آرہی ہیں اور کام ہے کہ پاس پھٹک ہی نہیں رہا۔ پر اس دکھیارے نے انھیں چائے پلانے کے لیے کیوں سوچا؟ اس گتھی کو سلجھانے کے لیے انھیں کچھ سوال پوچھنے چاہیے تھے، پر وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ کمرے میں موجود دوسرا بابو سکھی تھا یا دکھی۔ اس موقعے پر انھوں نے وہی کیا جو عام طور پر ہندوستانی کرتے ہیں۔ وہ چائے پیتے پیتے مسکرانے لگے۔

بابو نمبر ایک بھی مسکرایا اور اور اس نے چائے کی ایک پیالی بابو نمبر دو کے آگے بڑھا دی۔ بابو نمبر دو بھی مسکرایا۔ بٹوک چند سمجھ گئے کہ دونوں ہی دکھی ہیں۔ اب بات آسان ہو گئی۔

دونوں بابوؤں نے ایک دوسرے کو مخاطب کیا تو بات اور آسان ہو گئی۔ دونوں بابو برہمن

Scanned with CamScanner

تھے۔ بٹوک چند بھی برہمن تھے، اس لیے تینوں نے ایک دوسرے کو "پنڈت جی" کہہ کر مخاطب کرنا شروع کردیا۔ اس مخاطبت کی گہرائی سے پھوٹتے ہوئے جو چشمے ہلوریں مارتے ہوئے بہہ نکلے، انھوں نے اجنبیت کے سارے وندھیاچل ڈھادیے اور جب وہی چپراسی جوٹھے برتن اٹھانے آیا تو اسے محسوس ہوا کہ بٹوک چند بھی اس کمرے کا اتنا ہی حصہ ہیں جتنے یہ دو بابو لوگ۔

اس کے بعد بٹوک چند نے عیب جوئی اور حسد جیسے دو ہتھیاروں کا ایک ساتھ استعمال کیا، جن کے بارے میں ان کا تجربہ تھا کہ یہ کبھی خالی نہیں جاتے۔ آج بھی ان کا وار کارگر ثابت ہوا۔ انھوں نے کوشک کے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو پوچھا جس کا مطلب یہ جاننا تھا کہ اُس کمرے میں بیٹھنے والا شخص بھی کیا ان میں سے ہی ہے۔

جواب میں جو اطلاعات موصول ہوئیں، ان کے مطابق وہ شخص، یعنی کوشک، ان میں سے ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ شخص لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے اپنے نام کے آگے کوشک لگاتا ہے۔ اس کی اقدار، اس کے خیالات ایسے ہیں کہ وہ برہمن کیسے ہوسکتا ہے؟ چونکہ یہ تینوں یوپی کے ہیں اور وہ پنجاب کا ہے، اس لیے فطری بات ہے کہ وہ نیچ اور لالچی ہے؛ اس لیے وہ دونوں انھیں منھ نہیں لگاتے اور ان کے صلاح مشورے کے مطابق بٹوک چند کو بھی اسے منھ نہیں لگانا چاہیے۔

کوشک کہانی سننے کے بعد بٹوک چند نے صرف اتنا کہا، "تبھی تو۔"

اس چھوٹے سے جملے کے بہت سے معنی نکالے جاسکتے ہیں۔ ان دونوں بابوؤں نے اس کا وہی مطلب نکالا جو وہ چاہتے تھے یعنی "تبھی تو کوشک کے طور طریقے اتنے گھٹیا ہیں۔"

اس کے بعد کی گفتگو سرگوشی میں تبدیل ہوگئی۔ یہ سرگوشی کچھ کچھ پارسی تھیٹر میں کی جانے والی خود کلامی کی طرح تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہاں پورا ہال اسے سنتا تھا، یہاں کمرے میں چونکہ صرف تین ہی کردار تھے، اس لیے صرف وہی سن رہے تھے۔ بیچ بیچ میں چپراسی کمرے میں آجاتا تھا تو وہ بھی سن لیتا تھا، مگر اسے سن کر خاموش رہنے کی عادت تھی۔ اس کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ تبھی بولتا ہے جب وہ بولنا چاہتا ہے۔ وہ نہ بولے، اس کی ترکیب دونوں بابو جانتے تھے۔ انھوں نے کچھ نکے بندھے جملے ٹکڑوں میں کہے اور نتیجتاً جب وہ تینوں اُٹھے تو بٹوک چند کو چپراسی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھنا ہی پڑا: "اور، بچے کیسے ہیں اُپادھیائے جی؟"

اپادھیائے جی نے دونوں ہاتھ جوڑے اور آنکھیں موند کر سر آسمان کی طرف تان دیا، جس کا مطلب صاف تھا کہ اوپر بھگوان ہے جو ان کے بچوں کی دیکھ بھال کرتا ہے اور اسی دیکھ بھال کے لیے وہ بٹوک چند جیسی مخلوق کو وسیلہ بنا کر بھیج دیتا ہے۔

بٹوک چند نے ان افسروں کی شان میں کچھ قصیدے پڑھے جنھوں نے دفتر میں چپراسی کی جگہ پر بھی کسی شودر کو نہیں گھسنے دیا اور بتایا کہ اسی طرح وہ اپنے دفتر میں تو جمعدار کی نوکری بھی صرف برہمنوں کو ہی دیتے ہیں؛ یہ بات اور ہے کہ ان کے دفتر میں کوئی برہمن چپراسی یا جمعدار اپنا کام خود نہیں کرتا اور اپنی تنخواہ کا چوتھائی دے کر دوسروں کو کام پر رکھ لیتا ہے۔

''مہنگائی بہت بڑھ گئی ہے۔''

بٹوک چند نے سر ہلا دیا۔ اُپادھیائے نے مہنگائی کی وجہ سے اتنی بڑی قربانی دی تھی کہ برہمن ہو کر چپراسی کا کام کر رہا تھا اور اس نے اپنی جگہ کسی شودر کو نہیں رکھا تھا اور اس لیے اس کے بچوں کو مٹھائی کھانے کے لیے بٹوک چند کو دوبارہ جیب میں ہاتھ ڈال کر دس دس کے دو نوٹ نکالنے پڑے۔

اپادھیائے خوش ہو گیا اور اس نے پھر دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ وہ ان کا نہیں بھگوان کا شکریہ ادا کر رہا تھا، اس بات کا بٹوک چند نے برا نہیں مانا۔ بھگوان خوش نہ ہوتا تو وہ اس کمرے میں کیسے آتے؟ وہ اس کمرے میں نہ آتے تو اپادھیائے کو بیس روپے کیسے ملتے اور ان کی ان دونوں دکھی بابوؤں سے ملاقات کیسے ہوتی؟ انھوں نے بھی چپراسی کی طرز پر دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے اور بابو نمبر ایک کو لے کر باہر نکل گئے۔

باہر ابھی دھوپ میں تیزی تھی مگر سکریٹریٹ کے برآمدوں سے گزرنے میں پہلے جیسی گھبراہٹ نہیں ہوئی۔

''آیئے، کہیں چائے پیتے ہیں۔''

بٹوک چند نے گھوم کر بابو کی طرف دیکھا۔ وہ ان سے کچھ فاصلہ قائم رکھتے ہوئے چل رہا تھا۔ اس کے چہرے سے اجنبیت پوری طرح ٹپک رہی تھی کہ اگر کوئی تیسرا دیکھتا تو اسے لگتا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو نہیں جانتے۔

''کہیں چائے پی جائے۔''

بٹوک چند نے اپنی چال دھیمی کی لیکن بابو نے اپنی چال اور دھیمی کردی۔ مطلب صاف تھا کہ بابو نہیں چاہتا تھا کہ وہاں سے گزرنے والا کوئی شخص، یہ سمجھے کہ وہ دونوں ساتھ جا رہے ہیں۔ بٹوک چند نے اپنی چال بڑھادی۔

سیکریٹریٹ کی راہداریاں کسی بھول بھلیوں سے کم نہیں تھیں۔ بٹوک چند سینکڑوں بار یہاں آئے تھے اور ہر بار کی طرح آج بھی راستہ بھول گئے۔ وہ کچھ ٹھٹھک کر باہر نکلنے کا راستہ تلاش کر رہے تھے کہ ان کے پیچھے سے بابو انھیں کہنی مارتا ہوا آگے نکل گیا۔ وہ اس کے پیچھے لپک لیے۔ دونوں جب باہر نکل آئے تبھی بابو ان سے مخاطب ہوا۔

''ہاں سر، بتائیں، کیا حکم ہے؟''

''کہیں بیٹھ کر چائے پی جائے۔''

''کہاں چلیں؟''

بٹوک چند نے سیکریٹریٹ کی کینٹین کی طرف اشارہ کیا۔ بابو نے چہرے پر خوف طاری کرتے ہوئے کہا، ''سر جی، یہاں دیواروں کے بھی آنکھ کان ہیں''۔

''پھر؟'' کے جواب میں بابو نے جس ریستوران کا نام لیا، وہ راجدھانی کے اکلوتے پانچ ستارہ ہوٹل کا حصہ تھا۔ بٹوک چند ایک لمحے کو تو لڑکھڑائے، انھوں نے بابو کو نظروں سے تولا اور اس فیصلے پر پہنچے کہ بابو اس لائق تو نہیں ہے کہ اسے کسی پانچ ستارہ ہوٹل میں لے جایا جائے، پر ایسا ہے کہ اب اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں۔ اندر دونوں بابوؤں سے جو باتیں ہوئی تھیں، ان سے یہ امید بندھی تھی کہ بابو کسی ایسے شخص کو جانتا ہے جو چیف منسٹر کے بہت قریب ہے، اور اتنا قریب ہے کہ ان کے منتری کے آرڈر کو بھی چیف منسٹر سے الٹوا سکتا ہے۔ یہ بابو علی بابا کے کھل جا سم سم کی طرح کوئی منتر جانتا تھا اور اسی منتر سے ان کی قسمت کا تالا کھل سکتا ہے اور اس منتر کو جاننے کے لیے انھیں اسے پانچ ستارہ ہوٹل لے جانا پڑے گا، فرار کا کوئی راستہ نہیں؛ اس لیے وہ بابو کو لے کر پارکنگ کی طرف بڑھے جہاں ان کی کار کھڑی تھی۔

Scanned with CamScanner

کمرہ کوئی بڑا نہیں تھا لیکن چیخ رنگوں کے غلاف چڑھے صوفہ سیٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ کمرے میں دو کھڑکیاں تھیں اور دو دروازے۔ ان پر بھی تیز رنگ کے پردے لٹک رہے تھے۔ خوشحالی ابھی اس گھر کے مکینوں کی زندگی میں نئی نئی آئی تھی، اس لیے دروازوں اور کھڑکیوں کے دونوں طرف ایک ایک کیل گاڑ کر اور ان میں اسپرنگ باندھ کر پردے لٹکا دیے گئے تھے۔ ایک کو چھوڑ کر باقی سارے اسپرنگ ڈھیلے پڑ گئے تھے، اس لیے پردے لٹک کر زمین میں لتھڑ رہے تھے۔ فرش پر گہرے سرخ رنگ کا ایک قالین بچھا ہوا تھا جس نے صوفوں سے گھری زمین کو چھوڑ کر سارے فرش کو ڈھانک رکھا تھا۔ جیسا کہ راجد ھانی کے ایسے کسی کمرے میں ہونا چاہیے تھا، یہاں بھی پورا کمرہ ٹھساٹھس بھرا ہوا تھا، اور اس ٹھساٹھس بھرے کمرے میں بٹوک چند بھی تین کے لیے بنے ایک صوفے پر پانچویں سوار کے روپ میں بیٹھے تھے، اور وہی سب کر رہے تھے جو دوسرے لوگ کر رہے تھے۔

یہ لوگ زور زور سے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ ایسے مقام اور موقعوں پر باتیں کم کی جاتی ہیں، خود بخود زیادہ ہوتی رہتی ہیں۔ یہاں باتیں زبان سے زیادہ پھیپھڑوں سے کی جاتی ہیں۔ ضروری نہیں کہ لوگ اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے شخص سے ہی باتیں کریں، کمرے میں ٹھنسے ہوئے لوگ داہنے بائیں، آزو بازو، سامنے پیچھے غرض یہ کہ کسی بھی سمت میں بیٹھے شخص سے مخاطب ہو سکتے ہیں۔ بات کرنے کے لیے ضروری نہیں کہ آپ جس سے مخاطب ہیں اسے جانتے بھی ہوں؛ یہ بھی ضروری نہیں کہ ایک وقت میں ایک ہی شخص کو مخاطب کیا جائے۔ آوازیں کسی گیند کی طرح آڑی ترچھی ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی ایک کونے سے دوسرے کونے میں اچھل رہی تھیں۔ اکثر گیند اچھالی کسی کے لیے جاتی تھی، اسے لپک کوئی اور لیتا تھا، اور پھر وہ اپنے طریقے سے کسی تیسرے کے لیے اچھال دیتا تھا۔

Scanned with CamScanner

افسر کے لیے یہ شرمناک مانا جاتا ہے کہ وہ دھوتی کرتا پاجامہ پہنے لوگوں کے ساتھ عوامی طور طریقے اپنائے یا ہنسے بولے۔ اپنے کمرے میں یا غیرتا۔ کے گھر میں وہ اس کے سامنے پسر سکتا ہے، اس کے رونے لائق چٹکلوں پر پچھاڑیں کھا کھا کر قہقہے لگا سکتا ہے، سامنے والے کا جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی ''یس سر... جی سر...'' کے انداز میں سر ہلا سکتا ہے، پر عام جگہ یعنی پبلک پلیس پر سنجیدگی اس کا سب سے بڑا ہتھیار ہوتا ہے۔ آج بھی اس کمرے میں کچھ لوگ باوجود اتنی گہما گہمی کے خاموش، غیر جانبدار انداز میں بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھیں دیواروں پر، پنکھوں پر یا پردوں پر ٹکی ہوئی تھیں۔ صرف غور سے کسی کے چہرے پر آنکھیں ٹکانے سے ہی معلوم ہوتا تھا کہ کمرے میں چل رہی حرکات وسکنات کو نہ دیکھنے کا دکھاوا کرنے والی ان کی آنکھیں کمرے میں ہو رہی ساری باتوں، واقعات، ہر اس چیز پر جمی ہوئی تھیں جو ان کے اپنے مطلب کی تھی۔ کچھ نہ سننے کا تاثر پیدا کرنے والے ان کے کان اپنی دلچسپی کا ہر لفظ پکڑ رہے تھے۔ قہقہوں پر غیر جانبدار رہنے والے ہونٹ دھیان سے دیکھنے پر پھڑ پھڑاتے نظر آتے تھے۔ یہ افسر لوگ تھے۔ غیر جانبدار انداز سے کمرے میں بیٹھے لوگوں میں بوک چند بھی تھے جو مستقل یہ ظاہر کر رہے تھے کہ وہ اس کمرے میں اپنی خوشی سے نہیں بلکہ دھکیل کر لائے گئے ہیں؛ یہاں تک کہ وہ اپنے پہلو میں بیٹھے کرتے پاجامے میں ملبوس شخص کو بھی اس طرح نظر انداز کر رہے تھے جیسے کہ وہ اسے جانتے ہی نہیں، جبکہ گھوڑے جیسے لمبے منھ، کھچڑی بالوں اور پھر پھراتی مونچھوں والا، سفید کھادی کا کرتا پاجامہ پہنے ہوئے یہ شخص اگر نہ ہوتا تو وہ اس کمرے میں داخل ہی نہیں ہو سکتے تھے۔

یہ شخص انھیں کچھ ہی گھنٹے پہلے ملا تھا اور راجدھانی کی تاریخ اور جغرافیے کے بارے میں انھیں ایسی ایسی معلومات فراہم کی تھیں جنھیں سن کر وہ حیرت زدہ ہو گئے تھے۔ اگر وہ افسر نہ ہوتے اور اس کمرے میں اپنے اوپر سنجیدگی طاری کرنے کی مجبوری نہ ہوتی تو اب تک وہ دو تین مرتبہ اس کے پیر چھو چکے ہوتے یا ہاتھ جوڑ کر اپنے پان بھرے منھ کو چلاتے ہوئے یہ ضرور کہتے کہ ''شکر گذار ہوں گرو!'' یہ سارے عمل ہوٹل سے اس گھر تک آنے کے دوران وہ کئی بار دہرا چکے تھے۔

اس نادرِ روزگار شخصیت سے ان کی ملاقات اس پانچ ستارہ ہوٹل میں ہوئی تھی جہاں وہ سیکریٹریٹ سے بابو کو لے کر پہنچے تھے۔

Scanned with CamScanner

ہوٹل جاتے وقت راستے میں بابو نے جو بتایا، وہ اگر ترتیب وار لکھا جائے تو کچھ اس طرح کے جملے بنیں گے: بابو انھیں شرما جی سے ملوائے گا۔ شرما جی اپنے ہی آدمی ہیں اور بابو تب سے انھیں جانتا ہے جب وہ راجدھانی میں نئے نئے آئے تھے اور بابو کے گھر کے پاس سبزی کا ٹھیلا لگاتے تھے۔

انھیں دنوں شرما جی کی آنکھ ایک ایسی خاتون سے لڑ گئی جو اس وقت کچھ نہیں تھی، پر آج پورے ملک میں اسے اس صوبے کی ''منی چیف منسٹر'' کہا جاتا ہے۔

اُن دنوں وہ خاتون بھی گردش میں تھی۔ اس کا پتی بے روزگار تھا۔ خاتون خوبصورت تھی اور بہت زیادہ بلند حوصلہ (ambitious) بھی۔

شرما جی نے اسے ادھار سبزیاں دیں، اس کی خوبصورتی کی تعریف کی اور اس کے بلند حوصلوں کو بھی بھڑکایا۔

راجدھانی میں اگر کوئی خوبصورت عورت ہو اور وہ بلند حوصلہ بھی ہو تو سیدھے سیاست کا رخ کرتی ہے۔

آج کی منی چیف منسٹر، جن کا نام سُمن ہے اور جنھیں لوگ بھابھی جی کے نام سے پکارتے ہیں اور جو اس وقت خوبصورت اور اہم دونوں تھیں، سیاست کی طرف بھاگیں، اور بقول بابو کے شرما جی حالانکہ بیچتے تو سبزی تھے لیکن زمینی حقائق پر ان کی اتنی مضبوط پکڑ تھی کہ ان کے بتائے ہوئے گُروں سے سمن صرف سیاست کی طرف بھاگیں ہی نہیں بلکہ سیاست کے اندر اتنی تیز دوڑیں کہ محاورے کی زبان میں دیکھنے والے دانتوں تلے انگلی دبائے دیکھتے رہ گئے۔

یہ خبریں بابو نے بٹوک چند کو ہوٹل پہنچتے پہنچتے راستے میں دی تھیں۔ راستے میں ہی ایک پی سی او کے پاس کار رکوا کے وہ اندر گیا اور تھوڑی دیر بعد باہر آ کے کار میں بیٹھتے بیٹھتے اس نے بتایا، ''شرما جی سے بات ہوگئی۔ ساعت اچھی تھی جو گھر میں مل گئے۔ مصروف تھے پر میں نے اصرار کیا تو مان گئے۔ آدھے گھنٹے میں ہوٹل پہنچ جائیں گے۔''

آدھے گھنٹے میں تو نہیں، ایک گھنٹے میں شرما جی ان لوگوں کے پاس پہنچ گئے۔ وہ لوگ جس جگہ پر بیٹھے تھے، وہاں سے اندر داخل ہونے کا دروازہ بابو کے سامنے پڑتا تھا۔ بٹوک چند کی پیٹھ اُدھر تھی۔ چائے پیتے پیتے انھوں نے دیکھا کہ بابو کا چہرہ کھل اٹھا۔ مطلب صاف تھا کہ اندر داخل ہونے والے

Scanned with CamScanner

دروازے پر شرما جی ظاہر ہو چکے ہیں۔ بٹوک چند نے گھوم کر دیکھا۔ راجد ھانی کی مخصوص پہچان یعنی کھادی کے کُرتے پاجامے، بے ترتیب گھنگھریالے بالوں والا، چالیس بیالیس سال کا ایک شخص ہاتھ میں سیلولر فون لیے، ریستوران میں داخل ہو رہا تھا۔ وہاں کے کام کرنے والے اسے سلام کر رہے تھے اور وہ اپنے ہاتھوں سے ان کے سلام کا کچھ کچھ ایسے جواب دے رہا تھا کہ اگر کوئی چاہے تو یہ بھی سمجھ سکتا تھا کہ اس کی دلچسپی ان مکھیوں کو اڑانے میں تھی جو اس ایر کنڈیشنڈ ہال میں تھیں ہی نہیں۔

شرما کی شخصیت میں کچھ مقناطیسی اثر ایسا تھا جو لوگوں کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ اس نے بیٹھتے ہی بے تکلفی سے پوچھا، ''اور اپادھیائے جی، کیا حال چال ہے؟... سسُر لالہ نے کا ئستھ پنا دکھا ہی دیا... آپ ٹھہرے گئو آدمی، اس کی مار میں آ گئے۔''

بٹوک چند عرف اپادھیائے جی نے آنکھیں جھپکائیں اور اس کی طرف دیکھا۔ نوکر شاہی کا اصول ہے کہ اگر نیتا نما شخص کار آمد نہ ہو تو اس کے ساتھ بے تکلف نہیں ہوا جا سکتا، اور اگر وہ کام کا ہے تو اس کے آگے پوری طرح بچھ جانا چاہیے۔

ابھی اس بات کا فیصلہ ہونا باقی تھا کہ گھوڑے جیسے منھ والا، سفید براق جیسی کھادی کے کرتے پاجامے میں ملبوس اور کھائے اگھائے جسم کی چغلی کرنے والی ہلکی سی توند کا مالک، شرما نام کا یہ شخص کس حد تک کار آمد ثابت ہوگا۔

بیٹھتے بیٹھتے شرما نے جن اطلاعات کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کیا، وہ تو اسے بابو سے بھی مل سکتی تھیں جب وہ اسے پی سی او سے فون کرنے گیا تھا، اس لیے ابھی شرما سے بے تکلفی نہیں کی جا سکتی تھی۔ بٹوک چند صرف ہلکے سے مسکرائے اور شرما کو تولتے رہے۔

''ارے یہ سالا کا ئستھ بڑی اونچی کھوپڑی کا ہے۔ آپ سیدھے سادے آدمی ہیں۔ کمبخت نے سب سے پہلے کوشک کو پکڑا۔ اس نے تو اس پی ڈبلیو ڈی منتری کے بیڈ روم میں گھس پیٹھ کر رکھی ہے۔ ارے آپ نہیں جانتے اس کوشک کے بچے کو... وہی کوشکوا جو آپ کے منتری کا پی اے ہے۔ سالا منتری کے کچن سے لے کر بیڈ روم تک کا انتظام کرتا ہے۔ اسی نے ساری گڑبڑ کی۔ آپ تو اپنا آرڈر لے کر چلے گئے الہ آباد اور ادھر لالہ بھائی آ کر بیٹھ گئے راجدھانی میں۔ اپنے منتری کو تو آپ جانتے ہی ہیں۔ ہر طرح کی کمزوری ہے وہاں... اب آپ سے کیا چھپا ہے! کوشک کرتا ہے سارے

Scanned with CamScanner

انتظام۔ کتنا پے منٹ ہوا ہے، ہمیں سب پتا ہے۔''

شرما پانی پینے کے لیے رکا۔ بٹوک چند نے اسے ایک بار تولنے کی کوشش کی لیکن اب ان کو اپنی آنکھوں پر شک ہونے لگا تھا۔ اتنی معلومات بابو پی سی او سے نہیں دے سکتا تھا۔ اس نیتا کے سامنے بچھا جا سکتا تھا۔ انھوں نے ہونٹ پھیلائے اور پان سے رنگے کتھئی دانتوں کی نمائش کی۔ ''اب یہاں آپ سے کیا چھپا رہ سکتا ہے؟''

بابو کو لگا کہ یہاں تو دونوں فریقوں میں براہ راست گفتگو کی گنجائش بن رہی ہے۔ ''اب تیرا کیا ہوگا کالیا!'' والے انداز سے وہ بھی اسٹیج پر کود پڑا۔

''راجدھانی میں دن بھر کیا ہوتا ہے، سب کی رپورٹ شام تک شرما جی کو پہنچ جاتی ہے۔ اسی لیے تو میں نے کہا کہ ایک بار شرما جی کے دربار میں بات پہنچ جائے، پھر بے فکر ہو کر ہم لوگ گھر بیٹھیں۔ شرما جی سب دیکھ لیں گے۔''

شرما جی نے ہوا میں ہاتھ سے کچھ مارنے کی کوشش کی۔ بٹوک چند نے چاروں طرف مکھی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ سامنے ایک بیرا آ کر کھڑا ہو گیا تب ان کی سمجھ میں آیا کہ شرما کی یہ خاص ادا ہے جسے اس ہوٹل کے بیرے بھی پہچانتے ہیں۔

بیرا صرف آیا نہیں، شرما نے اپنی زبان، آنکھ اور ٹھوڑی کے اشاروں سے جتنا کچھ سمجھایا، اس سے زیادہ وہ اپنی پنسل سے کاغذ کے ٹکڑوں پر لکھتا رہا۔ بٹوک چند کی سمجھ میں صرف اتنا آیا کہ انھیں پوری کارروائی کے بعد کافی کچھ بھگتان کرنا پڑے گا، پر اب انھیں کھل نہیں رہا تھا۔ جس طرح کی خبریں شرما کے پاس تھیں اور جتنے یقین کے ساتھ وہ راجدھانی کے بڑے لوگوں کے نام لے رہا تھا، اس سے بٹوک چند کو لگا کہ کھانے پینے کی اشیا کی جو لمبی فہرست بیرے نے نوٹ کی تھی، وہ اتنی لمبی نہیں تھی جتنی اس کی پنسل چلتے وقت لگ رہی تھی۔

''اس مہینے میں کملا کانت کا تبادلہ کرانے کا کیا مطلب؟ ارے آپ کو تو مارچ اپریل میں ہی کوشش کر لینی چاہیے تھی۔ اب تک تو فصل پک کر تیار ہو گئی، اب کٹنے کا وقت آیا ہے تو آپ ڈگری لا کر کسان کو دکھا رہے ہیں کہ بھئی، کھیت تمھارا نہیں ہے۔ ایسے میں تو کسان لڑے گا ہی۔ کیوں بھائی، میں جھوٹ بول رہا ہوں؟'' اس نے بابو کی طرف دیکھا۔

Scanned with CamScanner

بابو کا دھیان میز پر لگنے والی پلیٹوں کی طرف تھا، جنھیں بیرا دھیرے دھیرے میز پر سجا رہا تھا۔ شرما کو اپنی طرف مخاطب ہوتے دیکھ کر وہ سٹپٹا گیا، پھر منھ میں تھوک نگلتے ہوئے اس نے کہا، ''ارے شرما جی، ہم بھی تو کسان آدمی ہیں۔ کون سالا فصل پکنے کے بعد ہمارے کھیت کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے گا۔ سالے کی آنکھ نکال کر... اس میں ڈال دیں گے۔'' بابو پانچ ستارہ ہوٹل سے خوفزدہ تھا؛ اگر سیکریٹریٹ ہوتا تو وہ ان اعضائے خاص کے نام بھی لے لیتا۔

بٹوک چند نے کھنکھار کے کرسی پر کروٹ بدلی۔ بابو کو لگا، اس نے شرما کے مطلب کی بات کہہ دی تھی۔ وہ پھر سے پلیٹیں گھورنے لگا۔

''یہی تو ہم بھی کہہ رہے ہیں۔ لڑائی میں ہمیں دشمن کی طاقت اور کمزوری کا برابر خیال رکھنا چاہیے،'' کسی تجربہ کار ماہر فوجی افسر کی طرح شرما نے صلاح دی۔ ''اب آپ دیکھیے کہ پورے صوبے کو معلوم تھا کہ اس مرتبہ بارہ سالہ کمبھ لگنے والا ہے۔ چھوٹے چھوٹے چپراسی، میٹ بھی لاکھ دو لاکھ گھر لے آئیں گے۔ ایک درجن سے زیادہ ایگزیکٹو انجینئر لائن میں تھے۔ یہاں راجدھانی میں کھلی بولی ہو رہی تھی۔ پتا نہیں آپ اس بولی میں تھے یا نہیں؟'' اس نے بٹوک چند کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

بٹوک چند نے آنکھیں جھکا لیں۔ یہ کمبخت جتنا جانتا ہے، اس میں اپنی طرف سے کچھ جوڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ انھوں نے پلیٹ میں سے ایک پنیر پکوڑا اٹھایا اور منھ میں ڈال لیا۔ بابو کے لیے یہ اشارہ تھا۔ اس نے اپنی پلیٹ بھرنی شروع کر دی۔

''آپ سیدھے آدمی ہیں، آپ نہیں رہے ہوں گے، یار بے بھی ہوں گے تو کسی صحیح آدمی کے پاس نہیں پہنچے ہوں گے۔ ہمارے پاس تو آئے نہیں۔ ایک چڑی مار آیا تھا بھابھی جی کے پاس۔ لگا سودے بازی کرنے۔ ہم نے ڈانٹ کر بھگا دیا۔ ارے ہم کوئی بنیا بقال تو ہیں نہیں کہ دکان کھول کر بیٹھے ہوں۔ ہم تو تعلقات بناتے ہیں اور پھر زندگی بھر ان کو نبھاتے ہیں۔''

بٹوک چند نے اپنی پلیٹ بھر لی۔ اب تک کی گفتگو سے انھیں دو پیغام ملے تھے۔ شرما جب ''ہم'' لفظ کا استعمال کرتا تھا تو اس کا مطلب خود سے اور بھابھی جی سے تھا۔ بھابھی جی وہی محترمہ تھیں جن کو لوگ صوبے کی منی چیف منسٹر کہتے تھے اور جن کے بارے میں بابو انھیں بتاتا آیا تھا۔ دوسرا

Scanned with CamScanner

پیغام یہ تھا کہ شرما کو صرف ایک ہی بار پے منٹ نہیں کرنا ہوگا، وہ زندگی بھر کا تعلق بناتا تھا یعنی نوکری کے باقی سال بھی اسے کچھ نہ کچھ دینا پڑے گا۔

شرما نے اپنی پلیٹ میں کچھ نہیں لیا۔ سیدھے ہاتھ ڈال کر ڈونگے میں سے دو رس گلے نکالے اور گپا گپ منہ میں ڈال لیے۔ خوبصورتی یہ تھی کہ چاشنی اس کے ہاتھوں اور ہونٹوں سے چاروں طرف ٹپکی، پر اس کے سفید اجلے کرتے پاجامے پر ایک بوند نہیں گری۔ بٹوک چند کے سامنے دو متبادل تھے۔ وہ شرما کے بڑے بڑے میلے ناخنوں والے ہاتھ کو چاشنی میں ڈوبتے اور پھر جوٹھی چاشنی کو چاروں طرف گرتے دیکھ کر اپنی طبیعت میں پیدا ہوئی گھن کو اپنے چہرے سے ظاہر کرتے یا پھر شرما کی اس چابکدستی پر کہ شیرے کی ایک بوند بھی اس کے سفید کپڑوں پر نہیں پڑی، گہرے تعریفی انداز میں مسکراتے۔ انھوں نے دوسرے متبادل کو چنا۔ دھیمی دھیمی مسکراہٹ چہرے پر لیے وہ انتظار کرتے رہے کہ کھانے کی کن اشیا پر شرما اب حملہ آور ہوگا۔ پر اس نے اپنی ہتھیلی الٹی کر کے اپنے منہ پر لگے ہوئے شیرے اور رال کی ملی جلی لہروں کو پونچھا اور پھر دونوں ہاتھوں کو میز پوش سے پونچھ ڈالا۔

"میں نے کہا نا بڑے صاحب، آپ سیدھے آدمی ہیں۔ آپ ہم لوگوں کے پاس آئے نہیں، اس سیتاپور والے فراڈ کے ساتھ گھومتے رہے..."

بٹوک چند خاموشی سے شرما کو پانی پیتے دیکھتے رہے۔ سالا پورا گھاگھ ہے۔ جانتا سب ہے، پر میرے منہ سے سننا چاہتا ہے۔

"کملاکانت نے صحیح تالے کی صحیح چابی پکڑلی..."

پھر انھوں نے اپنی اس کہاوت کی تشریح کی۔ راجدھانی میں الگ الگ تالے تھے اور ان کو کھولنے کے لیے الگ الگ چابیاں تھیں۔ صحیح چابی لگ جانے پر تالا کھل جاتا تھا۔ پی ڈبلیو ڈی منتری نامی تالے کی چابی کوشک نامی پی اے تھا۔

"پر گروجی، آپ بھی کم نہیں نکلے۔ سالے للوا کو اسی کے داؤں سے پٹخنی دے دی۔ کوشک سے ہی اُس کا تبادلہ کروا دیا..."

اس مرتبہ شرما نے انھیں سیدھا آدمی نہیں کہا تھا اور انھیں کملاکانت کے برابر رکھا تھا، اس لیے بٹوک چند نے کرسی پر جگہ ضرور بدلی، پر چہرے پر وہی مسکراہٹ قائم رکھی جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ

Scanned with CamScanner

سامنے والا کہتا رہے، سننے والا سن بھی رہا ہے، نہیں بھی سن رہا ہے، اتفاق بھی کر رہا ہے اور مصلحت کوشی بھی۔ ضروری نہیں کہ ہر بات پر اتفاق رائے ہو۔

''ہمیں سب پتا ہے سرکار بہادر، کیا کیا ہوا! پہلے ورما آیا، آرڈر لے گیا۔ پھر آپ آئے، آپ کا آرڈر ہو گیا۔ پھر ورما آیا اور اپنا آرڈر کرا کے لے گیا۔ ہمیں تو صاحب، یہ کھیل پسند نہیں ہے۔ اپنا تو ایک اصول ہے، ایک بار تعلق بناتے ہیں تو پھر پوری زندگی اسے نبھاتے ہیں۔ اگر ہم نے بیس لے کر ورما کو آرڈر دلوا دیا تو پھر آپ پچیس پچاس کچھ بھی دیں، ہم تو نہیں بدل سکتے۔ کیوں صاحب، ٹھیک کہہ رہے ہیں نا؟''

بٹوک چند نے کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف مسکراتے رہے اور اسے تولتے رہے۔ جو اعداد و شمار اس کے منہ سے نکلے تھے، وہ سچ تو نہیں تھے، پر سچ سے کافی قریب تھے۔ اپنے منہ سے وہ لین دین پر خرچ ہوئی رقم کا اندازہ نہیں دینا چاہتے تھے۔ ان کی جگہ جواب دیا بابو نے، جو اب تک سامنے رکھی کھانے پینے کی تمام چیزوں کا نپٹارا کر چکا تھا اور میز پر رکھے سارے نیپکنوں سے باری باری اپنا منہ ہاتھ پونچھ کر منہ میں انگلی ڈال ڈال کر دانتوں میں پھنسے ریشے نکال رہا تھا۔ شرما کی بات کا جواب اس نے دیا مگر مخاطب کیا بٹوک چند کو ہی: ''مرد کی بات تو یہی ہوتی ہے پنڈت جی۔ یہ کیا کہ زیادہ پیسہ دیکھ کر زبان بدل گئی۔''

پھر کافی دیر تک دونوں نے مردانگی اور رشوت کے قریبی تعلق پر تبادلۂ خیال کیا۔ اس کے مطابق جس طرح مرد کی زبان ایک ہوتی ہے، اسی طرح اگر آپ نے کسی سے پیسہ لے لیا ہے تو پھر آپ بدل نہیں سکتے۔ اگر آپ نے مخالف سے زیادہ پیسہ لے کر پہلے والے کا کام بگاڑ دیا تو آپ مرد نہیں ہیں۔ شرما چونکہ مرد تھا اس لیے وہ زندگی بھر کے لیے تعلق بناتا تھا۔

بٹوک چند مسکراتے رہے اور سنتے رہے۔ ان کی دلچسپی زندگی بھر کے تعلق میں نہیں تھی۔ کمبھ ختم ہونے کے بعد وہ تعلقات کی تجدید کر سکتے تھے۔ اب وہ وقت آ گیا تھا کہ ان کا دخل اندازی کرنا ضروری ہو گیا۔

''اسی لیے تو آپ کی شرن میں آیا ہوں شرما جی۔ میں تو خود ایک بار کسی سے رشتہ قائم ہو جائے تو زندگی بھر نبھاتا ہوں۔ آپ آزمائیں گے تو پیچھے نہیں پائیں گے۔''

Scanned with CamScanner

''سو تو ہے۔ آپ کو دیکھتے ہی مجھ کو لگ گیا تھا کہ آپ سیدھے آدمی ہیں۔ آپ سے خوب پٹے گی۔ تعجب ہے کہ ابھی تک آپ سے ملاقات کیوں نہیں ہوئی؟''

''سب وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ جب تک لکھا نہ ہو، کچھ نہیں ہوتا۔'' بٹوک چند نے چھت کی طرف نگاہیں اٹھا دیں۔

''ہاں، یہ تو ہے صاحب۔ جب تک قسمت میں نہیں لکھا ہوتا، انسان کچھ نہیں کر سکتا۔ آج بدا تھا، اس لیے آج صاحب میرے کمرے میں آ گئے۔ میں نے سنتے ہی کہا کہ بس شرما جی ہی اس مشکل سے نجات دلا سکتے ہیں۔ جب تک لکھا نہ ہو—'' بابو نے بھی چھت کی طرف دیکھنے کی کوشش کی، پر اوپر جاتے جاتے اس کی نگاہیں اس خوبصورت عورت کے چہرے پر اٹک گئیں جو اس درمیان ان کے سامنے والی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی تھی اور وہ وہیں قسمت لکھنے والے کو تلاش کرنے لگا۔

''چلیے صاحب، قسمت کو آج ہی منظور تھا تو آج ہی سہی۔ اب مل گئے ہیں تو کچھ نہ کچھ اچھا ہی ہوگا۔ اب بتائیے کہ کیا کرنا ہے... کیسے کرنا ہے؟''

بٹوک چند خوش ہوئے کہ اتنی لمبی چوڑی تمہید کے بعد وہ اس نقطے پر آ گئے ہیں جہاں سے کام کی باتیں شروع ہو سکتی ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے وہی کیا جو انھیں ایسے موقعے پر کرنا چاہیے تھا اور جس کی امید شرما کر رہا تھا۔ انھوں نے معنی خیز نظروں سے بابو کی طرف دیکھا۔ بابو جو ابھی تک کنکھیوں سے خوبصورت عورت کی طرف دیکھ رہا تھا، اب پوری طرح اس کو گھورنے لگا۔ صاف تھا کہ وہ کوئی اشارہ سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے ساری زمین جوتی بوئی تھی اور اب جب فصل کاٹنے کا موقع آیا تو اس سے امید کی جا رہی تھی کہ وہ وہاں سے چلا جائے۔ اس نے اشارہ سمجھنے سے انکار کر دیا۔

''پنڈت جی، آپ حضرت گنج سے ذرا بڑھیا پان لگوا لاؤ۔ صاحب کی گاڑی لے لو... نہیں تو میری گاڑی لیتے جاؤ۔'' اب شرما نے دخل اندازی کی۔

''ابھی یہاں سے نکلیں گے تو باہر کہیں کھا لیں گے۔'' بابو نے دھیمے لہجے میں مخالفت کی۔

''نہیں... نہیں... لے آؤ۔ سسُر گھنٹہ بھر ہو گیا پان کھائے۔ ہم تو صاحب بنارس کے ہیں۔ لاکھ لکھنؤ میں رہ لیں، پر پان کے بنا من نہیں مانتا۔'' شرما ہنسا۔ بابو بھی ہنسا، پر بے دلی سے، اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔ اس کے باہر جاتے ہی بٹوک چند نے جیب سے پانوں کی ڈبیا نکالی اور شرما کے

Scanned with CamScanner

آگے بڑھا دی۔ شرما نے دو بیڑے نکالے اور منھ میں ٹھونس لیے۔

''پان بڑھیا ہیں پنڈت جی۔''

''یہی تو ایک چیز ہے صاحب، جس کا ہمیں نشہ ہے۔ شراب ہم چھوتے نہیں... سگریٹ ہم نے پی نہیں... ایک چیز کے سہارے زندگی کاٹ رہے ہیں۔''

دونوں نے ایک ساتھ قہقہے لگائے۔ بٹوک چند نے بھی دو بڑے پان منھ میں ٹھونسے۔ اب میدان صاف ہو گیا تھا اور بات کی جا سکتی تھی۔

''ہاں تو بتائیے صاحب، کیا کرنا ہے... کیسے کرنا ہے؟''

''کیا کرنا ہے؟'' اسے بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ''کیسے کرنا ہے؟'' اسی پر بحث ہونی تھی۔ سامنے والے کو کتنی معلومات ہے، اس پر ''کیسے کرنا ہے'' طے ہونا تھا۔ اب تک کی گفتگو سے یہ تو صاف ظاہر تھا کہ شرما جانتا ہے کہ کیسے کملا کانت نے اپنا تبادلہ کمبھ میلہ ڈویژن میں کرایا، پھر بٹوک چند نے اسے ہٹا کر خود کو وہاں تعینات کرا لیا، اور فوراً بعد کملا کانت نے پھر اپنا تبادلہ رکوا لیا۔

پر یہ تو پوری راجدھانی کو معلوم تھا۔ اس میں پیچ یہ تھا کہ لین دین کتنے کا ہوا، یہ اسے معلوم ہے کہ نہیں؟ بیچ بیچ میں اس نے جو رقمیں بولی تھیں، وہ سچ کے قریب تھیں، پر سچ نہیں تھیں۔ اس کا مطلب ہے، اس پر سودے بازی ہو سکتی ہے۔

سودے بازی اسی پر شروع ہوئی۔ شرما نے جو رقم کملا کانت کی طرف سے خرچ کی گئی بتائی، وہ دراصل دگنی سے زیادہ تھی۔ جواب میں بٹوک چند نے جو اپنا خرچہ بتایا، وہ ان کی خرچ کی ہوئی رقم کا تہائی تھا۔ یہ کام کا اصول تھا۔ اس میں دونوں فریق ایک دوسرے کو تولتے ہیں، آگے پیچھے ہوتے ہیں، پھر کسی ایک رقم پر سودا طے کر لیتے ہیں۔

''پچیس۔ دیکھیے بھابھی جی تو اب چھوٹے موٹے کاموں میں ہاتھ ڈالتی نہیں ہیں۔ اس سے کم کہوں گا تو میرا گھر میں گھسنا بھی بند ہو جائے گا۔''

''میرے لیے تو آپ ہی سب کچھ ہیں شرما جی۔ پانچ ٹھیک رہے گا۔''

''پچیس۔''

''پانچ۔''

Scanned with CamScanner

''کیا بنیوں والی باتیں کرتے ہیں پنڈت جی۔ پانچ دس کے لیے بھابھی جی کسی کام میں ہاتھ نہیں ڈالتیں۔''

''میرے لیے تو آپ ہی بھائی صاحب ہیں اور آپ ہی بھابھی جی۔ میں جتنا کرسکتا ہوں، آپ سے عرض کردیا۔ اس کے بعد گردن پکڑیں گے تو ایک دو اور کردوں گا، پر اس کے آگے تو ہاتھ جوڑ لوں گا۔''

''ایسے تو بات نہیں بنے گی بڑے صاحب۔ اس سے زیادہ تو کملا کانت ورما کو خبر کردی جائے تو وہی پہنچا جائے گا، جبکہ اس کے لیے کرنا کچھ نہیں ہے۔ میں تو سمجھا تھا کہ آپ سیدھے آدمی ہیں، آپ کے ساتھ ایک تعلق بن رہا ہے، زندگی بھر چلے گا، مگر آپ کاروباری بات کررہے ہیں...''

بین الاقوامی ڈپلومیسی کی طرح اس قسم کی سودے بازی میں بھی صبر وتحمل سب سے زبردست فیصلہ کن جزو ہے؛ دونوں فریق اسے جانتے تھے، اس لیے دونوں نے بیچ بیچ میں بات ختم ہونے کا اعلان کیا، دونوں نے اٹھنے کا ارادہ ظاہر کیا، لیکن نہ تو بات ختم ہوئی اور نہ ہی کوئی اٹھا۔

بات تبھی ختم ہوئی جب بابو پان لے کر ہال میں داخل ہوا۔ بنوک چند نے پانوں کی ڈبیا اٹھا کر جیب میں رکھ لی۔

''بڑی دیر لگادیے!'' بابو کے لائے پان کے بیڑوں میں سے دو اٹھا کر منھ میں ٹھونستے ہوئے شرما نے کہا۔ ''تمبا کو نہیں لائے کیا؟''

''لائے ہیں۔ ہمیں پتا نہیں کیا کہ آپ ایک سو بتیس نمبر کھاتے ہیں!''

بابو نے پلاش کے پتے میں لپٹی تمباکو ان کے آگے بڑھادی۔ ''ارے ہم جانتے ہیں، آپ کا کوئی کام ہلکا نہیں ہوتا۔ ای تو سالا آپ کا منتری بے وقوف ہے، آپ کو کام نہیں دیتا۔ سارا کام کو شکوا سے کراتا ہے...''

''اب آپ کو ہمارا بھی کچھ بھلا کرانا ہے شرما جی۔ پہلے صاحب کا کام ہوجائے، پھر ہمارا بھی کچھ خیال کیجیے گا۔ بھابھی جی سے یا تو ہمارے منتری جی کو ڈنٹوا دیجیے یا پھر سی ایم کے یہاں لگوا دیجیے ہمیں۔ آپ کا ایک آدمی وہاں بھی ہونا چاہیے۔''

''کریں گے... کریں گے... اس بار بھابھی جی سے کہیں گے، تاکہ آپ کو سی ایم کے

یہاں ہی لگوادیں۔'' شرمانے پھر ہاتھ سے کچھ مکھی جیسی چیز مارنے کی کوشش کی۔ ایک ویٹر بل لے کر حاضر ہوگیا۔ بل شرمانے اٹھانے کی کوشش کی۔ بابو نے بھی کچھ اسی طرح کا دکھاوا کیا کہ اگر بل اس نے نہیں چکایا تو اس کے ساتھ بہت بڑی ناانصافی ہو جائے گی۔ بٹوک چند کو معلوم تھا کہ بل چکانا انھی کو ہے، اس لیے ان دونوں کی مضبوط گرفت سے انھوں نے آسانی سے بل اپنی طرف کھینچ لیا اور جیب سے پرس نکال کر روپے گننے لگے۔

''پھر؟''

بابو کے اس سوال کا کسی نے جواب نہیں دیا۔ اس کا رول ختم ہوگیا تھا اور ڈرامے کے دوسرے کردار اسٹیج سے اس کے جانے کا انتظار کر رہے تھے۔

''پھر؟''

اس مرتبہ بھی کسی نے جواب نہیں دیا۔ شرما اٹھا اور ہال کے باہر کی طرف چل دیا۔ بٹوک چند نے ویٹر کے واپس لائے ہوئے نوٹوں کی گنتی کی، اس میں سے دس کا ایک نوٹ طشتری میں رکھ کر ویٹر کو جانے کا اشارہ کیا۔ ویٹر کے جانے کے بعد اپنی جیب سے کچھ اور نوٹ نکالے اور پہلے والے نوٹوں میں ملا کر بابو کی طرف بڑھا دیا۔ بابو کو اس کے سوال کا جواب مل گیا۔ اس نے کھیسیں نکالیں اور نوٹ جیب میں رکھ لیے۔

جب وہ لوگ باہر نکلے، باہر پوری طرح اندھیرا چھا گیا تھا۔

''آپ کو کہاں چھوڑیں؟'' بٹوک چند نے بابو سے پوچھا۔ بابو نے جس جگہ کا نام لیا، وہ ان کی منزل سے بالکل مخالف سمت میں تھی۔

''ٹیکسی کا پیسہ دے دیجیے، چلے جائیں گے،'' شرمانے اپنی آواز کی جھنجلاہٹ چھپاتے ہوئے کہا۔

بٹوک چند نے جیب سے ایک نوٹ نکالا اور بابو کے ہاتھ میں تھما دیا۔ بابو نے پھر اپنے دانت نکال دیے۔

''دیکھیے شرما جی، میرا بھی دیکھیے گا۔ اور نہیں تو سی ایم کے یہاں ہی رکھوا دیجیے۔ ایک بار بھابھی جی چاہ لیں تو...'' بابو گڑگڑایا۔

Scanned with CamScanner

''دیکھیں گے... دیکھیں گے... کچھ نہ کچھ کریں گے۔'' شرما نے ہاتھ سے تصوراتی قسم کی کوئی مکھی سی اڑائی۔

''اپنی گاڑی کو کہیے ہمارے پیچھے آئے۔'' شرما اپنی کار کی طرف بڑھا۔ بٹوک چند نے اپنے ڈرائیور کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور خود شرما کی کار کا دروازہ کھول کر اسی میں بیٹھ گئے۔

ہندوستانی ہونے کا ایک فائدہ ہے۔ آپ کبھی بھی فلسفی ہو سکتے ہیں۔ اس کے لیے موقع، وقت یا ساتھی کی رکاوٹ نہیں ہوتی۔

کار چلی تو شرما بھی فلسفی ہو گیا۔ اس کے فلسفی ہونے کی دو وجہیں تھیں۔ ایک تو ان کی آج کی ملاقات تھی جس کے لیے وہ بار بار صرف اور صرف قسمت کا ہی قائل ہوتا جا رہا تھا۔

''اب دیکھیے پنڈت جی، جب لکھا تھا تبھی ملاقات ہوئی۔ پچھلے سال آپ سیتا پور والے سالے فراڈ کے ساتھ گھوم رہے تھے تو ہمیں پتا چل گیا تھا۔ ہم نے سوچا بھی کہ آپ بھلے آدمی ہیں، آپ کو بلالیں، پر بھابھی جی نے کہا، شرما، سب وقت وقت کی بات ہے۔ جس دن لکھا ہوگا، اس دن ہو جائے گی ملاقات۔ تو آج ہو گئی صاحب۔''

فلسفی ہونے کی دوسری وجہ کچھ ایسی تھی کہ بٹوک چند ہکا بکا رہ گئے، ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس پر ہنسیں یا اداس ہو جائیں۔

''آج میں آپ کو بھابھی جی کے پاس لے جا رہا ہوں۔ ایک زمانہ تھا یہی بھابھی جی میرے پاس لوگوں کو لے کر آتی تھیں۔ سب وقت وقت کی بات ہے صاحب۔''

شرما نے سانس لی تو بٹوک چند کار کے شیشے سے باہر جھانکنے لگے۔ کہاوت ہے کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ یہاں دیوار تو نہیں تھی، پر دو کانوں والا ڈرائیور کار چلا رہا تھا۔ کچھ بھی کہنا خطرے سے خالی نہیں تھا، اس لیے سب سے آسان راستہ تھا کہ وہ باہر جھانکنے لگتے، اور وہ یہی کرنے لگے۔

فلسفیانہ حملہ اکثر سننے والوں کو خاموش کر دیتا ہے۔ یہاں تو فلسفیانہ حملے نے شرما ہی کو سلا دیا۔ شرما کی نیند تب ٹوٹی جب کار اس مکان کے باہر رکی۔ اس آنکھیں جھپکاتے ہوئے دیکھا تو بٹوک چند بنفس نفیس اس کے پہلو میں براجمان تھے۔

Scanned with CamScanner

کمرے میں بیٹھے لوگوں میں جن موضوعات پر بات چیت ہو رہی تھی وہ راجدھانی کے لوگوں کے سب سے پسندیدہ موضوعات تھے، تبادلے اور لائسنس یہ دونوں راجدھانی کے ادب وثقافت کا حصہ تھے۔ قومی لیڈروں کے گھروں، دلالوں کے ٹھکانوں، پارٹی دفتروں اور سیکریٹریٹ کے کمروں میں چوبیس گھنٹے انھی موضوعات پر سیمینار منعقد ہوتے رہتے تھے۔ سیاسی جماعتوں کے منشوروں میں بڑے بڑے وعدے، بڑی بڑی باتیں لکھی جاتی تھیں، پر ان کے کارکن جانتے تھے کہ لکھی ہوئی باتیں مستند نہیں ہوتیں۔ انتخابات ہوتے ہی چوراہوں پر گائیں اس منشور کو کھاتی دکھائی پڑتی ہیں۔ نیتا لوگ دوبارہ لائسنس اور تبادلوں کے کاروبار میں لگ جاتے ہیں اور جو نیتا تبادلہ کرا سکتا ہے یا لائسنس دلا سکتا ہے، اس۔ کے یہاں سب سے زیادہ بھیڑ لگتی ہے۔ بھابھی جی عرف منی چیف منسٹر کے یہاں آج کل سب سے زیادہ بھیڑ لگ رہی تھی، کیونکہ آج کل سب سے زیادہ تبادلے وہی کرا رہی تھیں۔

بٹوک چند افسر تھے، اس لیے بھیڑ میں بیٹھے دوسرے افسروں کی طرح منھ لٹکائے بیٹھے تھے۔ یہ سبھی کسی نہ کسی دلال کے ساتھ یہاں پہنچے تھے۔ سب کا کوئی نہ کوئی کام تھا، پر چونکہ یہ افسر تھے، اس لیے ماتمی صورت بنائے رکھنے کے لیے مجبور تھے۔ دلال چہک رہے تھے: افسر منھ لٹکائے ہوئے تھے۔

بھابھی جی چیف منسٹر کی کوٹھی پر کسی میٹنگ کے لیے گئی ہوئی تھیں۔ میٹنگ ختم ہوتے ہی یہاں پہنچیں گی، یہ خبر لے کر بیچ بیچ میں لوگ آرہے تھے اور اندر جاتے جا رہے تھے۔

خبریں دینے والے نوجوان لڑکے تھے جو اندر سے ایک دم نمودار ہوتے اور کمرے میں بیٹھے ایک دو لوگوں سے ہاتھ ملاتے، ایک دو لوگوں کے پیر چھوتے، ایک دو لوگوں کو جیب سے نکال کر پان دیتے اور انتہائی مصروف ہونے کے باوجود بیچ بیچ میں یہ اعلان بھی کرتے رہتے کہ بھابھی جی بس آ ہی رہی ہیں... وہ تو چیف منسٹر نے اتنی امپارٹنٹ میٹنگ رکھ لی ہے، نہیں تو آج کہیں نکلنے والی ہی نہیں تھیں۔

ان لڑکوں میں کچھ باتیں حیرت انگیز طور پر مشترک تھیں۔ پچیس تیس کی عمر والے یہ لڑکے کھدر کے کلف سے کڑکڑاتے کرتے پاجامے پہنے، ہاتھوں میں سیل فون لیے، ہلکی ڈاڑھی بڑھائے، منھ میں پان ٹھونسے، ایک ہی جیسی مصروفیت میں ڈوبے لگتے تھے۔ وہ تیزی کے ساتھ کمرے میں گھستے، اکثر

Scanned with CamScanner

اس وقت سیل فون پر باتیں کرتے رہتے اور پھر اسی تیزی کے ساتھ کمرے میں ایک چکر لگاتے ہوئے اندر چلے جاتے۔

یہ لڑکے بھابھی جی کے کارکن تھے۔ پارٹی کے پرانے نیتا جب چیف منسٹر اور بھابھی جی کے درمیان کسی نخش قسم کے رشتے کو جوڑتے یا اشارہ کرتے تو یہی لڑکے ان کی ٹھکائی کرنے کے کام آتے تھے۔ کوئی افسر اگر صرف فون پر بات نہ سمجھ پاتا تو یہ جا کر اسے اس کے کمرے میں سمجھا آتے۔ پارٹی کی مرکزی قیادت اگر صوبے کے جھگڑے سلجھانے کے لیے کوئی مڈل مین بھیجتی تو یہ لڑکے اسے بتاتے کہ کس طرح پرانی قیادت نے ان کارکنوں کو نظر انداز کیا ہے اور کس طرح بھابھی جی نے پہلی بار زمینی کارکنوں کو پہچانا ہے اور انھیں اہمیت دینا شروع کیا ہے۔ اکثر یہ فیصلہ بھی یہی لڑکے کرتے کہ مرکزی قیادت سے صوبے کا کون سا لیڈر ملے گا اور کسے ملنے سے روکا جائے گا۔

ڈسپلن ہی برسر اقتدار پارٹی کی خاص طاقت تھی اور یہ لڑکے اسی ڈسپلن کو قائم رکھتے تھے۔

بٹوک چند کے سامنے کچھ اندیشے تھے۔ کافی دیر سے انھیں لگ رہا تھا کہ کمرے میں آنے والے لڑکوں کا رویہ شرما کے ساتھ کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جس کی تعریف کرنا کچھ کچھ مشکل ہے۔ تقریباً ہر آنے والا لڑکا شرما کو نمستے ضرور کہتا ہے اور کچھ اس کے پیر بھی چھوتے ہیں، لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ شرما کچھ کہنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کا جملہ ادھورا رہ جاتا ہے اور ''ہاں... ہوں...'' سے زیادہ کوئی جواب نہیں ملتا۔ ایک بار ایک لڑکے کو شرما نے ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیا۔ اس نے اس کے کان میں کچھ کہنا شروع ہی کیا تھا کہ لڑکے نے جیب سے پان نکالا، شرما کی طرف بڑھایا اور جیسے ہی شرما نے پان منھ میں رکھا، لڑکا اٹھا اور آگے بڑھ گیا۔

اچانک شرما اٹھا اور اندر کی طرف بڑھا۔ بٹوک چند کا دل دھڑکنے لگا۔ اس دربار میں شرما کی حیثیت کا اندازہ اسی سے ہوگا کہ گھر کے اندر اس کا داخلہ ہوتا ہے یا نہیں۔ جس خود اعتمادی کے ساتھ شرما اندر جا رہا تھا، اس سے یہ تو صاف ظاہر تھا کہ وہ اس گھر کے اندر جاتا رہا ہے۔ بٹوک چند کو لگا کہ ان کی مہم کی کامیابی شرما کی اس حرکت میں پوشیدہ ہے۔ شرما اندر چلا گیا تو انھوں نے لمبی سانس لی۔

دو ہی منٹ بعد شرما باہر آ گیا۔ ایک مضبوط لڑکا اسے اپنی بانہوں میں بھر کر لایا تھا۔ شرما بٹوک چند کو دیکھ کر مسکرایا، ان کی جان میں جان آئی۔ لڑکا دوستانہ انداز میں گل بہیاں ڈالے شرما کو لا رہا تھا۔

Scanned with CamScanner

پتا نہیں انھیں کیوں لگا کہ شرما کو وہاں لایا جانا گھسیٹنا جیسا لگا تھا اور اس کی مسکراہٹ کھسیانی جیسی تھی۔

بٹوک چند گھبرائے۔ لڑکا زبردستی لڑھکا تا ہوا شرما کو ان کی بغل میں پٹک گیا۔

''نہیں بیٹھیے شرما جی... بھابھی جی آنے والی ہیں... کیا ہے کہ ان کی سی ایم کے یہاں میٹنگ پڑگئی نا... نہیں تو آج کہیں جانے والی نہیں تھیں۔''

بٹوک چند کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ کون سی صورت حال ٹھیک ہے اور کون سی نہیں۔ لڑکا دوستانہ انداز میں شرما کو وہاں تک لایا تھا یا پھر غیر ضروری اچھوت چیز کی طرح وہاں پٹک گیا تھا؟ پانچ ستارہ ہوٹل کا بل کتنے کا تھا؟ انھوں نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ پھر اس سالے بابو کو انعام واکرام اور ٹیکسی کا کرایہ الگ سے دیا۔ سب بیکار ہو گیا۔ خیر، یہاں تک آ تو گئے ہی ہیں، اب باقی اوپر والے کے ہاتھ۔ انھوں نے چھت کی طرف دیکھا جہاں پنکھا چل رہا تھا، اس پر اگر کوئی ایشور بیٹھا تھا تو وہ اتنا تیز گھوم رہا تھا کہ انھیں دکھائی نہیں پڑا۔ وہ کمروں کی آوازوں سے دور ہو کر اس کو تلاش کرنے لگے۔

کمرے کی آوازیں ایک لمحے کی خاموشی میں ڈوبیں اور پھر اور زیادہ تیزی سے بھنبھنانے لگیں۔

بھائی صاحب، یعنی بھابھی جی کے پتی دیو، کمرے میں داخل ہو گئے تھے۔ ان کے ارد گرد وہی لڑکے تھے جو بار بار کمرے میں آ جا رہے تھے۔ کھچا کھچ بھرے کمرے میں بیچ والے صوفے پر کچھ ہلچل ہوئی اور اس کے بیچوں بیچ اتنی جگہ بن گئی جس پر بھائی صاحب بیٹھ گئے۔ یہ معجزہ صرف راجدھانی کے انھی کمروں میں ہوتا تھا جہاں تین کی جگہ والے صوفے پر سات لوگ بیٹھتے ہوں اور بغیر کسی کے وہاں سے دستبردار ہوئے آٹھویں سیٹ بھی بھر جائے۔

''آ گئی ہیں... بس اندر ہاتھ منھ دھو کر آ رہی ہیں،'' بھائی صاحب نے بغیر کسی سے مخاطب ہوئے کہا۔ مطلب، یہ اطلاع سبھی کے لیے تھی۔ سب نے سر ہلا دیا۔

''آج گرمی کچھ زیادہ ہے بھائی جی۔''

''گرمی نہیں، اُمس ہے۔''

تھوڑی دیر اس پر بحث ہوئی کہ گرمی زیادہ ہے یا اُمس۔

Scanned with CamScanner

"اسی لیے تو آج نکلنے کا کہیں من نہیں تھا۔ انھوں نے تو انکار کر دیا تھا کہ کہیں جائیں گی نہیں۔ وہ تو سی ایم لوٹے دو پہر بعد دلی سے، اور سہ پہر کو ان کی کار حاضر۔ پہلے تو منع کر رہی تھیں، پھر میں نے کہا تو مان گئیں۔ میں نے کہا، بیچارے دو دن بعد دلی سے لوٹے ہیں، کچھ نہ کچھ صلاح مشورہ کرنا ہوگا۔ تب گئیں۔ بس ابھی واپس لے کر آیا ہوں۔ اندر ہاتھ منھ دھو کر آ رہی ہیں۔"

"گرمی بھی خوب ہے۔"

"اُمس ہے صاحب، ہر وقت نہانے کا من کرتا ہے۔"

بھائی صاحب بھابھی جی کے بارے میں اور کچھ معلومات فراہم کرنے لگے۔ بولتے وقت ان کی آنکھیں چالاک بلی کی طرح اپنے حلقوں میں گھوم رہی تھیں۔ ایک بار انھوں نے تقریباً پورے کمرے کا معائنہ کر لیا تھا، اب دوسری بار پھر ان کی نظریں کمرے میں بیٹھے لوگوں کے چہروں پر پھسل رہی تھیں، مگر اس بار کچھ رک رک کر۔ ان کی آنکھوں کی چمک اور غیر جانبداری سے ہی کمرے میں بیٹھے شخص کی حیثیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔

بٹوک چند کا دل پھر ڈوبنے لگا۔ پہلی بار تو لگا تھا کہ شرما کے چہرے پر سے پھسلتی بھائی صاحب کی نظریں کچھ دعا سلام کی سی تھیں۔ شرما نے بھی اپنی کھیسیں نکالی تھیں، لیکن دوسری بار جب سلوموشن میں آنکھیں گھومیں تو معاملہ کافی کچھ ٹھنڈا اور سرد مہری والا لگا۔ ہو سکتا ہے ان کا وہم ہو۔ انھوں نے پھر ایک مرتبہ پنکھے کی طرف دیکھا اور تیزی سے گھوم رہی کسی اَن دیکھی طاقت سے دعا کی کہ یہ ان کا وہم ہی ہو اور شرما نام کی اس مخلوق کا بھابھی جی کے اوپر ویسا ہی اثر ہو جیسا بابو نے بیان کیا تھا، یا کم از کم تب تک تو یہ اثر قائم رہے جب تک ان کا کام نہ ہو جائے۔

بٹوک چند کی دعا سنی گئی یا نہیں، اس کو پرکھنے کا لمحہ بھی آ گیا۔

بھابھی جی کمرے میں داخل ہوئیں تو سبھی لوگ گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ بھائی صاحب نے بھی اپنے کو تھوڑا سا اٹھایا، پر انھیں کچھ یاد آ گیا اور پھر انھوں نے دھم سے صوفے پر خود کو گرا سا دیا۔

بھابھی جی جب تک کھڑی رہیں، کمرے میں ایک شخص کو چھوڑ کر سبھی کھڑے رہے۔ اس درمیان ان کے زمینی کارکن اندر سے ایک کرسی لے آئے اور جو کمرہ پوری طرح سے بھرا نظر آ رہا تھا، اس کے بیچوں بیچ اتنی جگہ بنا دی گئی جہاں کرسی رکھی جا سکے۔ اس کے برابر میں ایک اسٹول بھی آ گیا

جس پر ایک ٹیلی فون رکھ دیا گیا۔ بھابھی جی نے کمرے میں موجود بھی لوگوں پر ایک طائرانہ نظر دوڑائی۔ کچھ لوگوں کے نمستے کا ہاتھ جوڑ کر جواب دیا، کچھ کے لیے مسکرائیں؛ کچھ کے جواب میں سر ہلا اور کچھ کو سرد مہری سے دیکھا گیا، اور پھر وہ کرسی پر بیٹھ گئیں۔ باقی سب لوگ بھی بیٹھ گئے۔

بٹوک چند کا حوصلہ کچھ بڑھا۔ شرما جی کی طرف دیکھ کر بھابھی جی مسکرائیں۔

اس کے بعد کمرے میں وہی سب کچھ شروع ہوا جس کے لیے بٹوک چند تیار ہو کر آئے تھے۔

صوبے میں تبادلہ سب سے بڑی صنعت تھی۔ لاکھوں کی تعداد میں سرکاری ملازمین تھے۔ سرکار عوام سے جتنی دولت لوٹتی تھی، اس کا بڑا حصہ یہ ملازمین سرکار سے لوٹ لیتے تھے۔ سرکاری خزانے کی لوٹ مار سے پیٹ نہیں بھرتا تھا، اس لیے باقی وقت میں یہ عوام کو براہ راست لوٹتے تھے۔ زیادہ تر محکموں میں تو سرکار کو لوٹنے کا صرف پہلی تاریخ کو ہی موقع ملتا تھا، اس لیے مہینے کے باقی دن یہ عوام کے فراق میں رہتے تھے۔ لوٹنے کے لیے اپنے گھر سے دور نہیں جانا چاہتے تھے، اس لیے جب بھی ان کا تبادلہ کسی ایسی جگہ ہو جاتا جہاں سے ان کا گھر بارہ گھنٹے سے زیادہ دوری پر ہوتا تو یہ بلبلا جاتے۔ انھیں ایسی جگہیں چاہیے تھیں جہاں عوام کو لوٹنے میں زیادہ محنت نہ کرنی پڑے اور جو ان کے گھر کے بھی قریب ہو۔ ایسی جگہیں کم تھیں اور امیدوار زیادہ، اس لیے ان جگہوں پر پہنچنے کے لیے مدد کرنے کو بھابھی جی اور ان جیسے سینکڑوں لوگ راجدھانی میں موجود تھے۔

آج بھی ایسے دکھیاروں کی بھیڑ کمرے میں بھری تھی اور بھابھی جی ان کے اس دکھ درد میں برابر کی شریک تھیں۔

بھابھی جی ابھی تک منسٹر یا کسی ایسے عہدے پر نہیں رہی تھیں جہاں انھیں کاغذ نپٹانے کا تجربہ ہو، مگر جس تیزی اور پھرتی کے ساتھ وہ کاغذ نپٹا رہی تھیں، اسے دیکھ کر بٹوک چند کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ انھیں اور ان کے پیر پکڑ لیں۔ یہاں پیر پکڑنا خطرناک ہو سکتا تھا، اس لیے وہ چپ چاپ بیٹھے رہے۔ ملاقاتیوں سے نپٹنے کا ان کا طریقہ بڑا ہی پیچیدہ تھا اور زیادہ تر موجود لوگوں کی پکڑ سے باہر تھا۔ بٹوک چند جیسے کچھ اور لوگ جو کمرے میں موجود تھے اور جن کا اس طرح کی صورت حال سے نپٹنے کا پرانا تجربہ تھا، وہی ان کے اس نپٹنے کے طریقے کی باریکی کو بخوبی سمجھ رہے تھے۔

زیادہ تر لوگ جو کام لے کر آئے تھے، اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی پیروکار بھی لائے تھے۔ پیروکار

Scanned with CamScanner

اور سوالی بھابھی جی سے مخاطب ہوتے۔ پیروکار اس انداز سے بھابھی جی سے سرگوشی کرتا کہ انھیں چھوڑ کر پورا کمرہ اسے سنتا۔ کمرے میں بیٹھے دوسرے لوگ تجاہل عارفانہ کا مظاہرہ کرتے جیسے انھوں نے کچھ سنا ہی نہیں اور بھابھی جی یہ ظاہر کرتیں کہ جیسے انھوں نے سب کچھ سن لیا ہو۔ دراصل یہ ایک ایسی صورت حال ہوتی جس کے لیے کسی ہندی شاعر نے کہا ہے کہ وہ نہیں بولے گا، شبد بولیں گے۔ یہ سارے الفاظ اگر حتمی طور پر کوئی مطلب کی بات بولتے تو بھابھی جی پیروکار کو قریب آنے کا اشارہ کرتیں۔ پیروکار آس پاس کے ان کے قریب بیٹھے لوگوں کو دھکیلتا ہوا وہاں پہنچ جاتا اور بیٹھ جاتا۔ دھکیلے جانے والا شخص اگر اپنے جسم کو ہٹانے سے انکار کر دیتا تو بھابھی جی کے سامنے اکڑوں زمین پر بیٹھ جاتا یا پھر آس پاس بیٹھے کسی شخص کی گود میں اس طرح بیٹھ جاتا کہ دیکھنے والے اسے صوفے جیسی کسی چیز پر بیٹھا مان لیں۔

اس کے بعد گفتگو شروع ہوتی۔ پیروکار اپنے منھ سے کچھ کہتا، بھابھی جی آنکھوں سے کچھ جواب دیتیں۔ پیروکار انگلیاں گھمانے لگتا، بھابھی جی آواز کا سہارا لیتیں۔ بیچ میں بھائی صاحب کود پڑتے۔ پیروکار اپنا موڈ بدل دیتا۔ ایک ساتھ دونوں کو مخاطب کرنے لگتا۔ بھابھی جی سیل فون سننے لگتیں۔ بھائی صاحب کسی ملاقاتی سے انتخابی حلقے کا حال پوچھنے لگتے۔ پیروکار بولتا رہتا۔ فریادی بوکھلایا سا کبھی اپنے پیروکار کو دیکھتا، کبھی بھابھی کو دیکھتا، کبھی بھائی صاحب کو دیکھتا۔ کمرے کی زندگی چلتی رہتی۔

جن پیروکاروں سے گفتگو کچھ بامقصد ہوتی، انھیں لے کر بھائی صاحب اندر چلے جاتے۔ کچھ کو کسی زمینی کارکن کے حوالے کر دیا جاتا جو انھیں لے کر کسی اور کمرے میں چلا جاتا۔ اندر کمرے بھر جاتے تو پیروکاروں اور فریادیوں کو لے کر یہ کارکن باہر لان، گیراج، پیشاب گھر، سڑک، جہاں جگہ ملتی چلے جاتے۔ پورا ماحول ہندی شاعر کی خوش فہمی کی وہ جنت ہو جاتا جہاں بات نہ ہونے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی اور جہاں لوگ آپس کے سارے اختلافات مل بیٹھ کر سلجھا لیتے تھے۔

بنوک چند شرما کی طرف سے کسی پیش رفت کا انتظار کر رہے تھے، مگر شرما آرام سے صوفے پر ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ بیچ بیچ میں وہ سیاست سے لے کر موسم تک کسی بھی مسئلے پر کوئی جملہ اچھال دیتا۔ اکثر کمرے کے کسی کونے میں کوئی اس جملے کو اچک لیتا اور جواب میں کچھ کہتا، جس کے جواب میں کوئی

Scanned with CamScanner

تیسرا کچھ ایسا کہتا جس کا پہلے جملے سے کوئی تعلق ہو، یہ ضروری نہیں تھا۔

شرما کا یوں ساکت و جامد رہنے کی صورت حال کے پیش نظر بٹوک چند نے خاموشی سے صوفے کی پشت پر سر ٹکایا اور اونگھنے لگے۔

کمرے میں زندگی روز کی طرح آرام سے چلتی رہتی، اگر خشخشی ڈاڑھی اور ابھری ہڈیوں والے چہرے والا نوجوان جو اپنی آنکھیں نیچی کیے اپنی ڈائری میں کچھ لکھ رہا تھا، اس پر بھائی صاحب کی نظر نہ پڑ جاتی۔

''آپ کا تعارف؟''

بھائی صاحب نے جس لہجے میں سوال پوچھا، اس میں وہ شیرینی غائب تھی جسے ابھی تک وہ اپنی آواز میں گھول کر کمرے میں بیٹھے لوگوں سے باتیں کر رہے تھے۔

سوال جس سے پوچھا گیا تھا، اس نے اپنی نوٹ بک بند کر، چشمہ اتار کر پونچھا، پھر بھابھی جی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا:

''آپ لوگ ان کو نپٹا لیں... پھر بات کریں گے۔''

''کیا بات کریں گے؟''

''آپ فرصت میں ہو جائیے...''

''نہیں پہلے آپ اپنا کام بتائیے۔''

کچھ دیر تک ''پہلے آپ... پہلے آپ'' کا کورس چلا۔

''آپ ہیں کون؟ کہاں سے آئے ہیں؟'' اس بار بھابھی جی نے کچھ سختی سے پوچھا۔

''انٹرویو...''

جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی ایک زمینی کارکن جھپٹ پڑا۔

''کہاں ہے انٹرویو؟ یہی تو بھابھی جی پوچھ رہی ہیں۔ کون افسر لے گا؟ کس نوکری کا ہے؟ نام، رول نمبر لکھوائیے نا۔ اس دربار میں آئے ہیں تو ہو نہ جائے گا۔''

ڈھیل جسے مخاطب کیا جا رہا تھا، تھوڑا گھبرایا۔ اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ وہ جس دنیا سے آیا تھا، وہاں اس طرح کی صورت حال سے اس کا سابقہ ابھی تک نہیں پڑا تھا۔

Scanned with CamScanner

"انٹرویو... انٹرویو تو میں لوں گا۔ سمن جی خالی ہو جائیں تو میں ان کا انٹرویو لوں گا۔"

تھوڑی دیر تک ماحول مکدر رہا۔ مطلب، ڈ ڑھیل کسی اخبار سے آیا تھا۔ آج کل صوبے اور ملک سے چھپنے والے اخبار اور رسالے بھابھی جی کی تصویروں والی خبریں رہ رہ کر چھاپ رہے تھے۔ کچھ میں ان کے انٹرویو بھی چھپے تھے۔ شروع شروع میں تو بھابھی جی کو بڑی مسرت ہوتی تھی۔ اپنی تصویر چھپا اخبار یا رسالہ لے کر باتھ روم چلی جاتیں اور اندر دیر تک اس پر فدا ہوتی رہتیں۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا کہ اخبار والوں کا نام سنتے ہی بھڑکنے لگیں۔ وہ تو خیر منی چیف منسٹر تھیں، جو اصلی چیف منسٹر تھے وہ بھی بھڑکنے لگے۔ اکثر پریس کانفرنسوں میں یہ ہوتا کہ کوئی صحافی سوال پوچھتا کسی کمرے میں، پر جواب ملتے ملتے پتا چلتا وہ باہر برآمدے میں فرش پر پڑا اس بات کا اندازہ لگا رہا ہے کہ اس کی کتنی پسلیاں اپنی جگہ سلامت ہیں۔

منی چیف منسٹر یعنی شریمتی سمن کو یہ آسانی تھی کہ وہ اس کارروائی کو اپنے زمینی کارکنوں کی مدد سے سوال پوچھے جانے سے پہلے ہی اپنے اختتام کو پہنچا دیتیں۔

آج بھی یہی ہوا۔ بھابھی کے جی زمینی کارکنوں نے اس ڈ ڑھیل صحافی کے اردگرد گھیرا تنگ کر دیا۔ ان کی کارروائی طے شدہ تھی۔ اس لیے کسی اشارے کی ضرورت نہیں تھی، پر کوئی دوسرا اشارہ نہیں مل رہا تھا، جس کی وجہ سے کارروائی شروع ہونے میں دیر ہو رہی تھی۔

بھابھی جی نے بھائی صاحب کی طرف دیکھا۔ شہر کے سارے صحافیوں کو وہ لوگ پہچانتے تھے۔ ویسے بھی اس شہر میں کوئی مائی کا لال نہیں بچا تھا جو کسی اخبار کے لیے کام کرتا ہو اور اس نے ان کا جوتا یا لفافہ نہ قبول کیا ہو۔

لفافہ اور جوتا بھابھی جی کے دربار کا محاورہ تھا۔ یہاں بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ یہ محاورہ چیف منسٹر کے دربار سے نکلا ہے۔ یہاں کے زیادہ تر زمینی کارکنوں کو چیف منسٹر کے دربار تک پہنچنے کی اجازت نہیں تھی اس لیے وہ اسے بھابھی جی کی ہی ایجاد مانتے تھے۔

چیف منسٹر کی رائے میں وہ راجہ دو کوڑی کا ہوتا ہے جو خوش ہونے پر کسی کو کچھ دے نہ سکے، اس لیے انھوں نے لفافے اور جوتے کا چلن اختیار کیا تھا۔ صحافی بھی ان کی رعایا تھے، اس لیے انھیں بھی لفافے اور جوتے ملتے رہتے تھے۔ لفافے اکثر رات میں لیے جاتے تھے جبکہ جوتے کسی بھی

Scanned with CamScanner

پریس کانفرنس میں مل سکتے تھے بشرطے کہ صحافی چیف منسٹر سے منی چیف منسٹر کے بارے میں پوچھ لے۔

آج بھی وہ موقع تھا جب لفافے یا جوتے میں سے کسی ایک کا استعمال کیا جاتا۔ زمینی کارکنوں کی دلچسپی عام طور سے جوتے میں زیادہ ہوتی تھی، اس لیے وہ اسی تیاری سے صحافی کے اردگرد کھڑے تھے، پر آنکھوں کی کوئی زبان تھی جو انھیں روکے ہوے تھی۔

''کس اخبار سے آئے ہیں آپ؟'' اخبار کا جو نام لیا گیا، اسے ادا کرنا بھائی صاحب، بھابھی جی یا ان کے کارکنوں کے لیے تھوڑا مشکل تھا، اس لیے انھوں نے صرف یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ اخبار فرانسیسی زبان کا ہے یا جرمن کا۔ پر اس مشکل اور آسانی سے تلفظ کی ادائگی نہ ہو سکنے والے لفظ سے یہ فرق ضرور پڑا کہ کمرہ کچھ خوف و ہراس اور کچھ رعب سے بھر گیا اور جوتا لگانے والوں کو تھوڑی دیر کے لیے اپنا ارادہ بدلنا پڑا۔

''ارے تو آپ ہمارا کیا انٹرویو لیں گے؟ انٹرویو لیجیے بڑے لیڈروں کا، ہم تو چھوٹے موٹے کارکن ہیں۔'' بھابھی جی کی آواز پھر شیریں ہو گئی۔

''آپ کی پارٹی تو کارکنوں کی پارٹی ہے۔ آپ کے لیڈر کہتے ہیں کہ کارکن ہی ان کی طاقت ہیں۔ آپ سے زیادہ فعال کون کارکن ملے گا، اس لیے ہمارے اخبار نے . . .''

''پر میں تو بہت چھوٹی کارکن ہوں . . .''

''ہم تو چھوٹے کارکنوں سے ہی بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''پر میں کس لائق ہوں؟''

''یہاں تو لوگ کہہ رہے ہیں کہ آپ ہی سرکار چلا رہی ہیں۔''

''آپ بھی مذاق کر رہے ہیں۔ میں تو بہت چھوٹی . . .''

جیسا کہ ایسے موقعوں پر امید کی جا سکتی تھی، دونوں طرف سے کوئی جھکا نہیں۔ ایک فریق یہ اعلان کر رہا تھا کہ شریمتی سمن نامی جس خاتون کا انٹرویو یہ صحافی لینا چاہ رہا تھا، وہ تو پارٹی کی ایک ادنیٰ سی کارکن ہیں، اور پارٹی جو کام انھیں سونپتی ہے اسے پورا کرنے کے علاوہ کسی کام میں انھیں کوئی دلچسپی نہیں ہے، اور چونکہ پارٹی نے انھیں انٹرویو دینے سے منع کر رکھا ہے اس لیے بہتر ہوگا کہ جناب

Scanned with CamScanner

صحافی، آپ اپنا وقت برباد نہ کریں اور پارٹی کے کسی بڑے لیڈر کا جا کر انٹرویو لیں۔

دوسرا فریق، جس میں اکیلا صحافی تھا، یہ مانتا تھا کہ موجودہ پارٹی اقتدار میں ہے اور چونکہ یہ کارکنوں کی پارٹی ہے اور شریمتی سمن خود مان رہی ہیں کہ وہ اس پارٹی کی ادنیٰ کارکن ہیں اور پورا صوبہ جانتا ہے کہ وہ کس قدر اہم اور فعال کارکن ہیں، اس لیے پوری دنیا ان کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین ہے اور اس لیے ان کا انٹرویو لینا نہایت ضروری ہے۔

اور جیسا کہ ایسے موقع پر ہوتا آیا ہے کہ دونوں فریقوں میں سے نہ تو کوئی جھکا اور نہ ہی یہ طے ہو پایا کہ کون کیا ہے۔

''آپ کب سے سیاست میں ہیں؟'' صحافی نے بحث ختم کرتے ہوئے اپنی ڈائری اور قلم سنبھالا۔

''دیکھیے، میں کہہ چکی ہوں میں انٹرویو نہیں دوں گی۔''

''آپ کے پتا جی بھی سیاست میں تھے؟''

''مجھے کوئی بات نہیں کرنی۔''

زمینی کارکن الرٹ ہوئے۔ معاملہ کچھ نازک تھا۔ کسی ایسے اخبار کے نامہ نگار کے ساتھ کس طرح ایسا سلوک کیا جائے جس کے اخبار کا نام اتنا مشکل ہے جو ادا ہی نہ ہو سکے، یہ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''آپ کے پاس کوئی عہدہ نہیں ہے، پھر آپ کے پاس اتنی بھیڑ کیسے رہتی ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم۔ میں تو عام سی کارکن ہوں۔''

''پھر آپ کے پاس اتنی بھیڑ...؟''

''میں جا رہی ہوں۔ آپ نہیں چاہتے کہ میں یہاں بیٹھوں۔ میں جا رہی ہوں...''

''آپ کا گھر ہے... آپ کیوں جائیں گی... آپ کی پارٹی میں اور کتنے کارکنوں کے یہاں اتنی بھیڑ ہوتی ہے؟''

بھابھی جی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ کمرے میں ہڑبونگ مچ گئی۔ دور دور سے لوگ بڑی آس امیدیں لے کر آئے تھے۔ ان سالے صحافیوں کا کیا؛ لینے میں نہ پوتنے میں۔ باہر نکلے ہوئے

Scanned with CamScanner

دوسرے ملاقاتی اور پیروکار بھی کھڑکی درازوں سے جھانکنے لگے۔ ''مارو سالے کو چار چھ چپل... ٹھیک ہو جائے گا... بڑے آئے ہیں انٹرویو لینے والے۔'' ڈزمیل صحافی بھونچکا سا چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے دنیا کی بڑی بڑی ہستیوں کا انٹرویو لیا تھا۔ اس انٹرویو سے کیسے نپٹا جائے، اس کے بارے میں نہ تو صحافت کی تعلیم حاصل کرنے والی یونیورسٹی میں کچھ پڑھایا گیا تھا اور نہ ہی اپنے پیشے کے دوران اب تک اس نے سیکھا تھا۔ اس کی سمجھ میں ایک بات آئی کہ اسے ابھی پیٹا نہیں جائے گا۔ اسی کا اس نے فائدہ اٹھایا۔

''آپ کی پارٹی نہیں چاہتی کہ کارکنوں کا انٹرویو لیا جائے؟''

''میں کچھ نہیں جانتی... میں جا رہی ہوں...''

معاملہ بے حد نازک تھا۔ بھابھی جی کا گروپ جانتا تھا کہ بھابھی جی اپنے ہی گھر میں بائیکاٹ کر کے اندر نہیں جا سکتیں اور کسی غیر ملکی اخبار کے نامہ نگار کو گھر میں پیٹا نہیں جا سکتا۔

اس لمحے جو کچھ رونما ہوا، اسے دیکھ کر بٹوک چند کی باچھیں کھل گئیں۔ اچانک شرما تمتماتا ہوا صحافی کے سامنے ڈٹ گیا اور اس اصول کے مطابق کہ اگر آپ کے پاس دلائل نہ ہوں تو آپ کے پھیپھڑے آپ کی سب سے بڑی دلیل ہیں، چیخا، ''لیجیے کارکن کا انٹرویو۔ ہم بھی تو پارٹی کے کارکن ہیں۔ لیجیے ہمارا انٹرویو۔ بیچاری لیڈیز کو پریشان کر رہے ہیں۔ پوچھیے کیا پوچھنا ہے؟''

شرما خواتین کے لیے ہمیشہ لیڈیز کا لفظ ہی استعمال کرتا تھا؛ خاتون ایک ہو یا کئی، اس کے لیے ہمیشہ لیڈیز ہی ہوتی تھیں۔

صحافی تھوڑا گھبرایا، مگر چونکہ اس نے خود ہی کارکنوں کے انٹرویو کی بات کی تھی اور جو شخص سامنے کھڑا ہو کر اپنے پھیپھڑوں کا بھرپور استعمال کر رہا تھا، وہ اپنے کہنے کے مطابق کارکن تھا۔ اس نے دائیں بائیں دیکھنے کی کوشش کی تو شرما نے مسکرا کر بھابھی جی کی طرف دیکھا۔ بھابھی جی نے کمرے میں موجود دوسرے لوگوں کی طرف دیکھا۔ سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اب صحافی کے علاوہ سبھی مسکرا رہے تھے۔

سب کو پتا تھا کہ شرما سے انٹرویو لے کر کوئی جیت نہیں سکتا۔ صحافی نے ایک اور سوال بھابھی جی کی طرف داغا۔

Scanned with CamScanner

''آپ اتنی کنٹروورشیل کیوں ہیں؟''

''اس لیے کہ ہم لیڈیز ہیں!'' شرما صفائی کے وکیل کی طرح اپنے موکل کی طرف سے بولتے وقت واحد متکلم کی طرح بول رہا تھا۔ ''ہمارا گناہ تو یہ ہے کہ ہم لیڈیز ہیں اور سیاست میں آگئے ہیں، اور صاحب، سیاست میں اپنے بل بوتے پر آگے بڑھ رہے ہیں تو کیسے آپ برداشت کرے گا! بتائیے نا... بولیے...''

صحافی پھر لڑکھڑایا—انٹرویو کس کا ہو رہا ہے؟

''پر خواتین تو بہت ہیں سیاست میں۔ اور کوئی اس طرح کنٹروورشیل کیوں نہیں ہوتا؟''

''کون نہیں ہوتا؟ کس پر آپ لوگوں نے انگلی نہیں اٹھائی... ارے آپ نے سیتا میا کو نہیں چھوڑا... بھابھی جی کی کیا بساط ہے...'' شرما کی آواز رندھ گئی۔ وہاں بیٹھے لوگ جانتے تھے کہ وہ اب روئے گا۔ صرف دو لوگ نہیں جانتے تھے۔ ایک تو بٹوک چند، جو شرما کے ڈائیلاگ کم سن رہے تھے، ان کا اثر بھابھی جی کے چہرے پر زیادہ ڈھونڈ رہے تھے اور اس بات پر خوش تھے کہ اس کے ہر لفظ سے بھابھی جی کے چہرے پر انے مراسم، دکھ، غرور اور لالچ کے چشمے پھوٹ رہے تھے۔ دوسرا لاعلم شخص وہ صحافی تھا جو یہ نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ انٹرویو کس کا ہو رہا ہے۔

''آپ لوگ لیڈیز کو بڑھتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتے۔ ارے صاحب، ہم تو جانتے ہیں آپ لوگوں کو! بڑے ترقی پسند بنتے ہیں۔ ارے ہماری پارٹی تو بھارتیہ سنسکرتی کی پجاری ہے۔ ہمارے ہاں تو کالی داس لکھ گئے ہیں کہ عورت کا کیا مقام ہے...'' اس کے بعد شرما نے سنسکرت، اردو، بھوجپوری، اودھی، نہ جانے کن کن زبانوں میں کیا کیا سنایا۔ اس کے خیال سے سنسکرت میں جو کچھ لکھا گیا ہے سبھی کالی داس نے لکھا تھا اور اردو میں غالب کے علاوہ کوئی شاعر نہیں تھا، اس لیے ہر اشلوک سے پہلے وہ کالی داس کا نام لیتا تھا اور ہر شعر کے آخر میں چچا غالب کو یاد کرتا تھا۔ وہ اتنا تیز بول رہا تھا کہ صحافی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اگلا سوال کہاں داغے۔

بولتے بولتے شرما کے منھ سے جھاگ نکلنے لگا۔ اس نے ان سوالوں کے جواب دینے شروع کر دیے جو ابھی تک پوچھے ہی نہیں گئے تھے۔

''اب آپ پوچھیے گا کہ اس دربار میں اتنے لوگ کیوں اکٹھا ہیں؟ ارے صاحب، ہم تو

جانتے ہیں آپ لوگوں کو۔ کارکن وہیں تو جائے گا جہاں اس کی پوچھ ہوگی۔ اور ہے کوئی راجدھانی میں جو کارکنوں کو اتنی عزت دیتا ہو؟ جائیے نا منتریوں کی کوٹھیوں پر۔ کوئی ایک گلاس پانی کو نہیں پوچھے گا۔ یہاں ہمارا احترام کیا جاتا ہے، عزت ملتی ہے، اس لیے آتے ہیں ہم صاحب، آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں؟''

شرما پورے موڈ میں آ گیا تھا اور اب ان الفاظ کا دھڑلے سے استعمال کر رہا تھا جن کی اپنے انٹرویو میں ڈڑھیل صحافی کو سب سے کم امید تھی۔ شرما کا اصول تھا کہ دشمن پر جب حملہ کرو تو اسے سنبھلنے کا موقع مت دو۔ اس نے اپنے پھیپھڑوں کو کوئلے کے انجن میں تبدیل کیا اور منھ سے جھاگ اڑاتے ہوئے تقریر کی پٹڑی پر سرپٹ دوڑا، پھر پٹڑی بدلتے ہوئے ڈیزل انجن کے پیچھے لٹک گیا اور جب تک اس موضوع پر پہنچا، جہاں اسے رکنا تھا، وہ بجلی کے انجن پر کود کے چڑھ گیا۔

ہندوستانی تہذیب کی بات کرنی تھوڑی مشکل ہے لیکن اگر اس کے استعمال کی تعریف بیان کرنی ہو تو برملا یہ کہا جا سکتا ہے کہ الگ الگ موقعوں پر اس کا الگ الگ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ آپ عورتوں کو گھر کے اندر بند رکھنا چاہیں تو اس سے مفید کوئی نسخہ نہیں۔ آپ ان کی برابری کی حمایت کرنے والے ہوں، تب بھی اس سے دھاردار کوئی دلیل نہیں ہو سکتی۔ شرما اور سمن کی پارٹی ہندوستانی تہذیب کی سب سے بڑی علمبردار تھی اور کسی بیرونی اخبار کا نامہ نگار اس کا سب سے بڑا دشمن ہو سکتا تھا، اس لیے شرما نے رونے کے لیے یہی پہلو چنا۔

''ارے ہماری بھارتیہ سنسکرتی سے بڑھ کر لیڈیز کو کون اہمیت دے گا؟ مغرب والے! ارے، آپ نے تو عورت کو کموڈٹی بنا دیا ہے۔ آپ لوگ تو ہر چیز کو بازار کے نظریے سے دیکھتے ہیں۔ ارتھ شاستر کا ایک اصول ہے...''

بٹوک چند پانی پی رہے تھے، انھیں لگا کہ گلاس ان کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ پٹھا اتنے مشکل الفاظ استعمال کر رہا ہے!

''لیکن میں تو غیر ملکی نہیں ہوں...'' صحافی بڑبڑایا۔

''پر کام تو غیر ملکی اخبار کے لیے کرتے ہیں۔''

''اس سے کیا؟''

Scanned with CamScanner

''اس سے بہت کچھ ہے۔ آپ لوگ بدیسی پیسے پر پلتے ہیں۔ آپ کیا جانیں بھارتیہ سنسکرتی میں کیا لکھا ہے؟ ہمارے ہاں کہا گیا ہے کہ۔۔۔''

شرما نے موسلا دھار سنسکرت کے اشلوکوں کی بھرمار کردی۔ ویدوں، پرانوں، اپنشدوں سے کالی داس جھانک رہے تھے۔ پنڈت بٹوک چند اُپادھیائے کے پتا سنسکرت کے پنڈت تھے اور پڑھاتے بھی تھے۔ ان کی زندگی کا ایک ہی مقصد تھا— بچوں کو ہشت پہلو تعلیم سے ہمکنار کرنا۔ بٹوک چند انجینئرنگ کالج پہنچ گئے، تب بھی گھر آنے پر کوئی بھروسا نہیں تھا کہ کب سنسکرت کی کسی ترکیب کے بارے میں پوچھ لیں۔ اتنی چھوٹ انھوں نے ضرور دے دی تھی کہ اب بینت ہاتھ میں لے کر امتحان نہیں لیتے تھے۔ پر اتنے بینت پیٹھ پر پڑے تھے کہ بٹوک چند کو ان کے خالی ہاتھ میں بھی بینت نظر آتا تھا۔

اس لیے آج شرما کے منھ سے سنسکرت کے اشلوک سن کر بٹوک چند حیران تھے۔ وہ گھبرا کر بیچ بیچ میں چاروں طرف دیکھ لیتے، کہیں ان کے سورگ واسی پتا تو نہیں سن رہے ہیں۔ اتنی بگڑی ہوئی اور ناخالص سنسکرت بولنے والے شخص کے ساتھ وہ یہاں تک آئے ہیں، یہ جان کر تو ان کے پتا شری ان کی پیٹھ چھلنی کر ڈالیں گے۔ انھوں نے چہرہ تھوڑا ایسا گھما لیا کہ اگر پکڑے جائیں تو پتا جی سے کہہ سکیں کہ وہ تو اس اجڈ، مورکھ، سنسکرت کے ہتیارے کو جانتے تک نہیں، اس کے ساتھ یہاں تک آنے کی بات تو دور رہی!

شرما کو جاننے والے لوگ اس لمحے کا انتظار کر رہے تھے جب اسے رونا تھا، اور وہ لمحہ بھی آ گیا۔

شرما نے سنسکرت کی ایسی کی تیسی کی، پھر وہ اردو کے میدان میں کود پڑا۔ سنسکرت اگر اس کے لیے کالی داس تھی تو اردو چچا غالب؛ فرق صرف اتنا پڑا تھا کہ ڈھیل صحافی اردو تھوڑی بہت جانتا تھا۔ اس نے ایک آدھ بار ٹوکنے کی کوشش کی۔ شرما کو معلوم تھا کہ اردو میں ''جا'' کو ''زا'' کہا جاتا ہے۔ جیسے ہی اس نے زو کہا، صحافی ٹپک پڑا۔

''بھائی صاحب، 'زو' نہیں۔۔۔ 'جو'۔۔۔''

''اب آپ مجھے اردو سکھائیں گے؟ مجھے! کل کو آپ مجھے بھارتیہ سنسکرتی بھی سکھانے لگیے گا۔

Scanned with CamScanner

ارے صاحب، آپ جیسے لوگوں نے ہماری سنسکرتی کا بھنٹا دھار کیا ہے۔ آپ لوگ لیڈیز کو سیاست میں بڑھتے نہیں دیکھ سکتے۔ گوسوامی جی نے لکھا ہے کہ غیر ملکی اخبار کا نامہ نگار ایودھیا میں آ کر سیتا جی کے بارے میں بھگوان رام سے اوٹ پٹانگ سوالات پوچھنے لگا...''

شرما نے سب پر ایک فاتحانہ نظر دوڑائی۔ بٹوک چند کا دل چاہا دوڑ کر اس کے قدموں کو چوم لے۔ کمرے میں موجود سارے سامعین صحافی کی طرف دیکھ رہے تھے، بولو بیٹا، اب جواب دو۔

''غیر ملکی اخبار کا نامہ نگار ایودھیا میں...''

وہ اس دھوبی کی بات کر رہے تھے جس نے، جب سیتا راون کے قبضے سے نکل کر واپس رام جی کے پاس آئی تھیں، اس وقت ایک دھوبی نے اپنی بیوی کے کردار پر شک کرتے ہوئے رام جی پر طعنہ کسا تھا کہ وہ رام جی نہیں ہے جو اغوا کی گئی سیتا کو دوبارہ اپنے حرم میں رکھ لے۔

''اور کیا! وہ سالا دھوبیا کون تھا؟ بتایئے... بڑے آئے ہیں انٹرویو لینے۔ اس زمانے میں آپ لوگوں نے سیتا میا کو نہیں چھوڑا اور اب بھابھی جی جیسی ستی سادھوی ناری پر کیچڑ اچھال رہے ہیں۔ ارے آپ بھابھی جی پر نہیں، بھارتیہ سنسکرتی پر کیچڑ اچھال رہے ہیں...''

شرما جی کی آواز رندھ گئی۔ اس نے دو تین بار ''بھابھی جی... سیتا میا... بھارتیہ سنسکرتی...'' جیسے الفاظ ادا کیے اور پھر منھ پھاڑ پھاڑ کر رونے لگا۔

کمرے میں ایک ساتھ کئی باتیں رونما ہوئیں۔ سامعین تھوڑی دیر کے لیے چپ ہوئے۔ صحافی کو لگا کہ دنیا کا سب سے بڑا الو وہی ہے۔ گاؤں سے آئے ہوئے اپنی لگان کی قسط معاف کروانے آئے ایک کسان کو لگا کہ کتھا کا وہ حصہ آ گیا ہے جب جے جے کا نعرہ لگایا جا سکتا ہے۔ وہ ایک دم سے الرٹ ہوا اور اس نے جے کار لگایا: ''بول سیتا میا کی...''

''مار سالے کو...'' ایک زمینی کارکن نے للکارا۔

''جے... جے... بول سیارام چندر کی...''

''مار سالے کو! بہن... انٹرویو لینے آیا ہے...''

اس کے بعد جو کچھ ہوا، اسے مختصراً صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ صحافی نام کی اس مخلوق کو پہلے کمرے سے نکال کر لان میں پھینکا گیا، اور پھر پھینکنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ لڑھکتا پڑھکتا سڑک پر

Scanned with CamScanner

پہنچ گیا۔ لان تک اس کی نوٹ بک، قلم اور کیمرا ساتھ ساتھ تھے، پر جب وہ سڑک پر پہنچا تو بقول ایک شاعر کے، اس کی حالت کچھ کچھ دنیا چھوڑ کر جاتے سکندر جیسی تھی جو اس دار فانی سے رخصت ہوتے ہوئے خالی ہاتھ ہی گیا تھا۔ اتنا ضرور ہوا کہ اس کی نوٹ بک کچھ بچی کھچی حالت میں اس کے پاس پہنچ گئی تھی۔ قلم دو ٹکڑوں میں بٹ چکا تھا۔ اس کی ٹوپی بھی اس کے نزدیک آ گری۔ ظاہر تھا کہ قلم کا نچلا حصہ کسی پڑھنے لکھنے والے کارکن کے ہاتھ لگ گیا تھا اور اس یقین کے ساتھ کہ اس کا صحیح استعمال اسی کے پاس ہے اور اگر اسے اس کے اصلی مالک کو دے دیا گیا تو وہ پھر کہیں خرافات کرے گا، اس نے اس حصے کو اپنی جیب میں ڈال لیا تھا۔

کیمرے کے بارے میں اگر اس وقت صحافی سے بھی پوچھا جاتا تو وہ پورے یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اسے وہاں لے کر آیا بھی تھا کہ نہیں۔ وہاں موجود کوئی شخص نہیں بتا سکتا تھا کہ کیمرا کہاں گیا۔

کمرے کا ماحول پھر پرانی ڈگر پر لوٹ آیا۔ فرق صرف اتنا آیا کہ قومی ورثے میں ملی ہوئی اخلاقیات کے مطابق ابھی ابھی رونما ہونے والے واقعات پر لوگ اپنی ماہرانہ رائے دے رہے تھے۔

''ان سالوں سے بات نہیں کرنی چاہیے۔ ان کو تو شروع میں ہی جوتا...''

''ہاں بھائی جی، ان کو سو جوتے مارنے چاہییں، پر ستر کے بعد گنتی بھول کر پھر ایک سے شروع کرنی چاہیے۔''

کچھ دیر اس پر تبادلۂ خیال ہوا کہ گنتی کہاں بھولنی چاہیے۔ قوم سے ورثے میں ملے عادات و اطوار کے مطابق ایک رائے پر اتفاق نہ ہو سکا۔ اس نکتے پر بھی اتفاق نہ ہو سکا کہ جوتا کس نسل کا ہو۔

''بھائی، اپنے گاؤں کا چمرودھا سب سے اچھا ہے۔ تھوڑا سا تیل پلا دو اور پھر دیکھو۔''

''عجیب لڑبھینگ ہو یار۔ اب چمرودھا کون پہنتا ہے جی! ارے ملٹی نیشنل والے اتنے بڑھیا جوتے بنا رہے ہیں...''

''پر ہم تو سودیش والے ہیں۔'' بہر حال اس پر بھی کوئی ہم آہنگی نہ بن سکی۔ سودیشی نعرہ اچھا تھا لیکن کوئی یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ اس طرح کے صحافیوں کے لیے جوتے مارنے کے طریقے

Scanned with CamScanner

کو کامیاب ترین بنانے کے لیے ایک عدد چمرودھار کھا جائے۔

ایک نکتے پر اتفاق رائے ہوگیا۔

''شرما بھیا نے کمال کر دیا۔ سالا زندگی بھر یاد کرے گا۔'' کئی لوگوں نے یہ جملہ دہرایا کہ ''شرما نے کمال کر دیا۔''

بھابھی جی نے بھی مہر تصدیق ثبت کر دی۔

''ارے انھیں کے چرنوں میں بیٹھ کر ہی تو ہم نے سیاست سیکھی ہے۔ ان کا کمال تو ہم خوب جانتے ہیں۔''

شرما نے صحافی کو کھدیڑنے کے علاوہ جو کام کیا تھا، اسے دیکھ کر بٹوک چند کو اپنے سورگ واسی پتا، سنسکرت کے استاد کی یاد آ گئی۔ وہ کسی کو بھی صحیح تلفظ کے ساتھ اشلوک پڑھتے دیکھ کر ''شاباش... شاباش'' کہنے لگتے۔ ان کا دل بھی چاہ رہا تھا کہ وہ بھی شاباشی دیں۔

صحافی کو کمرے سے باہر پھینکنے کا کام جب انجام کو پہنچا اس وقت دوسرا چمتکار ہو رہا تھا۔

شرما کی رندھی آواز چہکنے لگی اور اس کے آنسو ہندی فلموں کی برہن کے آنسوؤں کی طرح نہ جانے کہاں کھو گئے جس کا پریتم اچانک پیڑوں کے جھرمٹ سے نکل کر اس کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے اور وہ رونا بھول کر کمر مٹکاتے ہوئے گانا گانا شروع کر دیتی ہے۔

جس وقت آدھے لوگ صحافی کو کمرے کے باہر پھینکنے میں اور آدھے ان کا مورال بلند کرنے میں مشغول تھے، شرما اچانک اپنی جگہ سے اچھلا اور اس کرسی کے بغل میں پڑے صوفے پر بیٹھ گیا جہاں بھابھی جی بیٹھی تھیں اور مہذب ہونے کے تمام تاثرات اپنے چہرے پر اوڑھے تمام کارروائی دیکھ رہی تھیں۔

بٹوک چند نے شرما کو اٹھ کر جاتے اور بیٹھتے تو دیکھا، پر دونوں کے درمیان کیا گفتگو ہو رہی تھی، یہ دیکھنے اور سننے میں کمرے کے اندر ہو رہے شور وغوغا نے ایک رکاوٹ بنا رکھی تھی اور سب کچھ قصبے کے سنیما ہال میں چل رہی تھرڈ کلاس کی طرح تھا۔ نائک کھل نائک کی ناک پر گھونسا جماتا کہ آپ کے سامنے ''واہ پٹھے...'' کی للکار مارتا ہوا کوئی تماشائی کھڑا ہو جاتا۔ گھونسے کو آپ ناک کے قریب پہنچتے دیکھ کر اگلی صورت حال کا تصور کر لیتے۔ پٹے بازی کے بیچ میں ہیرو ہیروئن کی طرف تیزی سے جھکتا تو

Scanned with CamScanner

دوسیٹ آگے کا تماشائی ''جیوراجہ...'' جیسی کوئی پھبتی کستا اور آپ یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتے کہ دونوں کے بیچ عشق و محبت سے متعلق کوئی گفتگو ہوئی ہوگی۔

ایسا ہی کچھ کچھ اندازہ بٹوک چند کو بھی ہو رہا تھا کہ شرما اور بھابھی جی کے درمیان انھی سے متعلق کوئی بات ہو رہی ہے۔

شرما نے کچھ کہا اور بٹوک چند کی طرف دیکھا۔ بھابھی جی نے بھی ان کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا اور مسکرائیں۔

''ارے ادھر آیئے نا پنڈت جی، اتنی دور کہاں بیٹھے ہیں؟''

شرما چپکا تو بٹوک چند اٹھ کر بھابھی جی کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے انتہائی ملتجیانہ انداز سے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ بھابھی جی مسکرائیں۔

''ادھر بیٹھیے بڑے صاحب، وہاں کیوں بیٹھے ہیں؟ شرما جی نے یہاں کسی کو بتایا نہیں۔ آپ کو تو اندر بیٹھنا چاہیے تھا۔ آپ لوگ تو سرکار چلاتے ہیں۔ ہم تو مانتے ہیں کہ سرکار کو سرکار چلانے والوں کا پورا آدر کرنا چاہیے، تبھی سرکار ٹھیک سے چل سکے گی۔ ادھر بیٹھیے۔''

کمرے کی اتھل پتھل نے بیٹھنے کی جگہ بھی بنا دی تھی اور کام کی بات کرنے کا موقع بھی۔

''شرما جی نے سب بتا دیا۔ آپ کا منتری ہے ہی بڑا بدمعاش۔ یہی لوگ تو ہماری سرکار کی بدنامی کا باعث ہیں۔ بے چارے سی ایم تو سب کو ساتھ لے کر چلنا چاہتے ہیں، پر ان بدمعاشوں کے ساتھ کتنے دن سرکار چلائیں گے! میں نے تو پی ایم سے بھی کہہ دیا ہے کہ اگر صاف ستھری سرکار چلانی ہے تو ایسے لوگوں کو نکالنا پڑے گا۔ دیکھیے کب تک یہ راون رہتے ہیں سرکار میں۔''

بٹوک چند بیٹھے تھے، تھوڑا اُچکے۔ وقت کم تھا۔ پارٹی ہائی کمانڈ اور سی ایم میں ان کی کوئی دلچسپی نہیں بن پا رہی تھی۔ صحافی کو لان سے سڑک کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ کب یہ صورت حال ختم ہو جائے اور کب لوگ کمرے میں واپس آ جائیں، کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

''جی میڈم، آپ صحیح کہہ رہی ہیں۔ ہمارا تو ڈپارٹمنٹ منتری نے چوپٹ کر دیا ہے۔ کوئی کام نہیں ہو رہا ہے۔ کمبھ سر پر ہے اور میرا ایک ہفتے میں دو مرتبہ تبادلہ...''

''ارے وہ تو بات ہو گئی ہے نا بھابھی جی سے۔ آپ نشاخاطر رہیں، کل آرڈر مل جائے گا نا۔

کل بلایا ہے صبح کوٹھی پر۔ اتنی بھیڑ بھاڑ میں آپ جیسے بڑے افسر سے کیا بتیا ئیں گی؟''

''ہاں، بڑے صاحب، کل آئیں۔ صبح صبح بھیڑ نہیں ہوتی۔ آپ جیسے افسروں کو بھیڑ میں کھڑا ہونا پڑے، مجھے تو نہیں اچھا لگتا۔ میں تو مانتی ہوں کہ سرکار سرکار چلانے والوں...''

بٹوک چند خوشی سے جھوم اٹھے۔ اتنی بڑی ہستی اور ایسی منکسر مزاج۔ ''ہیں ہیں'' کرتے ہوئے انھوں نے بھابھی جی کے چرنوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''کیا کرتے ہیں!... کیوں نرک میں ڈالتے ہیں صاحب... آپ تو عمر میں بھی بڑے ہیں... میں تو کہتی ہوں کہ اگر سرکار سرکار چلانے والوں کی قدر...''

جب بھابھی جی کے زمینی کارکن صحافی کو جوتیا کر کمرے کے اندر داخل ہو رہے تھے، بٹوک چند کا ہاتھ پکڑے شرما انھیں کمرے کے باہر لے جا رہا تھا۔

''سب وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔''

غسل خانے میں گھستے ہوئے جب شرما نے تیسری بار یہ جملہ دہرایا تو بٹوک چند سمجھ گئے کہ اب پھر سے راستے والا فلسفی پن اس پر طاری ہونے والا ہے۔

شرما کو بٹوک چند اپنے ساتھ پکڑ لائے تھے۔ منی چیف منسٹر عرف سمن کے گھر سے باہر نکلنے پر شرما اپنی گاڑی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور اس کے دروازے پر ہاتھ ٹکا کر اس نے پوچھا،''اب؟''

اس ''اب'' کے کئی مطلب نکالے جا سکتے تھے۔ ایک مطلب تو یہ تھا کہ اب اپنے اپنے راستے ناپے جائیں، صرف کل کے ملنے کو طے کر لیا جائے۔

بٹوک چند نے دوسرا مطلب نکالا۔ انھوں نے جو مطلب نکالا، اس کے مطابق ابھی کچھ طے نہیں تھا، اور اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ انھیں طے کرنا تھا کہ اب کیا کرنا ہے۔ اور انھوں نے طے کر لیا تھا کہ وہ شرما کو رات بھر کے لیے اکیلا نہیں چھوڑ سکتے۔ راجدھانی میں کسی کو رات بھر کے لیے اکیلا چھوڑنے کا مطلب تھا کہ صبح وہ آپ کو پہچاننے سے انکار کر دے۔ انھوں نے کس کر شرما کی کلائی تھام لی،''ارے شرما جی، ابھی آپ کے ساتھ بھرپور ملاقات بھی نہیں ہوئی ہے۔ آپ اتنے پہنچے ہوئے آدمی ہیں کہ من کر رہا ہے کہ آپ کے چرن پکڑ لوں۔ ائی سا (ایسا) لیکچر دیا آپ نے کہ سالے پترکار کی بولتی بند ہو گئی۔ آیئے، کچھ دیر ہمارے ساتھ سنگت کیجیے۔''

''یہاں کون سا آپ کا گھر ہے پنڈت جی! کبھی کمبھ نہانے آئے تو آپ کے یہاں بیٹھیں گے۔ پسینے سے بدن چپچپا رہا ہے۔ گھر جا کر نہائیں دھوئیں گے تب کہیں چین پڑے گا۔''

''گھر نہیں ہے تو کیا ہوا؟ ہوٹل تو ہے۔ وہیں چلیے گرو جی۔''

اس کے بعد تھوڑی دیر تک دوستانہ خوش گپی ہوئی۔ فارمیلٹی نام کا ایک لفظ تھا جس کے

Scanned with CamScanner

بارے میں شرما بار بار کہہ رہا تھا کہ وہ اسے پسند نہیں ہے۔ بٹوک چند کے مطابق انھیں بھی یہ لفظ نہایت ناپسند تھا۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اس میں فارمیلٹی یعنی ظاہرداری جیسا کچھ ہے بھی نہیں۔ چار پانچ گھنٹے ساتھ رہ کر شرما تو اب گھر کا آدمی ہو گیا ہے اور گھر کے آدمی کے ساتھ کیسی ظاہرداری!

''ارے بڑے صاحب، پہلے اپنی گاڑی کا کچھ انتظام تو کرلوں۔'' شرما کار سے باہر نکلا اور گیٹ پر کھڑے سنتری سے اس نے اشارے میں کچھ کہا۔ مطلب صاف تھا کہ وہ سنتری کو یہ بتانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے تو صبح وہاں آنا ہی ہے، رات بھر اس کی گاڑی یہیں کھڑی رہے گی۔ سنتری کیا کہہ رہا ہے، اسے سننے کے لیے وہ نہیں رکا اور واپس بٹوک چند کی کار کی طرف آ گیا۔

بٹوک چند نے شرما کا ہاتھ پکڑ کر اپنی کار میں گھسیٹ لیا اور بحث ختم ہو گئی۔

راستے میں شرما نے باہر دیکھتے ہوئے کہا، ''آپ تو پنڈت جی، صوفی آدمی ہیں، پان کے علاوہ کچھ لیتے نہیں ہیں۔''

بٹوک چند نے پان کی ڈبیا نکال کر شرما کی طرف بڑھائی اور ڈرائیور سے کہا کہ بازار میں گاڑی روک لینا۔ گاڑی رکنے پر انھوں نے اس کے ہاتھ میں سو سو کے تین نوٹ تھمائے۔ ''وِسکی کی ایک بوتل لے آؤ۔ برانڈ صاحب بتائیں گے۔''

''کوئی سی لے آؤ، سُسُر شراب تو شراب ہے۔''

ہوٹل میں پہنچتے ہی سب سے پہلا کام شرما نے یہ کیا کہ اپنا کرتا اتار کر فرش پر پھینک دیا، بنیائن پیٹھ کے اوپر تک اٹھائی اور ایر کنڈیشنر کے آگے بیٹھ گیا۔

''اب تو بڑے صاحب، نہائے بنا چین نہیں پڑے گا۔''

''تو نہا لیجیے۔ تب تک میں کچھ کھانے کے لیے منگواتا ہوں۔''

بٹوک چند نے اخبار میں لپٹی شراب کی بوتل کا کاغذ پھاڑ کر پھینک دیا اور بوتل شرما کی آنکھ کے سامنے میز پر رکھ دی۔

اشارہ صاف تھا کہ جا کر نہا لو پہلے اور پھر آ کر دارو چکھو، پر شرما نے اشارہ سمجھنے سے انکار کر دیا۔ اس نے پیٹھ کے اوپر تک اٹھائی بنیائن پوری طرح سے اتار کر پھینک دی اور جذباتی ہونے لگا۔

Scanned with CamScanner

بٹوک چند کو لگا کہ شرما کی آواز کچھ کچھ رندھنے لگی ہے۔

''وقت وقت کی بات ہوتی ہے بڑے صاحب۔ آج اس عورت کے یہاں جا کر انتظار کرنا پڑا۔ کل تک یہی سُسُری...''

شرما پوری طرح سے فلسفہ جھاڑنے کے موڈ میں آ گیا تھا اور جیسا کہ ایسی صورت حال میں فطری بات تھی، وہ جذباتی ہو گیا۔

بٹوک جانتے تھے کہ جذباتی ہونے پر آدمی دو میں سے ایک کام کرتا ہے۔ یا تو وہ سچ بولنے لگتا ہے اور اپنے اندر پوشیدہ غار میں دبی چھپی تمام باتیں سامنے والے کو بتانے کے لیے بے چین ہو جاتا ہے، یا پھر پوری طرح سے جھوٹ بولنے پر اتارو ہو جاتا ہے اور رندھے گلے، بھرائی آواز اور ڈبڈباتی آنکھوں سے ایسی کہانی گڑھ سکتا ہے جسے سننے والا آغاز پر ہی انجام کو سچ ماننے لگتا ہے۔ بٹوک چند انتظار کرنے لگے کہ شرما کس خانے میں جاتا ہے۔

لگتا تھا کہ شرما کو جذباتیت کی اس سطح پر پہنچنے میں، جہاں اسے سچ یا جھوٹ میں کسی ایک کا انتخاب کرنا ہو، ابھی تھوڑی دیر تھی۔ شاید شراب کی کمی تھی۔ اس لیے تیسری بار وقت کو کوستا ہوا وہ اٹھا اور غسل خانے میں گھس گیا۔

شرما جب غسل خانے سے باہر نکلا تو کسی شاعر کے الفاظ میں اس کی ''چھنا برنی نہیں جائے'' تھی۔ اس یقین کے ساتھ کہ اگر ساتھ والے کمرے میں پنکھا چل رہا ہو تو اوپری دھڑ کے پانی سکھانے کی ضرورت نہیں پڑتی، اس نے سر سے لے کر کمر تک کا پانی بس اتنا پونچھا تھا کہ وہ وافر مقدار میں کمرے میں گرتا رہا اور وہ پنکھے کے نیچے کھڑا ہو کر اسے سکھاتا رہا۔ کمر سے چونکہ اس نے تولیہ لپیٹ رکھی تھی، اس لیے اندر کی صورت حال واضح نہیں تھی، مگر پیروں سے جتنا پانی ٹپک کر کمرے میں بچھے قالین پر گر رہا تھا، اس سے صاف ظاہر تھا کہ جسم پر تولیے کا استعمال بڑی کنجوسی سے کیا گیا تھا۔ اس کا زیادہ بہتر استعمال کمر کے گرد لپیٹنے میں کیا جا سکتا ہے، یہ ثابت کرنے کے لیے شرما اسے لپیٹے پنکھے کے نیچے کھڑا تھا۔

''کوئی بیرا نہیں آیا؟''

جیسے ہی شرما نے کہا، بٹوک چند نے لپک کر کال بیل دبا دی۔ اس دہشت سے چھٹکارا پانے

میں انھیں تھوڑا وقت لگا کہ شرما اپنے فولادی جسم کی نمائش کرتے ہوئے کہیں تین ستارہ ہوٹل کے برآمدے میں نہ چلا جائے۔

''بیرا آ ہی رہا ہوگا۔ آپ نہا رہے تھے، تبھی میں نے آرڈر دے دیا تھا۔''

بٹوک چند نے گھبراہٹ میں اتنی دیر تک کال بیل کے بٹن پر ہاتھ رکھا کہ کئی لوگ ایک کے بعد ایک یہ معلوم کرنے کے لیے چلے آئے کہ معاملہ کیا ہے؟ تھوڑی دیر وہ اگر اور گھنٹی پر ہاتھ رکھے رہتے تو ہوٹل کی انتظامیہ فائر بریگیڈ بلا لیتی۔ جو لوگ آئے، ان میں وہ بیرا بھی تھا جو ان کا آرڈر لے کر گیا تھا۔

شرما بیرے کو میز پر کھانے کی چیزیں لگاتے دیکھتا رہا اور اس درمیان بٹوک چند کی فکر نقطۂ عروج پر پہنچ گئی اور ان کی نگاہیں کپڑے کے اس ٹکڑے پر گڑ گئیں جسے ہوٹل انتظامیہ نے تولیے کے نام سے بدن پونچھنے کے لیے غسل خانے میں رکھا تھا اور شرما نے جسے محاورے کی زبان میں اپنی حیا ڈھانکنے کے لیے اپنی موٹی کمر کے ارد گرد لپیٹ رکھا تھا، اور صورت یہ تھی کہ بٹوک چند کسی جاسوسی فلم کے ہیرو کے رول میں یہ پتا لگانے میں جٹے تھے کہ کپڑے کا یہ ٹکڑا اس کی کمر پر اٹکا ہوا کیسے ہے؟ شرما نے تھوڑی دیر آنکھیں جھپکائیں، نتھنے پھیلائے اور میز پر لگنے والی پلیٹوں کا معائنہ کیا۔ ''صاحب بہادر ویجیٹیرین ہیں۔''

''جی...'' شرما کے جسم کے اوپری حصے اور تولیہ سے بغیر نظریں ہٹائے بٹوک چند گھگھیائے۔

''تبھی...''

اس ''تبھی'' کا مطلب ان کی سمجھ میں تب آیا جب شرما نے نان ویجیٹیرین کھانوں کی ایک لمبی فہرست بیرے کو نوٹ کرا دی۔

بیرا جب مڑا تو شرما نے اسے روکا۔

''نیچے صاحب کا ڈرائیور ہوگا، اسے اوپر بھیج دو۔ کیا نمبر ہے گاڑی کا صاحب؟''

''کہیں جائیں گے کیا شرما جی؟''

''ارے نہیں صاحب، جائیں گے کہاں؟ اب تو رات کا ڈیرہ یہیں جمے گا۔ کرتا پاجامہ گندا ہو گیا۔ دن بھر چپچپاہٹ میں گھومے۔ سوچ رہے ہیں منگا لیں۔ ابھی دار الشفا والی دکانیں کھلی

Scanned with CamScanner

ہوں گی۔‘‘

’’ڈرائیور کو بھیج دینا۔‘‘ بٹوک چند نے ڈرائیور کا حلیہ اور گاڑی کا نمبر بیرے کو بتایا۔

جب تک ڈرائیور آیا، تب تک بٹوک چند نے زبردستی شرما کو اپنی لنگی پہننے کو دے دی۔ اس نے لنگی پہن لی، تب ان کی جان میں جان آئی اور وہ ان اندیشوں کے بھنور سے ابھر آئے کہ اگر کہیں شرما کی کمر سے لپٹا یہ چھوٹا سا ٹکڑا کبھی بھی زمین پر ٹپک گیا تو انھیں محسوس ہوگا کہ وہ خود برہنگی کے عالم میں ہیں۔ اب انھوں نے سکھ کا سانس لیا۔

شرما نے بغیر کسی تکلف کے گلاس میں شراب انڈیلی، برف ڈالی، پانی سے خالی گلاس بھرا اور غٹا غٹ پی گیا۔ بٹوک چند نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ وہ پہلے بھی باقاعدہ پیتے تھے۔ ان کی لغت کے لارج، اسمال یا پٹیالہ پیگ سبھی خلط ملط ہو گئے۔

ڈرائیور دروازے پر کھڑا تھا۔ گلاس ختم کر کے شرما نے اس کی طرف دیکھا۔ ’’ڈرائیور صاحب، دارالشفا چلے جائیں۔ وہاں چاروں طرف کھادی کے کرتے پاجامے بیچنے والے بیٹھے ہوں گے۔ کسی کے یہاں سے میرے ناپ کا کرتا پاجامہ لے آیئے گا۔‘‘

ڈرائیور نے پلکیں جھپکائیں، پر اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔

’’ارے سب سے بڑی ناپ کا لیجیے گا... ایکسٹرا لارج...‘‘

ڈرائیور اس پر بھی نہ ہلا۔ شرما نے اپنی لنگی کی تصوراتی جیب کو ٹٹولنا شروع کیا۔ جیب نہیں ملی تو پیٹ پر ایک بار ہاتھ پھیر کر گلاس میں دوسرا پیگ بنانے لگا۔

’’یہ لو۔‘‘ بٹوک چند نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

’’چھ جوڑے لانا جی۔‘‘ شرما نے دوسرا پیگ منھ سے لگایا۔

بٹوک چند کا ہاتھ جیب میں ٹھٹک گیا۔ وہ اٹھے اور غسل خانے میں کھسک گئے۔ سامنے گالی دینا ٹھیک نہیں ہے۔ شرما کی کئی پشتوں کو گالی دیتے ہوئے انھوں نے جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالی، اس میں سے اندازے سے نوٹ باہر نکالے اور واپس آ گئے۔ ڈرائیور کے ہاتھ میں نوٹ تھماتے ہوئے ان کے منھ سے ہدایت نکلی: ’’اچھی کوالٹی کا لانا۔ اپنے شرما جی بڑے لیڈر ہیں، روز چیف منسٹر سے ملتے ہیں، کپڑا بڑھیا ہونا چاہیے۔‘‘

Scanned with CamScanner

شرمانے ڈرائیور کے جاتے ہی ایک دوسرے گلاس میں ایک چھوٹا پیگ بنایا اور بٹوک چند کے سامنے رکھ دیا۔

''لیجیے بڑے صاحب۔''

''پر میں تو پیتا نہیں۔''

''میں اکیلے نہیں پیتا۔''

بٹوک چند نے ''ہیں... ہیں... '' کرنا شروع کر دیا۔ ان کی زندگی کا کئی بار کا آزمایا ہوا فارمولا تھا کہ جب کچھ نہ کر سکو تو ''ہیں... ہیں... '' کرو، کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئے گا۔ آج بھی نکل آیا۔

''چلیے، آپ نہیں پییں گے تو میں پی لوں گا۔ ایک بار اِس گلاس سے، دوسری بار اُس گلاس سے۔''

پھر شرمانے اپنے اصول کی بات بتائی۔ اصولاً وہ اکیلے نہیں پیتا۔ جب اکیلا ہوتا ہے تو دو پیگ رکھ لیتا ہے اور باری باری سے دونوں سے پیتا ہے۔ اصولاً اپنے لیے بڑا پیگ بناتا ہے اور سامنے والے کے لیے چھوٹا پیگ۔ کئی بار اسے لگتا ہے کہ دونوں ایک ہی شراب کیسے پی سکتے ہیں، اس لیے اپنے لیے وِسکی بناتا ہے تو سامنے والے کے لیے رم یا جن۔ اس کاک ٹیل سے کئی مرتبہ گڑبڑ بھی ہو جاتی ہے۔ بٹوک چند دلچسپی سے شرما سے گڑبڑ کے بارے میں سنتے رہے۔ آج تو کاک ٹیل نہیں تھی۔ شرما دونوں گلاسوں میں وِسکی ڈال کر پی رہا تھا، پر گڑبڑ شروع ہو چکی تھی۔ دراصل یہ گڑبڑ فلسفے سے جڑی تھی۔

فلسفے اور شراب میں بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ ویسے تو اوسطاً ہر ہندوستانی ہمیشہ ہی فلسفی ہو سکتا ہے، پیدائش سے لے کر موت تک کوئی بھی ایک لمحہ اسے فلسفی بنا سکتا ہے، پر اگر وہ شراب پیتا ہو اور اس نے شراب پی رکھی ہو تو اسے فلسفی بننے سے کوئی روک نہیں سکتا۔

شرما بھی دو بڑے پیگ حلق کے اندر اتارتے ہی فلسفی ہو گیا۔ بٹوک چند اسے دونوں ہاتھوں سے مرغ اور مچھلی کی پلیٹیں صاف کرتے دیکھتے رہے اور اس حد سے تجاوز کرنے والی اس کی حالت کا انتظار کرتے رہے جب شرمایا تو سچ کو پرت در پرت چھیلتے ہوئے اسے ان کے سامنے بکھیر دے گا یا

پھر جھوٹ کو اس طرح دلچسپ بنا کر اور اتنے افسانوی ڈھنگ سے پیش کرے گا کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے اسے سچ مان لیں گے، اور اب وہ نقطۂ عروج آ ہی گیا۔

''سب وقت وقت کی بات ہوتی ہے بڑے صاحب!'' شرما نے کہا اور رونے لگا۔

شراب اور فلسفہ دونوں رونے میں مدد کرتی ہیں۔ گڑبڑ یہ ہے کہ روتے روتے اکثر آدمی سچ بولنے لگتا ہے۔ راجدھانی میں سچ بولنے والا کم پھنستا ہے، اسے سننے والے ضرور پھنس جاتے ہیں۔ بٹوک چند نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ ''دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں'' والے فارمولے کے مطابق انھوں نے کمرے کی دیواروں کا معائنہ کیا۔ باتھ روم کا دروازہ کھلا تھا، اسے اٹھ کر بند کر دیا۔

''پُرش بلی نہیں ہوت ہے، سمے ہوت بلوان۔'' (انسان طاقتور نہیں ہوتا بلکہ وقت سب سے طاقتور ہوتا ہے۔)

اگلا شعر شرما بھول گیا تھا اس لیے اب اس نے نثر کی مدد لے کر کہنا شروع کیا، ''بڑے صاحب، سب وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ ارجن اور اس کے تیر کچھ کام نہ آئے اور بھیل گوپیوں کو لوٹ کر لے گئے۔ یہی ہوتا ہے بڑے صاحب، جب وقت خراب ہوتا ہے۔ یہ... سالی...''

فلسفے کا دورہ پڑنے پر رونے کا رول ہارمونیم کی طرح ہوتا ہے۔ گانے والا دم لینے کے لیے اور اپنی آواز کی دھونکنی روکنے کے لیے ہارمونیم بجانے لگتا ہے۔ شرابی فلسفی ستانے کے لیے رونے لگتا ہے۔ شرما بھی رونے لگا۔

اس مرتبہ ستا کر شرما جب فلسفی ہوا تو دیر تک اسے رونے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اس نے بغیر دم لیے اپنی کہانی سنانی شروع کی۔

بٹوک چند کے سامنے راجدھانی کا پورا کیچڑ اپنی تمام تر بدبو کے ساتھ گاڑھے کالے رقیق بہاؤ کے ساتھ پھیلا پڑا تھا اور وہ اس میں چھپا چھپ ہاتھ پیر پٹک رہے تھے۔ اس کیچڑ میں چھپکیاں مارنے کا اپنا الگ ہی مزہ ہوتا ہے اور بٹوک چند پوری دلچسپی سے اس میں غوطے لگا رہے تھے۔ بیچ بیچ میں یہ ضرور دیکھ لیتے تھے کہ دیواروں کے کان کھلے تو نہیں ہیں۔ ایک آدھ مرتبہ کوئی دروازہ یا کھڑکی کھلنے کو ہوئی تو انھوں نے کہانی کے بیچ میں اٹھ کر اسے بند کر دیا۔

اوسط ہندوستانی عام حالات میں تفصیل پسند ہوتا ہے: اگر شراب پیٹ میں ہو اور فلسفہ سر پر

ناچ رہا ہو تو وہ کچھ مزید تفصیل میں چلا جاتا ہے۔ شرما کے ساتھ یہ تینوں صورتیں تھیں، اس لیے اس نے جو کچھ بتایا، پوری تفصیل کے ساتھ بتایا۔ چونکہ رات اپنی تھی اور بٹوک چند کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ شرما رات میں یہیں رکے گا، اور معاملہ کیچڑ میں لوٹنے پوٹنے کا تھا، اس لیے بٹوک چند نے شرما کو ایک بار بھی روکا ٹوکا نہیں۔ انھوں نے اتنا کیا کہ ڈرائیور اس بیچ جب شرما کے کرتے پاجامے لے کر آیا تو اسے بھی کھا پی کر آرام کرنے اور صبح سات بجے گاڑی لگانے کا حکم دیا اور دروازے آخری مرتبہ اچھی طرح بند کر دیے۔ جتنا کچھ شرما نے شراب کے ساتھ کھانے کے لیے منگا لیا تھا اور دونوں ہاتھوں سے اس میں سے نکال نکال کر کھانے اور قالین پر گرانے کے بعد جو کچھ بچا پایا تھا، وہ ان کے لیے کافی تھا۔ شرما کی باتوں میں خلل ڈالے بغیر کیے انھوں نے اپنے کپڑے بدلے اور صوفے سے اٹھ کر بستر پر چلے گئے اور دو تکیے دیوار کے سہارے لگا کر اس پر پیٹھ ٹکا کر بیٹھ گئے اور دیر رات تک شرما کی دکھ بھری داستان سنتے رہے۔

لوگ سوچتے ہیں کہ ایسے معاملات فلموں میں ہی ہوتے ہیں۔ بٹوک چند نے تفصیلات شروع ہوتے ہی سمجھ لیا تھا کہ اصل زندگی میں زیادہ مسالا ہوتا ہے۔ اس تفصیل میں تو مسالا فلموں سے زیادہ بہت کچھ تھا — سب کچھ، یعنی سیکس، مار دھاڑ، آنسو، حوصلہ مندی اور دغا۔ دغا بازی پر آتے ہی شرما کو پھر وقت کی یاد آنے لگی اور اس کی سوئی پھر اس ریکارڈ پر اٹک گئی: ''سب وقت وقت کی بات ہے، بڑے صاحب، نہیں تو اس کتیا کی یہ حیثیت کہ مجھے اس کے گھر کے باہر انتظار کرنا پڑے۔''

جس عورت کو شرما ''کتیا'' جیسے اسم صفت سے نواز رہا تھا اور جسے پورا صوبہ ''منی چیف منسٹر'' کے نام سے جانتا تھا، اس سے شرما کی ملاقات تب ہوئی تھی جب وہ راجدھانی کی سڑکوں پر سبزی کا ٹھیلا لگاتا تھا۔ یہ عورت اس سے سبزی خریدتی تھی۔ بمبیا فلموں کی طرح آنکھیں لڑنے کے لیے آئیڈیل سچویشن تھی۔ لوکی یا تری تولتے ہوئے کب انگلیاں چھلنے لگیں اور کب آنکھیں لڑنے لگیں، نشے کی وجہ سے شرما کو یہ یاد کرنے میں دقت ضرور ہوئی، پر جدید ہندی شاعروں کی طرح اس کے سامنے ابلاغ کا مسئلہ کبھی نہیں رہا۔ شراب سے لڑکھڑاتی زبان اور فلسفے سے رندھے گلے سے اس نے لوک ساہتیہ کا سہارا لیتے ہوئے کچھ لسرو پسرو جیسے الفاظ ادا کیے جن سے جو وہ سمجھانا چاہتا تھا، اسے بٹوک چند فوراً سمجھ گئے کہ ان دونوں کے بیچ ہندی فلموں کی طرح اٹھارہ ریلوں کا انتظار کیے بغیر دوسری ریل

سے ہی جسمانی تعلق شروع ہو گیا۔

کہانی میں سیکس کے بعد حوصلہ مندی نام کا جز بھی شامل ہو گیا۔ شرما سبزی ضرور بیچتا تھا، پر رہتا تھا اپنے علاقے کے ایک ایم ایل اے کے بنگلو کے آؤٹ ہاؤس میں۔ سبزی بیچنے کے بعد وہ ایم ایل اے کے، جنھیں پورا علاقہ چیئرمین صاحب کے نام سے جانتا تھا کیونکہ وہ ایک کالج کی انتظامیہ کے پشتینی چیئرمین تھے، بے تنخواہ دار سیاسی صلاح کار کے طور پر کام کرتا تھا۔ شام ہوتے ہی ان کے علاقے کے وہ سارے لوگ جنھیں چیئرمین صاحب اپنا کارکن کہتے تھے اور جن کے بارے میں ان کے محلے والے لوگوں کی رائے تھی کہ وہ اٹھائی گیرے اور لفنگے تھے اور جو راجدھانی میں دن بھر کسی نہ کسی کام سے دفتروں کے چکر لگا رہے ہوتے، چیئرمین کی کوٹھی پر اکٹھے ہو جاتے۔ کوٹھی کے باہر ایک چبوترا تھا جس پر سورج ڈوبتے ڈوبتے شرما کی قیادت میں علاقے کے کارکنوں کی ایک فوج پانی چھڑکتی۔ پھر گھر میں موجود ساری ثابت اور ٹوٹی کرسیاں جو بیٹھنے والوں کے ساتھ خود نہ بیٹھ جائیں، چبوترے پر لگا دی جاتیں۔ کوٹھی کے برآمدے میں پڑی چار پانچ چارپائیاں بھی چبوترے پر پہنچ جاتیں۔

ان بیٹھکوں میں چیئرمین صاحب کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ان کا علاقہ سیاست کے معاملے میں بہت زرخیز تھا۔ علاقے میں سڑکیں ٹوٹی پھوٹی تھیں، صنعت کس چڑیا کا نام ہے، لوگ نہیں جانتے تھے، باندھ کا صحیح استعمال باڑھ روکنے میں بھی ہو سکتا ہے، اس پر لوگوں کے دلوں میں شکوک تھے۔ ان کی رائے ہمیشہ اس جانب رہتی کہ باندھ مچھلی پالنے کے لیے زیادہ مفید ثابت ہوتے ہیں۔ تمام فالتو چیزیں تھیں جن پر اکثر بڑے شہروں کے لوگ ایرکنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھ کر بحثیں کرتے ہیں اور ترقی نام کی کسی فالتو چیز کے طور پر چیئرمین صاحب کے علاقے پر لادنا چاہتے ہیں۔ علاقے کے لوگ جانتے تھے کہ ان بڑے شہروں کے بابوؤں کی خواہشات صرف بحث مباحثے اور میگا سیسے انعام پانے کے لیے ہوتی ہیں، اس لیے وہ ان کی بہت فکر نہیں کرتے اور اپنے کام میں لگ جاتے ہیں جو ان کا سب سے پسندیدہ شغل ہے اور جس کی وجہ سے وہ شام کو چیئرمین صاحب کی کوٹھی کے اس چبوترے پر اکٹھے ہوتے ہیں۔

چیئرمین صاحب کے علاقے کے لوگوں کا سب سے پسندیدہ مشغلہ تھا سیاست یعنی پالیٹکس۔

Scanned with CamScanner

وہ ہر چیز میں سیاست کرتے تھے۔ اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے، فراغت کے لیے لپکتے، پریم کرتے، دلت لوگوں کی بستیاں اجاڑتے، انھیں جلاتے، کبھی ان کی بستیوں میں ہینڈ پمپ لگاتے، کورٹ کچہری جاتے، تھانے کی دلالی کرتے، غرض یہ کہ جیتے مرتے، ہر وقت سیاست کرتے رہتے۔ ان کے علاقے میں ہر چوراہے پر کافی ہاؤس کھلے ہوئے تھے۔ لوگ انھیں جانتے بھلے ہی چائے یا پان کی دکان کے روپ میں ہوں مگر علاقے کی دانشورانہ صلاحیتوں کی ترقی میں ان کا کنٹری بیوشن کافی ہاؤسوں سے کم نہیں تھا۔ صبح ہوتے ہی دانشورانِ علاقہ ان کافی ہاؤسوں میں پہنچ جاتے۔ ان کی بحثوں کا دائرہ اکثر قومی یا بعض موقعوں پر بین الاقوامی موضوعات ہوتے تھے۔ ان کے پاس ملک وقوم کے سارے مسائل کے حل ہوتے تھے۔ قومی کیا، بین الاقوامی مسائل پر بھی ان کی رائے حیرت زدہ کردینے والی ہوا کرتی۔

سیاست سے انھیں بس اتنا سروکار تھا کہ اگر بغیر گھمائے پھرائے بات کی جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ ان کی مقامی سیاست کا محور صرف اور صرف تبادلہ ہی ہوتا ہے۔ اس سیاسی گیم کو کھیلنے کے لیے دو کیمپوں میں لوگ بٹے ہوئے ہیں۔ چیئرمین صاحب کا کیمپ اور چیئرمین صاحب کے مخالفین کا کیمپ۔ ایک تھانیدار کا تبادلہ کرا آتا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ چیئرمین کا کارکن جیب کاٹتے ہوئے پکڑا جائے تو اسے داروغہ جی حوالات میں بند کردیں۔ علاقے کا لا اینڈ آرڈر پہلی بار اتنا خراب ہوا ہے۔ دوسرا کیمپ جاکر ضلعی انتظامیہ کے آفس پر دھرنا دے دیتا ہے کہ ایسا تھانیدار تو آج تک آیا ہی نہیں۔ پورا رام راج ہے۔ علاقے کے چور گاندھی ٹوپی عوام کے قدموں میں رکھ دیتے ہیں اور بھائی صاحب، ماتا جی یا بہن جی جیسے القاب سے مخاطب کرتے ہوئے بس ایک ہی التجا کرتے ہیں کہ لوگ ان پر ترس کھائیں اور جیب کی ساری رقم ان کے حوالے کردیں۔ اگر لٹنے والا بغیر پٹے ان کی مدد کرنے کو نہیں تیار ہوتا تو وہ ہاتھ جوڑ کر ایک ہی جملہ بار بار دہراتے ہیں کہ جب تک یہ کمبخت داروغہ ان کے علاقے میں ہے، تب تک ان کا کٹھن امتحان نہ لیا جائے۔

علاقے میں بجلی کے کھمبے گڑے ہیں۔ دو کھمبوں کے بیچ تار نام کی ایک غیر ضروری چیز بھی باندھی گئی ہے جسے لوگوں نے بیچ بیچ میں سے نکال بھی لیا ہے اور گھروں میں کپڑے ٹانگنے یا مویشیوں کو باندھنے جیسا استعمال کیا ہے۔ جہاں کھمبوں کے بیچ تار موجود ہیں، وہاں لوگ سرکار سے امید

Scanned with CamScanner

کرنے لگتے ہیں کہ ان میں بجلی بھی دوڑے۔ سرکار ویسے ہی بہت مصروف چیز ہوتی ہے اس لیے علاقے کے لوگ یا ان کے لیڈر سرکار کو پریشان کرنا نہیں چاہتے۔ وہ ان سے ایسی فضول مانگیں نہیں کرتے کہ کھمبوں کے بیچ تار بھی ہو اور ان میں بجلی بھی دوڑے۔ بجلی سے ان کا مطلب مقامی سب اسٹیشن کے جونیئر انجینئر سے ہوتا ہے۔ اگر اپنا آدمی جے ای ہو تو علاقے میں بجلی کی سپلائی ٹھیک ٹھاک چل رہی ہوتی ہے۔ بغیر تار کے بھی کھمبے بجلی کے لقو سے جگمگانے لگتے ہیں۔ بغیر بجلی کے تھریشر چلنے لگتے ہیں، ٹیوب ویل پانی پھینکنے لگتے ہیں اور مخالفین بجلی کی چمک دمک کے حملے سے شکست خوردہ ہو جاتے ہیں۔ جیسے ہی اپنے والے جے ای کا تبادلہ ہوتا ہے، بجلی کا نظام درہم برہم لگنے لگتا ہے۔ علاقے میں طوفان اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور عوام کے دکھ سے بے قرار کارکن راجدھانی کا رخ کرتے ہیں اور چیئرمین صاحب کے چبوترے پر ہنگامی صورت حال پر صلاح مشورے ہونے لگتے ہیں۔

ایسے صلاح مشوروں میں شرما ان کے دکھ درد میں برابر کا شریک ہوتا تھا۔ دن بھر سبزی بیچ کر شام ڈھلے وہ آؤٹ ہاؤس پہنچ جاتا۔ وہاں ٹھیلا کھڑا کر کے دن بھر کا حساب کتاب لگا کر وہ نہاتا اور پھر چکا چک کرتا پاجامہ پہن کر شام کی بیٹھک کا انتظام کرنے پہنچ جاتا۔

چیئرمین صاحب کے یہاں مکمل طور پر جمہوریت تھی۔ وہاں کی میٹنگ میں حصہ لینے کے لیے صرف تین چار شرائط پوری کرنی ضروری تھیں۔ شرط نمبر ایک تھی کہ بیٹھک میں حصہ لینے والا چیئرمین صاحب کے علاقے کا ہو۔ دوسری شرط کے مطابق اس کے پھیپھڑے مضبوط ہوں۔ تیسری شرط لباس سے متعلق تھی۔ وہاں آنے والا اگر کھدر کے کرتے پاجامے میں ہو تو اس کی حیثیت میں مزید اضافہ ہوتا۔

شرما ان تمام شرائط پر پورا اترتا تھا۔ خاص طور سے بیچ والی یعنی دوسری شرط پر۔ اس کے پھیپھڑے اتنے مضبوط تھے کہ وہ کسی بھی بحث میں کبھی بھی گلا پھاڑ کے چلانے لگ سکتا تھا اور پکے راگ کے کسی سدھے گانے والے کی طرح دیر تک راگ ولمبت میں رہ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور خوبی بھی تھی جس کی وجہ سے چیئرمین صاحب کے دربار میں اس کا مقام تھا۔ وہ ہمیشہ چپل پہنتا تھا اور کبھی بھی اسے پیر سے نکال کر ہاتھ میں لے سکتا تھا۔ پھیپھڑے کی طاقت سے بھرپور آواز اور ہاتھ میں چپل کچھ ایسا منظر پیش کرتے کہ چیئرمین صاحب اس پر لہلوٹ ہو کر اسے دیکھتے رہتے۔ یہ منظر

Scanned with CamScanner

اکثر سیکریٹریٹ میں دکھائی دیتا جب چیئرمین صاحب کسی نادان افسر کو یہ سمجھانے کی کوشش میں لگے ہوتے کہ سچ وہ نہیں ہے جو فائل میں دیے گئے کمنٹس سے جھلک رہا ہے بلکہ وہ ہے جسے وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے سمجھانے میں لگے ہیں۔ بحث کا اختتام عام طور سے شرما کی مداخلت سے ہوتا۔

چیئرمین صاحب دل کے مریض تھے۔ ویسے بھی ان کی سیاسی تربیت گاندھی واد کی اقدار کے مطابق ہوئی تھی۔ ان کا اس پر یقین تھا کہ نادانی کرنا تو افسروں کی فطرت ہے اس لیے ان کی نادانی پر ناراض نہیں ہونا چاہیے۔ وہ مسکراتے رہتے اور دھیمے دھیمے لہجے میں رک رک کر باتیں کرتے، پر اس طرح کے کسی رویے کے لیے شرما کو کوئی مجبور نہیں کرسکتا تھا۔ نہ صرف شرما بلکہ ان کے چیلوں پر بھی اس قسم کے نرم رویے کی کوئی پابندی نہیں تھی، اس لیے وہ مسکراتے رہتے اور ان کے چیلے اپنے پھیپھڑوں کا استعمال کرکے سمجھانے کی کوشش کرتے۔ چیئرمین صاحب دھیرے دھیرے رک رک کر بولتے اور شرما اس افسر کا دھیان اس صورت حال کی طرف مبذول کراتا جس میں چپل پاؤں سے نکل کر ہاتھوں میں پہنچ جاتی ہے۔ شرما کسی بھی افسر کے سامنے ہندوستانی دفتروں میں چپل کے استعمال کے موضوع پر گھنٹوں تقریر کرسکتا تھا۔ زیادہ تر افسروں کی اس تقریر میں دلچسپی نہیں ہوتی تھی۔ کئی بار کچھ نادان افسر اس موضوع پر غیر منطقی دلائل دینا شروع کردیتے۔ وہ شرما کو بتانے کی کوشش کرتے کہ چپل سے زیادہ مفید جوتا ہوتا ہے اور اپنے زمانہ طالب علمی میں یا اپنی پچھلی تقرری تک وہ بھی چپلیں پہنتے تھے، پر اب وہ جوتا پہننے لگے ہیں۔ بحث اس بات پر ٹک جاتی تھی کہ جوتے اور چپل میں کسے پہلے اتارا جاسکتا ہے۔

چیئرمین صاحب مسکراتے رہتے اور اس بحث مباحثے سے لطف اندوز ہوتے رہتے۔ کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ یہ بحث جوتے چپل اتارنے کے مقابلے میں تبدیل ہوجاتی۔ تب ان کی مسکراہٹ بڑی کام آتی۔ اگر شرما جیتتا تو وہ افسر کو بتاتے کہ جس فن کی مہارت کے بارے میں شرما بات کررہا ہے، یعنی پھینک کر ماری گئی چپل، یہ اس کی اس ٹریننگ کا جیتا جاگتا ثبوت ہے جس کے تحت وہ چاہتا ہے کہ ہندوستانی نونہال اس طرح کے کرتبوں میں ماہر ہوں اور اولمپک میں قوم کی خواہشات کو پورا کرتے ہوئے طرح طرح کے میڈل جیتنے کی تیاری میں لگ سکیں۔ اگر شرما ہارتا ہوا دکھائی دیتا تو ان کی مسکراہٹ ''ابھی بچہ ہے!'' والے تاثرات سے اس کی حفاظت کرنے کے لیے آگے بڑھتی۔

چیئر مین کے گھر شام کو اکٹھا ہونے والا ''ہلہ بریگیڈ'' صرف سرکاری دفتروں کے بابوؤں کے ساتھ تبادلہ خیال کے لیے ہی کارآمد نہیں تھا؛ سیاست میں اس کی افادیت زیادہ تھی۔ چیئر مین صاحب شفقت کے ساتھ ہلہ بریگیڈ کو ''بچے'' کہا کرتے تھے۔ ان کے مطابق بچوں کو ان کی افادیت کے لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا تھا: ایک طرف پھیپھڑا وادی تھے اور دوسری طرف چپل وادی۔ پھیپھڑا وادی اپنے پھیپھڑوں میں ہوا بھر کر اسے منھ کے راستے اس طرح نکالتے تھے کہ سامنے والا افسر یا سیاسی مخالف ہکا بکا منھ کھولے تب تک دیکھتا رہ جاتا جب تک اس کے منھ سے رال نہ بہنے لگتی۔ زیادہ تر مسائل تو پھیپھڑا وادیوں کے سہارے حل ہو جاتے۔ کبھی کبھی ہائی کمانڈ کا کوئی نمائندہ یا کوئی افسر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا کہ اس کے پھیپھڑوں میں بھی اتنا ہی دم ہے، تب پھیپھڑا وادی ایک طرف ہٹ جاتے اور چپل وادی دستہ ہلا بولتا۔

شرما دونوں دستوں میں تھا اس لیے اس کی افادیت زیادہ تھی۔

شرما کی افادیت کے اور بھی اسباب تھے۔

حالانکہ شراب نے تکلف اور شرم وحیا کی ضرورت ختم کر دی تھی، پھر بھی شرما نے کمرے میں چل رہے پنکھے، کونوں، کھڑکیوں اور دروازوں کے اوپر سے جھانکتے ہوئے جو کچھ کہا، اس سے بٹوک چند کی سمجھ میں یہ آیا کہ چیئر مین صاحب لنگوٹ نام کی کسی پوشاک کے بڑے کچے تھے۔ شراب شرما پی رہا تھا، پر سمجھ میں آنے کے بعد بٹوک چند نے بھی کھڑکی دروازوں اور پنکھوں کو گھورنا شروع کر دیا۔

راجدھانی میں بہت سے نیتا تھے جو چیئر مین صاحب کی طرح لنگوٹ کے کچے تھے۔ راجدھانی میں ایسی بہت سی عورتیں بھی تھیں جو سمن کی طرح خوبصورت اور حوصلہ مند تھیں۔ ان دونوں طرح کی مخلوق کے ساتھ شرما جیسے سیلف سروس والوں کی ایک لمبی فوج تھی جو خوبصورت اور حوصلہ مند عورتوں کو لنگوٹ کے کچے ان قومی لیڈروں سے ملانے کے لیے بے چین رہا کرتی تھی۔ اکثر یہ سیلف سروس والے اندھیری راتوں میں، اپنی، لیڈر کی یا حوصلہ مند خوبصورت عورت کی حیثیت کے مطابق، چوپہیا، تی پہیا یا دو پہیا سواری سے اترتے اور ان کے ساتھ اترتی وہ حوصلہ مند اور خوبصورت عورت جسے نیتا جی سے بہت ضروری سوالوں پر سیاسی صلاح مشورے کرنا ہوتے۔ کئی بار شرما کی کیٹگری کے لوگ باہر ہی رک جاتے اور بعض دفعہ یہ اس خوبصورت عورت کو خود ہی ان کی آرام گاہ تک پہنچا

Scanned with CamScanner

آتے۔ یہ بات بھی وقت، حوصلے اور آسانی پر منحصر تھی کہ عورت کو لانے والا باہر اپنی سواری میں انتظار کرے گا یا گھر جا کر صبح ہونے سے پہلے آکر اسے واپس لے جائے گا۔

شرما نے جب سمن کو چیئرمین صاحب سے ملانے کی بات کی، تب اسے امید تھی کہ اس کے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھانے والی حسینہ بھڑک جائے گی، لیکن ہر بیوقوف عاشق کی طرح اس نے بھی اس خوبصورت جسم کے اندر دھڑکتے ہوئے بلند حوصلہ دل کی ٹک ٹک نہیں سنی تھی۔ جیسے ہی اس نے یہ تجویز رکھی، ویسے ہی محاورے کی زبان میں سمن نے اسے لپک لیا۔

دو چار دن سمن شام والی بیٹھک میں شریک ہوئی۔ سیاسی موضوعات پر اس کی عقل اتنی تیز چلتی تھی کہ کئی بار شرما بھی بھونچکا رہ جاتا۔ چیئرمین صاحب اس کی موجودگی سے ہی نہالوں نہال رہا کرتے تھے۔ آخر میں وہ لمحہ آ ہی گیا جس کا سمن اور شرما کو انتظار تھا۔ چیئرمین صاحب سمن سے زیادہ سنجیدہ موضوعات پر اور زیادہ دیر تک تبادلۂ خیال کرنا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اتنے سنجیدہ موضوعات پر شام کے دربارِ عام میں گفتگو نہیں ہو سکتی تھی، اس لیے شرما سمن کو پہلے رکشے پر، پھر کار میں بٹھا کر رات کے وقت چیئرمین صاحب کے گھر لانے لگا۔ چیئرمین صاحب اور سمن بہت ہی سنجیدہ سیاسی صلاح مشورے کرتے اور باہر رکشے پر بیٹھ کر شرما ''مچھروں سے بچنے کے طریقے'' نام کی کتاب کی ورق گردانی کرتا رہتا۔ تھوڑے عرصے کے بعد کار آ جانے پر اس میں ریڈیو چلا کر سو جاتا۔ مشورے ختم کر کے پو پھٹنے سے پہلے سمن باہر آتی تو وہ اسے گھر چھوڑ آتا۔

اس طرح کی کہانی میں جیسے موڑ آتے ہیں، ویسے ہی اس کہانی میں بھی آئے۔ ایک خوبصورت اور بلند حوصلہ عورت اپنی سیاسی بصیرت کو ان لوگوں تک پہنچانا چاہتی ہے جو جنتا کی سیوا میں اس کا بہتر استعمال کر سکیں۔ ایک ایم ایل اے اپنے علاقے کی عوام کی خدمت کے عوض منتری بننا چاہتا ہے۔ ایک چیف منسٹر جو حکومت کے رپٹیلے پتھریلے راستوں پر سانپ سیڑھی کا کھیل کھیلتے ہوئے بلندی پر پہنچ گیا ہو، دن بھر کی اکتاہٹ، یکساں اور تھکا دینے والے معمول کے بعد اپنے تھکن اور کسلمندی کے شکار جسم کو آرام دینے کے لیے، سیاست میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے بے قرار حسیناؤں سے گمبھیر صلاح مشورے کرنے کو بے چین رہتا ہے۔ اوپر سے دیکھنے میں تینوں میں کوئی خاص تعلق نہیں دکھائی دیتا، مگر تھوڑا غور سے جھانکنے پر ان کے مابین ہلکورے لیتی کیچڑ کی ایسی دھارا

ملے گی جس کے بہاؤ میں تینوں نہانے کے لیے بیتاب ہوں گے اور کہانی کا اختتام فطری طور پر یہی ہو سکتا تھا کہ جلد ہی تینوں کیچڑ میں چھپ چھپ کر نہانے لگتے۔

اس کہانی میں بھی یہی ہوا۔ منتری بننے کے لیے بے قرار چھوٹا موٹا نیتا حسین عورت کو لے کر ڈھلے گالوں اور تھل تھل کرتے جسم اور پائیوریا سے سڑتے دانتوں والے چیف منسٹر کے دربار میں حاضر ہوا اور ان دونوں کو سنجیدہ صلاح مشورے میں مشغول چھوڑ کر لوٹا اور باہر کار میں رات بتانے لگا۔ منتری بن جانے کے بعد بھی چیئرمین صاحب نے اپنا رول چھوڑا نہیں۔ فرق صرف اتنا پڑا کہ پہلے اپنی کار خود چلاتے ہوئے جاتے تھے اور سمن کے اندر چلے جانے کے بعد گاڑی کی اگلی سیٹ پر پیر پسار کر سو جاتے تھے؛ اب جھنڈا لہراتی ہوئی گاڑی پر پچھلی سیٹ پر سمن کے ساتھ بیٹھ کر جاتے اور اسے اندر تک پہنچا کر پچھلی سیٹ پر سو جاتے، اگلی سیٹ پر ڈرائیور سوتا۔ اس نے پہلے بھی دوسرے منتریوں کے ساتھ اتنی بار یہ ڈیوٹی انجام دی تھی کہ صلاح مشورہ ختم ہونے کے وقت اس کی نیند خود بخود ٹوٹ جاتی۔ جب سمن تیز قدموں سے گاڑی کی طرف آتی دکھائی دیتی تو وہ ایک ہاتھ سے گاڑی کا دروازہ کھولتا ہوتا اور دوسرے ہاتھ سے منتری ہونے کے باوجود چیئرمین صاحب نام سے پکاری جانے والی مخلوق کو جگاتا ہوا دکھائی دیتا۔

یہ وہ مقام تھا جب شرما کو پھر سے وقت کی اہمیت سمجھ میں آنے لگی۔

''سب وقت وقت کی بات ہوتی ہے بڑے صاحب۔ اس وقت میری مت ماری گئی تھی...''

بٹوک چند کی سمجھ میں آ گیا کہ مت کہاں ماری گئی تھی۔ ان کہانیوں میں ایک غلطی ہمیشہ دہرائی جاتی ہے۔ بلند حوصلہ حسینہ کا عاشق یہ سمجھ لیتا ہے کہ اپنے شوہر سے بے وفائی کرنے والی اس کی محبوبہ اس کے تئیں وفا سے لبریز ہے۔ یہیں وہ دھوکا کھاتا ہے اور یہیں اسٹیج پر وقت دندناتا ہوا داخل ہوتا ہے۔

شرما نے دو تین مرتبہ سی ایم ہاؤس میں سمن کو لے جانے کے لیے گاڑی بان کا کردار ادا کرنے کی پیشکش کی، پر شروع میں نرمی سے اور بعد میں سختی سے یہ پیشکش ٹھکرا دی گئی۔ چیئرمین صاحب کے رویے میں بھی کچھ ایسی تبدیلی آ گئی کہ شرما کو شام کی بیٹھکیں کافی بیگانی لگنے لگیں۔ اس کی موجودگی میں

چیئر مین صاحب کو کچھ اتنے گمبھیر موضوعات یاد آ جاتے کہ وہ ان کے بیان کرنے میں پوری طرح غرق ہو جاتے۔ اگر وہ بحث میں دخل اندازی کرنے کی کوشش کرتا تو چیئر مین صاحب کی سماعت کچھ ایسی ہو جاتی کہ انھیں دوسروں کی باتیں تو سنائی دیتیں لیکن شرما کی آواز ان کے کانوں تک نہ پہنچتی۔ شرما شام کی بیٹھکوں کے لیے کرسی میز لگوانے پہنچتا تو اسے نرم انداز میں بتایا جاتا کہ اسے تکلف کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اس کی دعا سے وہاں یہ سب کام کرنے کے لیے سیلف سروس والے موجود ہیں۔

بڑی مشکل سے شرما چیئر مین صاحب کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہوا تھا کہ سمن کو سی ایم ہاؤس میں چھوڑ کر آنے کی تجویز کے سلسلے میں اس کی نیت صرف یہ تھی کہ چیئر مین صاحب کو ایسے کسی کام میں ملوث ہونے سے بچایا جائے جو ان کے شایانِ شان نہیں۔ چیئر مین صاحب منتری ہو گئے تھے اور کسی منتری کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ سی ایم ہاؤس میں کسی کو پہنچا کر خود باہر کار میں سوتے ہوئے کسی کا انتظار کرے۔

شرما چیئر مین صاحب کو اتنا یقین تو نہیں دلا پایا کہ اسے سی ایم اور سمن کے بیچ پل بننے کا موقع مل جائے، پر اتنا یقین ضرور دلا لے گیا کہ ان کی کوٹھی پر شام کو کرسی اور چار پائی بچھانے کا اس کا پرانا کام اسے پھر سے مل گیا۔ چیئر مین صاحب بھی زیادہ دنوں تک قاصد کا رول نہیں نبھا پائے۔ جلد ہی سمن کے شوہر نے یہ ذمے داری سنبھال لی۔ شوہر نام کا یہ انسان کافی دنوں سے بے روزگار تھا۔ چیف منسٹر نے سمن کے ساتھ پہلی رات کو ہی انتہائی سنجیدہ صلاح مشورے کے بعد یہ طے کر دیا تھا کہ وہ شوہر محترم کو او ایس ڈی بنا دیں گے۔

او ایس ڈی یعنی آفسر آن اسپیشل ڈیوٹی۔ یعنی نوکر شاہی میں اس کا کردار پُران میں نارد کی طرح ہوتا ہے۔ یہ ہر جگہ ہو سکتا ہے اور کہیں نہیں بھی ہو سکتا ہے۔ او ایس ڈی بنا کر چپراسی سے چیف سیکرٹری کا رول ادا کرنے کو کہا جا سکتا ہے اور بعض اوقات کسی چیف سیکرٹری کو اس کی اوقات بتانے کے لیے او ایس ڈی بنا کر چپراسی کی حیثیت میں پہنچا دیا جاتا ہے۔

سمن کا شوہر او ایس ڈی بنا، تب تک سمن منی چیف منسٹر بن چکی تھی۔ اس لیے صوبے کی نوکر شاہی کے لیے اس او ایس ڈی شوہر کی وہی حیثیت بنی جو صوبے کے چیف منسٹر کی بیوی کی تھی۔ چیف منسٹر کے بہت قریبی کچھ افسروں کو چھوڑ کر وہ کسی بھی افسر کو ہڑکا سکتا تھا اور کوئی بھی افسر اس کے

Scanned with CamScanner

بتائے گئے کام کو انجام دے کر اور انھیں مطلع کر کے اپنے اوپر فخر محسوس کرتا تھا۔

''بڑے صاحب، کیا وقت آ گیا ہے!'' اس مرتبہ وقت کی یاد کے پس پردہ اس کے دل میں جو ہل چل مچی، وہ یہ کہ وہ اُس کے شوہر کے اس نئے رول کے بارے میں جلد بتا دے جسے بتانے کے لیے وہ بیتاب تھا۔

''اب آپ نے کبھی سنا ہے بڑے صاحب، کہ کوئی شوہر خود ہی اپنی بیوی کو کسی سالے کے بیڈ روم میں پہنچا کر باہر اسٹول پر بیٹھ کر چوکیداری کرے؟''

بٹوک چند نے دیکھا اور سنا دونوں تھا کہ ترقی اور اچھی جگہ تقرری کی چاہ میں کئی ماتحت اپنی بیویوں کا اسی طرح استعمال کرتے تھے، پر ابھی شرما ان سے کسی جواب کی امید نہیں کر رہا تھا اس لیے چپ چاپ سامع بنے رہنے کو وقت کی پکار مان کر انھوں نے سلاد میں سے مولی کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور اسے ٹونگنے لگے۔

''اُو سالا کہتا ہے کہ اس کی مہرارو (بیوی) سی ایم اے کے ساتھ پولیٹکل ڈسکشن کر رہی ہے، اور خود گاڑی میں بیٹھ کر مچھر مارتا رہتا ہے... ڈسکشن نہیں، ٹھینگا کرتی ہے... پورا صوبہ جانتا ہے کہ کیا ڈسکشن ہوتا ہے...''

اس کے بعد شرما نے پولیٹکل ڈسکشن کا جو نقشہ کھینچا، اس سے بٹوک چند ہندوستانی روایات کے مطابق اسی طرح سے جم کر لطف اندوز ہوئے جس طرح سامع اپنے چہرے اور آنکھوں میں مسلسل ایک ایسا اثر محسوس کرتا ہے کہ اس کے لیے اس غلیظ موضوع کو سننا کسی جہنم کے نظارے سے کم نہیں ہوتا مگر اس کے کان یکسوئی سے سامنے والے کی گفتگو سے چھلکتے رسیلے الفاظ کو خوب ہی خوب اندر اتارتے رہتے ہیں۔ وہ بیچ بیچ میں اپنی لغت سے حاصل دھتکار کے ہم پلہ الفاظ کا جم کر استعمال کرتے رہے اور جب بھی شراب کے اثر سے شرما کی زبان کچھ لڑکھڑاتی، اسے واپس کتھا کے لذیذ موضوعات کی طرف موڑ کر لاتے۔

اگلے کچھ منٹوں میں شرما نے جو کتھا سنائی، وہ اس پچھڑے ہوئے صوبے میں کئی بار دہرائی جا چکی تھی اور بٹوک چند جیسے لوگوں نے الگ الگ چیف منسٹروں کے دورِ حکومت میں الگ الگ طریقوں سے سن رکھی تھی۔ اسی صوبے میں ایک بہترین آدمی چیف منسٹر رہ چکے تھے جو اپنی بہو کی

Scanned with CamScanner

صلاح سے راج کاج چلاتے تھے۔ ان کے زمانے میں صوبہ بہومت (کثرت رائے) سے نہیں، بھُومت (بھوکی رائے) سے چلتا تھا۔ ایک ضلعے میں اکثر دو کلکٹر چارج لینے پہنچ جاتے تھے۔ ایک کو سرکار آرڈر دیتی تھی، دوسرا بھوجی کے دربار سے جاری آرڈر کی کاپی پھڑپھڑاتا پہنچ جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ بھوجی جس پر مہربان ہوں، وہی کلکٹر کی کرسی پر براجمان ہوسکتا تھا۔ ایک دوسرے انتہائی معزز مانے جانے والے صاحب، جن کی شہرت ''چپل اُٹھاؤ'' چیف منسٹر کی تھی، صوبے کے ہر شہر میں ڈکشن کے لیے الگ الگ قسم کے کردار پالنے میں یقین رکھتے تھے۔ اپنی بیوی سے اولاد پیدا کرنے میں ناکام تھے مگر صوبے کے کونے کونے میں ان کی اولاد بکھری دکھائی دیتی۔ شرما جن چیف منسٹر کے بارے میں بتا رہا تھا، ان کے ساتھ دقت یہ تھی کہ وہ پچھڑی ذات کے تھے اور ڈکشن ہمیشہ اگڑی (اونچی) ذات کی خواتین سے کرتے تھے۔ شرما کے دکھ کی ایک یہ بھی وجہ تھی۔

''اب آپ ہی بتائیے بڑے صاحب... سالا وقت اتنا خراب آ گیا ہے کہ...'' اس کے بعد شرما نے دکھ ظاہر کرتے ہوئے بتایا کہ اس خراب وقت میں فلاں فلاں ذاتوں کی خواتین کو فلاں فلاں ذاتوں کے مردوں سے پولیٹکل ڈکشن جیسا گھناؤنا کام کرنا پڑ رہا ہے۔ اس کے مطابق ''فلاں ذات کے چیئرمین تک تو ٹھیک تھا، پر فلاں ذات کے چیف منسٹر کے ساتھ... چھی چھی...''

تھوڑی دیر تک ''چھی چھی'' ہوتی رہی مگر ظاہر تھا کہ ''چھی چھی'' سے نہ تو وہ بے چینی ختم ہوتی جو سب کچھ بیان کردینے کے لیے اندر سے بے قرار کر رہی تھی اور نہ اس اشتیاق کو سرد کرسکتی تھی جو ان رس بھری کہانیوں کا جی بھر کر مزہ لینا چاہتی تھی۔ لہٰذا دیر رات تک شرما وہ ساری تفصیلات بتاتا رہا جنھیں سن کر بٹوک چند کو لگ رہا تھا کہ انھوں نے آج دن بھر جو کچھ بابو اور شرما پر خرچ کیا تھا، وہ بیکار نہیں جانے والا تھا۔

شرما کی کہانی کا لب لباب یہ تھا کہ پہلے چیئرمین صاحب کی قربت سے سمن کی زندگی کے طور طریقے بدلے اور پھر چیف منسٹر سے گہرے تعلقات نے پوری زندگی ہی بدل ڈالی۔ کس طرح کچھ ہزار سے شروع کرکے سمن نے لاکھوں اور کبھی کبھی کروڑوں فیس کی شکل میں وصول کرنا شروع کردیا۔ اس درد کا اظہار شرما نے بار بار اپنے خالی گلاس کو بھر کر کیا۔ دکھ اسے اس بات کا تھا کہ شروع میں تو کئی سودے اس کے ذریعے ہوئے تھے اور اسے بھی اس کا حصہ مل گیا تھا۔ بعد میں سمن کے شوہر اور

دیوروں نے براہ راست سودے کرنا شروع کر دیے۔ شرما کے پاس شکار نہیں آتے تھے، اسے خود شکار کی تلاش میں سیکریٹریٹ سے لے کر ریلوے اسٹیشن تک خاک چھاننی پڑتی تھی۔

ان تفصیلات کے بعد شرما کچھ ٹھٹھکا۔ شراب میں اس کا جسم ضرور دُھت تھا، پر دماغ ابھی کام کر رہا تھا۔ اس نے پوری طرح بے سدھ ہو کر لڑھکنے سے پہلے بٹوک چند کو اطمینان دلاتے ہوئے کہا، ''پر کچھ بھی کہو بڑے صاحب... جتنی بھی بڑی توپ ہو گئی ہو سالی، پر اپنے پرانے یار کو ابھی بھی نہیں بھولی۔ میں کوئی کیس لے کر جاتا ہوں تو انکار نہیں کرتی۔ آپ کا کیس بھی کرے گی... بڑے صاحب... آپ نے دیکھا نہیں، کیسے مجھ سے بات کر رہی تھی...''

شرما تو بستر پر لڑھک گیا، پر اس جملے سے بٹوک چند کا منھ لٹک گیا۔

انھوں نے سمن کے کمرے میں جو دیکھا تھا، اس کے پیش لفظ اس بات سے ان کا منھ زیادہ لٹکنا چاہیے تھا۔ سمن عرف بھابھی جی کا ایک زمینی کارکن جب شرما کو بانہوں میں بھر کر اندر کمرے سے واپس لا رہا تھا اور شرما اس کی طرف اس طرح سے دیکھ کر مسکرا رہا تھا کہ یہ تو اپنا یار ہے اور دوستی میں یہ سب کچھ چلتا ہے، انھوں نے اس وقت اسے مان لیا تھا اور خود بھی مسکرائے تھے۔ اب اچانک انھیں لگنے لگا کہ زمینی کارکن شرما کو گھر کے اندر بغیر اجازت گھس جانے پر گردن دبوچ کر باہر نکال رہا تھا۔ اسی طرح سمن کی نگاہیں کمرے میں بیٹھے لوگوں کے چہروں پر گھومتی ہوئی شرما کے مکھڑے پر بغیر ٹکے، اچھلتی کودتی آگے بڑھ جاتی تھیں۔ تب انھوں نے سوچا تھا کہ شوہر اور کارکنوں کی موجودگی میں پرانے عاشق کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ مگر پھر لگنے لگا تھا کہ شرما کے لیے سمن کی غیر دلچسپی والی صورت حال اس کی آنکھوں سے صاف جھلک رہی تھی۔ انھوں نے اپنی یادداشت پر کافی زور ڈالا، پر انھیں ایک بھی ایسا موقع یاد نہیں آیا جب سمن نے اپنے شوہر سے چھپا کر شرما سے آنکھ لڑائی ہو۔ ایسا یاد نہ آنے پر بٹوک چند کا منھ اور لٹک گیا۔

ایسا تو نہیں کہ دن بھر جو خرچہ پانی کیا، وہ سب نالی میں چلا گیا؟ اب تو دو ہی متبادل تھے۔ ایک تو یہ کہ دبا کر مرغ توڑنے اور چھک کر دارو پینے والے اس تھل تھل بدن کو جو اس وقت اپنے ہر سوراخ سے ہوا اور کراہت آمیز آوازوں سے ماحول کو گندا بنانے میں مشغول تھا، اٹھا کر ہوٹل کے باہر پھینک دیں۔ دوسرا متبادل تھوڑا آسان لگ رہا تھا۔ وہ نیند میں غرق اس جسم کو اپنی ناک سے

دوسری مخلوق کی غراہٹ کی آوازیں نکالنے دیں اور بدن کے نچلے سوراخوں سے بدبودار گیس چھوڑنے کے عمل کو جاری رہنے دیں اور ان سب سے بے خبر ہو کر سونے کی کوشش کریں۔ انھوں نے یہی کیا اور جلدی ہی ان کے جسم نے بھی وہی سب کچھ دہرانے کا عمل جاری کر دیا جسے ان کے کمرے میں موجود پہلے شخص نے شروع کیا تھا۔

دوسرے دن جب بٹوک چند کی آنکھ کھلی تو انھوں نے دیکھا کہ شرما نہا دھو کر، رات میں لائے گئے کرتے پاجامے میں سجا سنورا، سنٹرل ٹیبل پر پیر پسارے اخبار پڑھ رہا ہے۔

''بڑے صاحب، جلدی اٹھیے، اب تک تو درخواست گذار بھابھی کے یہاں اکٹھے ہو گئے ہوں گے۔''

بٹوک چند ہڑبڑا کر اٹھے۔ کئی بار کا سیکھا ہوا سبق وہ بھول گئے تھے۔ راجدھانی میں سوؤ کبھی بھی، اٹھو منھ اندھیرے، اور نہا دھو کر نکل پڑو نیتا کی کوٹھی کی طرف؛ اس سے پہلے کہ وہ اپنے گھر سے نکلے، اسے پکڑ لو۔

جب بٹوک چند اور شرما کار سے اترے تو صبح کے ساڑھے سات ہی بجے تھے، لیکن اس قدر گرمی تھی کہ شرما کا دل چاہ رہا تھا کہ دوڑتا ہوا ملاقاتیوں کے کمرے میں گھس جائے اور بدن سے ٹپک رہے پسینے کو پنکھے کی ہوا میں بیٹھ کر سکھائے۔ اس نے بٹوک چند کی مہربانی سے حاصل نئے کرتے پاجامے کو پہن رکھا تھا اور گزری ہوئی شام کی اپنی کارگزاری کو یاد کر کے مسکرا رہا تھا۔ اس کارگزاری نے اس میں ایک خوداعتمادی پیدا کر دی تھی جو اس گھر کی چار دیواری میں قدم رکھتے ہی اس کی چال سے جھلک رہی تھی۔ گیٹ پر پولیس کا ایک سپاہی بندوق لیے کھڑا تھا۔ شرما نے اس کی سوالیہ نظروں کے سامنے اس خوداعتمادی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہ اگر آپ پورے اعتماد کے ساتھ سر اٹھائیں اور اپنی نگاہیں بالکل سیدھ میں کیے محل میں داخل ہوں تو کسی دربان کی کیا مجال کہ آپ کو ٹوک سکے، سیدھا اندر چلا گیا۔

بٹوک چند پیچھے تھے اور ان کی چال کو سپاہی کی آنکھوں نے منگوی مار دی۔ انھوں نے سپاہی کی آنکھوں سے اپنی آنکھیں ٹکرانے دیں۔ نتیجے میں وہ لڑکھڑائے اور سپاہی نے انھیں ڈپٹ دیا۔

''کس سے ملنا ہے جی؟ سیرے سیرے منھ اٹھائے چلے آئے...''

''عجیب لڑ بھیر ہو تم... بڑے صاحب کو نہیں پہچانتے!'' شرما جو کچھ آگے بڑھ گیا تھا، بٹوک چند کی حفاظت کے لیے جھپٹا۔ ''لڑ بھیر'' اور ''بڑے صاحب'' دو ایسے لفظ تھے جن سے سپاہی کے چہرے پر پیدا ہوا تناؤ دور ہو گیا۔ وہ مسکرایا۔ ابھی اس کوٹھی کے دربانوں میں وہ نیا نیا آیا تھا، پر تین چار دن میں ہی کچھ باتیں اس کی سمجھ میں آ گئی تھیں۔ لڑ بھیر جیسا سنسکرت کا لفظ بھابھی جی کے زمینی کارکن ہی استعمال کر سکتے تھے۔ اپنے چھوٹے سے قیام کے دوران اس نے تمام بڑے صاحبوں کو تبادلوں اور ترقیوں کے چکر میں بھابھی جی ڈیوڑھی کے چکر لگاتے دیکھا تھا، اس لیے ''لڑ بھیر'' اور ''بڑے صاحب'' لفظوں کو سننے کے بعد اس نے احترام کے ساتھ راستہ چھوڑ دیا اور بٹوک چند کوٹھی کے اندر داخل ہو گئے۔

اندر کا منظر کسی ایسے میدان جنگ کا نظارہ پیش کر رہا تھا جہاں سے افواج ایک طویل جنگ کے بعد رات میں تھوڑے آرام کے لیے اپنے اپنے خیموں میں واپس چلی گئی ہوں۔ باہر کھلے میدانی حصے میں، جسے اس کے اچھے دنوں میں لان کہا جا سکتا تھا، کٹے پھٹے پولی تھین بیگ، مونگ پھلی کے چھلکے، ادھ کھائے سموسوں کے ٹکڑے، سگریٹ کے ٹکڑے اور چائے کے کاغذی پیالے بکھرے پڑے تھے۔ اگر کسی رزمیہ شاعر کو اس دلپذیر خوبصورتی کے بیان کے لیے بلایا جاتا تو شاید اسے اس نام نہاد لان میں الٹی پلٹی کرسیوں کو دیکھ کر شکست خوردہ بادشاہوں کی یاد آ جاتی۔

بٹوک چند خوش ہوے۔ صبح کا سورج چڑھ چکا تھا، پر لان میں ابھی تک کوئی نہیں تھا۔ لوگ ادھر ذرا کاہل ہو گئے تھے۔ پچھلے مہینے تک تو ایسا نہیں تھا۔ وہ اپنے محکمے کے منتری کے یہاں منھ اندھیرے پہنچے تھے، تب بھی فریادیوں کی اچھی خاصی بھیڑ تھی۔ اچھا ہے، لوگ دیر تک سونے لگے ہیں۔

ان کی یہ خوشی لمحاتی تھی۔ جیسے ہی شرما انھیں لان سے تقریباً دھکے دیتا ہوا گزشتہ رات والے کمرے میں لے گیا جو ملاقاتیوں کے لیے تھا، ان کا چہرہ اتر گیا۔ اندر آدھے سے زیادہ کمرہ بھرا ہوا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ لوگ صوفوں پر آرام سے بیٹھے تھے، کل کی طرح دو کی جگہ پانچ نہیں تھے اور بٹوک چند کو آسانی سے بیٹھنے کی جگہ مل گئی۔ شرما نے خالی جگہ کی تلاش نہیں کی۔ پہلے وہ کسی کی گود میں بیٹھا، پھر اس نے کسی کا پیر کچلا، آخر میں دو تین لوگوں کے جسم کے مختلف حصوں کو روندتا کچلتا ایک جگہ

Scanned with CamScanner

پر ٹھہر گیا۔ اس کے بیٹھنے کے بعد بٹوک چند کی سمجھ میں آیا کہ اسے خالی جگہ کی نہیں بلکہ صحیح جگہ کی تلاش تھی۔ وہ جہاں بیٹھا تھا، وہاں سے گھر کے اندر تک دیکھا جاسکتا تھا۔ بیچ میں ایک دروازہ تھا جس پر پڑا پردہ اتنی بار کھسکایا جاچکا تھا کہ اب اس کی شکل ہونے نہ ہونے کے درمیان کی تھی۔

بیٹھ کر بٹوک چند نے کمرے میں نگاہیں دوڑائیں۔ پہلے سے بیٹھے کچھ لوگوں نے پہلو بدلے۔ جاسوسی فلموں جیسا ماحول ہو گیا۔ ایک صاحب نے اخبار اس طرح پڑھنا شروع کیا کہ ان کا چہرہ تو ڈھک گیا مگر ورق الٹے ہو گئے۔ ایک کے چہرے پر پسینہ اس قدر کاٹنے لگا کہ اس نے رومال کو جیب کی بجائے چہرے پر ہی رکھ لیا۔ بٹوک چند نے بھی بائیں جانب بیٹھے شخص سے بچنے کے لیے داہنی جانب گردن موڑ لی، پر داہنی طرف ایک اس سے بھی زیادہ شناسا چہرہ تھا، اس لیے گھبرا کر وہ سامنے کی طرف دیکھنے لگے۔ جس طرح کمرے میں دوسرے سنجیدہ لوگ تھے اور یہ سوچ رہے تھے کہ انھیں کوئی نہیں دیکھ رہا، اسی طرح وہ بھی سنجیدہ ہو گئے اور ان کے نزدیک کمرے میں سارے اندھے موجود تھے۔

تھوڑی دیر میں ماحول عام حالت پر آ گیا۔ اخبار اور رومال اپنی اپنی جگہ پر پہنچ گئے۔ حمام میں دوسروں کو ننگا دیکھ کر اپنے ننگے ہونے کے احساسِ شرمندگی کی جگہ ایک تجسس کا اظہار کرنے لگا۔ اخبار سے چہرہ ڈھانپے شخص نے جیسے ہی اخبار سیدھا کیا، بٹوک چند نے اسے سلام کیا۔ ''گڈ مارننگ سر۔''

''گڈ مارننگ کپور... کیسے ہو؟''

''جی آپ کا آشیرواد ہے... میرا نام بٹوک چند اپادھیائے ہے۔ آپ سے پچھلے سال ملاقات...''

بٹوک چند نے انھیں یاد دلانے کی کوشش کی کہ کس طرح پچھلے سال وہ سیکریٹریٹ میں، کب ان سے ملے تھے اور کون اس ملاقات کے پیچھے تھا، پر جنھیں ''سر'' کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا، انھوں نے کچھ بھی یاد کرنے سے انکار کر دیا۔

بٹوک چند کو انھیں یاد دلانے میں کچھ کچھ ایسا لطف آ رہا تھا جسے کچھ عالم لوگ کینہ پروری کا لطف کہتے ہیں۔ سر بھول رہے تھے اور بٹوک چند یاد دلا رہے تھے۔ انھیں یاد دلا کر وہ اپنی بے عزتی کا

بدلہ لے رہے تھے۔ جنھیں یاد دلایا جا رہا تھا، وہ کچھ دن پہلے تک بٹوک چند کے محکمے کے سیکرٹری تھے۔ بٹوک چند پچھلے سال ایک ایم ایل اے کو پکڑ کر ان کے پاس پیروی کے لیے گئے تھے۔ سیکرٹری صاحب کافی دیر تک انھیں ڈانٹتے رہے۔ انھوں نے ہر جملے میں ''ڈسپلن'' نام کے اُس جز و کو تلاش کرنے کی کوشش کی جو ''پولیٹکل انٹرفیرنس'' نام کے لکڑ بھگے کے جبڑے میں نچا کھچا تڑپ رہا تھا اور جسے بچانا ان جیسے نوکر شاہ کا فرضِ منصبی تھا۔ جس ممبر اسمبلی کے ساتھ بٹوک چند گئے تھے، اس نے دہاڑنے سے زیادہ ممیانا شروع کر دیا۔ یہ تو بعد میں پتا چلا کہ جس ممبر اسمبلی کو لے کر وہ سیکرٹری کے کمرے میں گھسے تھے، ممیانا اس کے کردار کا مستقل حصہ تھا۔ نوکر شاہ اسی ممبر اسمبلی کے ساتھ ادب سے پیش آتے ہیں جس کی زبان اور جوتا ایک ساتھ چلتے ہیں۔ غنیمت تھا کہ اندر آنے سے پہلے انھوں نے صرف آدھی فیس ہی دی تھی۔ نکلنے کے بعد انھیں اشاروں سے کئی بار سمجھایا گیا لیکن انھوں نے بقایا رقم کے بارے میں یاد کرنے سے انکار کر دیا۔

بٹوک چند کو معلوم تھا کہ سیکرٹری صاحب کا تبادلہ کسی ایسے محکمے میں ہو گیا ہے جہاں ''گزیٹیر'' نام کی کسی کتاب کی ترمیم و اضافے کا کام کیا جاتا ہے۔ ہندوستانی نوکر شاہوں کو غم اسی بات کا تھا کہ انگریز جیسی چالاک صاحب بہادر والی طبیعت کی مالک قوم نے ایسے ایسے محکمے بنا دیے تھے جو نوکر شاہی کے لیے کلنک تھے۔ اگر ان میں کچھ ایسے سرپھرے موجود تھے جنھیں جنگلوں، حیوانوں، چرند و پرند اور قبائلیوں جیسی فضول چیزوں کے پیچھے مارے مارے پھرنا اچھا لگتا تھا تو انھیں کرنے دیتے یہ سارے کام۔ وہ لکھتے رہتے کتابیں، بناتے رہتے گزیٹیر۔ پر یہاں سے جاتے جاتے انھیں یہ سارے فضول کے محکمے تو ختم ہی کر دینے چاہیے تھے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ ان کے جانے کے بعد بھی کچھ ہندوستانی نوکر شاہوں کو جھاڑ جھنکاڑ صاف کرنے پڑ رہے تھے۔

ان سیکرٹری صاحب کا بھی کچھ ایسا ہی دکھ تھا۔ انھیں پی ڈبلیو ڈی کے محکمۂ تعمیرات سے ہٹا کر گزیٹیر ڈپارٹمنٹ میں بھیج دیا گیا تھا۔ پچھلے تین مہینوں سے وہ اسی الجھن میں ڈوبے تھے کہ گزیٹیر نام کی یہ چڑیا ہے کیا چیز؟ اور اگر انگریزوں نے اسے ڈھونڈ نکالنے کی حماقت کر ہی دی تھی تو اب اسے سکون کے ساتھ اپنے گھونسلے میں بیٹھنے کیوں نہیں دیا جا رہا؟ اس میں نئے رنگ روغن بھرنے کی کوشش کیوں کی جا رہی ہے؟ ان سے پہلے جو صاحب وہاں تعینات تھے، وہ تو کئی سالوں تک ان

Scanned with CamScanner

سوالوں کے جواب نہیں ڈھونڈ پائے تھے۔ یہ سیکرٹری صاحب تو تین مہینے میں ہی گھبرا کر بھابھی جی کی پناہ میں آ گئے۔

سیکرٹری صاحب کی یادداشت درست کرنے کے ساتھ ساتھ بٹوک چند کمرے کی سرگرمیوں پر بھی نظر رکھے ہوئے تھے، جن کے تحت بیٹھا کوئی شخص اچانک اٹھتا اور اندر والے دروازے سے ہوتا ہوا غائب ہوتا جا رہا تھا۔ کوئی اس کمرے میں واپس نہیں آ رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ اندر بات کرنے کے بعد اسے کسی دوسرے دروازے سے باہر بھیجا جا رہا تھا۔

آخر وہ لمحہ بھی آ ہی گیا جس کا انھیں انتظار تھا۔

ایک زمینی کارکن اندر آیا۔ اندر کیا آیا، دروازے کی دہلیز سے اس نے ایک قدم اندر کی طرف بڑھایا اور باقی حرکت اس کی گردن نے کی۔ سارس کی طرح لمبی گردن چاروں طرف گھومی اور کمرے میں بیٹھے لوگوں پر گھومتی ہوئی بٹوک چند پر ٹھہر گئی۔

''آیئے بڑے صاحب۔''

بٹوک چند اٹھے۔ شرما بھی اٹھ گیا۔

''آپ نہیں... بڑے صاحب کو بلایا ہے۔''

بٹوک چند نے کہنا چاہا کہ شرما ان کے ساتھ ہے، بلکہ وہی انھیں لایا ہے، پر انھیں بولنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ شرما خود ہی بول اٹھا،''ارے بھائی جی، ہم بھی صاحب کے ساتھ ہیں نا۔''

''صرف بڑے صاحب کو بلایا ہے۔''

آواز کی سختی نے بحث ختم کر دی۔ بٹوک چند اندر چلے گئے۔ اندر آنگن تھا، آنگن کے بعد برآمدہ تھا اور برآمدے کی طرف کھلنے والے کئی چھوٹے بڑے کمروں میں سے ایک کمرے میں انھیں لے جایا گیا۔

کمرہ چھوٹا ہی تھا، اتنا کہ بس اس میں صرف ایک صوفہ سیٹ آ جائے اور ایک کونے میں ٹی وی رکھ کر اسے اس طرح چلایا جا سکے جس سے بات چیت کرنے والے جب بات چیت سے اکتا جائیں تو ٹی وی دیکھنے لگیں۔

اندر بھابھی جی تھیں، بھائی صاحب تھے، ڈھیر سارے اخبار تھے اور ایک ٹی وی سیٹ تھا۔

Scanned with CamScanner

اخبار بھائی صاحب اور بھابھی جی کے ہاتھوں میں تھے، ان کے قدموں میں بکھرے ہوئے تھے، صوفوں پر تھے اور فرش پر جہاں کہیں جگہ بچی تھی، وہاں پر بھی چھترے ہوئے تھے۔ بٹوک چند اخباروں کے اوپر چل کر آئے تھے اور جب صوفے پر بیٹھے تو کچھ ان کے جسم کے پچھلے حصے تلے بھی دب گئے۔ انھوں نے پہلے تو انھیں نیچے سے نکالنے کی کوشش کی، پھر تھوڑی دیر بعد یہ حرکت چھوڑ کر اس ٹی وی کی طرف دیکھنے لگے جو اس طرح چل رہا تھا کہ اس کی آواز میں بات کی بھی جا سکتی تھی اور نہیں بھی کی جا سکتی تھی، اور جس کی موجودگی سے یہ سمجھنا دشوار تھا کہ میاں بیوی اخبار پڑھ رہے تھے یا اسے دیکھ رہے تھے۔

بھابھی جی نے پورا منھ کھول کر جماہی لی۔ انھوں نے ڈھیلا ڈھالا گاؤن پہن رکھا تھا۔ رات کا میک اپ بدرنگ دھبوں کی طرح کہیں کہیں چہرے پر چپکا تھا۔ بھائی صاحب پاجامے اور بنیائن میں تھے۔ وہاں بیٹھنے پر بٹوک چند کو پتا چلا کہ ان کے جسم کے الگ الگ حصوں میں کھجلی تھی۔ وہ ایک ہاتھ سے ایک کے بعد دوسرے حصے کو کھجلا رہے تھے، ایک ہاتھ سے اخبار پکڑے ہوئے تھے۔ ایک آنکھ سے اخبار پڑھ رہے تھے اور دوسری آنکھ ٹی وی کے اسکرین پر جمائے ہوئے تھے۔ ٹی وی کے پردے پر ایک ہیروئن کولھے مٹکاتی ہوئی ہیرو کے پیچھے دوڑ رہی تھی۔ جب ہیرو پردے پر رہ جاتا، بھائی صاحب دوسری آنکھ بھی اخبار پر گڑا دیتے۔ ہیروئن کا اچھلتا کودتا وجود جیسے ہی پردے پر آتا، ان کی دونوں آنکھیں ٹی وی پر ٹنگ جاتیں اور کھجلی مٹاتا ہاتھ ایک ہی حصے پر گھومنے لگتا۔

جماہی دوبارہ لی گئی اور پوری طبیعت سے لی گئی۔ جماہی اس طرح سے لی گئی کہ اس کے دو معنی نکلتے تھے۔ ایک تو یہ کہ جماہی لینے والی کی نیند پوری نہیں ہوئی تھی اور دوسرے یہ کہ آنے والے کو کمرے میں اخبار پڑھنے یا ٹی وی دیکھنے کے لیے نہیں بلایا گیا ہے۔

بٹوک چند نے دونوں معنی قبول کرنے سے انکار کر دیا اور ٹی وی پر ہیروئن کے مٹکتے ہوئے سینے پر نظریں گاڑ دیں اور بھائی صاحب کے نقش قدم پر چلنے لگے۔

''بتائیے بڑے صاحب، کیا حکم ہے؟'' بھابھی جی نے پھر جماہی لی۔

اس سوال کا بھی جو لمبا جواب دیا گیا، اس کا مطلب یہ تھا کہ حکم وہ کیا دیں گے، وہ تو خوش نصیب ہیں کہ آج بھابھی جی کے درشن ہو گئے۔ رہی بات پہلے نہ آنے کی، تو اسی کی سزا بھگت رہے

ہیں وہ؛ پہلے اگر اس دربار کی پناہ میں آگئے ہوتے تو آج یہ دن کیوں دیکھنے پڑتے۔

ٹی وی پر کوئی دوسرا پروگرام شروع ہو گیا تھا اور ہیروئن اپنے گداز سینے کے ساتھ غائب ہو گئی تھی، اس لیے بھائی صاحب نے گفتگو میں دخل اندازی کی۔

''پھر بتایئے، کیا کرنا ہے؟... کیسے کرنا ہے؟''

بٹوک چند کا تجربہ بتاتا تھا کہ یہی سوال ایسے موقعوں پر کیا جاتا ہے۔ ان کا تجربہ یہ بھی بتاتا تھا کہ ایسے سوال کا سیدھا اور فوری جواب نہیں دینا چاہیے۔

''میں کیا بتاؤں بھائی صاحب... بتانا تو آپ کو ہی ہے۔'' اس کے آگے وہ پھر ایک طویل جملہ بولے جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ عمر میں بڑے ضرور ہیں، پر ہیں آپ کے بچوں کی طرح، اس لیے اس مصیبت سے، جسے لوگ تبادلے کے نام سے پکارتے ہیں، نکالنے کے لیے کیا کرنا ہے، کیسے کرنا ہے، یہ تو بھائی صاحب یا بھابھی جی کے مبارک ہونٹوں سے سننا ہی اچھا لگے گا۔

''اس سالے منتریا کو کتنا دیا تھا؟'' سوال اتنا سیدھا سپاٹ تھا کہ بٹوک چند گھبرا گئے۔ یہ سمجھنے میں بھی انھیں تھوڑا وقت لگا کہ جسے ''منتریا'' کہہ کہ اشارہ کیا گیا ہے، وہ ان کے محکمے کے منسٹر تھے۔

اس سوال کا جواب ایک طویل جملے سے نہیں دیا جا سکتا تھا اس لیے انھوں نے اس کا جواب دینے کے لیے ایک لمبے پیراگراف کا سہارا لیا۔ ان کے پیراگراف پر مشتمل تمہید، دلائل، اعداد و شمار اور استعارات کو نکال دیا جائے تو اس میں مندرجہ ذیل معنی کام کے نکلتے تھے:

– کہ بٹوک چند لاعلم انسان ہیں اور دوسرے لاعلم لوگوں کی طرح ان سے بھی زندگی میں غلطیاں ہوئی ہیں، مگر زندگی کی دو سب سے بڑی غلطیاں اس تبادلے کے سلسلے میں ہوئی ہیں۔ پہلی تو یہ کہ وہ شروع میں ہی بھابھی جی کی پناہ میں نہیں آئے، اور دوسری یہ کہ کچھ شرپسند لوگوں کے مشورے مان کر وہ منتری جی کے پاس چلے گئے۔

– کہ پیسہ تو ہاتھ کا میل ہے، آتا جاتا رہتا ہے۔ ایک بار ہاتھ سے نکل جانے کے بعد بٹوک چند اسے یاد نہیں کرنا چاہتے۔ منتری جی کو کتنا پیسہ دیا تھا، اسے وہ بھول گئے ہیں اور اس دربار کی بھی جو خدمت کریں گے، اسے یہاں سے نکلتے ہی بھول جائیں گے۔

– کہ تبادلے تو زندگی میں ہوتے رہتے ہیں اور ان کا اصول ہے کہ سرکار جہاں تعینات

Scanned with CamScanner

کر دے، وہیں وہ نوکری کرنے لگتے ہیں، اور بھائی صاحب اور بھابھی جی کے آشیرباد سے ٹھسکے کے ساتھ کرتے ہیں۔ وہ تو اس بار معاملہ عزت کا پھنس گیا ہے۔ پہلی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ کسی مائی کے لال نے انھیں ہٹا کر اپنا تقرر کرایا ہے۔ اس ذلت کو وہ نہیں سہہ سکتے، اس لیے کچھ بھی کرنا پڑے، وہ واپس اسی جگہ جانا چاہتے ہیں۔

اپنے لمبے پیراگراف کا اختتام انھوں نے اس گزارش کے ساتھ کیا جو ایسے موقعوں پر کی جاتی ہے کہ وہ ان سے باہر تھوڑے ہی ہیں، جو حکم ہو، وہ سیوا اس بار کریں گے، اور زندگی بھر سیوا کے موقعے تلاش کرتے رہیں گے۔

طویل پیراگراف کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ بھابھی جی کو یاد آ گیا کہ ابھی انھوں نے کچھ ایسے کام انجام نہیں دیے ہیں جنھیں صحت مند رہنے کی خواہش رکھنے والے لوگ صبح صبح ہی نپٹا دیتے ہیں اور ان سے ملنے آنے والے لوگ ہمیشہ اس سلسلے میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ انھوں نے ایک لمبی جماہی لی اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''میرے لیے کیا حکم ہے؟'' بٹوک چند ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔

''صاحب بتا دیں گے۔ آپ بات کریے، میں آتی ہوں۔'' بھابھی جی نے بھائی صاحب کی طرف اشارہ کیا۔

''اب یہ غریب برہمن آپ کی پناہ میں ہے۔ آدمی اپنوں ہی کے پاس جاتا ہے۔ اب برہمنوں کے نیتا ہی کتنے بچے ہیں؟''

بٹوک چند نے جس طرف اشارہ کیا تھا، اس کی وجہ سے بھابھی جی نے صحت سے متعلق ان ضروری امور کو تھوڑی دیر کے لیے ملتوی کیا اور بیٹھ گئیں۔

انھوں نے بتایا کہ وقت ایسا آ گیا ہے کہ چھوٹی ذات کے لوگ چوری چکاری یا بوٹ پالش جیسے آئیڈیل کام چھوڑ کر آئی اے ایس، پی سی ایس بن رہے ہیں، یا منسٹر، چیف منسٹر کی کرسیوں پر بیٹھے نظر آ رہے ہیں۔ اب ایسے میں برہمن بیچارے کہاں جائیں! پر اس میں غلطی ان کی بھی ہے۔ بھابھی جی نے کتنی بار اپیل کی ہے کہ وہ آپسی جھگڑے چھوڑ کر ایک ہو جائیں، اور ایک ہی نہ ہوں، ان کی رہنمائی میں بھی آ جائیں۔ اس کے بعد بھی اگر وہ ایک نہیں ہوتے، آپس میں لڑتے رہتے ہیں، تو

اس میں ان کا کیا قصور؟ پر اپنی اکڑ میں ڈوبی اونچی ذاتیں اپنا فرض بھول جائیں تو بھول جائیں، وہ کیسے بھول سکتی ہیں؟ ان کا دربار ہمیشہ ان لوگوں کے لیے کھلا رہتا ہے۔

اس کے بعد بھابھی جی کے چہرے پر شرارت آمیز مسکراہٹ تیر گئی۔ انھوں نے بھائی صاحب کی طرف اٹھلاتی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا، ''میں تو سی ایم سے بھی کہتی ہوں کہ آپ لوگ کہاں سے اس کرسی پر بیٹھ گئے... آپ کو تو...''

انھوں نے بہت سارے ایسے دھندوں کا ذکر کیا جنھیں چیف منسٹر کو اس لیے کرنا چاہیے تھا کیونکہ وہی ان کی ذات کے لوگوں کو زیب دیتا ہے۔ وہاں صرف وہی تین لوگ تھے اس لیے وہ تینوں دھندوں کی اس فہرست پر زوردار قہقہے لگانے لگے۔

''ارے بھائی، سی ایم کے مشیر کار کون لوگ ہیں؟ یہ بھی تو دیکھو۔ ہمارے مشورے پر عمل کریں تو پرمانٹ سی ایم رہیں گے۔'' بھائی صاحب کی اس رائے پر بھابھی جی اور بٹوک چند دونوں نے سر ہلایا۔

بھابھی جی اٹھیں اور اندر چلی گئیں۔

''ہاں تو بتایئے بڑے صاحب... کیا کرنا ہے؟''

''مجھے کیا بتانا ہے؟ میں تو آپ کی پناہ میں آیا ہوں۔ بتانا تو آپ کو ہے۔''

اس کے بعد دونوں طرف سے اس بات پر لمبی بحث ہوئی کہ کسے بتانا ہے۔ اتنا ضرور ہوا کہ بحث کے دوران بھائی صاحب نے جاننے کی کوشش کی کہ کملا کانت کو ہٹا کر کمبھ میلہ ڈویژن میں پہنچنے کے لیے بٹوک چند نے منتری جی کی کتنی خدمت کی تھی۔ بٹوک چند نے پھر بتایا کہ وہ پیسے کو ہاتھ کا میل سمجھتے ہیں اور ایک مرتبہ کسی کی خدمت کرنے کے بعد اس رقم کو یاد کرنے کی خواہش ان کے دل میں کبھی نہیں اٹھتی۔ اس دربار کی خدمت کرنے کے بعد تو ان کی جان بھی لے لی جائے تو وہ کسی کے سامنے منھ نہیں کھولیں گے۔ بھائی صاحب نے اس کے جواب میں جو کہا اس کا مطلب یہ تھا کہ بٹوک چند جی کی جان بہت قیمتی ہے اور ان کے اس جذبے کی وہ قدر کرتے ہیں، کہ ایسے رشتوں میں رازداری بڑی ضروری چیز ہے۔

اس کے بعد جو گفتگو ہوئی، اسے اگر سیاق وسباق سے ناواقف کوئی طالبعلم آڑ میں بیٹھ کر سنتا تو

Scanned with CamScanner

یہی سمجھتا کہ اس کمرے میں ریاضی، الجبرا اور جیومیٹری کے کچھ اہم اور کٹھن مسئلوں پر دو کمزور طالبعلم غور وخوض کر رہے ہیں۔

بھائی صاحب نے کمبھ میلے کے بجٹ کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ اب تو پردھان منتری نے بھی اعلان کر دیا ہے کہ سولہ آنے میں صرف چار آنے عوام تک پہنچتا ہے، اس لیے اس کمبھ میں تو بڑے صاحب کی چاندی ہے اور ان کی سات پشتوں کو اس کمبھ کے بعد کوئی کام نہیں کرنا پڑے گا۔

بٹوک چند نے انتہائی انکسار سے گزارش کی کہ حالانکہ بھائی صاحب خود بھی سیاست میں ہیں، اگر وہ برا نہ مانیں تو بٹوک چند انھیں بتانا چاہیں گے کہ سیاست دانوں کی باتوں کو سنجیدگی سے نہیں لینا چاہیے۔ وہ لوگ اکثر سنجیدہ چہرہ بنا کر مذاق کرتے ہیں۔ پردھان منتری نے بھی عوام کو ہنسانے کے لیے کچھ کہا تھا، پر ہمارے ملک میں لوگوں کا سنس آف ہیومر اتنا کم ہے کہ لوگوں نے ہنسنے کے بجائے اسے منھ لٹکا کر سنا اور زیادہ سنجیدگی سے اسے لے لیا۔

پھر کچھ دیر تک کمبھ کے بجٹ پر بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ دونوں طرف کے اندازوں میں کوئی اتنا زیادہ فرق نہیں تھا کہ اگر اسے کوئی سن رہا ہوتا اسے پارلیمنٹ میں بجٹ پر ہو رہی بحث کا مزہ آنے لگے۔ بھائی صاحب ٹریژری بنچ پر بیٹھے ممبر کی طرح بول رہے تھے جس کے مطابق بجٹ میں اتنا پیسہ تھا کہ ملک اس سال کیا، اگلے کئی سالوں میں اس بجٹ کا پیسہ خرچ نہیں کر پائے گا۔ بٹوک چند کا رول اپوزیشن ممبر کا سا تھا جو یہ ثابت کرنے میں لگا تھا کہ اس بجٹ سے تو بس اتنا ہی ہو سکتا ہے کہ سرکار پچھلے قرضے چکادے اور نئے قرضوں کے لیے پھر کٹورا لے کر نکل پڑے۔ کمبھ کا بجٹ بھی کچھ ایسا ہے کہ بس رام رام کرتے کمبھ نکل جائے گا۔

جیسا کہ اس طرح کی طویل بحثوں میں ہوتا ہے، یہاں بھی ہوا کہ دونوں طرف کے لوگوں کو یاد آنے لگا کہ ان کے پاس سب کچھ ہے، پر ایک سب سے قیمتی چیز جسے وقت کہتے ہیں، اس کی کمی ہے۔ دونوں کی اپنی اپنی مجبوریاں تھیں۔ بھائی صاحب کو ان دکھیاروں کی فکر ستا رہی تھی جو صوبے کے دور دراز علاقوں سے آ کر ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے؛ اور چونکہ راجدھانی میں کوئی کام نہیں کرتا، صرف ان کے دربار میں ان کے دکھ درد سنے جاتے ہیں، اس لیے ان کا یہ فرض ہے کہ وہ ان دکھ کے ماروں کا دکھ درد سنیں اور ان کی مدد کریں۔ یہ مدد تبھی ہو سکتی ہے جب بٹوک چند اپنا دکھڑا کچھ مختصر

Scanned with CamScanner

بیان کریں اور جلد ہی اسٹیج سے کوچ کریں۔ بٹوک چند کو بھی وقت کی فکر کم نہیں تھی۔ کمبھ سر پر آ گیا ہے، ابھی تک کچھ ہوا نہیں۔ کملا کانت نام کا ایک ناکارہ شخص صرف سفارش کے بل پر میلہ ڈویژن کا ایگزیکٹو انجینئر بنا بیٹھا ہے اور سب کچھ برباد کرنے پر تلا ہوا ہے۔ ابھی تک جتنا نقصان وہ کر چکا ہے، اس کو سنبھالنے میں بٹوک چند کے چھکے چھوٹ جائیں گے، اسے اور کچھ دن رہنے دیا گیا تو بٹوک چند بھی کیا کر پائیں گے؟ جو کچھ نقصان ہوگا، اس کا ازالہ ناممکن ہو جائے گا۔ اس لیے بٹوک چند کو آج ہی آرڈر مل جانا چاہیے۔ وقت کی کمی کا احساس ہوتے ہی دونوں طرفین میں پھر اس رقم کے بارے میں تبادلۂ خیال ہونے لگا جسے بھائی صاحب پارٹی فنڈ میں جمع کرنے کی بات کر رہے تھے اور جس کی تفصیل بتانے سے پہلے وہ ہر دفعہ یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتے تھے کہ ان کے اور ان کی بیوی کے لیے کسی طرح کی خرد برد کرنا گئوماس کھانے کے برابر ہے۔ وہ تو سی ایم نے پارٹی فنڈ کے لیے کچھ رقم جمع کرنے کا کام سونپ رکھا ہے، اس لیے وہ لوگ دکھی لوگوں سے عقیدت کے مطابق کچھ فیس لے لیتے ہیں؛ پارٹی کا معاملہ نہ ہوتا تو ان کے چھوٹے سے خاندان کے لیے بھگوان نے بہت کچھ دے رکھا ہے۔ بٹوک چند بھی ہر بار بڑی عقیدت کے ساتھ سر ہلا کر یہ واضح کر دیتے تھے کہ انھیں بھائی صاحب کے قول و فعل پر پورا بھروسا ہے۔ پورے صوبے میں ان کی اور بھابھی جی کی ایمانداری کے ڈنکے بج رہے ہیں۔ اب تو عدالتوں میں لوگ ان کی قسمیں کھا کر گواہی دیتے ہیں۔

وقت کی کمی تھی، رقم پارٹی فنڈ کے لیے مانگی جا رہی تھی، باہر بیٹھے دکھیاروں کے سفیروں کے روپ میں کچھ زمینی کارکن آ کر تاک جھانک کر گئے تھے، مگر ان سب کے باوجود کافی جد و جہد کے بعد ہی ایک رقم پر بات ٹھہری۔ بحث میں حصہ لینے والے دونوں فریق دلوں کے بھید جاننے والے نہیں تھے، اگر ہوتے تو بھائی صاحب کو احساس ہو جاتا کہ چہرے پر "ہائے لٹ گئے" کا تاثر لیے، منھ لٹکائے بٹوک چند کا دل اندر اندر خوشی سے اچھل رہا تھا۔ انھوں نے جتنے کا اندازہ لگایا تھا، اس سے کافی کم میں سودا پٹ گیا تھا۔ اسی طرح اگر بٹوک چند بھائی صاحب کے دل کی کتاب پڑھ پاتے تو انھیں بھی محسوس ہوتا کہ وہ خوش تھے۔ وہ اس وقت یہ حساب لگانے میں جٹے تھے کہ ممبئی میں جس فلیٹ کا سودا انھوں نے اپنے سالے کے نام سے کیا ہے، اس کے لیے بقیہ رقم کا انتظام آج صبح کے دکھیاروں سے ہو جائے گا یا نہیں؟ انھیں لگ رہا تھا کہ ہو جائے گا۔

Scanned with CamScanner

رقم طے ہو جانے کے بعد اس کی ادائیگی کی مدت اور جگہ پر تھوڑی دیر تک بحث ہوئی۔ بٹوک چند کی رائے تھی کہ ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کی طرح بھائی صاحب اس رقم کی ایک لمبی مدت کے قرضے کی شکل میں ادائیگی کا موقع دیں۔ بھائی صاحب کی رائے تھی کہ اس طرح کے معاملات میں وہ اپنے باپ پر بھی بھروسا نہیں کر سکتے۔ بٹوک چند کے بار بار یہ کہنے پر کہ وہ ان لوگوں سے الگ تھوڑے ہی ہیں اور اب تو وہ ان کے خاندان کے فرد کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں، بھائی صاحب نے ہر مرتبہ اثبات میں سر ہلایا، لیکن ہر بار یہ بتانے سے نہیں چوکے کہ ادائیگی میں تاخیر طرح طرح کے وسوسوں کو جنم دیتی ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ ان کے اور بٹوک چند کے درمیان، اب جبکہ وہ ان کے خاندان کے ایک فرد بن چکے ہیں، کوئی غلط فہمی پیدا ہو۔ انھوں نے بٹوک چند کو وہ محاورہ سنایا جسے بچپن سے پنساریوں کی دکان پر پڑھتے آئے تھے اور جس کا مطلب تھا کہ ادھار نام کی قینچی محبت نام کی کسی چیز کو کاٹتی ہے۔ بھائی صاحب نہیں چاہتے تھے کہ یہ قینچی ان کے بیچ چلے۔

اتفاق رائے اس بات پر ہوا کہ طے شدہ رقم کا آدھا بٹوک چند ابھی دے دیں، باقی رقم کا آدھا آرڈر کی کاپی ہاتھ میں آنے کے بعد شام تک پہنچا دیں اور باقی آدھا کمبھ کا پہلا ٹینڈر پاس ہوتے ہی دے دیا جائے۔ اس کے لیے بٹوک چند نے پورا اطمینان دلایا کہ پہلے ٹینڈر کا نوٹس چھپتے ہی وہ خود اس رقم کو لے کر راجد ھانی حاضر ہو جائیں گے۔

بھائی صاحب نے پیار سے منع کیا اور اس بات پر مصر رہے کہ بٹوک چند بڑے افسر ہیں اور کمبھ کے میلے میں مصروفیت اور بھی بڑھ جائے گی، اس لیے ان کا یہاں آنا سرکاری کام میں رکاوٹ کے مترادف ہوگا، اس لیے وہ خود نہ آئیں، بلکہ اپنے کسی نمائندے کو اس کام کی ذمے داری سونپ دیں۔

بٹوک چند نے اپنے بریف کیس کو کھول کر روپے گننے شروع کر دیے اور وہ تب تک انھیں گنتے رہے جب تک بھابھی جی واپس نہیں آ گئیں۔ روپے بھائی صاحب کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے انھوں نے رقم کو اس طرح ادا کیا کہ بھابھی جی بھی اسے سن لیں۔

"آپ نشا خاطر رہیں۔ شام تک آرڈر مل جائے گا۔"

بھائی صاحب کے اس جملے کی ضرورت نہیں تھی۔ بٹوک چند کو معلوم تھا کہ بھابھی جی جو آرڈر

چاہیں گی، وہی شام تک ہو جائے گا۔ موجودہ چیف منسٹر جب تک ہیں، تب تک اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی، اسی لیے اپنے اصول کے خلاف آدھی رقم انھوں نے ایڈوانس میں دے دی تھی۔

''تو مجھے اجازت دیں۔'' بٹوک چند نے کھڑے ہو کر آدھا جھکتے ہوئے میاں بیوی کو باری باری نمستے کیا۔

''ارے کیوں دھرم سنکٹ میں ڈالتے ہیں بڑے صاحب... آپ تو ہمارے بزرگ ہیں۔''

بٹوک چند باہر دروازے کی طرف بڑھے۔

''بڑے صاحب، یہ دلال آپ کو کہاں مل گیا؟''

بٹوک چند کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے پیچھے مڑ کر بھابھی جی کی طرف دیکھا۔

''ارے یہی لڑبھیر، شرما... کل بھی تھا... آج بھی آپ کے ساتھ آیا ہے۔''

بٹوک چند ہولے سے ہنسے۔

''آپ کے دربار میں کس کس طرح کی مخلوق پلتی ہے بھابھی جی! کل آیا تو یہ باہر کھڑا تھا۔ میرے ساتھ ساتھ دربار میں گھس آیا۔ آج بھی صبح پہنچا تو گیٹ پر مل گیا۔ لگتا ہے، آپ نے کل مجھے آج صبح آنے کے لیے کہا تو اس نے سن لیا تھا۔''

''اچھا... تبھی... اب آپ ادھر سے نکل جایئے، اسے ہمارے لڑکے دیکھ لیں گے۔''

❊❊

آج کی کتابیں

کہانیاں

آئینۂ حیرت اور دوسری تحریریں	سید رفیق حسین	Rs. 375
عطرِ کافور	نیر مسعود	Rs. 80
زبدا اور دوسری کہانیاں	اسد محمد خان	Rs.180
خطِ مرموز	فہمیدہ ریاض	Rs.100
ایک اور آدمی	حسن منظر	Rs.85
عاقبت کا توشہ	نکہت حسن	Rs.85
دور کی آواز	فیروز مکرجی	Rs.150
صحرا کی شہزادی	سکینہ جلوانہ	Rs.120

کہانیوں کے ترجمے

ایرانی کہانیاں	انتخاب اور ترجمہ: نیر مسعود	Rs.90
عربی کہانیاں	ترتیب: اجمل کمال	Rs.180
ہندی کہانیاں (جلد 1)	ترتیب اجمل کمال	Rs.180
ہندی کہانیاں (جلد 2)	ترتیب: اجمل کمال	Rs.180
کارل اور اینا	(منتخب ترجمے) محمد سلیم الرحمن	Rs.80
گم شدہ خطوط	(منتخب ترجمے) محمد عمر میمن	Rs.90
مہرِ سکوت	(منتخب ترجمے) زینت حسام	Rs.120
کلمنجارو کی برفیں	(منتخب ترجمے) محمد خالد اختر	Rs.120

Scanned with CamScanner

انتخاب

منتخب تحریریں	گابریئل گارسیا مارکیز	ترتیب: اجمل کمال	(زیر طبع)
منتخب تحریریں	نرمل ورما	ترتیب: اجمل کمال	Rs.280
منتخب کہانیاں	ویکوم محمد بشیر	ترتیب: مسعود الحق	Rs.180
پریم وانی	میرا بائی	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395
کبیر بانی	کبیر	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395

ناول

بیس سو گیارہ	محمد خالد اختر	Rs. 70
گنگا جمنی میدان	اختر حامد خاں	Rs.120
دائرہ	محمد عاصم بٹ	Rs.100
نمبردار کا نیلا	سید محمد اشرف	Rs.60

ناولوں کے ترجمے

تمس	بھیشم ساہنی	ترجمہ: شہلا نقوی	Rs.180
قلبِ ظلمات	جوزف کونریڈ	ترجمہ: محمد سلیم الرحمن	Rs.80
بوفِ کور	صادق ہدایت	ترجمہ: اجمل کمال	(زیر طبع)
خیمہ	میرال طحاوی	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.75
نوکر کی قمیض	ونود کمار شکل	ترجمہ: عامر انصاری، اجمل کمال	Rs.100
پہلی بارش	خولیو لیاما زاریس	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.95
سرزمین مصر میں جنگ	یوسف القعید	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.125
درخت نشین	اتالو کلوینو	ترجمہ: راشد مفتی	Rs.175
شہزادہ احتجاب	ہوشنگ گلشیری	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.70
انگلی کے دیس میں	ولاس سارنگ	ترجمہ: گوری پٹوردھن، اجمل کمال	Rs.150
امید اور دوسرے خطرناک مشاغل	لیلیٰ العلمی	ترجمہ: محمد عمر میمن	Rs.100

Scanned with CamScanner

شاعری

پریم وانی	میرابائی	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395
کبیر بانی	کبیر	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395
کلیات اختر الایمان	اختر الایمان	ترتیب: سلطانہ ایمان، بیدار بخت	Rs.350
مٹی کی کان	افضال احمد سید	(کلیات)	Rs.500
روکوکو اور دوسری دنیائیں	افضال احمد سید		Rs.50
آدمی کی زندگی	فہمیدہ ریاض		Rs.70
ساری نظمیں	ذی شان ساحل	(کلیات)	(زیر طبع)
جنگ کے دنوں میں	ذی شان ساحل		Rs.125
ای میل اور دوسری نظمیں	ذی شان ساحل		Rs.150
نیم تاریک محبت	ذی شان ساحل		Rs.100
رات	سعید الدین		Rs.50
سائے چراغ کے	احمد عظیم		Rs.150
مٹی کا مضمون	فرخ یار		Rs.150
سویرے کا سیاہ دودھ	پاؤل سیلان	ترجمہ: آفتاب حسین	Rs.150
بارہ ہندوستانی شاعر	(انتخاب)	ترتیب: اجمل کمال	(زیر طبع)
خودکشی کے موسم	زاہد امروز		Rs.120

Scanned with CamScanner

نیر مسعود کی کتابیں

عطر کافور

(کہانیاں)

قیمت: 80 روپے

ایرانی کہانیاں

(ترجمے)

قیمت: 90 روپے

انیس

(سوانح)

قیمت: 375 روپے

مرثیہ خوانی کا فن

(تنقید و تحقیق)

قیمت: 150 روپے

منتخب مضامین

(تنقید و تحقیق)

قیمت: 280 روپے

کافکا کے افسانے

(افسانے)

قیمت: 70 روپے

معرکۂ انیس و دبیر

(تنقید و تحقیق)

قیمت: 150 روپے

گنجفہ

(کہانیاں)

قیمت: 200 روپے

Scanned with CamScanner

سٹی پریس کی کتابیں یہاں دستیاب ہیں

ویلکم بک پورٹ
اردو بازار
کراچی
فون:32633151

فضلی سنز
ٹیمپل روڈ، اردو بازار
کراچی
فون:32212991

تھامس اینڈ تھامس
نزد صدر جی پی او
کراچی
فون:35682220

سٹی بک پوائنٹ
نزد مقدس مسجد، اردو بازار
کراچی
فون:32732912

فرید پبلشرز
نزد مقدس مسجد
اردو بازار
کراچی

کریمی بک کارپوریشن
نزد چاندنی شاپنگ مال
حیدرآباد کینٹ
فون:780182

خالد بک ڈپو
درانی چوک
خانپور
فون:5577839

کتاب نگر
حسن آرکیڈ
ملتان کینٹ
فون:4510444

سانجھ پبلی کیشنز
دوسری منزل، مفتی بلڈنگ
ٹمپل روڈ، لاہور
فون:042-7355323

کوپرا بک شاپ
70، شاہراہ قائداعظم
لاہور
فون:7321161

بک ہوم
بک اسٹریٹ،
46 مزنگ روڈ، لاہور
فون:7231518

مرزا غالب کتاب مرکز
I-8 دکان نمبر 10
سٹی آرکیڈ پلازہ بیسمینٹ
اسلام آباد

Scanned with CamScanner

خالد طور

مِرچی

(ناولا)

Scanned with CamScanner

اگلے صفحات میں خالد طور کا مختصر ناول یا ناولا مرچی پیش کیا جا رہا ہے۔ آج کے شمارہ 63 میں ان کا پہلا ناول کانی نکاح شائع کیا گیا تھا جس نے پڑھنے والوں کی توجہ اور تحسین حاصل کی۔ مرچی میں بھی اپنے اردگرد کے سماجی اور قدرتی ماحول میں پیوست کرداروں کے گہرے مطالعے کی وہی خصوصیات کارفرما ہیں جو خالد طور کے پہلے ناول میں تھیں۔

ان دونوں تحریروں کی ایک اور اہم مشترک خصوصیت یہ ہے کہ ان میں عام انسانوں اور ان کے مسائل سے، یہاں تک کہ مادی مسائل اور محرومیوں سے، اور انسانوں کا بنایا ہوا جو نظام ان مسائل اور محرومیوں کا باعث ہے اس سے بھی تخلیقی دلچسپی لینے کے سلسلے میں کسی قسم کی جھینپ یا شرمندگی نہیں پائی جاتی۔

آپ کو یاد ہو گا چند دہائیوں پہلے بعض نک چڑھے اور تخلیقی طور پر بنجر نقادوں کے اس فتوے نے کہ صاحب، مفلسی، غلامی، قحط، استحصال وغیرہ سے ادب کا بھلا کیا لینا دینا، یہ تو صحافت کے موضوعات ہیں، اور یہ کہ ادیب کا کام تو دراصل تکنیک اور علامت کے طوطا مینا بنانا ہے، ہمارے بہت سے ادیبوں کو اس قدر سہما دیا تھا کہ وہ آنکھ اٹھا کر اپنے اردگرد کی زندگی کو دیکھنے اور اسے اپنی تحریروں میں آزادی سے برتنے کی صلاحیت، اور شاید خواہش بھی، کھو بیٹھے تھے۔ ہمارے مجموعی ادبی ماحول میں کنفیوژن اور سہمنا کی کی فضا پیدا کرنے میں ان پیشہ ور نقادوں کی کوششیں بلاشبہ رنگ لائیں۔ جب ان کوششوں کے نتیجے میں ہمارے معاشرے میں موجود انسانی زندگی کے حقیقی خدوخال ہمارے ادبی کلچر کی توجہ کا مرکز نہ رہے تو ادب پر جمود طاری ہو جانے کے، بلکہ ادب کے انتقال پر ملال تک کے مبنی بر حماقت اعلانات کیے جانے لگے۔ اب، ان اعلانات کا زور ٹوٹنے اور نقادوں کی ہدایت کاری میں احتیاط سے پروان چڑھائے والے مصنوعی علامتی و تجریدی افسانے کے شجر کے سوکھنے کے بعد، اردو فکشن میں اپنے اردگرد کی حقیقت سے آنکھیں ملانے کی ہمت پھر سے بیدار ہونے لگی ہے۔ مرچی اسی رجحان کی نمائندگی کرنے والی تحریر ہے۔

انسانی معاشرے کی بنیاد جس نظام پر ہے اس کی معاشی حقیقت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی گمبھیر انسانی صورت حال ہمیشہ تخلیقی طور پر زندہ ادیبوں کو اپنی طرف کھینچتی رہی ہے۔ ہمارے معاشرے پر مسلط یہ نظام، ایک ایسے ہی غیر معمولی ادیب ابوالفضل صدیقی کے لفظوں میں، ایک زندگی کو فربہ کرنے کے لیے بہت سی زندگیوں کو لاغر کرنے کے اصول پر قائم ہے۔ ایک اعتبار سے خالد طور کا ناولا مرچی، اپنے مختلف اور منفرد اسلوب میں، اسی نظام کے دوسرے پہلو پر توجہ مرکوز کرتا ہے جس کے ایک پہلو کو موجودہ شمارے کی پہلی تحریر تبادلہ میں موضوع بنایا گیا ہے۔ مرچی کا مرکزی کردار ایک ٹھیکیدار ہے جو اغوا کیے ہوئے یا کسی دوسرے استحصالی ہتھکنڈے سے بھرتی کیے ہوئے نوعمر پٹھان لڑکوں سے کام لیتا ہے۔

Scanned with CamScanner

1

شاید یہ ہر انسان کی فطرت ہوگی کہ جب کوئی خیال ذہن بلونگڑے کی طرح پنجے جمالے تو اس سے چھٹکارا پانا بہت دشوار ہو جاتا ہے۔ مکافاتِ عمل سے متعلق کسی بدھ عالم کی ایک تمثیل مجھے اکثر بلونگڑے کی طرح ذہن سے چمٹی محسوس ہوتی ہے:

> یہ زندگی ایک مدوّر تالاب کی مانند ہے، جس کے مرکز میں اگر عمل کا پتھر پھینکا جائے تو دائرے میں لہر اٹھتی ہے۔ یہ دائرہ پھیلتا ہے، تالاب کے مدوّر کناروں سے ٹکرا کر واپس لوٹتا ہے، سکڑتا ہے، اور پھر دائرے میں اٹھی ہوئی لہر اسی مرکز پر پہنچ جاتی ہے جہاں عمل کا پتھر گرایا گیا تھا۔ اور اے انسان، تیرا وجود، اسی ماسکے پر، ہوتا ہے جہاں تیرے عمل کا پتھر گرا تھا۔

یعنی ہر عمل پلٹ کر عامل تک پہنچتا ہے۔ اس تمثیل میں کوئی کشش ضرور ہے۔ شاید بلونگڑے کی نرم فر جیسی، شاید اس کی نازک سی میاؤں میاؤں جیسی، یا شاید اس کی سرخ، نرم، چکیلی اور گرم زبان جیسی، جس سے وہ سر پر ہاتھ پھیرنے والے کے ہاتھ چاٹتا ہے، لیکن اس کے ناخن، پنجوں کے چمٹے ہوئے ناخن، کراہت آمیز بیزاری پیدا کرنے میں اپنی مثال نہیں رکھتے۔

میں گناہگار نہیں ہوں، پھر بھی اس تمثیل کو جھٹلاتا رہتا ہوں۔ میں نے دانستہ کوئی گناہ نہیں کیا، اس آگہی کے باوجود میں اس تمثیل کی نفی کرتا رہتا ہوں — کبھی کسی دلیل سے، کبھی کسی منطق سے۔

بھلا ایک تالاب میں ایک ہی عمل کا پتھر گرنا تو ممکن نہیں ہے۔ یہاں تو لمحہ لمحہ پتھر گر رہے ہیں، لہریں دائرے بنا رہی ہیں۔ کسی شدید اٹھی ہوئی لہر کی شدت کو، اس کے پلٹنے پر، کوئی لہر کیا متاثر نہیں

کرے گی؟ کیا اس کی شدت کو کم نہیں کرے گی؟ پھر یہ کہ زندگی حادث ہے۔ ہر سمت، ہر لمحے، وجوہ اور نتائج کی آندھیاں چلتی رہتی ہیں — کسی تالاب کی سطح، تند جھونکوں میں اپنی سطح کیسے ہموار رکھ سکتی ہے؟

بلونگڑے کے پنجوں کو ذہن سے نکالنے کی یہ کوشش بھی خود بخود اس ردِ دلیل سے ناکام ہو جاتی ہے کہ زندگی کا مدوّر تالاب ہر عمل کے لیے اپنا الگ وجود رکھتا ہے، اور لمحے قید نہیں کیے جا سکتے۔ ہر انسان کی حادث زندگی اس کے شعور میں، وجوہ اور نتائج دونوں کے وجود سے پہلے، اپنا ساکن وجود رکھتی ہے۔

مجھے یاد ہے، برسوں پہلے پنجاب یونیورسٹی لاہور کے نیو کیمپس میں، نہر کے کنارے، خزاں رسیدہ درخت کے نیچے، کینٹین کی ایک بازو ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھا میں نہر میں تیرتے ہوئے ان درختوں کے ٹہنیوں سے سوکھ کر ٹوٹے ہوئے پتوں کو دیکھ رہا تھا جن کے زرد رنگ نمی سے مٹیالے ہو چکے تھے۔ ایک دوست مجھے بھائی کا خط دے گیا۔ میرے منجھلے بھائی اُن دنوں ضلع اٹک میں پنڈی گھیب کے پاس کھوڑ کی آئل فیلڈ میں فیلڈ انجینئر تھے۔ وہ مجھے باقاعدگی سے خط لکھا کرتے تھے، جن کا میں ہمیشہ بے قاعدگی سے جواب دیا کرتا تھا۔ خط میں سب خیریت کے ساتھ ایک خبر یہ بھی تھی کہ آئل کمپنی کا ٹھیکیدار ضیغم خان جریانِ خون میں مبتلا ہو کر مر گیا ہے۔ اسے معدے کا السر تھا۔ وہ مرنے سے دو دن پہلے خون کی قے آنے پر کمپنی کے ہسپتال میں لایا گیا، پھر اسے راولپنڈی کے کسی بڑے ہسپتال میں منتقل کیا گیا۔ وہ مسلسل دو دن خون اگلتا رہا اور اس طرح خون کی قے کرتے کرتے مر گیا۔

ضیغم خان کا چہرہ تصور میں ابھرا — چوڑا سرخ و سفید چہرہ، چوڑا دہانہ، بڑے بڑے نسواری دانت جن میں سامنے کے دو دانت ٹیڑھے تھے، چھوٹا قد، موٹا جسم۔ اکثر یوں لگتا تھا جیسے اس کا اوپر والا دھڑ نیچے کے دھڑ سے زیادہ لمبا ہے۔ موٹی ناک، عقابی آنکھیں، گھنی بھنویں۔ ہر سمت بہت تیز نگاہوں سے دیکھا کرتا تھا۔ اس کے بال پیچھے سے گول کٹے ہوئے تھے، بالکل ویسے جیسے خٹک ڈانس کرنے والوں کے ہوتے ہیں اور جو رقص کے دوران میں دائیں بائیں ہلتے رہتے ہیں۔ سر پر سفید پٹکا جس میں کبوتر کے پروں جیسا رنگ بھی نمایاں رہتا تھا — جنگلی کبوتر کے پروں جیسا۔ کبھی کبھی وہ

کھڑے شملے کی پگڑی بھی باندھتا تھا۔ گھوڑا مارکہ بوسکی کی شلوار قمیض اور صدری اس کا پسندیدہ لباس تھا۔ کوہاٹی براؤن چپل پہن کر، اپنی چپلوں ہی کے رنگ جیسی، مہندی رنگی مونچھوں کو اکثر مروڑتا رہتا تھا۔ ضیغم خان کی اصل بیماری کثرتِ مے نوشی تھی۔ کمپنی کی کالونی کے مغرب میں، پہاڑ کے نیچے اس کا ڈیرہ تھا۔ احاطے میں بچھی ہوئی چارپائیوں پر اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا ضیغم خان جب شراب پیتا تھا تو خبر چوتھا کلومیٹر دور کالونی کے بازار میں جا پہنچتی تھی۔ مجھے دیکھ کر اکثر شور مچاتا تھا:

''اوصیب (صاحب)... او مڑا!'' اچھی خاصی اردو بولنے کے باوجود وہ نشے میں جب بھی بولتا تھا اس کا لہجہ پشتو ہو جاتا تھا۔ ''اوصیب... او بچہ... ادھر آؤ... ادھر آؤ مڑا... ایک چسکی لگاؤ صیب... پیو— مالم جبہ کا آلوچہ ہے آلوچہ... ولایتی ہے صیب ولایتی...'' ہچکی کھا کر وہ کبھی اپنے ساتھیوں کو، کبھی شراب کو اور کبھی اپنے آپ کو گندی گالیاں دیا کرتا تھا۔ کمپنی کے کلب سے اسے غیر ملکی شراب کی بوتلیں آسانی سے مل جایا کرتی تھیں۔ اکثر میرے دل میں ہوس سی ابھرا کرتی تھی، ایک دو گھونٹ پی لینے کی شدید خواہش پیدا ہوتی تھی۔ مجھے اسکاچ وسکی کا ذائقہ یاد نہیں تھا لیکن بلکسر میں، پیر کوثر شاہ کے ڈیرے میں، میری اس سے آشنائی ہو چکی تھی۔ مجھے ٹھہرنے کی خواہش کا اسیر دیکھ کر ضیغم خان کی آنکھیں چمکا کرتی تھیں۔

''اولک... او مڑا... آ جاؤ! آ جاؤ!''

مجھ پر ماں کا خوف ہر مذہبی اور معاشرتی خوف سے زیادہ تھا۔ دینی خوف کا گنبد تو میں سکول کے زمانے ہی میں توڑ چکا تھا جب پرائمری سکول میں دینیات کے ماسٹر نے میری اس بات پر شدید پٹائی کی تھی کہ میں نے بھری جماعت میں، سب لڑکوں کے سامنے، کھلم کھلا بغاوت کرتے ہوئے یہ کہہ دیا تھا کہ:

''میں دوزخ سے نہیں ڈرتا، مجھے جنت کا لالچ نہیں ہے، کیونکہ خوف اور لالچ دونوں بری چیزیں ہیں۔''

لیکن ماں کا خوف ہمیشہ میرا پیچھا کیا کرتا تھا۔ ان کا چہرہ ہر ایسے لمحے میں میرے سامنے آ جایا کرتا تھا۔ ان کی آنکھوں میں مجھے وہ ممتا بھری شکایت نظر آیا کرتی تھی جس سے میں بہت ڈرتا تھا۔ وہ راسخ العقیدہ مسلمان تھیں اور شراب کو حرام سمجھتی تھیں۔ میں شراب کو ذہنی طور پر غذا کا حصہ سمجھنے کے باوجود،

Scanned with CamScanner

ماں کا چہرہ تصور میں ابھرنے پر ڈر سا جاتا تھا۔ میرے رکتے قدم پھر تیز ہو جاتے تھے۔ ضیغم خان کا کوئی مقامی ساتھی مجھے جاتے دیکھ کر شمالی پنجاب کے مخصوص لہجے میں، دیہاتی لہجے میں طعنے دیا کرتا تھا:

''ہا بھیڈو... ہاڈراکل... ہا بے نصیب...'' (ہا بھیڑ... ہا بزدل ڈرپوک... ہا بے نصیب...)

غصہ تو بہت آتا تھا لیکن ماں کا خوف مجھے شیر، دلیر اور بانصیب ہونے سے روک دیا کرتا تھا۔

ضیغم خان کا میرے بھائی سے گہرا رابطہ تھا۔ بھائی انجینئر اور وہ ٹھیکے دار۔ کھوڑ کی آئل فیلڈ سے راولپنڈی میں مورگاہ آئل ریفائنری تک جانے والی پائپ لائن کے ساتھ ساتھ پتھریلی اور کچی سڑک کو قابلِ استعمال رکھنے کا ٹھیکہ ہر سال ضیغم خان ہی کو ملتا تھا۔ پائپ لائن کے انچارج میرے بھائی تھے۔ وہ ہر روز پائپ لائن کے معائنے کے لیے جایا کرتے تھے۔ چھٹیوں میں اکثر میں بھی ان کے ساتھ سیر سپاٹے کے لیے نکل پڑتا تھا۔ کھوڑ سے احمدال، احمدال سے نتھیاں، نتھیاں سے سرلا اور سرلے سے گلی جاگیر تک ڈیزل انجن والی بکس کار پکی سڑک پر اڑتی ہوئی جایا کرتی تھی۔ گلی جاگیر سے چکری روڈ تک سڑک پتھریلی اور کچی تھی۔ اسی سڑک پر تناز عہ ڈیم بنا ہوا ہے۔ گلی جاگیر سے تناز عہ ڈیم تک سڑک پتھریلی ہے۔ اس سڑک پر آتے ہی بکس کار ہچکیاں لینا شروع کر دیتی تھی۔ انجن کو نشہ سا ہو جاتا تھا۔ وہ اکثر نعرہ زنی بھی کیا کرتا تھا، ان پٹھان لڑکوں کی طرح جنھیں ضیغم خان صوبہ سرحد سے لایا کرتا تھا اور جو دن بھر کدالیں، بیلچے اور ہتھوڑے اٹھائے سڑک کی مرمت میں مصروف رہتے تھے۔ مجھے اکثر شک گزرتا تھا کہ ضیغم خان خرکار ہے۔ اسے بھی نہ جانے کیسے میرے اس شک کا پتا چل گیا تھا۔ ایک دن بقائمی ہوش وحواس وہ درست اردو میں بولا:

''صاحب، میں بے ایمان نہیں ہوں!'' اس نے نسواری دانتوں میں آئے ہوئے لعاب دہن کو پیچھے کھینچتے ہوئے، نگلتے ہوئے کہا، ''ان سب کو باقاعدہ مزدوری دیتا ہوں۔ مزدوری میں پیچھے ان کے ماں باپ کو بھجوا دیتا ہوں۔ یہاں انھیں روٹی کپڑا دیتا ہوں۔ یہ اُدھر، سرحد میں بے کار پھرتے تھے، گولی پلے کھیلتے تھے، اخروٹ بازی کرتے تھے۔ میں نے انھیں کام پر لگایا ہے— میں نے!'' اس کا ہاتھ سینے پر جا ٹھہرا۔

شدید گرمی کے دنوں میں سڑک کی مرمت میں مصروف، کبھی گدلوں پر پتھر اور مٹی لاد کر انھیں

ہانکتے، خالی گڑھوں کو بھرتے، سڑک کو ہموار کرتے ہوئے مزدور لڑکوں کے رنگ سنولا چکے تھے۔ ضیغم خان سرحد کے دیہات سے لائے ہوئے ان لڑکوں کو روزی فراہم کرنے کو خدمتِ خلق سمجھتا تھا۔ ان لڑکوں میں زیادہ سے زیادہ عمر والا شاید اٹھارہ برس کا ہوگا۔ ان میں دس دس بارہ بارہ برس کے لڑکے بھی تھے۔ جہاں سڑک مرمت کرنا ہوتی تھی، وہاں لڑکوں کا کیمپ بن جاتا تھا، خیمہ بستی بس جاتی تھی۔ شام کے وقت ڈوبتے سورج کی کرنوں میں، ترچھی کرنوں میں، ہر خیمے کے باہر بیلچے، کدالیں اور دوسرے سیاہی مائل مٹی بھرے اوزار بکھرے نظر آتے تھے۔ ہر خیمے کے باہر ایک دو کلے (کھونٹے) لگے ہوئے تھے۔ اور ہر کلے پر ایک گدھا بندھا نظر آتا تھا جو دم کو دائیں بائیں جھلاتے ہوئے اپنے کلے پر کولھو کے بیل کی طرح گھومتا رہتا تھا۔ رسی کے بل کھا جانے پر جب اسے اپنا منھ کلے کی لکڑی سے ٹکراتا محسوس ہوتا تھا تو وہ رخ بدل کر گھومنے لگتا تھا، دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں۔ دائرے میں گھومتا ہر گدھا اپنی لید کو مسلسل کچلتا رہتا تھا۔ ہر کلے پر دائرے میں ایک گول فرش سا بن گیا تھا جس پر کالے چیونٹے اور لید کو گیند بنا کر لڑھکانے والے کالے بھورے حشرات الارض چمٹے رہتے تھے۔ کیمپ میں ایک مخصوص تعفن پھیلا رہتا تھا۔

''یہ ٹیٹنس کے مریض ہو جائیں گے،'' میں نے ایک بار بھائی سے کہا۔ ''یہ اکثر زخمی ہوتے رہتے ہیں۔ انھیں اینٹی ٹیٹنس انجکشن لگوانے چاہییں۔''

ہمیشہ سنجیدہ رہنے والے بھائی کی آواز میں کبھی کبھی بہت خوشگواری سی آ جاتی تھی۔ ''انجکشن؟'' انھوں نے ہنستے ہوئے کہا، ''ضیغم خان سے بات کرو۔''

میں نے واقعی ضیغم خان سے بات کی۔ اس نے زوردار قہقہہ لگایا، ''او صاحب... او صاحب... یہ تو خود جراثیم ہیں۔ انھیں کچھ نہیں ہوگا۔'' وہ مسلسل ہنسے جا رہا تھا۔

میری نگاہیں شور مچاتے، پشتو میں گالیاں دیتے، نعرے لگاتے پٹھان لڑکوں کی طرف اٹھ گئیں۔ پھر ایک نہایت کراہت انگیز تصور ابھرا، جیسے کسی زخم میں، سڑے ہوئے ناسور میں، پیپ کی دلدل بن گئی ہو۔

''پیپ میں تیرتے ہوئے وائرس اسی طرح شور مچاتے ہوں گے، نعرے لگاتے ہوں گے۔ ڈی این اے کی طرح۔ ان کا بھی ایک آقا ہوگا۔ وہ آقا ٹھیکیداری کرتا ہوگا۔ اور اس کے قریب ہی

Scanned with CamScanner

کالج میں پڑھنے والا ایک—"

اپنے وجود سے کراہت کا یہ انوکھا اور بیزار کن احساس مجھے اکثر کیمپ کے قریب محسوس ہوا کرتا تھا۔

2

ان دنوں میں گورنمنٹ کالج ساہیوال میں گریجویشن کر رہا تھا۔ گرمیوں کی چھٹیاں میں ہمیشہ کھوڑ میں گزارتا تھا۔ ہمیشہ کی طرح جب میں کھوڑ گیا تو بھابھی کے منع کرنے کے باوجود، شدید دھوپ میں پائپ لائن پر جانا میرے معمول میں شامل تھا۔ ان دنوں خیمہ بستی تنازعہ ڈیم کے پاس آباد تھی۔

نہ جانے مجھے کیا سوجھی، کیوں سوجھی، میں نے ایک بار شام کے وقت تنازعہ ڈیم سے کمپنی کی کالونی میں واپس جانے سے انکار کر دیا۔ میری ضد تھی کہ میں ایک رات پٹھان لڑکوں کے ساتھ کیمپ میں گزارنا چاہتا ہوں۔ بھائی نے مجھے سنجیدگی سے منع کیا۔ ان کا خیال تھا کہ میں اگر ایک رات بھی کیمپ میں رہا تو میرے بیمار ہونے میں کوئی شک وشبے کی گنجائش نہیں رہے گی۔ خود ضیغم خان نے میرے ارادے کو آنکھیں پھاڑ کر سنا۔ میری ضد قائم تھی۔ بھائی نے یہ فیصلہ دیا کہ اگر مجھے رات گزارنا ہی ہے تو اس کے لیے تنازعہ ڈیم کے ریسٹ ہاؤس کا لان بہتر رہے گا، جہاں کمپنی کے ایک قلی محمد خان نے قریبی پمپ اسٹیشن کی چوکیداری کے لیے خیمہ لگا رکھا تھا۔ ریسٹ ہاؤس کے قریب ہی پکی سڑک پر پائپ لائن کے اوپر پمپ اسٹیشن بنا ہوا ہے—صرف ایک کمرے کا پمپ اسٹیشن، جہاں ڈیزل انجن کی مدد سے خام تیل کو آگے کی سمت پمپ کیا جاتا ہے۔ خام تیل میال، ڈھلیاں اور کھوڑ کے کنوؤں سے اسی طرح پمپ اسٹیشنوں کی مدد سے مورگاہ ریفائنری تک پہنچایا جاتا ہے۔ پمپ اسٹیشن پر ہمیشہ تالا پڑا رہتا ہے۔ ہفتے میں شاید ایک یا دو بار کروڈ آئل کو پمپ کیا جاتا تھا۔

ریسٹ ہاؤس کا لان بہت خوبصورت تھا۔ جولائی کے شدید جھلستے دنوں میں گرمی کے باوجود ڈیم کی فضا خوشگوار تھی۔ ہوا میں جنگلی درختوں اور پودوں کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ جھیل کے خوبصورت پس منظر میں چاندنی رات گزارنے کا تصور مجھے اس قدر دلکش محسوس ہوا کہ میں نے فوراً بھائی کا فیصلہ مان لیا۔ چاند کی شاید بارھویں تھی۔ ہم ریسٹ ہاؤس پہنچے تو شدید گرمی میں دن گزارنے کے بعد شام

Scanned with CamScanner

سے پہلے کی فضا کا احساس پرندوں کی اڑان سے ہوا۔ دن بھر بہنے والے پسینے سے گیلے کپڑے بدن پر سوکھتے محسوس ہو رہے تھے۔ جھیل کے لان میں دھیمی دھیمی ہوا کے جھونکوں میں خنکی کا احساس بہت مدھم تھا۔ دن بھر کی تپش کم ہو رہی تھی، لیکن جھیل کے جنوب میں محکمۂ جنگلات کے لگائے ہوئے زیتون کے مصنوعی جنگل کی طرف سے آنے والے دھیمے دھیمے جھونکوں میں حبس سا تھا جس میں زیتون کے درختوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔

محمد خان پچھلے دو برسوں سے پمپ اسٹیشن کی چوکیداری کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر رامائن میں ہنومان جی کے وجود پر یقین سا آنے لگتا تھا۔ میرے بڑے بھائی، جو وٹرنری ڈاکٹر ہیں، محمد خان کو دیکھ کر اکثر جاوامین کا ذکر کرنے لگتے تھے، اور زولوجی کی لیکچرر بہن کو ڈارون کی اوریجن آف اسپیشیز یاد آنے لگتی تھی۔ ریسٹ ہاؤس کے لان میں لگے خاکی رنگ کے خیمے میں محمد خان نے چھوٹا سا گھر بنا رکھا تھا جس میں ایک سمت لوہے کی چارپائی بچھی ہوئی تھی جس پر میلا سا بستر بچھا ہوا تھا۔ تکیے پر تیل اور گرد نے عجیب میل سی جما دی تھی۔ ایک سمت لوہے کا ٹرنک اور اس کے قریب چھوٹا سا اسٹول دھرا تھا۔ ٹرنک پر آئینہ، کنگھی، سرسوں کا تیل، صابن اور دانتوں کا منجن پڑا تھا۔ منجن کے قریب پھلاہی کی چبائی ہوئی مسواک بھی پڑی رہتی تھی۔ خیمے کے آر پار ایک رسی بندھی ہوئی تھی جس پر محمد خان کے کپڑے اور ایک گندا سا تولیہ لٹکا ہوا تھا۔ رسی کے انتہائی کنارے پر ایک لالٹین لٹکی ہوئی تھی۔ اس لالٹین کے نیچے گیس کا اسٹوو، لان کی گھاس پر بچھی ہوئی خیمے کے سائز کی خاکی رنگ کی دری پر، ایک لکڑی کے تختے پر پڑا ہوا تھا۔ تانبے یا پیتل کے اس اسٹوو کے قریب دو اینٹوں پر ایک اور لکڑی کا تختہ دھرا تھا جس پر پلاسٹک کے ڈبوں میں چاول، دالیں، چینی، چائے کی پتی، خشک دودھ اور گرم مسالے پڑے تھے۔ نمک، ہلدی، مرچ اور پسے ہوئے دھنیے کے چھوٹے چھوٹے ڈبوں کے قریب ہی ایک اینٹ پر بوری پڑی تھی جس پر آٹے کے سفید سفید دھبے سے بنے ہوئے تھے۔ میں اکثر جنگل میں آوارہ گردی کے بعد محمد خان کے خیمے میں تھک کر لیٹ جایا کرتا تھا۔

ریسٹ ہاؤس کے لان میں محمد خان گوریلے کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا گہرا سانولا رنگ شدید دھوپ میں جھلس کر مکمل سیاہ ہو چکا تھا۔ محمد خان کی آنکھیں گوریلے کی طرح گول تھیں۔ بال قدرے گھنگھریالے تھے، ناک موٹی اور نتھنے چوڑے، جوڑا دہانہ۔ مسکراتا تھا تو ہونٹ چر کر کانوں کی

Scanned with CamScanner

لوؤں تک جا پہنچتے تھے۔ ہمیں لان کی سمت جاتا دیکھ کر پائپ لائن پر کام کرنے والے تین قلی، ابراہیم، مہدی اور فتح خان میٹنا بھی لان میں آ گئے۔ فتح خان اس قدر پھرتیلا تھا کہ وہ دوڑ کر پہاڑیوں پر چڑھ جایا کرتا تھا۔ اسے سب میٹنا (Teetna) کہتے تھے۔ اس لفظ کا کیا مطلب ہے، مجھے کبھی معلوم نہ ہو سکا۔ اسی طرح بھائی جان کے ڈرائیور غلام حسین کو سب کھٹر (Khattar) کہتے تھے۔ یہ لفظ بھی میرے لیے انوکھا تھا۔ محمد خان کو جب پتا چلا کہ میں رات اس کے ساتھ گزاروں گا تو بہت خوش ہوا۔

''چلو ہک راتیں ای سہی، ہک توں دو تے ہوساں!'' (چلو ایک رات ہی سہی، ایک سے دو تو ہوں گے۔) وہ خوشی سے بولا۔ ''مینڈا تے بگھیاڑاں ساہ کچھی گدا ائے۔'' (میرا تو بھیڑیوں نے سانس کھینچ رکھا ہے۔)

تنازعہ جھیل اس علاقے میں پانی کا واحد ذخیرہ ہے اور شام ہوتے ہی کالے چٹے پہاڑ کی ڈھلوانوں پر اُگی پھلاہیوں اور کریروں کے نیچے بنی غاروں سے یقیناً درندے باہر نکلتے ہوں گے اور وہ سب پانی پینے جھیل ہی پر آتے ہوں گے۔ محکمۂ جنگلات نے زیتون کے درخت لگانے کا جو تجربہ اس علاقے میں کیا ہے، بے حد کامیاب رہا ہے۔ کھیری مورت کے پہاڑی سلسلے کالے چٹے پہاڑ کے دامن سے تنازعہ جھیل تک ایک گھنا جنگل نمودار ہو گیا ہے۔ زیتون کے درختوں پر میں نے سیاہ زیتون کے پھل دیکھے تھے۔ لیکن یہ زیتون کہاں جاتا ہے، کچھ پتا نہیں چلتا۔ کھیری مورت کی ڈھلوانوں سے تنازعہ ڈیم تک گھنے جنگل میں جنگلی جانور ہر رات یقیناً جہد للبقا کا ازلی کھیل کھیلتے ہوں گے اور ان کی آوازیں محمد خان کے خیمے تک ضرور پہنچتی ہوں گی — ہولناک آوازیں۔

''محمد خانا!'' ہونٹوں سے باہر نکلتے ہوئے دانتوں والے لمبے قد کے ابراہیم نے آتے ہی کہا۔ ''جے راتیں بگھیاڑ پے ونجن، کے کریسیں؟'' (اگر رات کو بھیڑیے حملہ کر دیں، کیا کرو گے؟)

محمد خان نے گول گول آنکھوں سے ابراہیم کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایسا تاثر ابھرا جیسے اسے جواب نہ سوجھ رہا ہو۔ پورے چہرے پر اضطرابی کیفیت نمایاں تھی۔ اس کی پلکیں بار بار اوپر نیچے جھٹکے سے کھا رہی تھیں۔

''جے ہک آیا، جھم گھیساں!'' (اگر ایک آیا، مار گراؤں گا۔) محمد خان نے فیصلہ کن لہجے میں

کہا۔ ''جے دو آئے، تو شت کریساں۔ (اگر دو آئے تو کوشش کروں گا۔) جے ترے آئے تے...'' (اگر تین آئے تو...) محمد خان کا لہجہ اس سپاہی جیسا ہو گیا جسے اپنی شہادت کا یقین ہو گیا ہو، ''جے ترے آئے... وت مجبوری...'' (اگر تین آئے تو مجبوری ہے۔)

محمد خان کے اس جملے کے ساتھ ہی قہقہے گونجے، ماحول چہک سا گیا۔

3

گرمیوں کی حبس زدہ شام کے سائے پھیل رہے تھے۔ بھائی اپنے عملے کے ساتھ واپس کھوڑ چلے گئے۔ ضیغم خان زیادہ مصروفیت کے دنوں میں تنازعہ ڈیم سے پانچ کلومیٹر دور گلی جاگیر میں اپنے چھوٹے ڈیرے پر رہا کرتا تھا جو اس نے اسی مقصد کے لیے بنا رکھا تھا۔ ضیغم خان بھی جیپ پر گلی جاگیر چلا گیا۔ میں کچھ دیر خیمے کے باہر گھاس پر بیٹھا محمد خان سے باتیں کرتا رہا۔

''دو سال ہو گئے ہیں صاحب،'' محمد خان نے کہا،''یہاں قید با مشقت کاٹ رہا ہوں۔''

مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ محمد خان کھوڑ گاؤں کے قریب کسی چھوٹے سے قصبے کا رہنے والا تھا، شاید دروال کا۔ دو سال سے وہ یہ سخت ترین ڈیوٹی دے رہا تھا، اکیلا، بغیر کسی شکایت کے—دو برسوں میں شاید پہلی بار اس کے ہونٹوں پر شکایت آئی تھی۔

''محمد خان شاید جھیل سے، جھیل میں موجود جل مرغوں سے، جھیل کے کناروں پر پانی میں کھڑے بگلوں سے، اڑتے اور زیتونوں کی ٹہنیوں میں شور مچاتے پرندوں سے باتیں کرتا ہو گا،'' میں نے مسکراتے ہوئے سوچا۔ پھر میں اٹھ کر جھیل کی سمت چلا گیا۔ جھیل کے مشرقی کنارے پر سرکنڈوں کا گھنا جنگل سا نظر آتا ہے۔ مغرب کی سمت ریسٹ ہاؤس کے لان کو جھیل سے ایک پتھریلی دیوار الگ کرتی ہے۔ دو تین فٹ اونچی دیوار کے نیچے ڈھلوان میں چنے ہوئے پتھر جھیل کے پانی میں ڈوبتے چلے جاتے ہیں۔

''نہ جانے اس کا نام تنازعہ ڈیم کیوں ہے؟'' میں پتھریلی دیوار کے قریب پہنچ گیا۔ ''شاید کوئی جھگڑا کھڑا ہو گیا ہو گا،'' میں نے اندازہ لگایا۔ ''مقامی آبادی اور محکمہ جنگلات کے درمیان شاید جھگڑا ہوا ہو گا۔ یا شاید یہ علاقہ ہی تنازعہ کہلاتا ہو گا، کیونکہ اس نام کا کوئی گاؤں تو علاقے میں موجود نہیں ہے۔''

Scanned with CamScanner

تنازعہ ڈیم کی جھیل بہت چھوٹی سی ہے۔ گہرائی تیس فٹ تک ہوگی۔ جھیل کے جنوب میں کھیری مورت کے پہاڑی سلسلے سے آنے والے برساتی نالے اس جھیل میں گرتے ہیں۔ شمال کی جانب پتھروں کا مضبوط ڈیم ہے جس کی دراڑوں سے پانی رستا رہتا ہے۔ شاید یہ ڈیم کو بچانے کی کوئی تکنیک ہوگی۔ ڈیم کے نیچے شمال میں میدانی علاقہ ہے جہاں چھوٹے چھوٹے کھیت ہیں جو فتح جنگ تحصیل تک چلے جاتے ہیں۔ اس میدان میں بہت چھوٹے چھوٹے گاؤں ہیں اور مقامی کسانوں کی ڈھوکیں بھی نظر آتی ہیں — بکھری بکھری، دور دور — جہاں ہر شام تنوروں کا دھواں لکیریں سی بناتا ہوا اوپر اٹھتا ہے اور ہوا کے رخ کا احساس دلانے لگتا ہے۔ جھیل کے شمال مشرق میں ایک پہاڑی ہے جس کے دامن سے جھیل کا پانی ٹکراتا رہتا ہے۔ یہ پہاڑی جھیل کے لیے فطری دیوار کا کام کرتی ہے۔ اس پہاڑی کی چوٹی پر جانے کے لیے پتھروں کی سیڑھیاں بنائی گئی ہیں۔ چوٹی پر ایک کھلے جھروکے جیسا چبوترہ بنایا گیا ہے جس پر کنکریٹ کی گول چھت چار ستونوں پر شامیانہ سا بناتی ہے، اور چاروں ستون چاروں جانب کھلے دروازوں کا منظر بناتے نظر آتے ہیں۔ چبوترے میں پتھروں کو تراش کر ہموار فرش بنایا گیا ہے اور بیٹھنے کے لیے گول اسٹول سے بنے ہوئے ہیں۔ یہاں سے ڈیم کے چاروں طرف کے مناظر صاف دکھائی دیتے ہیں۔ دور دور تک ہر شے صاف نظر آتی ہے۔

جھیل کے جنوب مغرب میں دو تین سو گز دور محکمۂ حیوانات کا شیپ فارم ہے، جہاں آسٹریلیا سے منگوائی بھیڑوں کی افزائش کا تجربہ کرنے کا خیال نہ جانے کس خوش فہم کے ذہن میں آیا تھا۔ چاروں جانب فطری چراگاہیں تو موجود ہیں، لیکن یہاں لائی گئی بھیڑیں، بکس کاروں میں لد کر اسلام آباد میں سیاست دانوں، بیوروکریٹس اور راولپنڈی میں فوجی جرنیلوں کے گھروں میں پہنچتی رہیں۔ خصوصاً بڑی عید (عیدِ قرباں) پر تو یہ سلسلہ بہت بڑھ گیا۔ محمد خان نے بتایا تھا کہ یہاں بھیڑوں کے پانچ سو جوڑے لائے گئے تھے، لیکن اب بیس پچیس جوڑے باقی رہ گئے ہیں۔ فارم کا انچارج ڈاکٹر اور عملہ خاموشی سے یہ تماشا دیکھتا ہے، احکام کی تعمیل کرتا ہے اور جب بھیڑیں لد کر اسلام آباد چلی جاتی ہیں تو گندی گالیاں دے کر رجسٹروں میں اندراج کرتا رہتا ہے کہ اتنی بھیڑوں کو سانپوں نے ڈس لیا، اتنی بھیڑیں بیماری سے مر گئیں اور اتنی بھیڑوں کو بھیڑیے کھا گئے۔ بڑے افسران کی دیکھا دیکھی اب فارم ہاؤس کے عملے نے بھی بھیڑوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا ہے۔

Scanned with CamScanner

''اگر محکمۂ زراعت کسی زمیندار کو یہ فارم ہاؤس کانٹریکٹ پر دے دیتا،'' میں نے سوچا، ''تو ایک بھیڑ بھی یہاں سے نہ جاتی۔ لیکن شاید محکمۂ زراعت کے افسران کا مقصد ہی بھیڑیں منگوا کر ضیافتیں اڑانے کا تھا۔''

اس فارم ہاؤس سے مغرب کی سمت جائیں تو پتھریلی چٹانوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو کہیں بے حد نوکیلی ہیں، کہیں افقی انداز میں بڑے بڑے پتھریلے تودوں کی صورت میں نمایاں ہیں۔ اس پتھریلے سلسلے میں سے چھوٹی سی پتھریلی سڑک بل کھاتی ہوئی گلی جاگیر تک چلی جاتی ہے۔ جھیل کے مغرب میں محکمۂ جنگلات کا ریسٹ ہاؤس ہے، جو ہمیشہ بند رہتا ہے؛ چابی نہ جانے کس کے پاس رہتی ہے۔ پہاڑی کے چبوترے سے مشرق کی سمت دیکھنے پر سرکنڈوں کا جنگل دور تک پھیلا نظر آتا ہے۔ جھیل کا پانی اس جنگل میں دلدلی علاقے کا منظر پیش کرتا ہے۔ ہوا کے دھیمے دھیمے جھونکوں سے اٹھنے والی لہریں جھیل کی سطح پر چمکتی ہوئی ان سرکنڈوں میں روپوش ہو جاتی ہیں۔ سرکنڈوں کے جنوب مشرق میں گہرے سبز رنگ کی کائی ہے جس میں چوڑے چوڑے گہرے سبز رنگ ہی کے پتے پانی میں یوں تیرتے رہتے ہیں جیسے چھوٹے چھوٹے سے ٹاپو ہوں۔ ان پتوں کے درمیان کائی میں گہرے سبزی مائل سیاہ رنگے جل مرغے ڈبکیاں لگاتے رہتے ہیں۔ ان جل مرغوں کو مقامی لوگ ''جل ککڑ'' کہتے ہیں۔ جنوب کی سمت زیتون کا مصنوعی جنگل ہے۔ چبوترہ نما جھروکے سے زیتون کے جنگل کے اس پار دور تک بکھری مورت کے پہاڑی سلسلے کا لے چٹے کا دامن نظر آتا ہے، جہاں پتھریلی ڈھلوانوں پر پھلاہیوں اور کریروں کے فطری جنگل ابھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ زیتون کے مصنوعی جنگل کا سلسلہ کالے چٹے پہاڑ کی ڈھلوانوں میں پھلاہیوں، کریروں اور جنگلی بیروں کی جھاڑیوں میں مدغم سا ہو جاتا ہے، اور پھر نمایاں ہو کر شمال کی سمت آتے آتے متنازعہ جھیل سے آملتا ہے۔ جھیل کے جنوبی کنارے پر، زیتون کے جنگل تک، چالیس پچاس فٹ کا کھلا سا قطعہ ہے۔ اس کھلی جگہ سے آگے درختوں میں گلیوں کی طرح راستے بنے ہوئے ہیں۔ یہ راستے جنگلی جانوروں کی گزرگاہیں ہیں۔

میں سیڑھیاں چڑھتے ہوئے جھروکے نما چبوترے پر جا بیٹھا۔ سیر سپاٹے کے دوران میں جب بھائی پائپ لائن پر مصروف ہو جاتے تھے، میں اسی چبوترے پر وقت گزارا کرتا تھا۔ لیکن اس

بار میرے احساس کی نوعیت مختلف تھی۔ بھائی کھوڑ جا چکے تھے۔ شام گہری ہو رہی تھی۔ محمد خان اپنے خیمے میں شاید لالٹین جلانے کی تیاری کر رہا تھا۔ مغربی افق پر شفق کی لالی دھندلا سی گئی تھی۔ آسمان پر روشنی مکمل طور پر معدوم نہیں ہوئی تھی۔ جھیل کی سطح پر دھیمی دھیمی نہروں کا تموّج نمایاں تھا۔ ہوا کے جھونکے بہت دھیمے دھیمے سے تھے۔ جھیل کے مشرقی کنارے کے اتھلے پانی میں سفید بگلوں کے سر سرمئی، اور چونچیں، سرخ چونچیں، سیاہ سی ہوتی جا رہی تھیں۔

بے اختیار میرا دایاں ہاتھ گردن پر جا پڑا۔ اس کے ساتھ ہی مچھروں کی بھنبھناہٹ سنائی دی۔ مچھروں کو سیاہ رنگ سے شاید عشق ہے۔ میرے سر کے سیاہ بالوں پر وہ جھنڈ سا بنا کر اڑ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ رقص کر رہے ہوں۔ یہ رقص پہلے بھی کئی بار دیکھ چکا ہوں، خصوصاً بھینسوں پر مچھروں کے جھنڈ دیکھ کر ان کے کالے رنگ سے عشق سے متعلق کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔

''بے چارے محمد خان کو مچھر کا یہ عشق بہت مہنگا پڑتا ہوگا،'' میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ مچھروں کو سیاہ رنگ سے کیوں دلچسپی ہے؟ اس کی توجیہہ تو کوئی ماہرِ حشرات الارض ہی کر سکتا ہے۔ شاید کالے رنگ کو مچھر جما ہوا خون سمجھتے ہوں گے۔ مجھے تو گردن پر جلن کا احساس جیسے مجبور کر رہا تھا کہ میں ریسٹ ہاؤس کے لان میں محمد خان کے خیمے میں چلا جاؤں۔ ''خیمے میں تو بہت گرمی ہوگی،'' میں نے فضا میں حبس محسوس کرتے ہوئے سوچا۔ مچھروں کے ساتھ رات گزارنا ایک ایڈونچر لگ رہا تھا۔ میرے تصور میں کیمپ کے پٹھان لڑکے ابھرے جو ہر رات مچھروں کو اپنے خون کا نذرانہ پیش کرتے ہوں گے۔ پھر میرے تصور میں گدھوں نے سر اٹھایا۔

''شاید وہ...'' میں نے سوچا، ''شاید وہ مچھروں سے بچنے کے لیے، انھیں اڑانے کے لیے اپنی دمیں جھلاتے رہتے ہیں۔'' مجھے ہنسی سی آ گئی۔ گدھوں کا خیال آتے ہی مجھے ان کا کلّے پر مسلسل گھومتے رہنا یاد آیا اور انھی کی لید میں چھپے ٹیٹنس کے وائرسوں سے مجھے میرے انجینئر بھائی بچانا چاہتے ہیں۔ میرے بڑے بھائی جو وٹرنری ڈاکٹر ہیں، انھوں نے بھی ایک بار ضلع سرگودھا کے ایک چھوٹے سے قصبے جھاوریاں میں، وٹرنری ہسپتال میں موجود گھوڑوں کے طویلے میں جانے سے منع کیا تھا۔ انھیں بھی ڈر تھا کہ مجھے ٹیٹنس کے وائرس چمٹ جائیں گے۔ انھیں یہ خوف تھا کہ بیمار ہو کر میری گردن گینڈے کی طرح اکڑ نہ جائے۔

Scanned with CamScanner

''یہ پٹھان لڑکے بھی تو کسی کے بھائی ہوں گے...'' میں چبوترے سے اٹھا۔ ''گردنیں ان کی ابھی اکڑ سکتی ہیں۔ ان کو وائرسوں سے بچانے کی فکر کسی کو نہیں۔ میرے بھائی اس لیے خوفزدہ ہیں کہ میں ان کے اعلیٰ نسلی خاندان کا فرد ہوں۔ یہ پٹھان لڑکے یقیناً کسی اعلیٰ خاندان سے تعلق نہیں رکھتے...''

میں آہستہ آہستہ سیڑھیاں اتر رہا تھا۔

''خاندان اعلیٰ کیسے ہو جاتے ہیں؟ دولت سے، زمینوں سے، خوبصورت عورتوں سے، اونچے شملوں والی پگڑیوں سے، وجیہہ مردوں سے، اونچے اونچے محلوں سے، بڑی بڑی حویلیوں سے، کسی ہوئی پگڑیوں سے، ترچھی پگوں سے، کلف لگے پٹکوں سے اور نخوت سے اکڑی ہوئی گردنوں سے... پھر مجھے میرے بھائی گردن اکڑ جانے سے کیوں بچانا چاہتے ہیں؟''

4

پتا بھی نہ چلا میں کب سیڑھیوں سے اترا، کب محمد خان کے خیمے کے پاس سے گزرا، کب میرے قدم پٹھان لڑکوں کے کیمپ کی طرف اٹھے اور میں ان کے خیموں میں جا پہنچا۔

شام اب رات میں بدل رہی تھی۔ ہر خیمے میں لالٹین جل رہی تھی۔ ایک سمت الاؤ سا بھڑکا ہوا تھا۔ شاید تنور جلایا جا رہا تھا یا تنور میں روٹیاں لگاتے ہوئے، تنور کی دیواروں کو سرخ رکھنے کے لیے لکڑیاں ڈالی گئی تھیں۔ میرے کانوں میں ٹھک ٹھک کی غیر ہموار آوازیں آنا شروع ہو گئیں، جیسے کونڈیوں میں کوئی چیز پیسی جا رہی ہو۔ خیموں کے سامنے کلوں پر بندھے گدھے اب سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ شاید مسلسل چکر کھا کھا کر سکت کھو چکے تھے، یا پھر سونے کی کوشش کر رہے تھے۔ وقفے وقفے سے ان کی دمیں دائیں بائیں جھولتی تھیں۔ مجھے ایک بار پھر مچھروں کا احساس ہوا جو کثرت سے سروں کے اوپر اڑ رہے تھے۔ گدھے اس قدر ساکت تھے جیسے مجسمے ہوں۔ اگر ان کی دمیں بھی نہ ہلتیں تو وہ پتھر کے تراشے ہوئے مجسمے ہی لگتے۔

''یہ رسے تڑوا کر، دانتوں سے چبا کر بھاگ کیوں نہیں جاتے؟'' میں نے سوچا۔ مجھے بچپن میں پڑھی ہوئی منشی پریم چند کی کہانی ''دو بیل'' یاد آئی، تصور میں دونوں بیل، ہیرا اور موتی، کانجی ہاؤس

سے بھاگتے نظر آئے۔ ''گدھے گدھے ہی ہوتے ہیں...'' میں نے تلخی سے سوچا اور تنور کی سمت چل دیا۔

تنور کے قریب ایک کھلی جگہ پر پٹھان لڑکے نظر آئے۔ وہ شور مچا رہے تھے۔ کچھ کونڈیوں میں مسلسل کوئی شے کوٹ رہے تھے۔ قریب ہی چارپائی پر ضیغم خان کا مقامی کارندہ سجاول بیٹھا تھا۔

''صاحب آپ...'' وہ یوں گھبرا کر چارپائی سے اٹھا جیسے میرا خیموں میں آنا بڑے تعجب کی بات ہو۔ ''آؤ... آؤ صاحب... یہ ہمارا ڈیرہ ہے۔'' وہ دونوں ہاتھ بڑھاتے ہوئے آگے بڑھا۔ پھر اس نے یوں دائیں بائیں دیکھا جیسے کسمپرسی کا اظہار کر رہا ہو۔ ''ہزار بار کہا ہے خان صاحب سے...'' اس کا اشارہ ضیغم خان کی طرف تھا۔ ''ہزار بار کہا ہے کہ ان میں سے کوئی نہیں بھاگے گا، پھر بھی مجھے چوکیداری پر لگا رکھا ہے۔''

میں چونکا۔ ضیغم خان کی خرکاری سے متعلق میرا شک پوری شدت سے میرے ذہن میں ابھرا، لیکن اپنے احساس کو میں نے شعوری طور پر چھپایا۔

''کھانے کا کیا پروگرام ہے؟'' میں نے بات کا رخ بدلا۔

''آپ کا کھانا تو...'' سجاول بولا۔ ''آپ کا کھانا تو خان صاحب گلی جاگیر سے بھجیں گے۔''

''کیا؟'' مجھے حیرت ہوئی۔ ''کیا پانچ میل دور سے آئے گا میرا کھانا؟''

''پانچ میل...'' سجاول کے لہجے میں فخر سا ابھرا۔ ''او صاحب! ہمارے خان صاحب تو کھوڑ سے کھانا بھیج دیتے۔ بڑا جگرا ہے خان صاحب کا۔''

''آج لڑکوں کو کیا کھلا رہے ہو؟'' میں نے پوچھا اور سجاول کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ چپ سا ہو گیا۔ اس کی خاموشی کا راز بہت جلد کھل گیا۔ کونڈیوں میں سرخ مرچیں پیسی جا رہی تھیں۔ کچی سرخ مرچوں میں نمک ملا کر، تھوڑا سا پانی ڈال کر، مزدور لڑکوں کا ڈنر تیار کیا جا رہا تھا، جسے وہ تنور کی روٹیوں کے ساتھ کھائیں گے۔ اس ڈنر کا نام ''مرچی'' تھا۔

''کیا ہر روز یہی کھاتے ہیں؟'' میں نے سجاول کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ گھبرایا گھبرایا سا تھا۔

''نہیں صاحب،'' وہ بولا۔ ''ہفتے میں ایک بار کالے چنے بھی اُبالے جاتے ہیں۔''

''ابلے ہوئے کالے چنے؟'' میرے لہجے میں سوال تھا۔

Scanned with CamScanner

سجاول نے ایک کھوکھلا سا قہقہہ لگایا۔

''او صاحب!'' وہ ہاتھ کو اوپر کی طرف جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''گھوڑے گدھے کیا کھاتے ہیں؟''

''کیا یہ گھوڑے گدھے ہیں؟'' میں نے پٹھان لڑکوں کی طرف دیکھا۔

''گھوڑے گدھے ہی ہیں صاحب!'' سجاول کے لہجے میں بیزاری تھی۔

''یہ مرچیں...'' میں نے کہنا شروع کیا تو سجاول نے فوراً جیسے مجھے ٹوکا۔

''بڑی کمال کی چیز ہے یہ مرچی!'' اس نے تیزی سے کہا۔ ''کھا کر غصہ آتا ہے۔ غصہ آتا ہے تو بدن میں طاقت آ جاتی ہے۔ طاقت آتی ہے تو یہ زور زور سے کسیاں (کدائیں) چلاتے ہیں۔ بیلچے بھر بھر کر پتھر اٹھاتے ہیں۔ تین دن کا کام ایک دن میں ہو جاتا ہے۔'' سجاول نے کارکردگی بڑھانے کا نسخہ پیش کر دیا۔

''کیا تم بھی یہی کھاتے ہو؟'' میں نے سجاول کی طرف دیکھا اور وہ خاموش ہو گیا۔ میں کونڈیوں کی طرف بڑھا۔ وہاں موجود ضیغم خان کا ایک اور نمائندہ نذیر ایک دیگچی اٹھائے گزر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ سیدھا میری طرف آیا۔ سجاول بہت پریشان لگ رہا تھا۔

''آپ نے آنے کی تکلیف کیوں کی صاحب؟'' نذیر نے ہاتھوں میں تھامی ہوئی دیگچی کو انگلیوں میں گھمایا۔ ''مجھے معلوم ہے، محمد خان کے پاس ایک ہی چارپائی ہے۔ میں بس چارپائی پہنچانے ہی والا تھا۔ بستر تو گلی جاگیر سے خان صاحب بھیج ہی دیں گے... کھانے کے ساتھ۔''

اس نے پھر دیگچی کو گھمایا، انگلیوں کو یوں حرکت دی جیسے اسے انگلیوں پر جلن کا احساس ہو رہا ہو۔ دیگچی کے ڈھکن کے کناروں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ وہ سیدھا ایک خیمے کی طرف گیا۔ خالی ہاتھ واپس آیا۔ اس نے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو ایک دوسرے سے جوڑ کر انھیں انگوٹھے سے مسلا اور پھونک ماری۔ قریب پڑی ہوئی چارپائی اٹھائی، گھما کر چارپائی سر پر رکھی اور ریسٹ ہاؤس کی طرف چلا گیا۔

پٹھان لڑکے سب سے بے خبر پشتو میں اونچا اونچا بول رہے تھے۔ ایک سمت تین چار کم عمر کے پٹھان لڑکے خاموش اور اداس بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک کے چہرے پر وحشت سی تھی۔

Scanned with CamScanner

''تم ان کے چوکیدار ہو؟'' میں نے شور مچاتے پٹھان لڑکوں کی طرف دیکھا۔

''او بس صاحب...'' سجاول کے لہجے میں بیزاری بڑھ چکی تھی۔ ''خان صاحب کا حکم ہے ورنہ ان مادر... نے—'' اس نے گندی گالی دی۔ ''بھاگ کر کہاں جانا ہے۔ کوئی بھاگ کر جائے گا کہاں؟... رات ہی کو بھاگ سکتا ہے... بھاگ کر دکھائے... بگھیاڑ[1] اور تکھر[2] صبح تک قیمہ بنادیں گے... بڑے بگھیاڑ اور تکھر ہیں اس جنگل میں... رات کو اُوجڑوں[3] میں پھرتے ہیں بگھیاڑ!''

''کبھی دیکھے ہیں تم نے؟'' میں نے پوچھا، اور سجاول کی نگاہیں متنازعہ ڈیم کی سمت اٹھیں۔

''کئی بار صاحب!'' سجاول کے لہجے کی بیزاری پل ہی میں مٹ سی گئی۔ شام رات میں بدل چلی تھی اور پہاڑ کے پیچھے چھپی جھیل کا تصور شاید سجاول کے ذہن میں ابھرا ہوگا۔ ''کئی بار صاحب... جھیل پر پانی پینے آتے ہیں۔ کبھی آٹھ... کبھی دس... کبھی اس سے بھی زیادہ۔ ایک بار انھوں نے ادھر کیمپ پر حملہ کیا تھا—ایک گدھا مارا گیا تھا صاحب!'' سجاول نے کلّے پر بندھے گدھوں کی طرف دیکھا۔ ایک گدھا خاموشی سے گردن جھکائے اس انداز میں سو رہا تھا جیسے سامنے کی سمت جا گرے گا۔

''محمد خان کا ٹینٹ تو جھیل کے کنارے پر ہے... وہ...''

میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی سجاول نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''صاحب...'' وہ آہستہ سے بولا، ''دو سال سے رہ رہا ہے محمد خان... ایک بار بھی اس پر بھیڑیوں نے حملہ نہیں کیا... کوئی کلام ہے اس کے پاس...''

''کلام؟'' میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ محمد خان کا گورِیلے جیسا چہرہ میرے تصور میں، میرے سامنے، مجھے اپنے بہت قریب محسوس ہوا۔

''سب کہتے ہیں، محمد خان کے پاس کوئی کلام ہے جس سے ڈر کر بگھیاڑ اور تکھر حملہ نہیں کرتے،'' سجاول نے کہا، ''ورنہ... ورنہ اکیلا بندہ...'' سجاول کی آواز میں حیرت اور خوف کے تاثرات ملے جلے تھے۔ ''ہم یہاں گرمیوں میں بھی ساری رات آگ جلاتے ہیں، ساری رات دھواں اٹھتا ہے۔ آگ اور دھوئیں سے بگھیاڑ اور مچھر ڈرتے ہیں... پھر بھی اگر قریب آئیں تو ہم باری باری رات کو جاگتے ہیں صاحب۔ قریب آئیں تو ہم فائرنگ کرتے ہیں۔'' وہ پل بھر کے لیے رکا۔

---
[1] بگھیاڑ: بھیڑیے۔ [2] تکھر: چھوٹے قد کے چیتے۔ [3] اُوجڑ: گروہ۔

''اکیلا بندہ... بے ہتھیار بندہ... کیسے بچ سکتا ہے صاحب!''

کھلی جگہ پر تنور کی روٹیاں رکھی جا رہی تھیں۔ کونڈیوں کی مرچوں میں نمک اور پانی ڈال کر سرخ رنگ کا شوربہ، کچا شوربہ بنایا گیا۔ روٹیوں والی چنگیریں قطار میں پڑی تھیں۔ کونڈیاں سامنے رکھ دی گئیں۔ پھر جیسے کسی اشارے کی دیر تھی، سب کے سب روٹیوں اور کونڈیوں پر جھپٹ پڑے۔

پتھریلی زمین پر چوکڑیاں مارے، پٹھان لڑکے تنور کی روٹی سے نوالے توڑ کر کونڈیوں کی مرچی میں یوں ڈبو رہے تھے جیسے وہ مدتوں کے بھوکے ہوں۔ میں ان کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ سجاول پریشان نظر آ رہا تھا۔ میں نے قریب بیٹھے ہوئے ایک گورے چٹے، قدرے بھوری آنکھوں والے ایک پٹھان لڑکے کی چنگیر میں پڑی روٹی کا نوالہ توڑا۔ اس نے سر گھما کر مجھے حیرت سے دیکھا۔ نوالہ توڑ کر، کونڈی کے اندر مرچوں کے سرخ پانی میں ڈبو کر، میں نوالہ ہونٹوں کے قریب لایا ہی تھا کہ سجاول چیخا۔

''صاحب جی... کیا کرتے ہیں! آپ کا کھانا تو خان صاحب گلی جاگیر سے بھیجیں گے۔''

''یہ بھی تو کھانا ہی ہے سجاول!'' میں نے کہا، اور چند پٹھان لڑکوں نے میری طرف دیکھا۔

نوالہ منھ میں ڈالتے ہی مجھے کام و دہن کی اس اذیت کا احساس ہوا جسے بھوک مٹانے کی خاطر یہ پٹھان لڑکے ہر روز برداشت کرتے ہیں۔ روٹی میں بھوسا ملا ہوا تھا اور تیز مرچوں کی کڑواہٹ نے ایک ہی نوالے میں میری زبان، نتھنوں، آنکھوں، حلق اور چھاتی کو جلا دیا۔ میں نے دوسرا نوالہ توڑا، پھر تیسرا... تنور پر روٹیاں لگانے والا لڑکا دوڑتا ہوا آیا اور چنگیر میں گرم گرم روٹی رکھ گیا۔ آدھی روٹی ختم کرتے کرتے پسینہ میرے بالوں سے بوندوں کی صورت میں چہرے اور کندھوں پر گرتا محسوس ہوا۔ پسینے کی قطرے میری گردن پر لڑھکے اور قمیض کے کالر کے نیچے پھیلنے لگے۔ میری آنکھیں پسینے کے قطروں سے بھیجنے لگیں۔ ہر قطرے میں تیزاب ملا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ کونڈی کے قریب ہی مٹی کے پیالے میں پانی بھرا رکھا تھا۔ ٹھنڈا پانی پیتے ہی مجھے محسوس ہوا کہ میری بینائی بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ ہر شے دھندلی سی تھی۔ دو تین بٹھل[4] پی کر میری بینائی کچھ بہتر ہوئی۔ میرے قریب بیٹھا پٹھان لڑکا زور زور سے ہنس رہا تھا۔ کئی دوسرے لڑکے بھی ہنسی میں اس کا ساتھ دے رہے تھے۔

---

4 بٹھل: مٹی کا پیالہ۔

Scanned with CamScanner

سجاول کے ماتھے پر شکنیں ابھری ہوئی تھیں۔

نہ جانے محمد خان کب سے کیمپ میں آیا ہوا تھا۔ میں اٹھا تو اس نے شکایت بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''واہ صاحب...'' وہ ناراض سا تھا۔ ''میرا تو کوئی حق ہی نہیں ہے۔ میں نے جو آنڈرے[5] پکائے ہیں، کیا اب جنگلی بلوں کو کھلاؤں گا؟''

''اوئے، صاحب کا کھانا...'' سجاول چیخا۔ ''صاحب کا کھانا گلی جاگیر سے آنا ہے۔'' اس کے لہجے میں غصہ تھا۔ ''ان بھاگوانوں نے مرچی کھالی ہے۔''

جلتے منہ، جلتی آنکھوں، جلتے نتھنوں اور جلتے سانسوں کے ساتھ، مجھے پٹھان لڑکے بہت اچھے لگے، اپنے جیسے، جلتی زبانوں اور سلگتی چھاتیوں والے... مجھے اپنے گلے اور سینے میں جلن سے درد سا محسوس ہوا۔ میں نے محمد خان کی طرف دیکھا۔

''آدھی روٹی ہی کھائی ہے محمد خان،'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''چل، باقی تیرے ساتھ۔''

''پر صاحب جی!'' سجاول پھر چیخا۔ ''خان صاحب کا کھانا...''

میں نے اسے فراموش کر دیا۔ مجھے اس کی محبت میں ضیغم خان سے وفاداری کے ساتھ ساتھ وہ ٹھیکہ بھی نظر آ رہا تھا جو ضیغم خان کو ہر سال میرے بھائی کے دستخطوں سے ملتا ہے۔ مجھے ضیغم خان سے نفرت سی محسوس ہو رہی تھی — کڑوی، جلتی ہوئی نفرت۔

5

میں اور محمد خان آہستہ آہستہ چلتے ہوئے، کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے لیکن زیادہ تر خاموشی سے چلتے ہوئے، ریسٹ ہاؤس کے لان میں پہنچے۔

''یہاں پانی...'' میں نے جلتے ہوئے سینے میں سوزش سی محسوس کرتے ہوئے کہا۔ یہ سوزش اور جلن کا ایسا احساس ہے جسے شاید کبھی بھی لفظوں میں بیان نہ کیا جا سکے گا۔ کڑوی، غصہ دلانے والی سوزش! ''میں منہ دھونا چاہتا ہوں...'' مجھے ہونٹوں پر بھی جلن کا مسلسل احساس ہو رہا تھا۔

محمد خان نے ریسٹ ہاؤس کے عقبی صحن کی طرف اشارہ کیا جس کی دیوار، ایک اینٹی دیوار، جھیل

---

[5] آنڈرے: انڈے۔

کے رخ پر ہے۔ دیوار کے قریب ہی ہینڈ پمپ نظر آیا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اتنی بار میں یہاں آ چکا تھا، کبھی ہینڈ پمپ کی سمت میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ میں ہینڈ پمپ پر گیا۔ محمد خان میرے پیچھے پیچھے آیا۔

''میں گیڑتا (چلاتا) ہوں صاحب۔'' اس نے ہینڈ پمپ چلانا شروع کر دیا۔ ''آپ سے کس نے کہا تھا مرچی کھانے کو... وہ تو...'' محمد خان کو شاید مثال دینے کے لیے لفظ نہیں سوجھ رہا تھا۔ ''وہ تو... بچھو ہے صاحب بچھو!''

محمد خان نے پمپ چلانا تیز کیا۔ پانی کی گرتی ہوئی دھار ہاتھوں پر بہت ٹھنڈی محسوس ہوئی۔ اس ٹھنڈک کو محسوس کرتے ہوئے میں نے سر گرتی ہوئی دھار کے نیچے کر دیا۔ بالوں سے گزرتا ہوا ٹھنڈا پانی بہت اچھا لگا... بہت ہی اچھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے سر پر انگارے دھرے ہوئے تھے۔ منھ سر دھو کر میں اٹھا تو میری پلکوں سے لڑھک کر پانی کے چند قطرے رخساروں سے ہوتے ہوئے ہونٹوں کے کناروں تک پہنچ گئے۔ مرچی سے میرے حلق میں جلن، درد میں بدل چکی تھی۔ میں نے ہونٹوں کے کناروں تک آئے ہوئے قطروں کو چوس لیا۔

محمد خان اور میں خیمے کے قریب آئے۔ میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ محمد خان خیمے سے جلتی ہوئی لالٹین لے کر باہر نکلا۔ میرے تصور میں نہ جانے کیوں بار بار کم عمر والے پٹھان لڑکے ابھر رہے تھے۔ مجھے یہ منظر پریشان کرنے لگا۔ ایک تاریک خیال کو ذہن سے نکالنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے میں رہ نہ سکا۔ محمد خان خیمے کی طناب سے لالٹین لٹکا رہا تھا۔

''محمد خان...'' مجھے اپنی آواز مرچی سے جلے ہوئے حلق میں خراش ڈالتی محسوس ہوئی۔ ''کیمپ میں جو چار پانچ چھوٹے لڑکے ہیں... وہ بہت سہمے ہوئے تھے... کیا بات ہے وہ... وہ اتنے وحشت زدہ کیوں تھے؟'' میں نے رک رک کر کہا۔

محمد خان میرے جملے میں شامل الفاظ کو تو شاید نہ سمجھا ہو گا لیکن اس کا جہاں دیدہ ذہن بات کو فوراً سمجھ گیا۔

''بیچاروں کا یہی مقدر ہے!'' محمد خان نے گہرا سانس لیا۔ ''سجاول اور نذیر بہت حرامی ہیں صاحب... کیمپ میں اور بھی بہت سے حرامی ہیں... وہ لڑکے... ان کا یہی مقدر ہے۔ وہ ہر شام،

آنے والی رات سے ڈر جاتے ہیں اور دھمی (صبح) ان کے آنسوؤں سے طلوع ہوتی ہے — یہی ان کا مقدر ہے..." سفاک لہجے میں مقدر کی سفاکی کا احساس دلاتے ہوئے محمد خان نے مجھے دیکھا۔

"چھوٹے ہیں صاحب — لڑ نہیں سکتے۔"

میرے ذہن میں سجاول کے وہ جملے، مرچی کھا کر غصہ آنے اور جسم میں قوت بڑھ جانے سے متعلق جملے، ناگوں کی طرح لہرانے لگے۔ یوں محسوس ہوا جیسے ہر سمت روشنی ختم ہوگئی ہے۔ ہر سمت بھیانک تاریکی چھاگئی ہے اور اس تاریکی میں چھوٹے لڑکوں کی گھٹی گھٹی چیخیں ہیں، سسکیاں ہیں، آنسو ہیں۔

گلی جاگیر کی سمت سے آتی ہوئی سڑک پر جیپ کی آواز سنائی دی۔ ناہموار سڑک پر ہیڈ لائٹس اچھل اچھل کر گر رہی تھیں۔ جیپ ریسٹ ہاؤس کے سامنے رکی۔ ضیغم خان کا ایک اور مقامی کارندہ، ہاتھ میں ٹفن پکڑے، مسکراتا ہوا جیپ سے اترا۔ ڈرائیور نے انجن بند کیا اور جیپ سے اتر کر پچھلی سیٹ سے بستر اٹھایا، کندھے پر رکھا۔ دونوں مسکراتے ہوئے ہمارے قریب آئے۔

"واہ صاحب!" کارندہ مقامی لہجے اور انداز سے بولا، "آپ کو بھی عجیب عجیب شوق چڑھتے ہیں۔" وہ ہنسا۔ "تنکھروں اور بگھیاڑوں کے ساتھ رات گزارنے کا بڑا مزہ آئے گا۔"

ڈرائیور بھی اس کے ساتھ ہنسی میں شامل ہوگیا۔ "صاحب بستر،" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"چارپائی پر رکھ دو،" محمد خان بولا۔

"کیا یہ..." مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں ہنسنے کی ناکام کوشش کر رہا ہوں۔ میری ہنسی بہت کھوکھلی ہے، بے جان ہے، زندگی سے عاری ہے۔ "کیا یہ..." میں نے محمد خان کی طرف اشارہ کیا۔ "کیا یہ تنکھر ہے یا بگھیاڑ؟"

محمد خان نے قہقہہ لگایا۔ آنے والے کارندے کا قہقہہ تو اتنا بلند تھا کہ شاید دور کیمپ کے پٹھان لڑکوں نے بھی سنا ہوگا۔

"آپ کا کھانا صاحب،" کارندے نے ہنستے ہوئے ٹفن آگے بڑھایا۔

"کھانا تو میں کھا چکا،" میں نے کہا۔

Scanned with CamScanner

کارندے کے چہرے پر ناگواری سی آئی۔ وہ محمد خان کی طرف تیزی سے مڑا۔

''محمد خان...'' اس نے تیز لہجے میں کہا، ''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی... صاحب یہاں خان صاحب کے مہمان ہیں... تو نے کھانا کیوں کھلایا؟''

''میں نے نہیں کھلایا،'' محمد خان دفاعی انداز میں تیزی سے بولا۔ ''بے شک کٹوی[6] دیکھ لو۔ صاحب نے کیمپ میں لڑکوں کے ساتھ مرچی کھائی ہے۔''

''مرچی کھائی ہے؟'' کارندے نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ ''صاحب...'' وہ میری طرف مڑا۔ ''کیا ہم آپ کو کھانا بھی نہیں کھلا سکتے تھے؟ یہ آپ نے کیا کیا؟ خان صاحب نے تو بانگی ککڑ[7] ذبح کرایا ہے... یہ آپ نے کیا کیا؟ خان صاحب تو بہت ناراض ہوں گے...'' اس نے چیختے ہی کے انداز میں رک رک کر کہا۔ وہ تیزی سے ایک بار پھر محمد خان کی طرف گھوما۔ ''او، تجھے کیا ضرورت تھی صاحب کو کیمپ میں لے جانے کی؟''

''میں نہیں لے کر گیا!'' محمد خان چلایا۔

''اب میں کھانے کا کیا کروں؟'' کارندہ بولا۔

''تم اور ڈرائیور کھالو،'' میں نے جواب دیا

''ہم تو خان صاحب کے ڈیرے پر ہی کھائیں گے،'' ڈرائیور نے کہا۔

''تو پھر کھانا واپس لے جاؤ، وہاں کھالینا،'' میں نے کہا۔ ''میں تو کھا چکا، یہاں ضائع جائے گا۔''

کارندہ خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر ادھر اُدھر بے چینی سے دیکھتا رہا، پھر اس پر گھبراہٹ سی نمودار ہوئی۔

''کھانا واپس لے جاؤں؟'' وہ آہستہ سے بولا۔ ''آپ جانتے ہیں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

میں پٹھانوں کی روایات سے بخوبی آگاہ تھا۔ پھر بھی جان بوجھ کر ضیغم خان کو صدمہ پہنچانا چاہتا تھا۔ میرے دل میں اس کے لیے نفرت گہری ہو گئی تھی۔

---

[6] کٹوی: ہنڈیا۔ [7] بانگی ککڑ: اذان دینے والا جوان مرغا۔

Scanned with CamScanner

"کھانا واپس لے جاؤ اور خان صاحب سے کہنا کہ میں نے انھی کی مرچی کھائی ہے۔"

میرے لہجے میں نہ جانے کیا تھا— سختی، بیزاری، طنز، نفرت— کارندے نے ایک لفظ کہے بغیر جیپ کی سمت قدم بڑھائے۔ لالٹین کی دھیمی دھیمی روشنی میں جیپ کے قریب جا کر وہ رکا، اس نے لمحے بھر کے لیے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ٹفن کو دیکھا، پھر مجھے دیکھا، محمد خان کو دیکھا اور جیپ میں بیٹھ گیا۔ اسٹارٹ کرتے ہوئے ڈرائیور نے جیپ ریورس کی، جیپ نے ایک نیم دائرہ بنایا، چکر کاٹا، مٹی اڑی اور جیپ گلی جاگیر کی سمت چلی گئی۔ میں نے محمد خان کو دیکھا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔

"محمد خان،" میں نے کہا، "کہاں ہیں آنڈرے؟"

محمد خان کے گوریلے جیسے چہرے پر پل بھر کے لیے گھبراہٹ اور مسکراہٹ کے تاثرات ابھرے، پھر اس کے مسکراتے ہوئے ہونٹ چر کر کانوں کی لوؤں تک جا پہنچے۔

6

رات کا ابتدائی پہر تھا۔ جنگل میں رات گزارنے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ محمد خان کمال کا انسان تھا۔ ہر طرف مشہور تھا کہ وہ بے حد دلیر اور حوصلے والا ہے۔ سجاول کا خیال تھا کہ اس کے پاس کوئی کلام ہے جس کی وجہ سے جنگلی درندے اس سے ڈرتے ہیں۔ اس کی سلامتی کا بھید کچھ دیر بعد خود ہی کھل گیا۔ کھانے کے بعد برتن سنبھال کر میرے پاس آیا۔

"صاحب جی،" وہ سرگوشی میں بولا۔

"کیا بات ہے محمد خان؟"

مجھے اس کی سرگوشی عجیب سی لگی۔ وہ اس انداز میں بولا تھا جیسے اسے ڈر ہو کہ کوئی اس کی بات سن نہ لے۔ دور کیمپ پر گہری خاموشی چھا چکی تھی۔ شیپ فارم بھی تاریک خاموشی میں لپٹا ہوا تھا۔

"صاحب جی،" محمد خان نے جھجکتے ہوئے کہا، "اگر کسی کو نہ بتائیں تو... صاحب، یہ جگہ محفوظ نہیں ہے۔ رات کو یہاں سے بگھیاڑ گزرتے ہیں۔ دو تین بار تو نکھروں کا جوڑا بھی گزرا ہے۔ یہاں سونا سیدھی موت ہے۔" میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

"تو کہاں سوتے ہو؟" میرے جملے پر محمد خان مسکرایا اور اس کی نظریں ریسٹ ہاؤس کی سمت

Scanned with CamScanner

اوپر اٹھیں۔

"وہاں چھت پر۔ سیڑھیاں تو اندر صحن میں اترتی ہیں جہاں صحن پر اوپر سیڑھیوں تک آتے ہوئے لوہے کا دروازہ کھولنا پڑتا ہے جو بند ہے۔ پر... وہ جو نلکے کے پاس ایک اینٹی دیوار ہے..." اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "وہاں سے چھت پر چڑھ جاتا ہوں۔ رات گزار کر صبح اتر آتا ہوں۔ کیا کروں... ڈیوٹی ہے... ورنہ کون موت کے منہ میں رہتا ہے۔"

محمد خان کے چہرے پر شرمندگی کا تاثر ابھرا۔

"کیا کروں صاحب،" اس کی آواز آہستہ ہوگئی۔ "سب کہتے ہیں میں بہت دلیر ہوں۔ پر... یہاں بہادری نہیں چلتی صاحب... یہاں صرف عقل کام آتی ہے۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ریسٹ ہاؤس کا لان نہایت غیر محفوظ تھا۔

"میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔ تم فکر نہ کرو،" میں نے کہا، اور محمد خان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"میں چھت پر بستر لگاتا ہوں،" محمد خان کے پورے بدن میں تیزی سی نمودار ہوئی۔ وہ کسی کھلنڈرے لڑکے کی سی چستی سے بستر اٹھا کر ریسٹ ہاؤس کی سمت گیا۔ اس نے گھما کر بستر چھت پر پھینکے، پھر بندر کی طرح اچک کر ایک اینٹی دیوار پر چڑھ گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ چھت پر نظر آیا۔ بستر بچھا کر وہ پھر نیچے اترا۔ خیمے کے قریب آیا۔

"چارپائیاں اوپر لے تو جاؤں، پر..." وہ بولا۔

"نہیں رہنے دو، گدے تو ہیں نا؟" میں نے کہا۔ میری نگاہیں جنوب کی سمت زیتون کے مصنوعی جنگل کے دہانے پر بنی ہوئی گزرگاہوں کی سمت گئیں، جہاں سے درندوں کی آمد متوقع تھی۔ محمد خان نے ریسٹ ہاؤس کی چھت کی طرف دیکھا۔

"بھیڑیے اتنی اونچی چھلانگ نہیں لگا سکتے صاحب،" اس نے کہا، "نہ ہی ایک اینٹی دیوار پر چڑھ سکتے ہیں۔" اس نے نلکے کے پاس ایک اینٹی دیوار کو دیکھا۔

"چیتے تو چڑھ سکتے ہیں محمد خان،" میں نے محمد خان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"تکھروں کا بھی انتظام ہے میرے پاس،" محمد خان نے ہنستے ہوئے میلے دانت نکالے۔

Scanned with CamScanner

مسکراہٹ سے اس کے ہونٹ پھر چرتے ہوئے کانوں کی لووں تک جا پہنچے۔ ''کروڈ آئل کا ڈبا، ڈنڈا اور ڈنڈے کے سرے پر بندھی تھگڑیاں [8] ...اور ماچس...

''جب پائپ لائن میں پگ (pig) ڈالتے ہیں،'' محمد خان نے پمپ اسٹیشن کی طرف دیکھا، ''میں کروڈ آئل کا ڈرم بھر لیتا ہوں۔''

''پگ؟'' میں نے پھر سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''اسی سے تو پائپ لائن صاف ہوتی ہے صاحب،'' محمد کان نے کسی ماہر انجینئر کی طرح مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''پکی فوم کا ہوتا ہے پگ — بڑا مضبوط... لائن میں ڈالتے ہیں۔ آگے سے لائن کھول دیتے ہیں، پیچھے سے پریشر بڑھاتے ہیں۔ پگ لائن کی ساری گریس (grease) باہر نکال پھینکتا ہے، لائن صاف ہو جاتی ہے۔ میں کروڈ آئل ضائع نہیں ہونے دیتا، ڈرم بھر لیتا ہوں۔'' محمد خان سمجھانے کے انداز میں سر ہلا رہا تھا۔ ''ماچس، کروڈ آئل کا ڈبا، ڈنڈے کے سر پر لگی تھگڑیاں ہیں میرے پاس۔ تکھر آئے تو آگ لگا کر ان کے منہ میں دے دوں گا۔''

محمد خان نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

''جہاں بہادری کام نہ آئے، عقل کام آتی ہے صاحب... آئیں، چھت پر چلیں۔''

''تم چلو، میں آتا ہوں،'' میں نے کہا۔

میں لان کو جھیل سے جدا کرتی ہوئی دیوار کے ساتھ چلتے ہوئے سیڑھیوں تک پہنچا اور پھر آہستہ آہستہ چڑھنے لگا۔ میرے قدم اوپر بنے جھروکا نما چبوترے کی سمت سیڑھی سیڑھی اٹھ رہے تھے۔ افق پر بارھویں کا چاند تاخیر سے بلند ہو رہا تھا۔ ابھی اسے اپنے عالم شباب کا شاید احساس نہیں ہوا تھا۔

میں آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے چبوترے میں پہنچا اور ایک کنکریٹ کے اسٹول پر بیٹھتے ہی میری نگاہیں جھیل کے پانی پر پڑیں۔ جھیل کا پانی شکنوں پر چاندنی کے عکس سے چمک چمک جاتا تھا۔ سرکنڈوں کی سمت پانی پر چاندنی کا عکس نمایاں تھا۔ مجھے رات کا یہ سناٹا افسانوی بات محسوس ہوئی۔ یہ حقیقت اس قدر جادو اثر تھی کہ اس پر کسی خواب کا گمان ہوتا تھا۔ لمحہ بھر ہی میں جیسے میں خواب

---

8 تھگڑی: تھگلی، کپڑے کا چیتھڑا۔

سے باہر نکل آیا۔ مجھے جھیل کے اردگرد پھیلے ہوئے جنگل، سرکنڈوں، کھیتوں، پہاڑوں کی طرف سے وہ آوازیں آنا شروع ہو گئیں جنھیں دن بھر یا تو سنا ہی نہیں جا سکتا یا وہ دن کو اپنا وجود ہی نہیں رکھتی ہوں گی۔ آوازیں دور بھی تھیں، نزدیک بھی، اور سب سے قریب، کانوں کی لوؤں کے پاس، مچھروں کی بھنبھناہٹ سے میں بیزار سا ہو گیا۔ چہرے پر، ہاتھوں پر، گردن پر، بغیر جرابوں کے چپلوں والے پیروں پر، ہر جگہ مچھروں نے اپنے انجکشن لگانے شروع کر دیے تھے۔ وہ اپنی تیز، سرنج جیسی سونڈ بیدردی سے استعمال کرتے ہیں — بوند بوند لہو چوستے ہوئے۔ شاید سارے بدن کا لہو نچوڑنا چاہتے ہیں۔

''ہمارے جسموں میں کتنا خون ہو گا؟'' میں نے سوچا۔ ''کتنے لاکھ قطرے؟ یہاں تو لاکھوں کی تعداد میں مچھر ہیں۔''

اس علاقے کے مچھر بہت زہریلے ہیں۔ جہاں سے خون چوستے ہیں وہاں گھنٹوں جلن ہوتی ہے — مرچی کی طرح، جس کی جلن اور کڑوی سوزش میرے گلے اور سینے میں اپنی تیزابیت کے ساتھ مسلسل مجھے اپنا احساس دلا رہی تھی۔ آوازوں میں دوسری نمایاں آواز مینڈکوں کی تھی جو وقفے وقفے سے جھیل کے کناروں سے سنائی دے رہی تھی۔ سرکنڈوں کے قریب یہ آواز زیادہ تھی۔ ابھی برسات کا موسم دور تھا، ورنہ برسات میں تو مینڈک دن کے وقت بھی سانس لیے بغیر بولتے ہیں۔ سیڑھیوں کے قریب ہی ایک پھُلاہی کا درخت، چھوٹا سا درخت، نمایاں تھا۔ میں درخت کی سمت دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک نازک سی ٹہنی سے چھوٹا سا پرندہ اڑا، ننھا سا پرندہ جو ہوا میں اڑتے اڑتے ساکن سا ہو جاتا ہے۔ اس کے ننھے ننھے سے، انتہائی تیز رفتاری سے حرکت کرتے ہوئے پر، جھینگر کی طرح محسوس ہوتے ہیں۔ اس کی ایک انچ سے بھی زیادہ لمبی، سوئی جیسی تیز چونچ نمایاں نظر آتی ہے، جسے یہ پھولوں کے اندر رس پینے کے لیے اس طرح داخل کرتا ہے کہ اس کا ننھا سا وجود ہوا میں جامد سا ہو جاتا ہے۔ اس کا خدا جانے بایولوجیکل نام کیا ہو گا۔[9] وہ کچھ دیر ہوا میں ٹھہرا رہا اور پھر جھیل کی سمت سے زیتون کے جنگل کی سمت غائب ہو گیا۔ جھیل کی سطح پر مغربی سرکنڈوں کی جانب جل مرغ چھپاک چھپاک ڈبکیاں لگا رہے تھے۔ چاند کی ترچھی کرنوں سے ماحول کے سب مناظر دھندلے دھندلے سے تھے،

---

9 شکر خورے (Hummingbrid) کی طرح کا یہ پرندہ کھیری مورت رینج کے علاقے اور ضلع ہزارہ میں پہاڑی ندیوں کے کناروں پر ملتا ہے۔

پھر بھی فضا میں نظر دور تک جاتی محسوس ہوتی تھی۔ جھیل کی جنوبی سمت زیتون کے درختوں میں مکمل تاریکی تھی۔ زیتون کے جنگل سے آگے کالے چٹے پہاڑ کی چوٹیاں نمایاں تھیں۔ ان کی ڈھلوانوں پر پھیلی ہوئی نیلی نیلی سی روشنی، نیچے کی سمت جاتے ہوئے گہری ہوتی ہوئی، سیاہی مائل ہو رہی تھی۔ پہاڑوں کے نیچے سیاہی پھیلی ہوئی تھی۔

ہوا میں دھیمی دھیمی سی خنکی تھی اور میرے کان، چبوترے کے آگے پیچھے، دائیں بائیں پھیلی ہوئی جھاڑیوں میں مخصوص سرسراہٹ سننے کے منتظر تھے۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ علاقہ خطرناک ترین سانپوں کا علاقہ ہے۔ دھنی[10] سانپوں کا گھر ہے۔ دھنی کا کلیجی رنگا کوبرا، جو بہت لمبا نہیں ہوتا، ڈس لے تو دو تین منٹوں میں مضبوط سے مضبوط بدن والا طاقتور بیل بھی مر جاتا ہے۔ شور کرتے ہوئے الٹا چلنے والا جلیبی سانپ، ڈھائی گھڑیا، ڈسنے کے بعد پورے بدن کو سوجن میں مبتلا کرنے والی چھوٹی اور بڑی دومونہی... بڑی دومونہی تقریباً ایک فٹ اور چھوٹی دومونہی چھ انچ تک بھی ہوتی ہے۔ چھوٹی دومونہی تقریباً نایاب سانپ ہے۔ چھوٹی دومونہی کو پہچاننا ہر سپیرے کے بس کی بات نہیں ہے۔ سپیرے اکثر اسے دومونہی کا بچہ سمجھتے ہیں۔ بے ضرر سمجھ کر بے احتیاطی سے کام لینے والے سپیرے عموماً دومونہی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بڑی دومونہی کی طرح چھوٹی دومونہی کی دم بھی منہ جتنی موٹی ہوتی ہے۔ روشنی میں بھی پتا نہیں چلتا کہ منہ کس طرف ہے۔ پھر اس علاقے میں درختوں پر اپنی کینچلیاں چھوڑنے والے زہریلے ناگ، پھنیر، پرندوں اور چھوٹے جانوروں کو بل دے کر کچلنے والے اژدہے، کھیری مورت کے پہاڑی سلسلے میں کثرت سے ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ کم زہریلے سانپوں کی بہت بڑی تعداد اس علاقے کی پہاڑیوں اور میدانی علاقے کے کھیتوں میں پائی جاتی ہے۔ یہاں کے دیہاتی رات کے وقت تین چیزیں لے کر گھر سے نکلتے ہیں: لالٹین، کندھے پر پڑی سوتی چادر اور ہاکی، یا ہاکی نما کھونڈی، کوبرے اور پھنیر کو مارنے کے لیے۔ وہ پھن کھولے ناگ کے سامنے چادر پھینکتے ہیں۔ ناگ غصے میں چادر کو ڈستا ہے اور اس کے ٹیڑھے دانت سوت میں پھنس جاتے ہیں۔ چادر اس کے پھن کے ساتھ ہی الجھتی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ سوت سے دانت نکالے، دیہاتی اس پر ہاکی یا ہاکی نما کھونڈی اس تسلسل اور زور سے برساتے ہیں کہ اس کا کچومر نکل جاتا ہے۔ ماہر دیہاتی

---

[10] دھنی: شمالی پنجاب کے ضلع اٹک میں تحصیل پنڈی گھیب اور تحصیل فتح جنگ کا علاقہ۔

ایک دو وار ہی میں سانپ کا سر کچل دیتے ہیں۔

''ضیغم خان کے آگے چادر کون پھینکے گا؟'' سانپ کے ٹیڑھے دانتوں کا خیال آتے ہی ضیغم خان کا چوڑا چہرہ مجھے پھن کی طرح نظر آیا۔ ''یہ لڑکے، یہ پٹھان لڑکے... آخر ان کا قصور کیا ہے؟ یہی کہ انھوں نے امیر خاندانوں میں جنم نہیں لیا...''

میری نظر شمال مغرب کی جانب کیمپ کی سمت گئی۔

''خاندان امیر کیسے ہو جاتے ہیں؟'' میں نے سوچا۔ ''کمزوروں کو مار کر، ان سے ان کا حق چھین کر ہی طاقتور امیر ہو سکتے ہیں، ورنہ معاشرتی ناہمواری کی کوئی اور توجیہہ تو ہو نہیں سکتی۔''

مجھے قدیم زمانے کے ڈاکو یاد آئے، جنھیں میں اساطیری اور پراچین (پرانی) کہانیوں میں، پڑھتے وقت تصور میں کئی بار دیکھ چکا ہوں۔ جو گروہ بنا کر کبھی سمندروں میں وائی کنگز (Vikings) اور بحری قزاق اور خشکی پر بربروں کی صورت میں نمودار ہوا کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ اپنا ایک سردار بنا لیا کرتے تھے، اسے جو ذہنی اور جسمانی طور پر سب سے زیادہ طاقتور ہوتا تھا۔ وہ پہلے خشکی پر چھوٹی چھوٹی بستیوں میں ڈاکے ڈالتے تھے۔ سمندر میں تجارتی بادبانی کشتیاں لوٹتے تھے، پھر ان کا گروہ بڑھتا جاتا تھا۔ گروہ بڑھ جانے پر وہ بڑے تجارتی جہازوں اور جزیروں پر ڈاکے ڈالتے تھے اور خشکی پر ان کا دائرۂ اختیار علاقائی سطح تک بڑھ جاتا تھا۔ ہر سردار اپنی برتری کا تمنائی نظر آتا تھا۔ پھر بڑے پیمانے پر حریفوں میں تصادم کے بعد فتح مند سردار کبھی سیزر، کبھی فرعون، کبھی زار، کبھی جہاں پناہ، کبھی ظل الٰہی، کبھی مہابلی اور کبھی مہاراجہ بن جاتا تھا۔ اس کا خاندان شاہی خاندان کہلاتا تھا۔ اس کے ساتھ ڈاکے ڈالنے والے قدیم ساتھی اشرافیہ کہلانے لگتے تھے۔ وہی اس کے وزیر، مشیر، سپہ سالار، اور اس کے زیر انتظام صوبوں کے حاکم بن جاتے تھے، اور اس طرح راجیہ چھیتروں یا سلطنتوں کا آغاز ہو جاتا تھا۔ اب بڑے بڑے محلوں اور رجواڑوں میں ڈاکوں کی منصوبہ بندی، سیاست یا راج نیتی کہلانے لگتی تھی۔ پہلا سیزر، پہلا فرعون، پہلا زار، پہلا خان، پہلا شہنشاہ، پہلا مہاراجہ — سب ڈاکو تھے... سب کے سب...

''تاریخ شاہد ہے کہ امیر تیمور، اپنے جدِ امجد چنگیز خان کی طرح، ابتدا میں ڈاکے ڈالا کرتا تھا،'' میں نے سوچا۔ ''آج اس ڈاکو کا خاندان تاریخ میں عظیم مغلیہ خاندان کہلاتا ہے۔ آج وہ ابتدائی ڈاکو

Scanned with CamScanner

نہایت قابلِ احترام ہستی ہے۔ نہ معلوم کتنے شاہی خاندان، ڈاکوؤں کے خاندان ہوں گے — کیا خبر!"

میرے ذہن میں تلخی سی ابھر آئی۔ مجھے گلی جاگیر کا مشہور ڈاکو محمد خان [11] یاد آیا جو ضیغم خان کا گہرا دوست بھی تھا۔ تلخی بڑھ گئی۔ "اگر محمد خان ڈاکو کو نہ روکا گیا تو وہ ملک کا سربراہ نہ سہی، وزیر داخلہ ضرور بن جائے گا،" اس خیال سے پیدا ہونے والی کڑواہٹ زہریلی تھی۔ رات کا پرفسوں ماحول زہریلا ہو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے دھنی کے موذی کوبرے نے میرے ذہن کو ڈس لیا ہے۔ مرچی سے میرے حلق اور سینے میں سوجن سی نمودار ہو چکی تھی۔ مرچی کی دو مونہی اپنا زہر میرے گلے اور چھاتی میں انڈیل چکی تھی۔

"مرچی تو انسانوں کی خوراک ہے،" میں نے تلخی سے سوچا۔ "اسے تو انسان کھاتے ہیں — ضیغم خان کے ڈیرے پر تو مرچی سے متعلق کبھی کسی نے سوچا تک نہ ہوگا۔ وہاں تو ہر روز بکروں کی کھالیں اتاری جاتی ہیں... بانگی مرغوں کی گردنوں پر چھریاں پھرتی ہیں۔ اس کے دسترخوان پر چھ سات قریبی ساتھی موجود رہتے ہیں۔ ان میں اس کا جگری یار محمد خان ڈاکو بھی شامل ہوتا ہے۔ شراب پی کر بھنے گوشت کو دانتوں میں چباتے ہوئے انھوں نے کبھی مرچی سے متعلق سوچا بھی نہ ہوگا۔ انھیں تو مرچی کا ذائقہ بھی معلوم نہیں ہوگا... مرچی تو انسانوں کی خوراک ہے... وہ تو کوئی برتر مخلوق ہیں..."

میرے ذہن میں ایک مصرع ابھرا، ذرا سی کوشش سے شعر ہو گیا:

جسے کھانے پہ ہو جائے محبت نوعِ انسان سے
مجھے مرچی پسند آئی ہے نعمت ہائے الواں سے

شعر کی تخلیق نے زہریلی فضا میں تریاق کا کام کیا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں شعر کو گنگنانے ہی لگا تھا کہ جھروکے کے اوپر سے ایک پرندہ اڑا۔ تیر کی طرح سیدھا جھیل کی سمت گیا، جھیل کے پانی میں ڈبکی لگا کر پھر اڑا اور زیتون کے جنگل کی سمت چلا گیا۔ وہ کنگ فشر کی طرح کا کوئی پرندہ تھا۔ ایسے پرندے دریائے سواں کے کناروں پر پھیلی ہوئی پھلاہیوں اور کریروں کی شاخوں پر اکثر

---

[11] ڈاکو محمد خان گرفتار ہو کر جیل میں غالباً مر چکا ہے۔ اس ڈاکو کو سنا ہے کہ نواب آف کالاباغ کی سرپرستی حاصل تھی۔ ان دنوں دھنی پر محمد خان ڈاکو کی حکومت قائم تھی۔

Scanned with CamScanner

نظر آتے ہیں۔ ان کا رنگ گہرا سبز اور نیلا ہوتا ہے۔ ان کی چونچیں، سرخ اور لمبی چونچیں، بہت نمایاں دکھائی دیتی ہیں۔

''فطرت کی شدت اور فطرت کی لطافت کے درمیان ازلی کشمکش، جبلتوں کی جنگ ہی سے نمایاں ہوتی ہے...'' میرے خیال کا رخ بدلا۔ میرے خیالات ایک نئی دنیا میں داخل ہو رہے تھے کہ چبوترے کے نیچے جھاڑی میں سرسراہٹ ہوئی۔ میں تیزی سے اٹھا... سیڑھیوں پر آیا۔ شاید چوہا ہو... سانپ بھی ہو سکتا ہے۔ ان جھاڑیوں میں سیہ بھی ملتے ہیں۔ جہاں سرسراہٹ ہوئی تھی وہاں غور سے دیکھنے پر چھوٹا سا خار پشت نظر آیا۔ سیاہ خار پشت کو مقامی زبان میں ''جھاچوہا'' کہا جاتا ہے۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''یہاں تو دور دور تک کوئی سانپ نہیں ہوگا۔'' میں نے سوچا۔ سیاہ خار پشت جس بیدردی سے سانپ کو مارتا ہے، اتنی اذیت سے شاید ہی کوئی جانور کسی دوسرے جانور کو مارتا ہوگا۔ خار پشت سانپ کو دیکھ کر ایک سمت کھسک جاتا ہے، پھر پہلو کی سمت سے اچھل کر سانپ پر حملہ کرتا ہے۔ بجلی کی سی تیزی سے وہ سانپ کی دم کو دانتوں میں دبا کر چھوٹی سی کالی گیند بن جاتا ہے۔ اس گیند پر ابھرے ہوئے گہرے سیاہ رنگ کے کانٹے اکڑ سے جاتے ہیں۔ انھی کانٹوں میں سانپ کے جسم کا پچھلا حصہ پرو دیا جاتا ہے۔ خار پشت مکمل طور پر جکڑے ہوئے سانپ کے پچھلے حصے کو دم کی طرف سے کھانا شروع کر دیتا ہے۔ سانپ درد کی شدت میں بار بار کوڑے کی طرح خار پشت کے کانٹوں پر برستا ہے۔ لگاتار برسنے پر اس کا بدن چھلنی ہو جاتا ہے۔ اسی شدتِ درد سے آخر سانپ مر جاتا ہے۔ سانپ کی یہ اذیت کبھی کبھی دو گھنٹے تک جاری رہتی ہے۔

''کیا ضیغم خان کے لیے کبھی کوئی خار پشت گیند نہیں بنے گا؟'' میں نے پھر سوچا اور مجھے جھیل کی شمالی سمت میدان میں پھیلے ہوئے کھیتوں سے ''کوئیک کوئیک کواواواو'' کی آوازیں سنائی دیں۔ گیدڑ کھیتوں میں موجود خرگوشوں پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ دور ڈھوکوں سے کتوں کے بھونکنے کی بھی آوازیں آئیں۔ مجھے بچپن میں سنی ہوئی ایک کہانی یاد آئی جس میں ایک گیدڑ بلند آواز میں اعلان کرتا ہے:

''پدرم سلطان بود!''

''توراچہ... توراچہ... توراچہ...'' سب گیدڑ چلانے لگتے ہیں کہ باپ سلطان تھا تو تجھے کیا؟ تو کیا ہے؟ میرا دھیان پھر ضیغم خان کی طرف گیا۔

''ضیغم خان نام ہی کا شیر ہوگا— اور پھر شیر ہونا کون سی فخر کی بات ہے؟ نہ جانے انسانی تمدّن میں ہمیشہ طاقت ہی کو کیوں پوجا گیا ہے، قوت ہی کی کیوں پرستش کی گئی ہے... شیر جیسے خونخوار اور بے رحم درندے کو شجاعت کی مثال قرار دے کر جنگل کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ عقاب جیسے بدصورت اور خون آشام پرندے کو بہادری کی علامت قرار دیا جاتا ہے۔ غزالوں، فاختاؤں اور کبوتروں جیسے نازک اور خوبصورت پرندوں کو ڈرپوکی کی مثال بنایا جاتا ہے— ان کے حسن کا احساس کسی کو نہیں ہوتا۔ نہ جانے اس دنیا میں حسن کو صید اور بدصورت مکروہ ہوس کو صیاد کا درجہ کیوں ملتا ہے۔ شاید انسانی تمدن نے صدیاں گزرنے کے بعد بھی ذوقِ جمال سے فطرت کی لطافت کا ادراک حاصل نہیں کیا۔ شاید جبلی تقاضوں کی تخلیق قوتِ شر کا اپنے لیے حفظِ ماتقدم تھا۔ شاید ہوس قوتِ شر کا وہ ازلی ہتھیار تھا جس کے آگے سانپ کی زبان کی طرح دوشاخیں خوف اور اور خودغرضی، قوتِ شر کی سلامتی کی ضمانت بن کر قائم ہوگئی تھیں۔''

سیڑھیاں اترتے ہوئے میرے قدم ایک آواز پر رک گئے۔ دور زیتون کے مصنوعی جنگل میں،، بہت دور، کتے کے رونے جیسی دھیمی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ یہ دھیمی سی آواز چند لمحوں میں دہرائی گئی۔ یہ بھیڑیے کی آواز تھی۔ پھر دو تین بار ایسی آوازیں ابھریں۔ ریسٹ ہاؤس کی چھت کی طرف میری نظریں تیزی سے گئیں۔ محمد خان گوریلے کی طرح کھڑا میری سمت زور زور سے بازو ہلا رہا تھا۔

''صاحب... صاحب... صاحب جی،'' اس کی دبی دبی سی آواز سیڑھیوں تک پہنچی۔'' بگھیاڑ! بگھیاڑ!'' وہ چلّا رہا تھا۔

میں سیڑھیاں پھلانگتا ہوا لان میں پہنچ کر دوڑا، خیمے کے قریب سے گزرا، نلکے کے پاس اچک کر دیوار پہ چڑھا۔ ایک اینٹی دیوار پر توازن برقرار رکھنا مشکل تھا، محمد خان نے چھت سے بازو نیچے لا کر میرا ہاتھ پکڑا اور میں چھت پر چڑھ گیا۔ دو تین گہرے سانس لے کر میں نے زیتون کے جنگل کی سمت دیکھا۔ محمد خان نے مجھے اس انداز میں بلایا تھا جیسے اس نے بھیڑیوں کو دیکھ لیا ہے۔ جھیل کے کنارے زیتون کے درختوں میں تاریکی تھی۔ بھیڑیوں کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔

Scanned with CamScanner

''آ گئے مادر— '' محمد خان نے گندی گالی دی۔ وہ سیدھا جھیل کے اس کنارے کی طرف دیکھ رہا تھا جو لان سے ملا ہوا تھا اور جہاں چھدری چھدری سی خشک گھاس کا قلعہ سا بنا ہوا تھا۔

''آ گئے مادر— دس بارہ ہیں، ابھی کچھ دیر میں پہنچ جائیں گے پانی پینے... ہر رات آتے ہیں۔''

محمد خان چھت پر بچھے ایک بستر پر بیٹھ گیا۔ دوسرے کی سمت اشارہ کرتے ہوئے اس نے مجھے دیکھا۔

''بیٹھ جائیں صاحب جی... بلکہ لیٹ جائیں... پیٹ کے بل لیٹ جائیں۔ یہاں سے حرامی صاف نظر آتے ہیں۔''

مجھے اپنی ڈرپوکی پر شرمندگی سی محسوس ہوئی۔ بھیڑیے ابھی بہت دور تھے لیکن میں یوں بھاگا تھا جیسے انھوں نے حملہ کر دیا ہو۔ میں شرمندہ سا تھا۔

''شاید ہر انسان کے اندر ایک درندہ موجود ہے جو دلیری کو عظمت سمجھتا ہے اور ڈرپوکی پر ندامت محسوس کرتا ہے،'' میں نے تلخی سے سوچا۔ ''مجھے فطرت کی شدت نے اپنا چہرہ دکھایا ہے... خارپشت کی طرح، سیاہ اور سفاک چہرہ، جو اپنی ہی طرح ایک اور سفاکی کی علامت کو، زہریلی علامت کو قطرہ قطرہ خون گرا کر مٹا دیتا ہے... اور لطافت، شاید کسی پھول کے سامنے ہوا میں ساکن، چھوٹے سے پرندے کی طرح مسلسل اڑ رہی ہوگی، جس کا شکم بہت ہی محدود سا ہے، جو پھول کے ذرا سے رس سے بھر جاتا ہے۔''

7

بارھویں کے چاند کی روشنی میں جھیل کے پانی پر ہوا کے دھیمے دھیمے جھونکے ارتعاش پیدا کر رہے تھے اور لہروں پر روشنی تھرک رہی تھی۔ ان سے آگے پھیلی ہوئی سبز کائی میں ڈبکیاں لگاتے جل مرغوں کی چھپاک چھپاک ریسٹ ہاؤس کی چھت پر بھی سنائی دے رہی تھی۔ بھیڑیوں کی آوازیں نزدیک آ رہی تھیں... پھر جیسے بھیڑیوں کی آوازوں کے علاوہ سب آوازیں ختم ہو گئیں۔

''محمد خان،'' میں نے آہستہ سے کہا، ''کیمپ میں تو ہر رات خطرہ رہتا ہوگا؟ شیپ فارم میں

بھی...''

''ہاں صاحب،'' محمد خان نے جواب دیا۔ ''خطرہ تو رہتا ہی ہے۔ کیمپ میں رات کو آگ جلتی ہے... گرمیوں میں بھی۔ شیپ فارم کی پتھر کی دیواریں اور لوہے کے گیٹ بہت مضبوط ہیں۔ وہاں خطرہ نہیں ہے...'' محمد خان نے میری طرف دیکھا۔ ''خطرہ تو مجھے ہے صاحب... مجھے۔''

''اس چھت پر بھی؟'' میں نے کہا۔

''چھت محفوظ ہے،'' محمد خان آہستہ سے بولا۔ ''پر آئی کو کون ٹال سکتا ہے!''

بھیڑیوں کی آوازیں فرلانگ بھر دور محسوس ہوئیں۔ آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ ان میں اضافہ ہو رہا تھا۔ بھیڑیوں کا غول، زیتون کے درختوں میں بھاگتا اچھلتا چلا آ رہا تھا۔ محمد خان پیٹ کے بل، بستر پر لیٹ گیا۔

''لیٹ جائیں صاحب،'' وہ بولا، ''تکیے پر ٹھوڑی رکھ لیں، آواز نہ نکالیں...''

''کیوں محمد خان؟'' میں نے بستر پر تقریباً لیٹتے ہوئے کہا، ''وہ اوپر تو نہیں چڑھ سکتے...''

''تماشا دیکھنا ہے تو چپ رہنا صاحب،'' محمد خان نے دھیما سا قہقہہ لگایا۔ ''ورنہ بھاگ جائیں گے مادر—'' محمد خان نے پھر گالی دی۔ ''پہلے غرائیں گے، پھر خود ہی ڈر کر بھاگ جائیں گے۔ انسان کی آواز سے ڈرتے ہیں لیکن اکیلا دیکھ لیں تو پھر...'' محمد خان کی آواز قریب آتی ہوئی بھیڑیوں کی آوازیں سن کر آہستہ ہو گئی۔ ''اکیلا اور غیر محفوظ دیکھ لیں تو پھر حرامی... نہیں چھوڑتے... چیر پھاڑ دیتے ہیں۔ مجھے کئی بار دیکھ چکے ہیں۔ غراتے ہیں، پھر بھاگ جاتے ہیں۔''

بھیڑیوں کی آوازیں اب اتنی قریب تھیں کہ ان کا آپس میں غراتے ہوئے الجھنا بھی صاف سنائی دے رہا تھا۔ چاندنی میں ہماری نظریں زیتون کے جنگل کی طرف سے آنے والی گزرگاہوں پر جمی ہوئی تھیں۔

''مادر—'' محمد خان نے دانت پیس کر کہا۔ ''آپس میں کھیلتے بھی ہیں تو یوں... جیسے ایک دوسرے کو مار دیں گے۔''

زیتون کے جنگل سے دو جانور نکلے۔ بہت تیزی سے لان میں دوڑے، خیمے کے قریب چارپائیوں سے ٹکراتے ٹکراتے بچے اور کچی سڑک سے ہو کر پمپ اسٹیشن کی سمت کھیتوں کی طرف نکل گئے۔

Scanned with CamScanner

''سؤر ہیں بھین—'' محمد خان مسلسل گالیاں بک رہا تھا۔ میری موجودگی میں اس نے اپنے مخصوص دیہاتی انداز پر جو خود ساختہ پابندی لگائی تھی، جو شائستگی کا بلوریں گنبد اس نے اپنے ذہن پر خود ہی بنالیا تھا، کرچی کرچی ہو چکا تھا اور اسے خبر تک نہ تھی۔ وہ اضطرابی کیفیت میں تھا۔ اس کے اندر کا اُجڈ دیہاتی میرے قریب لیٹا، تیز تیز نگاہوں سے جنگل کی طرف دیکھ رہا تھا— مکمل ترین اُجڈ دیہاتی۔

زیتون کے درختوں سے پہلا بھیڑیا نکلا، پھر دوسرا، تیسرا، چوتھا، پانچواں... میں حیرت سے انھیں دیکھ رہا تھا۔ وہ میرے تصور کے برعکس تھے۔ تصویروں اور دستاویزی فلموں میں دیکھے ہوئے بھوری چھاتیوں، ٹانگوں اور دموں والے کالے بھیڑیوں، سفید اور سلیٹی گھنے بالوں والے بھیڑیوں کی جگہ میرے سامنے مکمل بھورے رنگ کے، لمبی تھوتھنیوں والے، شکاری کتے جتنے اونچے لیکن خوب موٹے تازے، کم بالوں والے بھیڑیے، تیز رفتاری سے جھیل کے پانی کی سمت یوں لپکے، جیسے بہت پیاسے ہوں۔ وہ کافی دیر پانی پیتے رہے۔ پانی پیتے ہوئے چپڑ چپڑ کی آوازیں بلند ہوتی رہیں۔ بھیڑیوں کے کھڑے کان آگے پیچھے ہل رہے تھے۔ کئی بھیڑیے پانی پیتے پیتے، پیچھے آنے والوں کی وجہ سے جھیل کے اتھلے پانی میں چلے گئے۔ ان کے پنجے اور ٹخنے پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ پانی پیتے ہوئے ان کے پیٹ زور زور سے ہل رہے تھے۔ پھر ایک بھیڑیے نے سر اٹھایا، اس کے منھ سے پانی کے چند قطرے گرے۔ مڑا، کھلی جگہ پر آیا، آگے بڑھا اور ایک زیتون کے درخت کے تنے پر اس نے ٹانگ اٹھادی۔

''کتے کی نسل ہیں بھین—'' محمد خان نے سرگوشی کی۔ وہ تعداد میں تیرہ چودہ ہوں گے۔ چاندنی میں اگرچہ وہ بہت نمایاں تھے، پھر بھی یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ نر کتنے ہیں اور مادہ کتنی ہیں۔ ان میں بچے نہیں تھے، اگرچہ کچھ بھیڑیے قدرے چھوٹے تھے اور بہت چست اور تیز نظر آتے تھے۔ کچھ بہت تھکے تھکے سے، سست نظر آتے تھے۔ پانی پینے کے بعد ان کا انداز کچھ بدل گیا۔ دو چار انتہائی سست بھیڑیوں کو چھوڑ کر باقی بہت چست نظر آنے لگے۔ سست بھیڑیے غالباً سب سے بوڑھے تھے۔ وہ تماشا جس کا ذکر محمد خان نے کیا تھا، شروع ہو گیا۔ بھیڑیوں کا یہ کھیل میرے لیے انوکھا تھا۔ وہ کبھی سیدھے، کبھی دائرے میں، ایک دوسرے کے پیچھے غراتے ہوئے دوڑنے لگے۔ کئی بار کوئی

Scanned with CamScanner

بھیڑیا اپنے اگلے پنجوں کو لان کی گھاس میں ٹکا کر، سر کو نیچے پنجوں کے قریب لا کر، چھلانگ لگانے کا انداز بناتا اور قریب سے گزرنے والے بھیڑیے پر کود پڑتا۔ ایک بھیڑیے نے اسی طرح چھلانگ لگا کر دوسرے بھیڑیے کو گرا دیا اور غراتے ہوئے اس پر پل پڑا۔

''دھر گندا اس!'' (مار گرایا ہے!) محمد خان نے مخصوص دیہاتی انداز میں پھر سرگوشی کی۔ کچھ بھیڑیے لان کے ساتھ، جھیل کو لان سے جدا کرنے والی اینٹوں کی دیوار کے پاس اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے، دو چار مشرقی جانب سرکنڈوں میں چلے گئے۔ چاندنی میں وہ صاف نظر آ رہے تھے۔ ایک نے اچانک اتھلے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ ایک جل مرغا ''کیں'' کی تیز آواز کے ساتھ دور تک پانی میں اچھلتا، پھڑ پھڑاتا چلا گیا۔ بھیڑیا اگلی ٹانگوں سے چھپاکے اڑاتا واپس پلٹتا۔

''تیری میں—'' محمد خان کی آواز بلند ہوئی اور ہمارے سامنے لان میں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے دو چار بھیڑیے رک گئے۔ انھوں نے ہماری سمت دیکھا، غرائے، پیچھے ہٹے۔ ان کی لمبی تھوتھنیاں، لمبے جبڑے ہماری سمت اٹھے ہوئے تھے۔ وہ غراتے ہوئے خیمے کی سمت بڑھے۔ کئی دوسرے بھیڑیے بھی اپنی تھوتھنی نما لمبے جبڑوں میں سے دانت دکھاتے ہوئے، آنکھوں کے درمیان شکنیں سی نمایاں کرتے ہوئے غرانے لگے۔ ایک دو بھیڑیے ایک اینٹی دیوار کی طرف آئے، پھر غراتے ہوئے واپس چلے گئے۔ خیمے کی سمت جاتے ہوئے انھوں نے رک کر، سر گھما کر، لمبے جبڑے اٹھا کر پھر ہمیں دیکھا، غرائے اور پھر تمام بھیڑیے اسی طرح کبھی سیدھے، کبھی دائروں میں، غراتے ہوئے چارپائیوں کے قریب پہنچ گئے۔ انھوں نے کتنی ہی بار خیمے اور چارپائیوں کے چکر کاٹے، پھر غراتے، دوڑتے، ایک دوسرے پر اچھلتے، چکر کھاتے وہ اس کچی سڑک پر جا پہنچے جو گلی جاگیر کی سمت جاتی ہے۔

''گلی جاگیر کے کھیتوں میں بہت خرگوش ہیں،'' محمد خان نے کہا۔ ''اور چٹانوں میں ہڑیال[12] بھی ہیں۔ یہ حرامی ایسے ہی موٹے تازے نہیں ہیں... کبھی کبھی تو گلی جاگیر اور ساتھ والے گاؤں دھڑی میں بھیڑ بکریوں کے باڑوں پر بھی حملہ کرتے ہیں۔ لیکن بُولی کتوں کا مقابلہ کرنے کے بجائے بھاگ جاتے ہیں۔''

گلی جاگیر کا ذکر چھڑتے ہی پل بھر میں مجھے ضیغم خان کا چہرہ تصور میں ابھرتا محسوس ہوا۔

---

12 ہڑیال: موٹے سینگوں والے ہرن۔

Scanned with CamScanner

''حرامیاں مینڈا ساہ جھکی گنڈا اے...'' (حرامیوں نے میرا سانس کھینچ رکھا ہے۔) محمد خان نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''ہر رات گزرتے ہیں...''

''تم ٹھیک کہتے ہو محمد خان،'' میں نے کہا۔ ''یہاں بہادری نہیں، عقل کام آتی ہے۔ اگر ہم چارپائیوں پر ہوتے تو اب تک...''

''دو سال سے رہ رہا ہوں... اکیلا...'' محمد خان اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ ''ایک بھیڑیا کبھی حملہ نہیں کرتا صاحب... یہ تو جتھا ہے جتھا...''

محمد خان نے گلی جاگیر کی سمت جاتی کچی سڑک کو دیکھا جواب خاموش سی تھی۔ بھیڑیے دور جا چکے تھے۔

''محمد خان ٹھیک کہہ رہا ہے،'' میں نے سوچا۔ ''اکیلا بھیڑیا کبھی حملہ نہیں کرتا۔ بھیڑیے ہمیشہ مل کر حملہ کرتے ہیں۔ انھیں اپنی اجتماعی قوت کا اندازہ ہے۔''

مجھے فطرت پر غصہ آیا۔ اس نے بھیڑیوں کو یہ اجتماعی شعور، یہ اجتماعی قوت کا احساس جبلتِ غول پسندی کے ذریعے دے رکھا ہے، جس سے کیمپ کے پٹھان لڑکے محروم ہیں۔ ان میں سے ہر ایک ضیغم خان سے خوفزدہ ہے۔ وہ سب مل جائیں تو ضیغم خان ان سے ڈر جائے، لیکن ان میں اجتماعی شعور ہے ہی نہیں۔

''یہ پٹھان لڑکے...'' میں نے تلخی سے سوچا، ''یہ پٹھان لڑکے... ان میں سے ہر ایک اپنے کلّے پر بندھا ہوا گدھا ہے۔''

محمد خان ابھی تک گلی جاگیر کی سمت جانے والی پتھریلی کچی سڑک کی سمت دیکھ رہا تھا، جس پر ابھرے ہوئے سلیٹ جیسے پتھریلے تودے چاندنی میں بہت نمایاں تھے۔

''محمد خان،'' میں نے کہا، ''کبھی اپنے ہم نام محمد خان ڈاکو کو بھی دیکھا ہے؟''

''گولی ماریں جی...'' محمد خان نے سر کو جھٹکا سا دے کر مجھے دیکھا۔ ''بہت حرامی آدمی ہے، صاحب... کئی بار دیکھا ہے... سینکڑوں قتل کر چکا ہے... ٹھیکیدار ضیغم خان کا جگری دوست ہے... دیکھا ہے حرامبڑ کو!'' محمد خان نے محمد خان ڈاکو کو گالی دی۔ اس کے دل میں ظالم ڈاکو کے خلاف بھرپور نفرت کھل کر سامنے آئی۔ محمد خان ڈاکو اس علاقے کا بے تاج بادشاہ ضرور تھا لیکن ہر دیہاتی

Scanned with CamScanner

کے دل میں اس کے لیے شدید نفرت موجود تھی۔ مگر یہ نفرت کبھی اجتماعی نفرت بن کر ظاہر نہ ہو سکی، اس کی نوعیت انفرادی ہی رہی۔

"طاقتور کا کمزور کو مار دینا شدید فطرت کا اولین اصول ہے..." میرے خیالات کا رخ بدلا۔ "کمزوروں کا مل کر طاقتور کو ختم کر دینا بھی اسی شدید فطرت کا ہی مظہر ہو سکتا ہے۔ لطافت نہ اول ہے نہ ثانی... لطافت کسی بھی پہلو پر تخریب کا مظہر نہیں ہو سکتی۔"

مچھروں کی وہ بھنبھناہٹ جو بھیڑیوں کی آمد کے ساتھ ہی نہ جانے کہاں چلی گئی تھی، واپس آ گئی۔ اچانک میری نظر ان خاردار جھاڑیوں، سوکھی جھاڑیوں پر پڑی جو چھت کے ایک کونے میں پڑی تھیں۔ ان کے قریب ہی دو بھاری پتھر بھی نظر آئے۔

"یہ جھاڑیاں کس لیے ہیں محمد خان؟" میں نے پوچھا اور وہ خاموش سا ہو گیا۔ اس نے جھاڑیوں کو دیکھ کر چھت کے اس کونے کو دیکھا جہاں سے ہم ایک اینٹی دیوار پر پاؤں رکھ کر چڑھتے۔

"سب راتیں چاندنی راتیں نہیں ہوتی ہیں صاحب،" محمد خان نے گہرا سانس لے کر آہستہ سے کہا، "تنکھروں کے جوڑے کو میں تین چار بار دیکھ چکا ہوں۔ اندھیری راتوں میں یہ جھاڑیاں کام آتی ہیں۔ انھیں میں اُدھر..." محمد خان نے ایک اینٹی دیوار والے کونے کی سمت اشارہ کیا، "اُدھر جما دیتا ہوں، اوپر پتھر رکھ دیتا ہوں۔ بڑی کانٹے دار ہیں... بڑے زہری کانٹے ہیں... تنکھر ان سے گزر کر اوپر نہیں آ سکیں گے... آئے بھی تو کچھ دیر تو لگے گی صاحب، میں خبردار تو ہو جاؤں گا..."

مجھے محمد خان بہت ہوشیار اور ذہین انسان محسوس ہوا۔

"سردیوں میں کیا کرتے ہو؟ اور برسات میں؟" میں نے پوچھا۔ محمد خان اس بار خاموش ہو گیا۔ میں نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ چاندنی میں مجھے اس کے چہرے پر اضطرابی کیفیت نمایاں نظر آئی۔ اس کی بھنچی بھنچی آنکھوں پر پلکیں تھرتھرا رہی تھیں۔

"صاحب،" وہ بمشکل بولا "اگر آپ بڑے صاحب کو نہ بتائیں تو..."

"نہیں بتاؤں گا،" میں نے کہا، اور محمد خان کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔

"سردیوں میں اور بارش میں..." محمد خان نے شمال مغرب میں شیپ فارم کی سمت دیکھا۔ "وہاں فارم پر محبوب خان کمپاؤنڈر کے کوارٹر میں سوتا ہوں... اکیلا ہے بیچارہ۔ سنگ بنا رہتا ہے،"

محمد خان نے یوں کہا جیسے کمپاؤنڈر کے پاس رہ کر وہ اس پر احسان کرتا ہو۔

''کیا کروں صاحب... '' محمد خان نے بات جاری رکھی۔ ''ادھر ٹینٹ میں رہوں تو تکھر اور بگھیاڑ نہیں چھوڑیں گے۔ چھت پر سردی سے اکڑ جاؤں گا۔ پمپ اسٹیشن کی چابی تو ہے میرے پاس، لیکن کمرہ چھوٹا ہے اور کیڑے بہت ہیں... سردیوں میں درندے بہت خطرناک ہو جاتے ہیں صاحب... سردیوں میں تو بگھیاڑیاں بھی بہت گرم ہوتی ہیں۔'' محمد خان نے دانت نکالے۔

مجھے ہنسی آ گئی۔

مچھروں کی بھنبھناہٹ کے ساتھ ساتھ جنگل کی سب آوازیں پھر سنائی دینے لگیں۔ ان میں سب سے نمایاں آواز زیتون کے درختوں سے آ رہی تھی۔ یہ آواز جھینگروں کی تھی جن کے مسلسل بجتے ہوئے باجوں میں جھیل کے کنارے سے کسی مینڈک کی آواز یوں شامل ہو جاتی تھی جیسے کسی نے سیکسوفون پر زور سے پھونک ماری ہو۔ مجھے آہستہ آہستہ اپنی جسمانی حالت کا احساس ہوا۔ میرے گلے اور چھاتی میں مرچی کی سوزش بڑھ چکی تھی، جس کا اثر میری آواز پر نمایاں تھا۔ بھیڑیوں کی آمد سے لے کر ان کے جانے تک میرے منھ، گردن، ہاتھوں اور پیروں پر کئی سرخ دھبے نمودار ہو چکے تھے۔ مچھروں کے بنائے ہوئے ان دھبوں میں جلن تھی جو خارش کرنے سے اور بڑھ جاتی تھی۔ میرے ایک پاؤں کا انگوٹھا اور ساتھ والی انگلی ایک دوسرے سے مسلسل رگڑ کھا رہے تھے۔ محمد خان مچھروں کا اس قدر عادی لگتا تھا کہ اسے احساس تک نہیں تھا۔

''یہاں تو بہت زیادہ مچھر ہیں،'' میں نے کہا، اور محمد خان پہلی بار کھل کر ہنسا۔

''صاحب،'' اس نے ہنستے ہوئے کہا، ''یہ جنگل ہے۔ یہاں ہر نامراد شے دوسری پر حملہ کرتی ہے۔ مچھروں کو ہمارے خون کی بو بے چین کر رہی ہے۔ کچھ دیر بعد ہوا اور ٹھنڈی ہو جائے گی تو چادر اوپر لینے سے بچت ہو جائے گی۔''

محمد خان بستر پر لیٹ گیا۔ اس نے آسمان کی طرف یوں دیکھا جیسے کسی کو تلاش کر رہا ہو۔ میری نگاہیں بھی آسمان کی سمت گئیں۔ چمکتے ہوئے تارے بہت قریب محسوس ہوئے۔ ''ابھی تو... '' محمد خان پھر ہنسا، ''ابھی تو حرامزدہ چمباکھیاں [13] نہیں آئیں، وہ بھی جھپٹے مارتی ہیں صاحب، کیمپ میں

---

[13] چمباکی: چمگادڑ۔

گدھوں کے کانوں سے چمٹ کر خون پیتی ہیں۔''

میں نے کھیس نما چادر، سوتی دھاگوں کی قدرے موٹی چادر، ٹانگوں پر کھینچ لی۔ ایک نا معلوم سی اداسی نے میرے دل پر جیسے سایہ سا ڈالا۔

''پٹھان لڑکوں کا خون مچھر پیتے ہیں، گدھوں کا خون چمگادڑیں پیتی ہیں... سب سے بڑا ویمپائر تو ضیغم خان ہے...''

مجھے خون چوستے مچھر، لہو چاٹتی چمگادڑیں اور ضیغم خان ایک ہی نسل کی مخلوق محسوس ہوئے۔ پھر اچانک میرے ذہن میں ایک اندیشہ سا ابھرا۔

''محمد خان،'' میں نے اندیشے کو چھت پر چڑھتے ہوئے محسوس کیا۔ ''چیتوں کا جوڑا اگر چاندنی رات میں بھی چھت پر چڑھ آئے، اور تو سویا ہو... تو؟''

محمد خان نے میری سمت دیکھ کر گہرا سانس لیا۔

''صاحب،'' اس نے ایک اینٹی دیوار والے کونے کی سمت دیکھا۔ ''اس فکر نے مجھے کئی راتیں، سونے نہیں دیا۔ شروع شروع میں میں ساری رات جاگتا رہتا تھا۔ اب عادی ہو چکا ہوں۔ نیند اتنی کچی ہے کہ اگر چوہا بھی چھت پر چڑھنے کی کوشش کرے تو میں اٹھ جاتا ہوں۔'' محمد خان نے چھت پر پڑے کروڈ آئل کے ڈبے کی سمت دیکھا۔ سیاہ کنستر میں جھگویاں بند ھا ڈنڈا ڈوبا ہوا تھا۔ ''ماچس میرے سرہانے تکیے کے نیچے پڑی رہتی ہے صاحب... ابھی تک تو نہیں چڑھے تکھر... آتے ہیں، پانی پیتے ہیں اور چلے جاتے ہیں... کبھی اوپر چڑھنے کی کوشش کریں گے تو نبڑ لوں گا مادر — سے۔'' محمد خان نے پھر گالی دی۔

''چاندنی راتوں میں بھی جھاڑیاں رکھ دیا کرو،'' میں نے مشورہ دیا۔

''دستانے نہیں ہیں میرے پاس،'' محمد خان نے کہا۔ ''بڑے صاحب سے کہوں گا کہ اسٹور سے ایک جوڑا نکلوا دیں۔'' اس نے میری سمت دیکھا۔ ''پھلاہی کی ٹہنیاں ہیں اور بیری کی جھاڑیاں بھی۔ تر چھے کانٹے ہیں، بڑے زہریلے — ہاتھوں میں کھب کھب جاتے ہیں اور ہاتھ دیر تک جلتے رہتے ہیں۔''

میں جانتا تھا کہ محمد خان کبھی بھی بھائی سے دستانے نہیں مانگے گا۔ نہ جانے اس علاقے کے

لوگوں کی فطرت میں یہ جھجک کیوں ہے۔ تکلیف سہہ جاتے ہیں، بولتے نہیں... مجھے محمد خان ایک عجیب سی شخصیت محسوس ہوا— نہایت عجیب۔

"یہاں،" میں نے کہا، "اس علاقے میں تو بچھو بھی بہت ہیں۔"

"ہاں صاحب،" محمد خان تیزی سے بولا، "یمپ اسٹیشن میں تو بہت ہیں— کالے لڑم[14] اور کن کریس[15] بھی بہت ہیں۔ لیکن چھت پر نہیں چڑھتے... شاید چمگادڑوں سے ڈرتے ہیں..." محمد خان نے پھر اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔

مجھے وہ بے حد دلیر انسان محسوس ہوا۔ وہ دو برس سے تنہا اس جنگل میں رہ رہا ہے— بیوی بچوں سے دور، گھر کے سکون سے دور۔ ہر رات اس پر موت کا خوف منڈلاتا ہوگا اور وہ چھت پر لیٹا آسمان کو دیکھتا ہوگا۔ اس کی نظریں مشرقی افق پر پھوٹنے والے اجالے کے انتظار میں بار بار اٹھتی ہوں گی، وہ نیند سے بار بار چونک اٹھتا ہوگا۔

"انسانی زندگی تاریک شب کی مانند ہے،" میری نگاہیں آسمان پر ہر سمت چمکتے ستاروں پر جم سی گئیں۔ "یہ تو میں بھی اکثر کہا کرتا ہوں کہ زندگی ایک نیند کی مانند ہے جس میں ہم موت کے خواب دیکھتے ہیں، اور جب ہم اس نیند سے بیدار ہوں گے تو وہ زندگی کا آخری اور موت کا پہلا لمحہ ہوگا، لیکن کیا اس تاریک شب کی سحر زندگی میں کبھی طلوع نہیں ہوگی؟"

محمد خان کے گہرے سانس سنائی دیے۔ وہ سو چکا تھا یا سونے کی انتہائی کوشش میں تھا۔

"یہ زندگی..." میں نے محمد خان کی طرف دیکھا۔ پھر میری نگاہیں جھیل کی سمت گئیں، جھیل سے ہوتی ہوئی، زیتون کے درختوں سے اوپر اٹھیں اور ایک بار پھر ستاروں پر، چمکتے ستاروں پر جا ٹھہریں۔ "یہ زندگی، جس میں فطرت نے اپنے دونوں پہلوؤں کو نمایاں کر دیا ہے لیکن کسی پہلو پر بھی مدام کی مہر نہیں لگائی... یہ زندگی کیا ہے؟"

یہ سوال جو صدیوں سے انسان کے ذہن میں تاریک شب کی طرح موجود ہے اور اس تاریک شب کی سحر آج تک طلوع نہیں ہو پائی۔ کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ... کسی کو بھی اپنے کہے کا مکمل یقین نہیں ہے۔ جہاں تک عقل اندازہ لگاتی ہے وہاں تک روشنی کی کرنیں پہنچ جاتی ہیں، اور اس کے بعد

---

14 کالا لڑم: کالا بچھو۔ 15 کن کریس: کن کھجورا۔

سوال کا ہر جواب تاریکی میں روپوش ہو جاتا ہے، اور ہر اندازہ عقیدے کا روپ دھار لیتا ہے۔۔ یہ غیر فطری توتوں کا کوئی جبر نہیں ہوتا کیونکہ ان کا اپنا کوئی وجود ہی نہیں ہوتا، وہ عقائد کی نظر نہ آنے والی صورتیں ہیں جو تاریکی میں بگڑے ہوئے اندازوں سے پیدا ہوتی ہیں۔

''یہ زندگی اور اس میں قائم کیسا توازن ہے،'' میں نے سوچا،'' جو ایک سمت خون آشام اور دوسری جانب بے بسی کا شکار ہے۔ غزال، فاختائیں، کبوتر اور بے ضرر خوبصورت پرندے خون تو نہیں پیتے۔ میں اس توازن کو کیسے مان لوں؟ پرندے کسی حد تک جزوی گوشت خور (Semi-Carnivorous) ہوں گے۔ میں نے کبھی فاختہ اور کبوتر کو حشرات الارض کھاتے نہیں دیکھا، لیکن وثوق سے کہہ بھی نہیں سکتا کہ وہ ایسا نہیں کرتے۔ لیکن غزال خون تو نہیں پیتے، گوشت تو نہیں کھاتے۔ جنگلی بھینسے، گائیں، نیل گائیں، ہرن اور گھاس کھانے والے تمام جانور کس اعتبار سے توازن میں ایک پلڑا بن سکتے ہیں؟ شاید کچھ لوگ یہ کہیں کہ وہ گھاس کھاتے ہوئے کئی جاندار کیڑے بھی کھا جاتے ہوں گے، لیکن کیا ان کا یہ عمل دانستہ کہلائے گا؟ وہ درندوں کی طرح دانستہ خون آشامی تو نہیں کرتے۔ یہ کیسا توازن ہے؟ میں اس توازن کو نہیں مانتا۔ ایک پلڑے پر زندگی ختم ہوتی ہے تو دوسرے پر زندگی کو قیام ملتا ہے۔ حسن کو دوام ہے اور ہمیشہ رہے گا، ورنہ قرن ہا قرن سے جاری عمل سے حسن مٹ چکا ہوتا۔ ہوس کو انہدام ہے اور ہمیشہ رہے گا، ورنہ اس کرۂ ارض سے خیر کی قوت کب کی جا چکی ہوتی... خیر کا وجود ہی ختم ہو چکا ہوتا۔ ذوقِ جمال کو فروغ ہے اور ہوتا رہے گا، جبلی بدنمائی کو معدوم ہونا ہے اور ہو کر رہے گی — ایسا ضرور ہوگا، یقیناً ہوگا۔ یہی اس زندگی کا مقصد ہے کہ فطرت کا سفر کثافت سے لطافت کی سمت جاری رہے جو صدیوں سے جاری ہے۔ یہی تو زندگی ہے کہ جس میں ہر شدید جذبہ لطیف جذبے میں تبدیل ہوتا رہے، جو ہزاروں سال سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔ یہ ہر انسان اپنی زندگی میں مشاہدہ کرتا ہی رہتا ہے کہ برائی ہی سے برائی جنم لیتی ہے۔ نیکی کا جذبہ ایک بار فروغ پا جائے تو پھر ہمیشہ قائم رہتا ہے، تاریک جبلتوں کے بہیمانہ عمل اسے رد نہیں کر پاتے، جبکہ شدید اور ہوس سے قائم شدہ تاریک جذبے نیکی کے جذبے کی روشنی میں خود بخود مٹ جاتے ہیں۔ اس روشن ثبوت کی کرنوں میں یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ اس کرۂ ارض پر آخری اور ہمیشہ رہنے والی فتح خیر ہی کی ہوگی۔ شدید فطرت کی شدت اور کثافت مٹتے مٹتے مٹ جائے گی۔''

Scanned with CamScanner

اچانک سر کے اوپر سے ایک بڑا سا پرندہ، بڑے بڑے پر پھیلائے تیزی سے گزرا۔ نہ جانے کیوں غالب کا ایک مصرع میرے ذہن میں کرن کی طرح چمکا۔

در انتظار ہما، دام چیدہ ام ہنگر

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

8

صبح جب محمد خان نے مجھے جگایا تو صبح کا تارا بہت قریب محسوس ہوا، بالکل آنکھوں کے سامنے، بہت ہی قریب۔ میں نے دو تین بار آنکھیں جھپکیں۔ جنوبی سمت زیتون کے جنگل میں پرندوں نے شور مچا رکھا تھا۔ کتنی ہی آوازیں تھیں جو مل کر جنگل کو چہکا رہی تھیں۔ دھیمی دھیمی سی روشنی ہر سمت پھیلی ہوئی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ آنکھیں ملتے ہوئے جھیل کو دیکھا۔ جھیل بھی بیدار ہو رہی تھی۔ جل مرغ جھنڈ سا بنا کر مشرقی سمت، سرکنڈوں کے سامنے، سبز کائی میں تیر رہے تھے۔ میری نگاہوں میں کائی کے اندر پھیلے ہوئے، پانی کی سطح پر پھیلے ہوئے گہرے سبز رنگ کے چوڑے چوڑے تیرتے پتوں میں رنگ سے بکھر گئے۔ کنول کے گلابی پھول کھلے نظر آئے۔ انھی پھولوں پر مجھے لمبی سوئی جیسی نوک والے بہت سے چھوٹے چھوٹے پرندے نظر آئے۔ شکر خورے جیسے انھی پرندوں کے پروں پر جھینگر کے پروں کا گمان ہوتا ہے۔ یہ بہت ہی چھوٹے چھوٹے سے تھے اور پھولوں پر سر جھکائے، غوطہ لگانے کے انداز میں، ہوا میں ٹھہرے سے تھے۔ زیتون کے درختوں کے اوپر سے لمبی دم والا، چمکتے ہوئے سیاہی مائل سبز، نیلے اور سامنے سرخ اور سنہری پروں والا ایک فیزنٹ اڑا۔ یہ پرندہ اس علاقے میں بہت نظر آتا ہے۔ آسمان پر بھی اڑتے ہوئے کچھ پرندے ادھر اُدھر ڈبکیاں سی لگا رہے تھے۔ پھر نیل کنٹھوں کا جوڑا تیزی سے گزرا۔

میں نے خیمے کی طرف دیکھا۔ محمد خان مجھے جگانے کے بعد نیچے اتر کر ٹینٹ کے قریب جا پہنچا تھا۔ وہ خیمے کے اندر گیا، باہر نکلا تو اس کے ہاتھ میں لوٹا تھا۔ وہ سیدھا نلکے کی سمت آیا۔

''اتریں صاحب،'' اس نے ہینڈ پمپ چلاتے ہوئے کہا۔ ''بستر نیچے پھینک دیں... اگر ضرورت ہے تو ریسٹ ہاؤس کے پیچھے چلے جائیں، نہیں تو پھر سو جائیں، میں چارپائی بچھا دیتا ہوں۔''

محمد خان نے سارے جمالیاتی ماحول کو انسانی ضرورت کی بھینٹ چڑھا دیا۔ میں نے بستر تہہ کر کے نیچے پھینکا، جسے محمد خان نے دبوچ لیا اور خیمے کی سمت چلا گیا۔ میں چھت سے اترا، اترتے ہوئے ایک اینٹی دیوار پر غیر متوازن ہونے پر، میں نے تقریباً چھلانگ لگا دی۔ محمد خان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ میں خیمے کی طرف گیا اور چارپائی پر بیٹھ گیا۔ محمد خان نے خیمے میں جاتے ہوئے مجھے مڑ کر دیکھا۔

''چائے پییں گے صاحب؟'' وہ بولا اور دوسرے ہی لمحے وہ تولیہ اور صابن لیے باہر آیا۔ اس نے تولیہ اور صابن مجھے پکڑاتے ہوئے ہینڈ پمپ کی طرف دیکھا جہاں نلکے کے نیچے لوٹا پڑا تھا۔ پھر خاموشی سے وہ دوبارہ خیمے میں گھس کر، پتیل کے اسٹوو میں، مٹی کے تیل کی پھوار بنانے کے لیے ہوا بھرنے لگا۔

9

ہینڈ پمپ پر ہاتھ منہ دھو کر، خشک دودھ کے مخصوص ذائقے والی گرم گرم چائے پی کر، میں اٹھا اور جھیل کے مشرقی کنارے کی طرف چلا گیا۔ میری نگاہیں کنول کے گلابی پھولوں پر جمی ہوئی تھیں، کہیں کہیں سفید کنول بھی نظر آتے تھے۔ ننھے ننھے پرندے اب وہاں نہیں تھے۔ کثافت اور لطافت کے رشتے کی گہرائی کو میں نے بہت سچائی کے ساتھ محسوس کیا۔ انسانی ضرورتوں کو انسانی احساسات سے مربوط دیکھ کر مجھے گوتم بدھ کا ایک واقعہ یاد آیا۔

ایک شاگرد نے گوتم بدھ سے پوچھا کہ پریم کیا ہے؟ ''پریم کنول کا پھول ہے؛'' گوتم بدھ نے جواب دیا۔ ''پریم کنول کا وہ پھول ہے جو جھیل میں کھلتا ہے اور جس کی جڑیں جھیل کے اندر کیچڑ میں ہوتی ہیں۔ پر بھور سے جب وہ بھینی بھینی پون میں جھومتا ہے تو اپنی کیچڑ کو بھول جاتا ہے۔''

مجھے لطافت اور کثافت کے رشتے میں لطافت کثافت سے جدا ہوتی محسوس ہوئی۔ گزشتہ شب کے خیالات میرے ذہن میں پلٹے۔ میری آنکھیں شاید چمک گئی ہوں گی۔

''سمندر سے بادل اٹھتے ہیں،'' میں نے سوچا، ''ہوا پر تیرتے ہوئے وہ بلند پہاڑوں کی چوٹیوں سے ٹکراتے ہیں، گھنے سے ہو کر وادیوں میں برستے ہیں، چٹانوں میں جذب ہو جاتے ہیں،

Scanned with CamScanner

چشمے بن کر پھوٹتے ہیں، جھرنے بن کر گرتے ہیں، ندیاں بن کر بڑے بڑے پتھروں سے ٹکراتے ہوے، جھاگ بناتے ہوے، پیچ وتاب کھاتے جھیل میں آن گرتے ہیں۔ جھیل سے پھر ندیوں کی صورت نکلتے ہیں، ندیاں مل کر دریا بن جاتی ہیں، دریا بہتے بہتے پھر سمندر میں جا گرتے ہیں۔ گردش مکمل ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ شبنم کا قطرہ جو ہر صبح کسی پھول کی پتی پر یا خاشاک پر اتر کر سورج کی کرن سے جگمگاتا ہے اور پھر ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے، وہ گردش کو توڑ دیتا ہے۔ وہ اپنے بدن کو لطیف کرتے ہوے، کثافت کے دائرے کو توڑ دیتا ہے — تو پھر لطافت کو دوام کیوں نہ ہوگا؟"

میری نگاہوں کے سامنے کنول کے تر و تازہ، چمکتے ہوے گلابی اور سفید پھول، پانی پر پھیلے ہوے گہرے سبز رنگ کے پتوں کے درمیان، ہوا کے دھیمے دھیمے جھونکوں میں جھوم رہے تھے۔ ان کی بھینی بھینی مہک ہر سمت پھیلی ہوئی تھی — ایسی مہک جو جنگل کی دوسری خوشبوں کی موجودگی میں اپنا احساس دلا دیا کرتی ہے۔ ہر اس جنگل میں جہاں جھیل ہو، کنول کے پھولوں کی مہک صبح اور شام کے وقت یقیناً بہت نمایاں ہوتی ہوگی۔

"پھول کی جڑیں کیچڑ میں ہوں یا مٹی میں، وہ بیج سے پتلی سی ہلکے سبز رنگ کی تار بن کر نکلتا ہے۔ پھر تنا بن جاتا ہے، پھر اس کی نازک ٹہنیوں پر پتیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ پھول درخت کا ہو تو کبھی اس کی ٹہنیوں پر پتوں سے پہلے کلیاں نکل آتی ہیں، کبھی کلیوں سے پہلے پتے... نازک ٹہنیوں پر کلیاں چٹکیں یا مضبوط ٹہنیوں پر، ان کے چٹکنے پر پھول اپنے وجود کو نمایاں کر دیتے ہیں۔ پھولوں کے رنگ دکنے لگتے ہیں، ان کے رنگوں کے عکس صبا کے دامن میں لہراتے نظر آتے ہیں... لیکن وہ مہک، وہ خوشبو، جو پھول کے وجود کی پہچان بن جاتی ہے، اس کے سوکھنے اور بیجوں کے ظاہر ہونے سے پہلے گردش توڑ دیتی ہے، وہ درختوں پر پھولوں سے پھلوں میں، اپنے ہی وجود کے عکس کی طرح چلی جاتی ہے، لیکن پھول کی طرح پھل کے سوکھنے اور بیج کے ظاہر ہونے سے پہلے گردش توڑ دیتی ہے... آزاد ہو جاتی ہے۔ تو پھر لطافت سے ذوقِ جمال کو فروغ کیوں حاصل نہیں ہوگا؟ پھول اور پھل میں مقید کثافت خود بخود مٹتے مٹتے مٹ جاتی ہے، تو پھر کثافت کو زوال کیوں نہ ہوگا؟ اس کثافت کو، جو ہوس کی صورت کائنات میں قوتِ شر کی پہچان ہے، اسے زوال ہوگا اور یقیناً ہوگا۔"

نہ جانے کیوں مجھے اپنا وجود، اس چھوٹے سے پرندے کی طرح محسوس ہوا جو کنول کے پھول

Scanned with CamScanner

پر غوطہ لگانے کے انداز میں ساکن سا ہو جاتا ہے اور جس کے پر جھینگر کی طرح انتہائی تیز رفتاری سے حرکت کرتے رہتے ہیں۔ وہ پھول کی خوشبو کا لافانی پیامبر بن جاتا ہے۔

10

میں پھر ریسٹ ہاؤس کے لان میں پہنچا۔ سورج ابھی پوری طرح مشرقی افق سے باہر نہیں آیا تھا کہ گلی جاگیر کی طرف سے آنے والی کچی سڑک پر جیپ کی آواز سنائی دی۔ محمد خان سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''خان صاحب نے ناشتہ بھیجا ہوگا،'' اس نے بے دلی سے کہا۔ وہ اپنے اور میرے لیے پراٹھے بنا چکا تھا۔ جیپ قریب آئی، رکی۔ ڈرائیور کی سیٹ پر خود ضیغم خان بیٹھا ہوا تھا۔

وہ اترا۔ اس کے گلے میں چمڑے کی پیٹی سے پستول لٹکا ہوا تھا۔ چہرے پر شکنیں تھیں۔ وہ قریب آیا۔ محمد خان نے سلام کیا۔

''آیئے خان صاحب،'' میں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ضیغم خان جہاں تھا وہیں رک گیا۔

''اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو تم؟'' اس کی آواز میں کرختگی تھی۔ ''میں نے مہمان سمجھ کر عزت کی، کھانا بھجوایا اور تم نے... نہ مڑا، تم ہو کیا؟''

''مجھے بھوک نہیں تھی،'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''کھانا کھا چکا تھا... اور مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ کھانا گلی جاگیر سے بھیجیں گے۔ آپ مجھے بتا کر نہیں گئے تھے...'' میں نے صورت حال کو خراب ہونے سے بچانے کے لیے تھوڑی سی منافقت کی، ورنہ مجھے مرچی کھانے سے پہلے سجاول یہ بات بتا چکا تھا کہ میرا کھانا گلی جاگیر سے آئے گا۔ یہ ذرا سی منافقت کارگر ثابت ہوئی۔ ضیغم خان آگے بڑھا اور میرے سامنے چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''نہ مڑا، کیا میں بیوقوف ہوں؟'' وہ بولا۔ ''کیا مجھے پتا نہیں تھا کہ صاحب تمھیں میرا مہمان بنا کر گئے ہیں؟ کیا میں نہیں جانتا تھا کہ تم نے کھانا کھانا ہے؟ کیا میں نے تم سے اٹھ پہر ا روزہ رکھوانا تھا؟ کوئی مہمانوں سے اٹھ پہرے روزے بھی رکھواتا ہے؟'' وہ ایک ہی سانس میں، سارے جملے

کہہ گیا۔

''مہمان تو میں محمد خان کا بھی ہوں،'' میں نے مسکرا کر کہا اور ضیغم خان کا چہرہ پھر بگڑ گیا۔

''مہمان برابری والوں کے ہوتے ہیں!'' ضیغم خان نے اپنا پھن کھول دیا۔

اس کے جملے کا زہر اڑ کر سیدھا محمد خان کے ذہن میں اترا، محمد خان کے سر نے اوپر کی سمت جھٹکا کھایا۔ جلدی سے مٹی کا گھڑا اٹھا کر وہ ہینڈ پمپ کی طرف چلا گیا۔ ضیغم خان نے بڑی رعونت کے ساتھ، ترچھی نظروں سے اسے دیکھا۔

''یہ تمھاری ضد تھی کہ تم یہاں ڈیم پر رہنا چاہتے ہو،'' ضیغم خان نے میری طرف دیکھا، ''ورنہ گل جاگیر میں میرا بہت آرام دہ ڈیرا ہے۔''

''میں یہاں آرام کرنے کے لیے نہیں ٹھہرا تھا،'' میں نے کہا۔ ''میں تو یہاں کا ماحول دیکھنا چاہتا تھا۔''

''تو پھر دیکھ لیا؟'' ضیغم خان کی آواز ابھی تک کرخت تھی۔

''ہاں،'' مجھے یوں لگا جیسے میری آواز میں بھی تختی ہے۔ ''مرچی بہت مزیدار تھی۔''

میرا طنزیہ جملہ ضیغم خان کے لیے بچھو ثابت ہوا۔

''کیا مطلب ہے تمھارا؟'' اس نے تڑپ کر کہا۔ ''کیا ان کے لیے روز دنبے روسٹ کراؤں؟''

''میں نے یہ تو نہیں کہا۔'' میری آواز پھر آہستہ ہو گئی۔ ''لیکن مرچی...'' میری آنکھیں ضیغم خان کی آنکھوں کے بالکل سامنے تھیں۔ ''وہ سب بیمار ہو جائیں گے۔''

''تیرے چاچے کے بیٹے ہیں یا مامے کے...'' ضیغم خان کا لہجہ غصیلا ہو گیا۔ ''کیا لگتے ہیں تیرے؟''

''میرے کچھ نہیں لگتے،'' میں نے جواب دیا، ''لیکن انسانیت کے ناتے سے...''

''او تم...'' ضیغم خان نے میرا جملہ کاٹ دیا۔ ''تم کالجوں کے لڑکے، جو کالج کی کینٹینوں میں بیٹھ کر انسانیت انسانیت کرتے ہو، وہ سب باتیں ہیں، صرف باتیں۔ زندگی سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔'' اس کا لہجہ بلند ہو گیا۔

Scanned with CamScanner

دور ہینڈ پمپ پر نلکے کے نیچے خالی گھڑا پڑا تھا۔ محمد خان نہ جانے کدھر چلا گیا تھا۔ ضیغم خان نے پہلو بدلا۔

''سن رہے ہو تم؟'' اس نے بلند لہجے میں کہا۔ ''انسانیت صرف کتابی چیز ہے۔''

ضیغم خان کا یہ جملہ سن کر میں نے اس کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

''انسانیت صرف کتابی چیز نہیں ہے خان صاحب! انسانیت کے بغیر زندگی، انسانی زندگی، کوئی شے نہیں ہوتی...''

''خاہ!'' ضیغم خان نے سر کو جھٹکا دیا۔ ''انسانیت! ایک دن کسی کو روٹی کھلانی پڑ جائے تو پتا چل جائے تمھاری انسانیت کا!'' ضیغم خان نے جملے کو جیسے دانتوں میں پیسا۔

''یہ لڑکے مفت کی روٹی تو نہیں کھاتے۔'' میں براہِ راست حملہ آور ہوا۔

''کیا؟'' ضیغم خان کو میری جانب سے اس حملے کی شاید توقع ہی نہ تھی۔ لمحہ بھر خاموشی رہی، پھر ضیغم خان کی عقابی آنکھیں بھینچ کر لمبی سی ہو گئیں، ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں۔

''اومڑا...'' وہ آہستہ سے بولا۔ ''تو جرنیل اکبر خان کی پارٹی کا سُرخا وُرخا تو نہیں ہے؟''

''نہیں، میں کوئی سُرخا وُرخا نہیں ہوں،'' میں نے ناگواری سے کہا اور ضیغم خان کی آنکھیں پھر کھل گئیں۔

''تو پھر تجھے کیا تکلیف ہے؟'' اس نے چہرے کو اوپر کی سمت جھٹکا دیا۔

''کیا اپنے جیسے انسانوں سے ہمدردی رکھنا صرف سرخوں کا کام ہے؟'' میں نے تیزی سے کہا۔ ضیغم خان خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے بڑی سنجیدگی سے میری طرف دیکھا۔

''دیکھو... میری بات سنو!'' اس کا لہجہ بہت بہتر ہو گیا۔ ''یہ جو دنیا ہے... یہ تم نے ابھی نہیں دیکھی۔ ناتجربہ کار ہو۔ یہ جو دنیا ہے، اس کا سارا نظام اللہ نے خود بنایا ہے۔ ایک شخص کی صورت دوسرے سے نہیں ملتی، پانچ انگلیاں برابر نہیں ہیں۔ یہ امیری، یہ غریبی، یہ سب اللہ کا نظام ہے... یہ فرق خود اللہ نے ڈالا ہے۔ کچھ وہ ہیں جن پر اس کا انعام ہے، کچھ وہ ہیں جن پر اس کا غضب ہے... تم اللہ کا شکر ادا کیوں نہیں کرتے کہ اس نے تمھیں ان لوگوں میں شامل کیا ہے جن پر اس کا انعام ہے؟'' ضیغم خان مولوی بن گیا۔

Scanned with CamScanner

"تو کیا ان پٹھان لڑکوں پر..." میں نے کیمپ کی طرف اشارہ کیا، "کیا ان پر اللہ کا غضب ہے؟"

"یہ میں نہیں جانتا،" ضیغم خان نے کہا۔ "ہر کوئی اپنا مقدر لے کر آتا ہے۔"

"دیکھو ضیغم خان!" میں نے جواب دیتے ہوئے کہا، "اس دنیا میں ہر آنے والا اپنے حصے کے سکھ اور اپنے حصے کے دکھ لے کر آتا ہے، لیکن کچھ لوگ اپنے حصے کے دکھ دوسروں کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں اور ان کے سکھ چھین لیتے ہیں... رہا الزام تو وہ مقدر پر دھر دیا جاتا ہے..."

"کیا مطلب ہے تیرا؟" ضیغم خان کی عقل اس کے بدن کی طرح موٹی تھی۔ "کیا کہنا چاہتا ہے تو؟"

"یہ لڑکے جنھیں تم صوبہ سرحد سے لائے ہو، یہ تمھارے اپنے ہیں ضیغم خان..." میری آواز پھر آہستہ ہوگئی۔ "یہ سب اس دنیا میں صرف دکھ ہی تو لے کر نہیں آئے ہوں گے۔ ان کے حصے کے کچھ سکھ بھی تو ہوں گے۔ ان کی جھولیاں، ان کے دامن، ان کے ہاتھ خوشیوں سے خالی کیوں ہیں؟"

"کیا میں قصوروار ہوں؟" ضیغم خان نے دفاعی انداز میں اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "میں ان کو مزدوری دیتا ہوں۔ مزدوری کا اسّی فیصد باقاعدگی سے ہر مہینے ان کے ماں باپ کو بھجواتا ہوں، سو روپے میں سے اسّی گئے، باقی بیس سے ان کی روٹی چلتی ہے۔ کپڑے بھی دیتا ہوں... اور... کیا اپنی کھال اتار کے دے دوں؟"

آخری جملے پر ضیغم خان کا انداز پھر جارحانہ ہوگیا، لہجہ پھر بلند ہوگیا۔

"یہ جو کچھ کھا رہے ہیں،" مجھے اپنا گہرا سانس لینے میں اٹکا محسوس ہوا، "یہ جو کچھ کھا رہے ہیں، یہ انسانوں کی خوراک تو نہیں ہے۔"

"او مڑا..." ضیغم خان جھنجلا سا گیا۔ "ان خچروں کو کچھ نہیں ہوگا۔ تم سے اور مجھ سے زیادہ صحت مند رہیں گے۔"

"کیا تم ان کو خچر سمجھتے ہو؟" مجھے اپنی چھاتی میں مرچی کی سوزش محسوس ہوئی جو ابکائی کی طرح حلق کی سمت آتی محسوس ہوئی۔

"تو اپنے بھائی سے کہہ!" ضیغم خان کا لہجہ تلخ ہوگیا۔ "کہہ اسے کہ ہر مہینے تیس بکرے، آٹے

Scanned with CamScanner

کی بوریاں، چاول، گھی کے ڈبے، سب کچھ بھجوا دیا کرے ان کے واسطے۔''

''انھیں میرے بھائی تو صوبہ سرحد سے نہیں لائے،'' اب میرے لہجے میں غصہ ابھرا۔''میں لایا ہوں تو میری ذمہ داری ہے،'' ضیغم خان کا لہجہ، غصیلا لہجہ بلند ہو گیا۔''تو کون ہے مجھ سے جواب طلبی کرنے والا؟... جا... جا کر جسے بتانا ہے بتا دے... مجھے کسی کے باپ کی بھی پروا نہیں۔''

''میں نے کسی سے کیا کہنا ہے،'' میں نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے کہا۔''کل رات مرچی کھائی تھی، ابھی تک میرا گلا اور سینہ جل رہا ہے۔''

میرے اس جملے کے بعد خاموشی سی چھا گئی۔ ضیغم خان نے پلکیں جھپکتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر اس کی نگاہیں میرے چہرے پر جم گئیں۔

''تیرا بھائی بہت اچھا ہے... بہت شریف۔ تیرے بھائی سے میرے بہت اچھے تعلقات ہیں۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتا ہے، میں اپنے کام سے کام رکھتا ہوں۔ نہ اس نے کبھی مجھے شکایت کا موقع دیا ہے اور نہ میں نے اسے۔'' اب ضیغم خان نے بھی اپنے غصے کو جیسے دبا لیا۔''بہت لحاظ ہے مجھے تیرے بھائی کا... اگر تیری جگہ کوئی اور ہوتا... '' وہ ہنسنے لگا۔''شکر کر یہ سرحد نہیں ہے۔ سرحد ہوتی تو میں نہ چاہتے ہوئے بھی تجھے گولی مار دیتا۔'' وہ ایک دم سنجیدہ سا ہو گیا۔''او مڑا... نہ مارتا تو وہاں لوگ مجھے طعنوں کی گولیوں سے مار دیتے۔''

میں افغانوں اور پختونوں کے معاشرتی رویوں کو، ان کی ثقافتی روایات کو بخوبی جانتا تھا۔ پھر بھی مجھے ضیغم خان کو صدمہ پہنچانے میں بہت لطف آیا تھا۔

''یہ تم نے ابھی ابھی کیا کہا تھا کہ... '' میں نے کہا،'' کہ اس دنیا کا سارا نظام اللہ کا بنایا ہوا ہے؟''

''اس میں کیا شک ہے؟'' ضیغم خان بولا۔

''اور تم نے یہ بھی کہا تھا کہ دنیا میں تفریق خود اللہ نے ڈالی ہے؟'' میرا لہجہ سوالیہ تھا۔

ضیغم خان نے غور سے مجھے دیکھا۔

''ہاں کہا تھا، اور درست کہا تھا،'' ضیغم خان نے کہا،'' یہ میرا ایمان ہے۔''

''تو پھر تمھارے ایمان میں یہ بھی ہو گا،'' میں نے بات جاری رکھی،'' کہ اس دنیا میں ہونے

Scanned with CamScanner

والے ہر عمل اور ہر بات پر، یہاں تک کہ ہر چیز پر اللہ ہی کا حکم چلتا ہے۔"

میرے مسلسل سوال کرنے پر ضیغم خان حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا کہ میں نے یہ کیا موضوع چھیڑ دیا ہے۔

"بالکل، بالکل،" وہ تیزی سے بولا۔ "اللہ وحدہ لاشریک ہے اور ہر چیز پر قادر ہے۔"

"تو پھر فرق ڈالنے کے لیے بادل اور ہوا اس کا حکم کیوں نہیں مانتے؟"

میرے جملے پر ضیغم خان کے چہرے پر کھچاؤ سا آ گیا۔

"کیا کہنا چاہتا ہے تو؟" اس کے ماتھے پر شکنیں ابھریں۔

"بادل جب برستے ہیں تو وہ کب دیکھتے ہیں کہ..." میں نے کہنا شروع کیا، "کب دیکھتے ہیں کہ وہ کسی زمیندار کی بہت بڑی اراضی پر برس رہے ہیں یا کسی کسان کی چھوٹی سی کھیتی پر؟ ہوا تمھارے پھیپھڑوں میں بھی اترتی ہے اور کیمپ کے پٹھان لڑکوں کے بھی... کسی بہتی ہوئی ندی نے آج تک یہ دیکھ کر رخ نہیں بدلا کہ اس کے کنارے پر کسی غریب نے جھونپڑی ڈال لی ہے۔ شبنم کے قطرے پھولوں کی پتیوں پر بھی اترتے ہیں اور مٹی میں پڑے ہوئے خشک تنکوں پر بھی... یہاں فرق کیوں نہیں ہے ضیغم خان؟"

"کیا مطلب ہے تمھارا... یہ... کہ..."

ضیغم خان کا جملہ اب میں نے کاٹ دیا۔

"دیکھو ضیغم خان... فطرت کی قوت نے اپنے مظاہر سب کے لیے یکساں رکھے ہوئے ہیں۔ بچہ چاہے ماسکو میں پیدا ہو یا واشنگٹن میں، روتے ہوئے ہی پیدا ہوتا ہے۔ تم نے ابھی کچھ دیر پہلے سرخوں کی بات کی تھی... وہ کہتے ہیں کہ انسان گورا ہو یا کالا، لال ہو یا پیلا، بھورا ہو یا دودھ کی طرح سفید، اس کے خون کا رنگ سرخ ہوتا ہے... میں کہتا ہوں کہ اس دنیا کے کسی حصے میں بھی چلے جاؤ، جب بھی کوئی انسان روتا ہے تو آنسو کے قطرے، پانی کے قطروں جیسے ہی شفاف ہوتے ہیں۔ خون تو پھر بھی ہلکا اور گہرا سرخ ہو سکتا ہے، آنسو صاف پانی کی طرح شفاف ہوتے ہیں — دکھ کی یکسانیت دنیا بھر میں ہر جگہ موجود ہے... کوئی تفریق نہیں... فرق کا یہ نظام، اس دنیا میں تفریق کا نظام آدمیوں کا بنایا ہوا ہے..."

ضیغم خان کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اس کی آنکھوں میں چمک سی آئی۔

''ادھر جنگل میں...'' ضیغم خان نے مسکراتے ہوئے کہا، ''ادھر جنگل میں...'' اس نے زیتون کے جنگل کی سمت اشارہ کیا۔ ''رات کے وقت... چیتے اور بھیڑیے ہرنیالوں اور خرگوشوں کو چیر پھاڑ دیتے ہیں، ہرنیال اور خرگوش انھیں کیوں نہیں چیر پھاڑ دیتے... یہ فرق کس نے ڈالا ہے؟'' ضیغم خان نے پہلی بار بہت مضبوط دلیل پیش کی۔

''فطرت کے مظاہر شدید بھی ہیں لطیف بھی...'' میں نے جواب دیا۔ ''فطرت کے شدید مظاہر ہی مکمل زندگی نہیں ہیں۔ لطافت کا بھی ایک روشن وجود ہے اور زندگی کا مقصد ہی شدت اور کثافت سے لطافت کی سمت جانا ہے۔ نامکمل قوت کو مکمل کہنا حماقت ہوگی۔ نامکمل تفریق کو سچائی سمجھ لینا کہاں کی عقلمندی ہوگی؟''

''یہ مشکل باتیں میرے پلّے نہیں پڑتیں،'' ضیغم خان نے کہا، ''اور نہ ہی میں ان چکروں میں پڑنا چاہتا ہوں۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ اللہ نے دنیا میں کسی کو حاکم بنایا ہے، کسی کو غلام، کسی کو عزت دی ہے کسی کو ذلت... اور وہ جو ابھی ابھی تو نے بادل ہوا اور پانی کی بات کی تھی...''

''آگ کی بات کرنا میں بھول گیا تھا،'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا، ''جلانے پر آتی ہے تو یہ نہیں دیکھتی کہ کسی غریب کا کچا مکان ہے، دیمک زدہ شہتیر ہیں یا کسی بادشاہ کا محل اور صندلی دروازے اور کھڑکیاں ہیں... سب کچھ بھسم کر دیتی ہے۔''

''اس کا بھی جواب ہے میرے پاس،'' ضیغم خان نے جملے پر زور دے کر کہا۔ اس کی آنکھیں بھنچ گئیں۔ ''اللہ نے یہاں بھی فرق ڈالا ہے۔ تو نے کہا تھا کہ بادل یہ نہیں دیکھتے کہ وہ بڑے زمیندار کی جاگیر پر برس رہے ہیں کہ غریب کے کھیت پر — اس میں بھی فرق ہے... تیری عقل وہاں تک نہیں پہنچی۔ سن — اللہ نے زمیندار کو مربعے دیے ہیں، اس کی وسیع اراضی پر بادل زیادہ برستے ہیں، غریب کو چھوٹا سا کھیت دیا ہے، وہاں پانی کم برستا ہے۔ وہ جسے جتنا چاہے دیتا ہے، اس نے جتنا دینا ہوتا ہے اتنا ہی دیتا ہے... آئی بات تیری عقل میں؟''

''تو کیا اس زمین پر...'' میں نے ضیغم خان کی دلیل کو ردِ دلیل سے کاٹتے ہوئے کہا، ''کیا اس زمین پر فرشتوں نے آ کر زمین کی پیمائش کی تھی؟''

''میں نہیں جانتا،'' ضیغم خان نے کہا۔ ''جس کو طاقت ملی ہے، اس کی زمین بھی ہے۔''

''تو کیا طاقت اس لیے ملتی ہے کہ ظلم کیا جائے، دوسروں کا حق چھینا جائے اور پھر اسے اللہ کی مرضی قرار دے دیا جائے؟'' میں نے کہا۔

''یہ میں نہیں جانتا!'' ضیغم خان نے تیزی سے کہا۔ ''میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ میرے اللہ نے مجھے اونچا درجہ دیا ہے۔ میں اس کا شکر گذار ہوں۔ میں مسلمان ہوں... سچا مسلمان! مجھ پر میرے اللہ کا انعام ہے۔ میں اس کا حکم مانتا ہوں۔ نماز پڑھتا ہوں، روزے رکھتا ہوں، حج کر چکا ہوں، زکوٰۃ دیتا ہوں... میرے اللہ نے مجھے آقا بنایا ہے اور مزدور لڑکوں کو میرا محتاج بنایا ہے۔ میں ان کے لیے روزی کا وسیلہ ہوں اور مجھے وسیلہ میرے اللہ نے بنایا ہے۔ میرے اللہ نے مجھے بہت دولت دی ہے۔ جو میں کھاتا پیتا ہوں وہ مجھے میرے اللہ نے دیا ہے۔ جو یہ لڑکے کھا رہے ہیں، اللہ نے ان کے مقدر میں یہی لکھا ہے۔ یہ بات تمھیں بہت بری لگی ہوگی...'' ضیغم خان نے میری آنکھوں میں غور سے دیکھا۔ ''لیکن یہی دنیا کا دستور ہے، نظام ہے، جو اللہ نے بنایا ہے۔ اسی پر میرا ایمان ہے اور یہی میرا دین بھی ہے کہ جو کچھ ہے اللہ نے ہی قائم کیا ہے... ٹھیک ہے میں اچھا آدمی نہیں ہوں...'' ضیغم خان نے پہلو بدلا۔ ''میں شراب پیتا ہوں، گناہ بھی ہو ہی جاتے ہیں — پروا نہیں۔ وہ میرا پاک پروردگار ہے، بڑا رحم کرنے والا، بخش دینے والا... میں جس کی امت میں ہوں، اس کا وعدہ ہے کہ وہ امت کو بخشوا لے گا،'' ضیغم خان نے جیسے فیصلہ ہی سنا دیا۔

''تو کیا...'' میرے لہجے میں تلخی بڑھ چکی تھی۔ ''تو کیا یہ پٹھان لڑکے کسی اور کی امت ہیں؟'' مرچی کی جلن ایک بار پھر مجھے سینے میں محسوس ہوئی۔ ''کیا یہ پٹھان لڑکے مسلمان نہیں ہیں؟ کیا یہ اللہ کا حکم نہیں مانتے؟ کیا یہ اس لیے غریب ہیں کہ اللہ نے انھیں غریب بنایا ہے؟ کیا ان پر اللہ کا غضب ہے؟ اگر ہے تو کیوں ہے؟ کیا ان پر رحم کرنے والا اور انھیں بخشنے والا کوئی نہیں ہے؟ واہ خان صاحب واہ، کیا ایمان ہے آپ کا!''

میرے جملے پر ضیغم خان کی آنکھیں سکڑیں، چہرے پر تشنج بڑھ گیا۔

''او...'' اس نے غور سے میری طرف دیکھا، ''ایک بات تو بتا۔''

''کیا؟'' میں نے پوچھا۔

Scanned with CamScanner

''کیا تو مسلمان ہے؟'' میں ضیغم خان کی طرف سے اس سوال کا منتظر نہیں تھا۔

''میں صرف ایک انسان ہوں،'' میں نے جواب دیا۔

''تو یوں کہہ نا... '' وہ تیزی سے بولا، ''تو مسلمان نہیں ہے۔''

''کیا مسلمان انسان نہیں ہوتے؟'' میں نے کہا اور ضیغم خان سٹپٹا گیا۔

''یہ میں نہیں جانتا،'' اس کے لہجے میں بہت تیزی سی آ گئی۔ ''یا تو... تو مسلمان ہے یا کافر ہے — بس!'' ضیغم خان نے اونچی آواز میں غصے سے کہا۔

''دیکھو ضیغم خان،'' میں نے آہستہ سے کہا، ''میری ایک بات سن لو، پھر میں کچھ نہیں کہوں گا۔''

''کیا؟'' ضیغم خان کی آواز میں کپکپاہٹ سی نمودار ہوئی۔ یہی کپکپاہٹ اس کے بدن پر بھی ظاہر ہو رہی تھی۔ شاید اسے غصے کا اثر تھا جسے وہ دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''دیکھو ضیغم خان،'' میں نے کہنا شروع کیا، ''ہم یہاں دو بیٹھے ہیں۔ ایک تو ایک میں۔ چلو تمھارے مطابق، تم ایک سچے مسلمان ہو اور میں کافر ہوں۔''

میرے اس جملے پر ضیغم خان کے ہونٹ کپکپائے، جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔

''چلو ہم تصور کرتے ہیں،'' میں نے کہا، ''ہم تصور کرتے ہیں کہ یہاں چارپائیاں بچھی ہوئی ہیں اور ان پر اور لوگ بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان میں ایک عیسائی ہے، ایک بدھ کا ماننے والا، ایک ہندو ہے، ایک سکھ ہے، ایک یہودی ہے، ایک آتش پرست، ایک قبائلی بت پرست ہے، ایک کمیونسٹ ہے۔ پھر یہاں سائبیریا اور الاسکا کا اسکیمو یا افریقی بش مین بھی بیٹھا ہے جسے اپنے مذہب کا بھی علم نہیں ہے — سب یہاں بیٹھے ہیں۔ جب تک ان کے ساتھ ان کے عنوانات لگے ہوئے ہیں، جب تک وہ ان ٹائیٹلز کے نیچے ہیں، وہ الگ الگ ہیں — ہیں کہ نہیں؟''

''ہیں،'' ضیغم خان نے بات سمجھنے کی کوشش کی۔ اس کی کپکپاہٹ ختم ہو گئی۔

''یہ سب عنوانات، سب ٹائیٹلز ہٹا دو، باقی سب کیا رہ جائیں گے؟''

''کیا رہ جائیں گے؟'' ضیغم خان نے میرا سوال دہرایا۔

''صرف انسان،'' میں نے کہا۔ ''وہ صرف انسان رہ جائیں گے۔ جب تک وہ اپنے اپنے

عنوانات کے ساتھ ہیں—تم بھی، میں بھی—جب تک ہمارے ساتھ یہ ٹائیٹلز لگے ہوئے ہیں، ہم جدا جدا ہیں!... اور ایک ستم ظریفی یہ ہے کہ ان میں سے ہر کوئی اپنے مذہب کو، اپنے دین ہی کو سچا سمجھتا ہے، اور چاہتا ہے کہ سب اس کا مذہب، اس کا دین قبول کرلیں، کیونکہ وہ خود کو راہِ راست پر اور دوسروں کو گمراہ سمجھتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک خود کو راہِ حق پر اور دوسروں کو گمراہ سمجھتا ہے—ہر ایک کا یہی ایمان ہے، یہاں تک کہ جن کو اپنے مذہب کا بھی علم نہیں وہ بھی اپنے آبا و اجداد کے طور طریقوں ہی کو درست مانتے ہیں۔ یہ جو تم سرخوں کی بات کر رہے تھے، یہ کمیونسٹ بھی صرف اور صرف اپنے نظریے ہی کو درست سمجھتے ہیں۔ خود کو آزاد اور باقی تمام دنیا کو غلام سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ سب کمیونسٹ ہو جائیں۔ یہ بھی انسانوں کے گروہ سے الگ ہیں۔ اسی طرح طاقتور، کمزور، امیر غریب—سب عنوانات ہیں۔ حاکم محکوم، آقا غلام، یہ سب ٹائیٹلز ہیں۔ شاید کوئی یہاں یہ دلیل دے کہ صحت منداور بیمار بھی کیا عنوانات ہیں؟ ہاں ہیں، دکھی بھی اور سکھی بھی، سب انسان ہیں۔ صحت مند بیمار ہو سکتا ہے، بیمار صحت مند ہو سکتا ہے۔ دو کمزور مل کر ایک طاقتور کو کمزور بنا سکتے ہیں۔ عنوان پھر بھی لگا رہے گا کیونکہ یہ دنیا کا نظام—آدمیوں کا اپنا بنایا ہوا ہے...'' میں پل بھر کے لیے رکا۔ ''میں انسان ہوں... صرف انسان...''

اچانک ضیغم خان پر چھائی ہوئی ناگواری یکسر ختم ہوگئی۔ اس کے چہرے پر سکون سا نمایاں ہوا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ سی آگئی۔

''میں سمجھا... میں سمجھ گیا!'' وہ تیزی سے بولا۔ ''تو یہ سمجھتا ہے کہ ہندو مسلم سکھ عیسائی سب برابر ہیں؟ اومڑا، یوں کہہ نا—تو باچا خان کی پارٹی کا بندہ ہے... پر وہ تو غدار ہے۔''

''کیا مصیبت ہے!'' میں چڑ کر چیخا۔ ''میرا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے... کوئی واسطہ نہیں ہے۔ میں کسی باچا خان کی پارٹی کا بندہ نہیں ہوں۔ میرا زندگی گزارنے کا اپنا راستہ ہے۔ یہ راستہ میرے ذہن میں بہت روشن ہے اور میں اسی پر چلوں گا—میں تو کسی بنائے ہوئے راستے پر، کسی کے پیچھے نہیں چلتا۔ آج تک اس دنیا میں جتنے راستے بنائے گئے ہیں، میرا راستہ سب سے جدا ہے... لیکن اگر سب ذرا سی روشن خیالی سے کام لیں، تنگ نظری چھوڑ دیں، اپنے انسان ہونے کا شعور حاصل کرلیں تو میرا راستہ خود بخود سب کا راستہ بن جائے گا۔''

میں ضیغم خان سے خاصا چڑ چکا تھا۔ ضیغم خان بھی میری اس کیفیت کو محسوس کر رہا تھا۔ وہ غصے سے اٹھا۔ دو قدم جیپ کی سمت جا کر رکا، مڑا۔

"او... " وہ غصے سے بولا، "تو تو پاگل ہے... دیوانہ ہے... سویرے سویرے میرا مغز بھی خراب کر دیا۔"

وہ غصے سے بولتا ہوا جیپ کے قریب گیا۔

"جا، کہیں جا کر دماغ کا علاج کرا!"

وہ بڑبڑاتا ہوا جیپ میں بیٹھا، جیپ اسٹارٹ کی، ریورس کی، جیپ نے تیزی سے نیم دائرہ بنایا اور یوں گلی جاگیر کی طرف اڑی جیسے جیپ بھی شدید غصے میں ہو۔

"میں دیوانہ ہوں!" میں نے تلخی سے سوچا۔ "ہاں میں دیوانہ ہوں۔ مجھے اپنی یہ دیوانگی بہت اچھی لگتی ہے۔ میں دیوانہ ہوں، باقی سب فرزانے ہیں۔ وہ جو خود کو دوسرے انسانوں سے بدتر سمجھتے ہیں۔ وہ جو اپنے حصے کے دکھ دوسروں کی جھولیوں میں ڈال دیتے ہیں اور دوسروں کے سکھ چھین لیتے ہیں۔ وہ جو استحصال کرتے ہیں۔ وہ جو اپنے جیسے انسانوں کو کبھی طاقت سے، کبھی عیاری سے لوٹتے ہیں۔ کبھی مذاہب کے لبادے پہن کر، کبھی نظریاتی مکاری کی نقاب پہن کر، وہ جو دلدل کی جونکوں کی طرح، ہم جنسوں کا خون چوستے ہیں — سب فرزانے ہیں، سب فرزانے ہیں۔"

مجھے اپنے قریب کسی کا احساس ہوا۔ محمد خان میرے قریب کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پھلاہی کی مسواک تھی۔

"چلا گیا!" محمد خان نے کڑواہٹ سے کہا۔ "انگریزوں کے ساتھ رہ رہ کر لاٹ صاحب بن گیا ہے — برابری کا پتر... خوچہ... خر دماغ۔"

محمد خان نے منہ میں بھرا مسواک کا پانی زور سے ایک سمت تھوکا، پھر مسواک کو بھی گھما کر جھیل کی سمت پھینکا۔ اس کے ذہن میں ضیغم خان کے کہے ہوئے جملے کا زہر خاصا پھیل چکا تھا۔ خیمے کے قریب پڑے پانی کے گھڑے سے، جسے وہ نلکے سے اٹھا لایا تھا، اس نے پانی مٹی کے پیالے میں انڈیلا اور کئی بار رخسار پھلا پھلا کر کلیاں کیں۔ پھر وہ خیمے کے اندر گیا۔ خیمے کے اندر، اس کی آواز بلند ہوئی: "پراٹھے بھی ٹھنڈے ہو گئے... خوچہ... خر دماغ۔"

Scanned with CamScanner

11

ناشتے کے بعد میں ریسٹ ہاؤس کے لان کو جھیل سے الگ کرنے والی دیوار کے ساتھ چلتے چلتے، زیتون کے مصنوعی جنگل کے سامنے اس کھلی جگہ پر گیا جہاں رات کو بھیڑیے نہ جانے کس ذہنی ہیجان میں مبتلا تھے۔ جنگل کے اندر سے ابھی تک پرندوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

''پٹھان لڑکے صرف اسی صورت میں ضیغم خان کے پنجے سے نجات حاصل کر سکتے ہیں اگر میں بھائی کو سب کچھ بتا دوں،'' میں نے سوچا۔ ''میں بھائی کو بتا دوں گا کہ کیمپ میں لڑکوں کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے۔''

میں کھلی جگہ سے ہو کر شمال مشرق میں سرکنڈوں کے سامنے، گہرے سبز رنگ کی کائی میں کھلے ہوئے کنول کے پھولوں کی سمت چلا گیا۔ میری ذہنی حالت پرائمری اسکول کے اس چھوٹے بچے جیسی ہو چکی تھی جو شکایت کرنے کی تیاری کر رہا ہو۔ کنول کے پھولوں پر اب وہ چھوٹے چھوٹے پرندے بھی نہیں تھے جنھیں دیکھ کر مجھے اپنے وجود کا انوکھا احساس ہوا تھا — اتنی بڑی کائنات میں اتنا چھوٹا لیکن مکمل وجود — ایسا وجود جو اڑتے ہوئے ہوا میں خود کو ساکن کرتے ہوئے، ہوا کو اس کے وجود سے ناآشنا کر دے، اتنا چھوٹا لیکن اتنا مکمل... کنول کے پھولوں پر بہت سی شہد کی مکھیاں اڑ رہی تھیں۔

''زیتون کے جنگل میں بہت سے چھتے ہوں گے...'' میں نے تصور میں جنگل کے اندر جھانکا۔ اس کے ساتھ ہی مرچی کی کڑواہٹ پوری تلخی کے ساتھ ابھری۔ شکایت لگانے والا بچہ کہیں چھپ سا گیا۔ میرے ذہن میں سختی سی آ گئی۔

''خاموش رہنا تو سراسر زیادتی ہوگی،'' میں نے سوچا۔ ''میں بھائی سے کہوں گا کہ ضیغم خان کو اس ظلم سے روکنا ایک انسانی فرض ہے۔ ہمیں یہ فرض ادا کرنا چاہیے — میں بھائی سے کہوں گا کہ وہ اگلے برس کا ٹھیکہ ضیغم خان کو نہ دیں... کانٹریکٹ پر انھی کے دستخط ہوتے ہیں، ان کی رضامندی کے بغیر ضیغم خان کو ٹھیکہ مل ہی نہیں سکتا۔ وہ فیلڈ انجینئر ہیں، پائپ لائن کے انچارج ہیں۔ میں ان سے کہوں گا کہ ضیغم خان کی ہمیشہ کے لیے چھٹی کرا دیں۔''

Scanned with CamScanner

میں کنول کے پھولوں کے قریب رک گیا۔

''آخر اور ٹھیکے دار بھی تو ہوں گے۔ اس علاقے کے رہنے والے مقامی ٹھیکے دار بھی تو ہوں گے...''

مجھے فتح جنگ کے قریب کسی گاؤں کا رہنے والا مہتاب دین یاد آیا جس کی ایک آنکھ پھوٹی ہوئی تھی اور جسے سب مذاق میں ''تابو کانا'' کہتے تھے۔ مہتاب میں شاید کسی بات پر برا ماننے کی حس ہی نہیں تھی۔ وہ ہنستا رہتا تھا۔ مہتاب دین کمپنی کے بہت چھوٹے چھوٹے کام ٹھیکے پر لے کر ضیغم خان جیسے گھنے درخت کے نیچے ایک کمزور پودے کی طرح اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا تھا۔

''میں بھائی سے کہوں گا کہ وہ اگلے سال کا ٹھیکہ مہتاب دین کو دے دیں۔''

جہاں پانی سرکنڈوں میں گم سا ہو جاتا ہے، وہاں ایک بڑا سا بگلا نظر آیا۔ نہ جانے کس چیز پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی لمبی لمبی ٹانگیں پنجوں سے کچھ اوپر تک پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ میری نگاہیں کنول کے پھولوں کے نیچے لمبی ڈنڈیوں کی سمت گئیں جو جھیل کی گہرائی میں چھپی دلدل تک جاتی ہیں، جہاں ان کی جڑوں سے کیچڑ چمٹا ہوتا ہے۔

''ٹھیکہ نہ ملنے پر لڑکے ضیغم خان کے چنگل سے آزاد ہو جائیں گے۔ وہ انھیں آزاد کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ یہاں کوئی اور کمپنی بھی نہیں ہے۔ میں مہتاب دین سے کہوں گا کہ ان پٹھان لڑکوں ہی کو کام پر لگا دے۔ مجھے یقین ہے کہ اسّی فی صد مزدوری ان کے ماں باپ کو بھجوا کر بھی انھیں اچھی خوراک دی جا سکتی ہے۔ مہتاب دین اچھا آدمی ہے۔ وہ میری بات ضرور مانے گا۔''

میں نے جیسے فیصلہ کر لیا کہ ضیغم خان کی چھٹی کرا کر ہی دم لوں گا۔ اس فیصلے نے مجھے ہر شے سے بے نیاز کر دیا۔ میں تیزی سے واپس خیمے کے پاس آیا اور بے چینی سے بھائی کا انتظار کرنے لگا۔

تقریباً ساڑھے نو بجے جب بھائی بکس کار پر کھوڑ سے تنازعہ ڈیم پہنچے تو ان کا موڈ بے حد خراب نظر آیا۔

''یقیناً وہ گلی جاگیر میں ضیغم خان سے مل کر آ رہے ہیں۔ اور ضیغم خان نے میرے خلاف بہت سی باتیں کی ہوں گی،'' میں نے سوچا۔

ریسٹ ہاؤس کے قریب بکس کار سے اتر کر انھوں نے بکس کار کے پیچھے بیٹھے میاں دُتے، ابراہیم، مہدی اور فتح خان میٹنے کو کچھ ہدایات دیں۔ ڈرائیور کھنڈر سے کچھ کہا۔ وہ بکس کار کو کیمپ کی

Scanned with CamScanner

طرف لے گیا۔ بھائی میرے پاس آئے۔

''رات کیسی گزری؟'' انھوں نے بہت خالی خالی لہجے میں کہا۔

''رات میں نے بھیڑیے دیکھے!'' میں بھول گیا کہ میں نے محمد خان کو یقین دہانی کرائی ہے کہ میں اس کے چھت پر سونے کی بات کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ بھائی بہت بیزار سے لگ رہے تھے۔ وہ آہستہ سے چارپائی پر بیٹھے۔

''ضیغم خان سے جھگڑنے کی کیا ضرورت تھی؟'' انھوں نے کہا۔

''میں نہیں جھگڑا،'' میں نے جواب دیا، ''بات صرف اتنی...''

''معلوم ہے مجھے!'' بھائی نے کہا۔ ''کیا ضرورت تھی پٹھان لڑکوں کے ساتھ مرچی کھانے کی؟''

میں پریشان سا ہو گیا۔ بھائی نے غور سے میری طرف دیکھا۔

''دیکھو...'' انھوں نے سمجھانے کے انداز میں کہا، ''ضیغم خان اٹک آئل کمپنی کا بہت پرانا ٹھیکے دار ہے۔ انگریز افسر اس سے بہت خوش ہیں۔ وہ ہر کام وقت پر کرتا ہے اور اس کا کام اعلیٰ کوالٹی کا ہوتا ہے۔ وہاں...'' انھوں نے مشرق کی سمت اشارہ کیا جہاں پتھریلی کچی سڑک پہاڑیوں اور برساتی نالوں سے ہوتی ہوئی چکری روڈ تک چلی جاتی ہے اور پھر وہاں سے راولپنڈی کی آئل ریفائنری مورگاہ کی طرف چلی جاتی ہے۔ ''وہاں مورگاہ میں کمپنی کے بڑے انگریز افسر ضیغم خان سے بہت خوش ہیں۔ تم میری پوزیشن کو نہیں سمجھتے۔ مجھے ضیغم خان سے بہت بنا کر رکھنی پڑتی ہے۔ انگریز افسروں کا حکم ہے کہ ہر سال ٹھیکہ ضیغم خان کو دیا جائے... وہ بہت طاقتور آدمی ہے...''

میرے کچھ کہے بغیر، میرے سارے سوچے ہوئے جملوں کو بھائی سے تنازعہ ڈیم کی جھیل میں ڈبو دیا۔ مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ ضیغم خان کا چوڑا منھ کوبرے کے پھن کی طرح میرے سامنے کھلا کھلا سا تھا۔

''میں ضیغم خان کو دشمن نہیں بنا سکتا،'' بھائی نے آہستہ سے کہا۔ ''تم شاید یہ سمجھ رہے ہو گے کہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کیمپ کے مزدور لڑکوں سے بہت غیر انسانی سلوک کرتا ہے۔ وہ انھیں بھی خچر اور گدھے سمجھتا ہے... لیکن مجھے اس سے کیا! اس کے اعمال اپنے ہیں، اس کے ساتھ

ہیں۔ مجھے تو صرف کمپنی کا کام دیکھنا ہے... جس روز اس کا کام غیر معیاری ہوگا، میں اس کی گردن پکڑلوں گا... وہ کیا کرتا ہے، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے... وہ ان مزدور لڑکوں سے متعلق بہت حساس ہے۔ اس معاملے میں وہ ایک جملہ سننا بھی گوارا نہیں کرتا۔ اگر اس نے کچھ لحاظ کیا ہے تو میری خاطر،'' بھائی نے بہت سنجیدگی سے کہا جس میں رنج نمایاں تھا۔'' وہ کچھ بھی کرسکتا تھا۔ غصے میں آدمی اندھا ہو جاتا ہے... جانتے ہو اس نے مجھے کیا کہا ہے؟... اس نے مجھے کہا ہے کہ میں تمھیں کسی ذہنی امراض کے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں یا تمھیں پاگل خانے میں داخل کرادوں۔''

میں خاموشی سے بھائی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ محمد خان قریب کھڑا باتیں سن رہا تھا۔ وہ مڑا، دوبارہ ریسٹ ہاؤس کے ہینڈ پمپ کی طرف چلا گیا، بغیر گھڑا اٹھائے۔ بھائی کے چہرے پر رنج نمایاں تھا۔

''میں نہیں چاہتا کہ تم کسی مسئلے سے الجھو، یا میرے لیے کوئی مسئلہ کھڑا کرو...'' انھوں نے آہستہ سے کہا۔'' کیا میں امید رکھوں کہ آئندہ تم سیر سپاٹے سے غرض رکھوگے؟ میں تمھیں سیر سے نہیں روکتا، لیکن مجھے امید ہے کہ تم آئندہ ضیغم خان کے معاملات میں دخل نہیں دوگے۔''

بھائی آہستگی سے اٹھے اور پیدل ہی پٹھان لڑکوں کے کیمپ کی طرف چلے گئے۔

مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں جھیل کے ساتھ، زیتون کے جنگل میں، بھیڑیوں کے نرغے میں ہوں اور وہ مجھ پر غرا رہے ہیں... آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے ہیں۔ اذیت کے اس احساس سے میں پہلے بھی کئی بار آشنا ہو چکا ہوں جو پورے وجود پر بے حسی بن کر اترتا ہے، لیکن اترنے سے پہلے ذہنی کیفیت کو اس بچے جیسی کر دیتا ہے جس کو ماں نے تھپڑ مارے ہوں۔ یہ احساس اس وقت شدید تر ہو کر اترتا ہے جب اپنی صداقت کا یقین بھی دل و دماغ میں روشن ہو اور ہر طرف سے مخالف قوتیں جھٹلاتے ہوئے، ذہنی اذیت میں مبتلا کر رہی ہوں۔ یہ احساس، اذیت کا یہ دوہرا احساس ذہن، دل اور بدن کو جلا دیتا ہے اور بے بسی ہوا بن کر آگ کو شعلوں میں پھیلانا شروع کر دیتی ہے... کچھ دیر بعد مجھ پر بے حسی اتری، پتھر کی طرح... پتھر کو بھی شاید اپنی سنگینی کا احساس کسی مرتعش ذرّے میں ہوتا ہوگا... میرے ذہن میں کچھ بھی نہیں تھا۔

Scanned with CamScanner

12

وہ چاشت بے حد تاریک تھی۔ مجھے تنہائی کا شدید ترین احساس ہوا۔ ابراہیم آیا اور محمد خان اس کے ساتھ چلا گیا۔ میں جھیل سے ملحق پہاڑ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر جھروکے نما چبوترے پر جا بیٹھا۔ ہر شے دھندلی دھندلی سی تھی۔ میں جھیل کی سمت یوں دیکھ رہا تھا جیسے میں ایک مورتی ہوں جسے جھروکے نما چبوترے میں نصب کر دیا گیا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ میری چھاتی پر دھرے پتھر میں شگاف نمودار ہوا۔

''کیا سوچا... کیا ہوا...'' میرے ذہن میں اذیت کا احساس طوفان کی طرح پلٹا اور گزر گیا۔ ''میں نہیں جانتا تھا کہ ہمیشہ مطمئن رہنے والے میرے بھائی کن حالات میں ملازمت کر رہے ہیں۔''

بھائی کے با اختیار ہونے کے باوجود اس قدر بے اختیار ہونے سے جبر کا ایک تاریک احساس میرے دل پر زخم لگا گیا۔ دل میں ٹیس سی اٹھی۔ جھیل پر میرے سامنے ایک بہت بڑا بگلا، سفید پر پھیلائے، لمبی گردن کو آگے کی سمت اور بھوری لمبی ٹانگوں اور پنجوں کو پیچھے کی سمت اکڑائے، یوں گزرا جیسے سلوموشن میں اڑ رہا ہو۔ دور کھیری مورت کا پہاڑی سلسلہ، پہاڑ کی ڈھلوانیں، ڈھلوانوں پر پھیلے ہوئے پھلاہیوں اور کریروں کے درخت، درختوں اور جھاڑیوں کے نیچے، غاروں میں چھپے ہوئے درندے، سوئے ہوئے چیتے، اونگھتے بھیڑیے، سہمے ہوئے ہرن اور خرگوش، نتھنوں کو سکیڑتے ہوئے گیدڑ اور بالوں کے گچھے جیسی دموں والی لومڑیاں، اوندھے پڑے ہوئے سؤر، دبکے ہوئے پارکوپائن اور گیند بنے ہوئے جھاچوہے، درختوں پر نیم خوابیدہ پرندے، جھاڑیوں کے نیچے کنڈلی مارے کوبرے، مٹی چاٹتی ہوئی دومونہیاں، زیتون کی شاخوں پر کینچلیاں چھوڑتے ناگ، جھیل کے کنارے درختوں پر مسلسل ریں ریں کرتے جھینگر، جھیل کے کنارے سرکنڈے، گہرے سبز رنگ کی کائی، پانی پر پھیلے ہوئے چوڑے پتے، کنول کے پھول، جل مرغے، شہد کی مکھیاں، مینڈک، کوے، مینائیں، چیلیں، گرجیں، کبوتر، فاختائیں، فیز نٹ، نیل کنٹھ، چھوٹے چھوٹے پرندے، چڑیاں، مچھر —— سب کچھ چشم تصور میں سلوموشن میں تھا۔ رنج، دکھ، شکست کا ایک اور احساس...

میں شکست کے اس احساس سے ناواقف نہیں تھا— میں اس احساس سے پہلے بھی دو چار ہو چکا تھا۔ مجھے بلکسر کا سائیں موسم یاد آیا جس نے پیر قدرت شاہ کے بیٹے پیر کوثر شاہ کی ڈھوک میں جبر و تشدد اور ذلت بھرے ماحول سے نکلنے کی ہامی بھرنے کے باوجود ڈھوک کو نہیں چھوڑا تھا۔ مجھے ماڑی گاؤں کی ملیاری[16] زینب یاد آئی جس کے ساتھ ملک کے بیٹے نے کھیتوں میں زنا بالجبر کیا اور پیر کے ڈیرے پر لگی عدالت میں مجھے زینب کے باپ رمضان ملیار کا ساتھ دینے پر پیر کے ملنگوں نے اٹھا کر ڈیرے سے باہر پھینک دیا تھا... شکست کا یہ احساس، جو پرائمری سکول میں دینیات کے ماسٹر کے ڈنڈے کی شدید مار سے شروع ہوا تھا، بار بار نئی جلن اور نیا درد لے کر آتا ہے...

میری نگاہیں کیمپ کی سمت گئیں جہاں پٹھان لڑکے جولائی کی اس تپتی چاشت میں، تیز دھوپ میں، پتھریلی کچی سڑک پر اوندھے ہو کر کدالیں چلا رہے تھے، بیلچوں پر پتھر اور مٹی اٹھا کر گدھوں پر رکھی کھلی، دونوں جانب سے کھلی، بوریوں میں ڈال رہے تھے۔ گدھوں پر سوٹیاں برسا رہے تھے، گالیاں دے رہے تھے، شور مچا رہے تھے۔ مجھے ایک بار پھر حلق اور سینے میں مرچی کی سوزش کا احساس یوں ہوا جیسے گلے سے سینے تک لمبی خراش پڑ گئی ہو۔

''آخر ہر بار مجھے ہی شکست کیوں ہوتی ہے؟'' میں نے کڑواہٹ سے سوچا۔ ''ہر بار مجھے ہی کیوں اذیت جھیلنا پڑتی ہے؟ ہر بار مجھے ہی ہزیمت کا سامنا کیوں کرنا پڑتا ہے؟ مجھے اپنی صداقت کا مکمل یقین ہے۔ میں ظلم کو ظلم کہتا ہوں، جھوٹ کو جھوٹ کہتا ہوں، باطل کو میں ہمیشہ باطل ہی قرار دیتا ہوں... مفاہمت نہیں کرتا۔ ظلم اور باطل کو مٹانے کی کوشش بھی کرتا ہوں۔ پھر بھی ہر بار مجھے ہی پسپائی ملتی ہے۔''

میرا ایک بار پھر جی چاہا کہ کوئی میرے سامنے ہو جسے میں دیکھ سکوں... میری نگاہیں اوپر پھیلی ہوئی نیلی فضا کی سمت گئیں۔

''اے روحِ فطرت، تجھے اپنی لطافت کی قسم، ایک بار مجسم ہو کر میرے سامنے آ... میں تجھ سے بس اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس دنیا میں ہر بار خلوص اور سچائی ہی کو کیوں شکست ہوتی ہے؟ کس لیے؟... آخر کس لیے؟''

---

16 ملیار: کنجڑا۔ سبزیاں بیچنے والا۔ ملیاری: کنجڑن۔

جھیل کی سطح پر سورج کی کرنیں پوری طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ ہوا کے جھونکوں سے جھیل کے پانی پر ارتعاش نمایاں تھا۔ لہریں بار بار چمک جاتی تھیں۔ ہوا میں تپش بڑھ رہی تھی۔ درختوں کے تنوں اور ٹہنیوں سے چمٹے جھینگر، ان کے پروں سے اٹھتی ہوئی ریں ریں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ کچھ دور زیتون کے درختوں پر فاختائیں اڑ اڑ کر بیٹھ رہی تھیں۔ سرکنڈوں کی جانب اوپر فضا میں سفید چیلیں اڑ رہی تھیں۔ مغرب کی سمت میں نے کچی سڑک پر ضیغم خان کی جیپ کو آتے دیکھا۔ میں نے منہ پھیر لیا اور سرکنڈوں کے سامنے گہرے سبز رنگ کی کائی میں کنول کے پھولوں کو دیکھنا شروع کر دیا۔ گلابی پھولوں میں اکا دکا دودھیا سفید کنول بہت چمکتا نظر آ رہا تھا۔ پھولوں پر شہد کی مکھیوں کے ساتھ ساتھ تتلیاں بھی اڑ رہی تھیں۔ پھر میری نظریں کھیری مورت کے پہاڑی سلسلے کی چوٹیوں کی سمت چلی گئیں۔ دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ فطرت کی شدید قوت — قوتِ شر — مجسم ہو کر میرے سامنے آئے، میں اس سے دو دو ہاتھ تو کر لوں...

''میں جانتا ہوں کہ اس دنیا تیری حکومت ہے۔ اس زمین پر قوتِ خیر کا نہیں، تیرا راج ہے۔ تو قوتِ شر ہے۔ میں جانتا ہوں تیرے کچھ تقاضے بھی ہیں۔ اس دنیا میں جو بھی تیرے تقاضوں کو پورا کرتا ہے، تو اسے کامیابی دیتی ہے۔ تو اسے عزت، دولت، شہرت اور ہر قسم کا آرام اور آسائش فراہم کر دیتی ہے... جو تیرا باغی ہوتا ہے اور تیرے تقاضے پورے نہیں کرتا، تو اسے بے حد تکلیفیں دیتی ہے۔ اس کے حصے کے سکھ چھین لینے میں اپنے ماننے والوں کی مدد کرتی ہے... تو تاریک قوت ہے۔ کوئی تجھے ابلیس کہتا ہے کوئی عزازیل، کوئی شیطان کہتا ہے تو کوئی اہرمن — میں تیری اصلیت سے واقف ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تو لافنا فطرت کی لامحدود وسعت میں تاریک اور محدود سایہ ہے۔ کائنات میں یہ زمین تیرا مسکن ہے۔ تو ایسا سایہ ہے جو لافنا فطرت کی لامحدود روشنی کی راہ ازل سے روک رہا ہے... اس لطیف روشنی کی راہ جس سے تو خود خوفزدہ ہے۔ اور یہ خوف تیرے اندر خود تیرا اپنا ہے... میں تیرے ہتھیاروں کو بھی جانتا ہوں۔ جبلتیں تیرے ہتھیار ہیں۔ تو ایسی قوت ہے جو جبلتوں سے تقاضے پیدا کرتی ہے۔ تو اپنا جال جبلی تقاضوں کے مضبوط تاروں سے بنتی ہے اور اس دنیا کے رہنے والوں کو حشرات الارض کی طرح پھانس لیتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ خوف اور خود غرضی تیرے قصرِ تاریک کے دو مضبوط ستون ہیں۔ یہ ہٹ جائیں تو تیرے تکبر کی سنگین عمارت دھڑام سے نیچے جا

Scanned with CamScanner

گرے گی۔ تو نے ازل ہی سے انسانی ذہن کو خوف اور خود غرضی کا اسیر بنا رکھا ہے... تو ایک تاریک قوت ہے... جھوٹ ہے، باطل ہے... اسی لیے تو اپنے آپ کو منواتے رہنے کے لیے جبر و تشدد کا سہارا لیتی ہے۔ تو باطل قوت ہے... سچائی کو، اپنے آپ کو منوانے کے لیے جبر و تشدد کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔ سچائی اپنے آپ کو کسی جبر کے بغیر منوا لیتی ہے۔ لاکھ انکار کرنے کے باوجود بھی منکر کے دل میں صداقت کا احساس موجود رہتا ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تو فطرت کی لا انتہا اور لافانی روشنی کی راہ روکنے کی کوشش تو کرتی ہے، روک نہیں پاتی۔ تو فطرتِ لطیف کی کرنوں کو ختم نہیں کر سکتی۔ تو اس دنیا میں رہنے والے انسانوں کے دلوں کو محدود کرتے ہوئے تاریک تو بنا دیتی ہے، سنگین تو کر دیتی ہے، لیکن ان میں لطافت کی روشنی ایک کرن کی طرح جگمگاتی رہتی ہے۔ تو اسے تاریکی کے دبیز پردوں میں ملفوف تو کر دیتی ہے، تو اسے سیاہ سنگین دیواروں میں قید تو کر دیتی ہے، لیکن اس کا وجود ختم نہیں کر سکتی۔ اور جب بھی انسانی زندگی اس شعاع زندگی کو شعور کی مدد سے حاصل کر لیتی ہے، دبیز پردے ہٹ جاتے ہیں، پتھروں میں شگاف نمایاں ہو جاتے ہیں اور ضمیر کی یہ شعاع راہ پاتے ہی پشیمان دلوں کو منور کر دیتی ہے — جب تو دیکھتی ہے کہ کوئی انسان ضمیر کی روشنی پا کر تیرے جال سے نکلنا چاہتا ہے، تو فوراً اسے سزا دیتی ہے — اسی عمل کے ساتھ جسے اس نے تیری رضا جوئی کے لیے کیا تھا، تا کہ دنیا پر تیری دھاک قائم رہے اور تیرا پُرفریب نظام قائم رہے۔ تو انتہائی مکاری کے ساتھ مکافاتِ عمل سے بیگانہ ہو جاتی ہے کیونکہ یہ تو بھی جانتی ہے کہ ہر عمل کا ردعمل ضمیرِ کل ہی سے ممکن ہوا کرتا ہے — اسی روشنی سے جس سے تو ازل سے گریزپا ہے... یہ ہوتا رہا ہے — ہو رہا ہے — ایسا ہر انسان کے ساتھ ہوتا ہے، یہ سلسلہ ازل سے جاری ہے... لیکن تو صدیوں کی اس کشمکش کے بعد بھی، قرنوں کی اس طویل ترین جنگ کے بعد بھی، اندیشے سے دوچار ہے۔ تیرا قصرِ تاریک اس وقت لرزنے لگتا ہے جب تو خود اپنے خوف سے خوفزدہ ہو جاتی ہے۔ تو اچھی طرح جانتی ہے کہ تجھ سے بغاوت کرنے والوں، تیرے تقاضے پورے نہ کرنے والوں کے اچھے اعمال کا بھی ردعمل ہوتا رہا ہے، ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا... اور تو اسے روک نہ سکے گی۔ ضمیر کے اس ردعمل کو تو روک نہیں سکتی اور یہی بالآخر تیری حتمی شکست کا باعث ہوگا۔

13

محمد خان نے مجھے اشارے سے بلایا۔ میں سیڑھیاں اتر کر خیمے کے قریب گیا۔ دوپہر ہونے والی تھی۔ جولائی کی جھلستی دوپہر میں سیڑھیاں اترتے اترتے میں پسینے سے بھیگ گیا۔ گلے اور حلق سے کچھ نیچے مرچی کی سوزش پھر محسوس ہوئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے ایکائی سی آئی ہو اور سینے میں آگ لگی ہو۔ محمد خان نے بتایا کہ بھائی کا ارادہ جلدی واپس جانے کا ہے۔ انھوں نے کھوڑ پہنچ کر سہ پہر کے وقت میال آئل فیلڈ میں بھی جانا ہے۔ محمد خان نے الوداعی نظروں سے مجھے دیکھا۔

''بڑے صاحب ٹھیک کہتے ہیں... '' محمد خان نے کہا۔ ''وہ خوچہ... خر دماغ ہے خر دماغ... اسے چھیڑو گے تو دولتی مارے گا۔'' محمد خان کو ضیغم خان سے شاید اتنی ہی نفرت تھی جتنی میں محسوس کر رہا تھا۔ ''یہاں لان میں سونا بہادری تو ہوگی صاحب، لیکن اصل میں بیوقوفی ہوگی۔ جہاں بہادری کام نہ آئے، وہاں عقل کام آتی ہے۔ بس چھت پر چڑھ جاؤ اور تماشا دیکھو... '' محمد خان نے وہ سب کچھ کہہ دیا جو شاید وہ صبح سے سوچ رہا تھا۔

کھوڑ واپس جاتے ہوئے بھائی خود بکس کار چلا رہے تھے۔ میں ساتھ بیٹھا تھا۔ ڈرائیور کھتر میاں دُتے، ابراہیم، مہدی اور فتح خان میٹنے کے ساتھ پیچھے بیٹھ گیا۔ بھائی کا موڈ بہتر تھا۔

''کیا یہ ممکن نہیں... '' میں نے کہا، ''کیا یہ ممکن نہیں کہ کمپنی ضیغم خان سے مزدور لڑکوں کی فہرست اور کوائف طلب کرے؟''

''تم ابھی تک اسی سوچ میں ہو... '' بھائی نے اسٹیرنگ کو دائیں ہاتھ سے پکڑ کر، بایاں ہاتھ نیچے لے جاتے ہوئے، سر گھما کر مجھے دیکھا۔ ''کمپنی کو کیا پڑی ہے... کمپنی کو اس سے کیا غرض کہ وہ مزدور کہاں سے لاتا ہے؟ وہ بہترین کام کرتا ہے اور وقت پر کرتا ہے۔ ان چٹانوں میں سڑک بنانا ناممکن نظر آتا تھا، ضیغم خان نے یہاں بھی راستہ بنا دیا۔''

بکس کار کو سڑک پر ابھرے ہوئے سلیٹ جیسے پتھروں پر چڑھانے کے لیے مزدور لڑکوں نے پتھروں کو تراش کر ڈھلوانیں سی بنا دی تھیں۔

''کم از کم... '' میں نے پھر کہا، ''کوئی فوڈ انسپکٹر ہی ہو جو مزدور لڑکوں کے کھانے کا معائنہ

Scanned with CamScanner

کرے۔''

''اس سے کیا ہوگا؟'' بھائی نے پھر سر گھما کر میری طرف دیکھا۔''وہ معائنہ کرنے آئے گا۔ ضیغم خان اسے گلی جاگیر میں اپنے ڈیرے پر لے جا کر روسٹ مرغے کھلائے گا۔ ہزار دو ہزار اس کی جیب میں ڈالے گا اور وہ بہترین رپورٹ پیش کردے گا۔''

''کیا کچھ نہیں ہو سکتا؟'' میں نے مایوسی سے کہا۔

''کچھ بھی نہیں۔'' بھائی نے میری مایوسی پر بے بسی کی مہر لگا دی۔

14

اس واقعے کو بائیس دن گزر گئے۔ اسی دوران میں مجھ پر ملیریا کا حملہ ہوا۔ ملیریا ہر بار بدن کو یوں توڑ جاتا ہے کہ مدافعتی قوت کو دوبارہ حاصل کرنے میں کتنے ہی دن لگ جاتے ہیں۔ ایک دن صبح صبح ہی بھائی کی بکس کار میں تنازعہ ڈیم سے اس پٹھان لڑکے کو لایا گیا جس کے ساتھ بیٹھ کر میں نے مرچی کھائی تھی، جو میرا بہتا ہوا پسینہ دیکھ کر بہت ہنسا تھا۔ اسے سانپ نے ڈس لیا تھا۔ سانپ زہریلا تھا۔ کھوڑ کے اسپتال میں اینٹی وینم (anti-venom) انجکشن موجود تھے اور ڈاکٹر شیروانی جیسے شفیق ڈاکٹر بھی، جو سہ پہر تک لڑکے کے ساتھ رہے۔ لڑکا بچ گیا۔

شام کے وقت میں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہسپتال پہنچا۔ پٹھان لڑکے نے مجھے فوراً پہچان لیا۔ اس کا چہرہ جولائی کی تپتی دوپہروں نے جھلسا دیا تھا۔ اس کے رخسار پچکے ہوئے تھے اور چہرے کے جھلسے ہوئے رنگ میں خشک مٹیالا پن تھا۔ اس کے بالوں میں، خشک بالوں میں، گرد و غبار نے بالوں کو رنگ بھورا سا کر دیا تھا۔ اس نے ہاتھ آگے بڑھایا، خزاں کے جھڑے ہوئے خشک پتے جیسا۔

''کیا نام ہے تمھارا؟'' میں نے پوچھا۔

''گل خان...'' اس نے یوں جواب دیا جیسے کچھ اور بھی کہنا چاہتا ہو۔

''کہاں کے رہنے والے ہو؟'' میں نے پھر پوچھا۔

''مالم جبہ کے پاس ایک گاؤں کا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ اس کی بے نور آنکھوں میں پل

Scanned with CamScanner

بھر کے لیے چمک سی آئی، جیسے تصور میں اس نے اپنے گاؤں کو دیکھا ہو۔

''کب سے ضیغم خان کے ساتھ ہو؟'' میرے اس سوال پر وہ خاموش ہو گیا۔ دو تین بار پوچھنے پر بھی وہ خاموش رہا۔ اس کی آنکھیں بجھ سی گئیں۔ مایوس ہو کر میں جانے ہی والا تھا کہ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

''پچھلے سال...'' اس نے سرگوشی میں کہا، ''ریوڑ چراتے ہوئے بکری گم ہو گئی تھی۔ بابا نے لاٹھی سے مارا تھا۔ میں گھر سے بھاگ آیا۔ بشام پٹن کے پل پر مجھے دو آدمیوں نے نوکری کا جھانسا دیا اور ایبٹ آباد میں ضیغم خان کے حوالے کر دیا — تب سے، ہوں۔''

اس نے ایک بار اپنے سوجے ہوئے پاؤں کی سمت دیکھا، پھر میری سمت... اس کی آنکھوں میں غم، مایوسی اور بے بسی کا ایسا تاثر تھا جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی نگاہیں پھر سوجے ہوئے پاؤں کی سمت گئیں۔

''سانپ...'' اس کی غم زدہ آواز کسی گہری کھائی سے نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ''سانپ نے مجھے نہیں کاٹا... میں نے خود اپنا پاؤں...''

یوں لگا جیسے کسی گہری کھائی سے، کھائی کے اندھیرے سے بہت دھیمی سی آواز سنائی دی اور پھر کھائی کی ڈھلوانوں پر بہت سے بھاری پتھر لڑھک گئے ہوں، جن کے نیچے آواز دبتی دبتی مر سی گئی ہو۔

مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا۔

15

رات کو جب میری بھتیجیاں سو گئیں تو میں نے بھائی اور بھابھی کو سب کچھ بتا دیا۔ بھائی کے چہرے پر پریشانی سی ابھری۔

''دیکھو، میں تم سے کہہ چکا ہوں، ضیغم خان کے معاملات میں دخل نہ دو،'' بھائی نے آہستہ سے کہا۔ ''مجھے معلوم ہے، ضیغم خان خرکار بھی ہے۔''

''پھر بھی آپ خاموش ہیں...'' میں نے کہا۔

بھائی نے میری سوئی ہوئی بھتیجیوں کی طرف دیکھا۔

''وہ بہت طاقتور آدمی ہے... بھائی کی آواز میں مجبوری کا احساس نمایاں تھا۔ ''بہت طاقتور... پولیس بھی اس پر ہاتھ نہیں ڈالے گی۔ اور یہ بات بھی سچ ہے کہ اس کے کیمپ میں زیادہ تر وہی لڑکے ہیں جنھیں وہ صوبہ سرحد سے ان کے ماں باپ کی رضامندی سے لایا ہے۔ اس کے پاس رسید بک بھی ہے جسے ہر ماہ اس کا کارندہ صوبہ سرحد لے کر جاتا ہے اور ہر مہینے اس پر لڑکوں کے ماں باپ کے انگوٹھے لگ جاتے ہیں۔ اغوا شدہ لڑکوں کو وہ کہیں چھپا دے گا... اور پھر ہوگا کیا؟'' بھائی کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔ پھر انھوں نے تھکی تھکی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''تم نہیں جانتے...'' انھوں نے میری سمت گہری نظروں سے دیکھا۔ ''تم نہیں جانتے، ضیغم خان کے رشتے دار اسمگلر ہیں۔ پشاور میں ان کے ڈیرے ہیں۔ ضیغم خان کمپنی کے بڑے افسروں کی بیویوں کو لنڈی کوتل کے باڑے میں لے جا کر، کم قیمت پر بیش قیمت سامان خریدواتا ہے۔ انگریز افسروں کی بیویاں اس سے بہت خوش ہیں۔ وہ آدھی قیمت دے کر آتی ہیں، باقی قیمت بعد میں ضیغم خان خود اپنے رشتے داروں کو ادا کر دیتا ہے۔ انگریز افسر اس سے بہت خوش رہتے ہیں۔ اور تم یہ بھی نہیں جانتے کہ کمپنی کے جو بڑے افسر ہیں، انگریز افسر، ان کے صدر ایوب خان، اس کی کابینہ کے اراکین، سیاست دانوں، فوجی افسروں، جرنیلوں اور بیوروکریٹس سے بہت اچھے تعلقات ہیں۔ پٹرولیم کی وزارت ان کے دوستوں سے بھری پڑی ہے...

''میں اگر ضیغم خان کے خلاف بات کروں گا تو وہ مورگاہ جا کر انگریز افسروں کے سامنے گڑگڑائے گا کہ میں زیادتی کر رہا ہوں۔ وہ مجھ پر الزام دھرے گا کہ میں نے کسی اور ٹھیکیدار سے رشوت لی ہے اور اگلے سال کا ٹھیکہ اسے دینے کے لیے راہ ہموار کر رہا ہوں... نتیجہ کیا ہوگا؟ ممکن ہے کہ میری ہی چھٹی کرا دی جائے... یا پھر اگر میری گزشتہ خدمات کا خیال کرتے ہوئے مجھے کمپنی سے نہ نکالا گیا تو بھی کم سے کم سزا یہ تو ہوگی کہ مجھے میال، ڈھلیاں یا بلکسر کی آئل فیلڈز میں ٹرانسفر کر دیا جائے، جہاں تمھاری بھتیجیوں کے لیے پرائمری اسکول بھی نہیں ہے... رہا ضیغم خان، تو وہ یہیں جما رہے گا۔ اس کا کچھ نہیں بگڑے گا...'' بھائی نے پھر میری سوئی ہوئی بھتیجیوں کی سمت دیکھا۔ ''مجھے امید ہے کہ تم میری، اپنی بھابھی اور بھتیجیوں کی خاطر خاموش رہو گے۔'' بھائی کی آواز میں رنجیدگی سی

تھی۔ ''میں... '' انھوں نے بمشکل کہا، '' مجھے... ضیغم خان سے دشمنی بہت مہنگی پڑے گی۔''

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مرچی کی کڑواہٹ میرے حلق سے ہوتی ہوئی، میری چھاتی سے گزرتی ہوئی، میرے دل کے گرد گھیرا ڈالتی ہوئی، پورے بدن میں پھیل گئی ہے۔ مجھے گل خان کا چہرہ دکھائی دیا... جھلسا ہوا چہرہ سیاہ ہوگیا۔ اس کے پچکے ہوئے رخسار اور پچک گئے، اس کی آنکھیں اجاڑ ہوگئیں۔ وہ خزاں کے اس خشک جھڑے ہوئے پتے کی طرح تھا جس پر کوئی پاؤں رکھ کر گزر گیا ہو۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مرچی کی دو مونہی، چھوٹی دو مونہی، پورے بدن کو سوجن اور سوزش میں مبتلا کرنے والے زہر کے ساتھ میرے حلق میں پھنس گئی ہے۔

16

بھائی کے خط میں ضیغم خان کی موت کی خبر پڑھ کر مجھے تازعہ ڈیم یاد آیا۔ یونیورسٹی کیمپس کی کینٹین کا ملازم میرے سامنے چائے کی پیالی رکھ گیا۔ چائے پیتے پیتے تمام واقعات میری چشم تصور سے گزر گئے۔ پھر نہ جانے کیوں، مجھے یوں لگا جیسے ابکائی آئی ہو اور میرے حلق میں گزشتہ تین برسوں سے پھنسی ہوئی چھوٹی دو مونہی قے کے ساتھ باہر جا گری ہو... مردہ، زہریلی دو مونہی...

پھر میرے سامنے دھند سی چھا گئی۔ دھند میں ضیغم خان کا چہرہ میرے سامنے آیا۔ وہ بے حد زرد تھا۔ رخسار پچکے ہوئے تھے، آنکھیں زندگی سے عاری تھیں۔

''تمھارے پاس مغفرت نہیں ہے،'' وہ خوفزدہ آواز میں بولا۔ ''یہ دنیا گناہگاروں سے بھری ہوئی ہے، اور تمھارے پاس مغفرت نہیں ہے۔ تمھارے رستے پر کوئی نہیں آئے گا— ایک بھی نہیں۔''

''نہ آئے... '' میں نے سرگوشی میں ضیغم خان سے کہا، ''ایک بھی نہ آئے، لیکن سچائی تو یہی ہے کہ نہ تم ردعمل کو روک سکتے ہو نہ میں— اس دنیا میں کردہ گناہوں کی بخشش نہیں ہے۔''

Scanned with CamScanner

17

چھتیس برس گزر چکے ہیں۔ مجھے یہ واقعہ کبھی یاد بھی نہ آتا... برا ہو ایک پرانی نوٹ بک کا جس میں مجھے اپنا تحریر کردہ یہ شعر اداس کر گیا:

دنیا میں مکافاتِ عمل سے نہ بچو گے
بخشش کو کبھی اپنا سہارا نہ سمجھنا

زندگی کے مدوّر تالاب میں بھنور سا پڑتا نظر آیا۔ اٹھی ہوئی لہر دائرہ بناتی ہوئی تالاب کے گول کناروں تک گئی، ٹکرائی، پلٹی، واپس مرکز کی سمت آئی اور پھر ماسکے پر مجھے ضیغم خان نظر آیا، چکر کھاتا ہوا ضیغم خان نظر آیا... چکر کھاتا ہوا ضیغم خان... اس کے منہ سے خون کے چھینٹے اڑ رہے تھے۔ مجھے ضیغم خان کے گرد بہت سے بہت سے چھوٹے چھوٹے پٹھان لڑکے بھی گھومتے نظر آئے۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے ضیغم خان کو دیکھ رہے تھے۔ ضیغم خان کے منہ سے اڑتے ہوئے خون کے چھینٹوں سے ان کے چہرے لال ہو رہے تھے۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے ذہن میں پیوست، میرے دماغ میں گڑے ہوئے بلونگڑے کے چھوٹے چھوٹے پنجے ڈھیلے پڑ گئے ہیں، وہ ناخن نکال کر، اپنی نرم فر سے میرے چہرے کو مس کرتا ہوا، نازک سی میاؤں کے ساتھ، میری جھولی میں آ گرا ہے...

❁❁

Scanned with CamScanner

شمس الحق عثمانی

ابوالفضل صدیقی کی کہانیاں: فہم و نظر کا اسمبلاژ

Scanned with CamScanner

موجودہ شمارے کی تیسری تحریر ایک منفرد اور غیر معمولی تنقیدی تجربہ ہے۔ غیر معمولی اس اعتبار سے کہ یہ اردو کی معمول کی تنقیدی سرگرمی سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ ہمارے یہاں کی ادبی تنقید کا خطاب عام طور پر پڑھنے والوں سے نہیں بلکہ لکھنے والوں سے رہتا ہے۔ ان کا مشغلہ تخلیقی ادیبوں کی کاوشوں پر نخوت سے نگاہ ڈالتے ہوئے، اپنے قائم کیے ہوئے مفروضہ تنقیدی معیاروں کی روشنی میں انھیں مختلف درجوں پر فائز کرنے اور انھیں ہدایات جاری کرتے رہنا ہے تاکہ وہ اپنے درجات میں ترقی کی کوششیں کر سکیں، اور یہ بات وہ آسانی سے بھول جاتے ہیں کہ آج تک کسی قابلِ ذکر تخلیقی ادیب نے نقاد کے ہدایت ناموں سے روشنی حاصل کر کے اپنے ہنر میں کامیابی حاصل نہیں کی اور نہ تکنیک کے مفروضہ تنوع کے بل پر بے جان تحریروں میں جان ڈالی جا سکی ہے۔ ایک اور شے جو ہمارے پیشہ ور نقادوں کی توجہ سے اوجھل ہے، یہ سادہ اور بنیادی حقیقت ہے کہ تنقیدی تحریروں کا واحد معقول جواز یہ ہے کہ وہ کسی تخلیقی تحریر یا تحریروں کے مجموعے کو توجہ اور احترام سے پڑھنے کے عمل میں عام پڑھنے والوں کو شریک کر سکے۔ اس صورت میں اسے زیرِ نظر ادیب کی تخلیقی دنیا تک رسائی حاصل کر کے اس کے اسلوب اور نفسِ مضمون سے پیدا ہونے والی تخلیقی ہیئت کی معنویت دریافت کرنی ہوگی اور اپنا خطاب کا رخ متواتر ان پڑھنے والوں کی سمت رکھنا ہوگا جو اس ادیب کی دنیا کو دریافت کرنے سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

آئندہ صفحات میں شمس الحق عثمانی نے اردو کے ایک جدید اور اہم صاحبِ اسلوب فکشن نگار ابوالفضل صدیقی کی چند تحریروں کے اسی تخن رس اور کارآمد ڈھنگ سے کیے گئے تفصیلی مطالعے میں پڑھنے والوں کو شریک کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنی اس منفرد کاوش میں، جس کی ہیئت کو انھوں نے 'اسمبلاژ' (assemblage) کا عنوان دیا ہے، وہ ابوالفضل صدیقی کی چند کہانیوں سے پچاس سے زائد اقتباسات منتخب کر کے ان کی مدد سے ان کے اسلوب، کرداروں، موضوعات اور سماجی تانے بانے کی پرتیں کھولتے ہیں، اور اس کے مطالعے کے بعد پڑھنے والے کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے ایک بامعنی ادیب کی دنیا سے، اور اس کے توسط سے خود اپنے اردگرد کی دنیا سے، زیادہ بہتر طور پر واقف ہو گیا ہے۔ شمس الحق عثمانی کی تنقیدی کاوش اسی بنیاد پر کامیاب ہے۔

Scanned with CamScanner

1

''ارے استاد سیوتی لال! ارے بھئی کہاں؟ خیر تو ہے، کدھر کا سامانِ سفر؟'' وہ بڑے بابو کو سلام کرنا بھی بھول گیا، جواب بھی نہ دے سکا اور بابو نکلا چلا گیا۔ اب اس نے پانچ روپے کا نوٹ چٹکی میں پکڑے، بکنگ آفس کی کھڑکی کے اندر ہاتھ بڑھایا اور بکنگ کلرک نے پہچان کر ضابطے کے استفسار سے زیادہ گھریلو انداز میں بے تکلفی کے ساتھ اندر سے بانگ لگائی: ''اوہو... ایں آں... آج استاد سیوتی لال! کہاں؟ کدھر آج چل پڑے بھئی، ایں؟'' تو بکنگ آفس کی کھڑکی کے سامنے اندر ہاتھ بڑھائے مسافر بیچ بغلیں جھانک گیا۔ جہاں ہر مسافر گھر سے پوری اسکیمِ سفر بنا کر پہنچا کرتا ہے، اس نے بار بار دائیں بائیں دیکھا جیسے آس پاس کی تاریکی میں مشورہ کر رہا ہے کہ ''کہاں جاؤں؟'' اور چھوٹے بابو کا اہم سوال بھی بڑے بابو کے چلتے ہوئے سوال کی طرح بے جواب رہا اور ''کہاں؟'' کا سوال اس کے شعور میں جھنجھلا کر اندر ہی اندر گونجا۔ وہ ٹکٹ خریدنے والی کھڑکی پر اندر ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا اور اس کا سوال سن کر اس کے اندر والے نے جواب دیا: ''وہاں جہاں کی سرزمین کی مٹی اپنی چھاتی پر گلاب خاص کو کھڑا کر کے پروان چڑھا سکے اور جس فضائے بسیط کی ہوا پال پروان چڑھا کر چھتنار درخت بنا سکے اور گلاب خاص دیسی گلاب کے پھولوں کی جھاڑی کی طرح لد سکے۔'' وہ سرزمین کہاں اور کرۂ ارض کے کون سے اسٹیشن پر ہے، نہ تو بابو جانتا تھا نہ خود سیوتی لال، اور نہ اس کی گلابو بیٹی ہی کو پتا معلوم تھا؛ نہ جریب کھینچنے اور گھٹنے ڈالنے والے پٹواری چک تراش ہی کے نقشۂ شجر میں ہنوز اس کا حدودِ اربعہ طے پایا تھا اور نہ اس کا جغرافیہ قطب شمالی سے قطب جنوبی تک قابض دخیل، ''مالک'' کہلانے والے زمینداروں نے آج تک دریافت کر پایا تھا۔ سب کچھ

بھادوں کی اماوس کے اندھیرے میں گم تھا۔

سیوتی لال بے چارہ کہاں کا ٹکٹ مانگتا اور بابو غریب کون سے اسٹیشن کا ٹکٹ کاٹتا۔

❁

یہ سطور ابوالفضل صدیقی (1910 تا 1987) کی کتاب آئینہ (مطبوعہ 1986، ناشر مکتبۂ اسلوب، کراچی) کی تین میں سے ایک کہانی ''گل زمین کی تلاش میں'' (صفحہ 111 تا 231) کا اختتامی جزو ہیں۔

ابوالفضل کی کہانیوں میں متعدد سیوتی لال ہیں، اُس کی گلابو جیسی متعدد لڑکیاں عورتیں ہیں، متعدد زمیندار ہیں اور زمینداروں کی چشم و ابرو کے گرفتار پٹواری جیسے کئی لوگ ہیں۔ مصنف نے ان لوگوں کے باہمی عمل و ردعمل کے جو ہمہ جہت زاویے نقش کیے ہیں وہ ہر جہاں سے سرسری گزرنے والی نظروں کو تو شاید کہانی کہنے والے کے محدود مقامی تجربے اور شخصی مشاہدے کا نیم پختہ قصہ دکھائی دیں، مگر وہ نظریں جو رک کر دیکھنا سیکھ چکی ہوں، غیر مشروط کی قائل و عامل ہوں، بظاہر سیدھے سادے (بیانیہ وغیرہ) کی پیچیدگی و دبازت کے پار اترنے لگی ہوں اور دیکھے پڑھے ایک کو گزشتہ و موجودہ کے دوسرے، تیسرے، پانچویں، ساتویں میں آمیز کر کے آئندہ کے غرفے میں جھانکنے کی اہلیت پا چکی ہوں، تو انھیں صاف دکھائی دے گا کہ ابوالفضل صدیقی کی کہانیوں میں عمل و ردعمل کے دائرے اور افراد کے نین نقش حالانکہ مصنف کے ماضی قریب اور حال سے منسوب ہیں، مگر انھیں (بصورتِ دیگر) جو معرکۂ خیر و شر درپیش ہے اس کی اساسی وجوہ بھی وہی ہیں جو گزشتگان کے لیے تھیں، اور آئندگان کو بھی جو معرکۂ خیر و شر بصورتِ دیگر یقیناً پیش رہے گا اس کی اساسی وجوہ بھی کم و بیش یہی ہوں گی۔

ابوالفضل صدیقی کی نمائندہ کہانیاں اوائل بیسویں صدی کے اُس ہندوستانی معاشرے کے پس منظر میں لکھی گئی ہیں جس پر چھوٹے بڑے زمیندار اور اُن کے طور طریقے حاوی تھے۔ ان کہانیوں میں وہ عام لوگ مصنف کی توجہ کا خاص مرکز ہیں جو کسی نہ کسی طور پر زمینداروں کے زیرنگیں تھے، اور وہ انھیں تا دیر وکلیتاً اپنا (مجہولیت کی حد تک) تابع بنائے رکھنے کے لیے تمام آزمودہ اور نت نئے حربے استعمال کر رہے تھے۔ ابوالفضل صدیقی کے زندہ و پُرفکر حواس نے ان کہانیوں کے

قاری کو باور کرایا ہے کہ زیر تحریر معاشرے کے افراد میں، بہ وجوہ، ان اسباب کا اکھوا پھوٹ چلا تھا جن کے طفیل میں عام عورت۔ مرد بھی اپنے وجود کے معانی اور مرتبے کو محسوس کرنے لگے تھے۔ اس احساس کی بالواسطہ یا بلاواسطہ سگندھ سے صاحبانِ اقتدار بھانپ گئے تھے کہ ان کے ہاتھوں سے اقتدار کی ریشمی ڈور دھیرے دھیرے پھسلتی جا رہی ہے، کیونکہ ڈور کے دوسرے سرے پر صدیوں سے بندھے دوسروں کے اعضا و افکار میں رہائی کے لیے کسمساہٹ و برگشتگی اور دلوں میں اپنے وجود کے معانی و مرتبے تک رسائی کی آرزو جنم لے رہی تھی۔ نتیجتاً، صاحبِ اقتدار کی گرفت میں مزید سختی پیدا ہوگئی تھی، تو گرفتاروں کی کسمساہٹ، برگشتگی اور آرزو و اں میں شدت عود کر آئی تھی۔

آئندہ صفحات اس تفہیم کی کوشش پر مبنی ہیں کہ مذکورہ حالات و کیفیات سے دوچار فریقین کے مفصل کوائف اور (قدرے محدود پیمانے پر) ان کی ذہنی و جذباتی کیفیتوں سے طویل کہانیاں ترتیب دینے والے ابوالفضل نے کیسے کیسے سیوتی لال، گلابو، زمیندار، پٹواری اور ٹکٹ بابو وغیرہ منتخب کیے ہیں؟ ان کے اطوار اور ردِعمل کس کس ڈھنگ سے بیان ہوئے ہیں؟ بیان کو قابلِ مطالعہ و بامعنی بنانے میں کیا کیا لسانی اور فنی حربے بروئے کار آئے ہیں؟ ان حربوں سے واقعات کی محدود یا وسیع تر معنویت اور کرداروں کی ظاہری یا باطنی کیفیات کس حد تک منکشف ہوئی ہیں؟ اس انکشاف میں تاثیر کتنی ہے؟ اس تاثیر سے مصنف کیا کام لینا چاہتا ہے اور وہ کام کس حد تک لیا جا سکا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

اس سب کچھ اور وغیرہ وغیرہ کی تفہیم کے لیے ابوالفضل صدیقی کی کچھ ایسی کہانیوں کو اسملاژ میں مکملاً شامل کیا گیا ہے، جو زندگی اور آدم زاد کے تئیں ان کی اساسی فہم، ان کے زاویہ نظر اور ان کے اسلوب کی نمایاں مثال محسوس ہوئی ہیں۔ ان پوری پوری کہانیوں کے پہلو بہ پہلو دیگر کہانیوں کے وہ خاص خاص اجزا بھی اسملاژ میں شامل ہوئے ہیں جو مصنف کے اسلوب، کردار نگاری یا افکار وغیرہ کا مخصوص رنگ قاری کے ذہن و دل پر مزید مستحکم کر سکتے ہیں۔

ابوالفضل صدیقی کی کہانیاں اردو کے دیگر طویل افسانوں کے مقابلے میں کچھ کمزور یا حشو و زوائد سے بوجھل محسوس ہوتی ہیں، مگر ان کی یہ صفات بھی اپنے مصنف کے طرزِ فکر و عمل کا ایسا جزو ہیں جو ان کی تقریباً تمام کہانیوں میں نشان زد کی جا سکتی ہیں؛ لیکن تقریباً تمام کہانیوں میں یہ شواہد بھی

موجود ہیں کہ مصنف نے زائد یا کم متعلق محسوس ہونے والے واقعات واجزا کو، کسی نہ کسی طور، کہانی کے مرکزی خیال سے مربوط کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کوششوں سے محسوس ہوتا ہے کہ ابوالفضل صدیقی نے کہانی کے مرکزی خیال کو نمایاں سے نمایاں تر اور بیان کو طویل سے طویل تر بنانے کا عمل، شعوری طور پر، تقریباً اسی طرح اپنے ہنر میں شامل رکھا ہے جس طرح کوئی مصور اپنی پینٹنگ کے اساسی نقوش کو نمایاں سے نمایاں تر کرنے کے لیے، یا یوں کہا جائے کہ دیکھنے والی نظر کو بہر طور اساسی نقوش پر مرکوز کرنے کے لیے، ان کے قریب و دور کو ایسے رنگوں اور خطوط سے بھر دیتا ہے جو بہ یک نگاہ تو زائد اور لایعنی محسوس ہوتے ہیں، مگر جب دیکھنے والی نظر اساسی نقوش پر مرکوز ہو کر اُن کی تاثیر و معنویت تک پہنچ جاتی ہے تو اول اول زائد لگنے والے رنگ اس لحاظ سے معنی خیز و ناگزیر قرار پاتے ہیں کہ ناظر نے انھی کے وسیلے سے مصور کے مقصود اساسی نقوش کو گرفت میں لیا ہے۔

یہ اسملاژ ابوالفضل صدیقی کی تمام کہانیوں پر محیط نہیں، کیونکہ ان کی کتابیں برصغیر کے جزوِ اعظم میں تقریباً نایاب ہیں۔ مرتبِ اسملاژ کو صرف تین کتابیں دستیاب ہیں: آئینہ، انصاف اور جوالامکھ۔ یہ پہلی بار 1986 میں کراچی سے طبع ہوئی تھیں۔ ان میں چودہ طویل و قدرے مختصر کہانیاں شامل ہیں۔ علاوہ ازیں کراچی اور لاہور کے کچھ رسائل میں مطبوعہ چند کہانیاں اور ایک ناول کی آخری قسط بھی مرتب کے مطالعے میں شامل رہی ہے، لیکن اسملاژ کا مجموعی مزاج صرف وہ کہانیاں قبول کر پایا جو مذکورہ بالا مجموعوں میں شامل ہیں؛ غالباً اس باعث کہ ابوالفضل صدیقی کی فکر اور فنی ہنرمندی کا تمام سفید و سیاہ، کم و بیش، ان کہانیوں کے دامن میں سمٹ آیا ہے — اور یہ مجموعے ابوالفضل صدیقی نے خود ترتیب دیے تھے: زندگی کے اختتامی برسوں میں۔

کہانی پڑھتے ہوئے، ادب پارے کے آدابِ مطالعہ بروئے کار لانے والے کے لیے سمجھنا مشکل نہیں کہ اسملاژ کی ابتدا میں درج کہانی، ''گل زمین کی تلاش میں''، کی اختتامی سطور کسی ایسے سلسلۂ واقعات کا منتہا اور نچوڑ ہیں جو 'خیر' کی موجودگی و عدم موجودگی کے بارے میں سوال قائم کرتے ہیں اور استاد سیوتی لال کے ساتھ اس طور پیش آ چکے ہیں کہ وہ سلام دعا کے آداب بھی بھول گیا ہے۔ اس وقت وہ بیٹی گلابو سمیت، اپنی چہیتی زمین کے اُس ٹکڑے پر ہے جو مقامِ وداع بھی ہے۔ بڑے

اور چھوٹے بابو کے حیرت میں شرابور سوالات سے ظاہر ہے کہ سیوتی لال آج سے پہلے کبھی اس طرح یہاں نہ آیا تھا۔ اسے "استاد استادؔ" کہنے والوں کا یہ پوچھنا کہ "ارے بھئی کہاں؟"، "خیر تو ہے؟" اور "کدھر چل پڑے بھئی؟" واضح کر رہا ہے کہ یہ لوگ سیوتی لال کی پُرکمال شخصیت کو برادرانہ سطح پر جانتے ہیں اور اسے اس خطے کا اٹوٹ انگ تصور کرتے ہیں؛ مگر سیوتی اس زمین سے اُکھڑ گیا ہے، تبھی تو کھڑکی میں ہاتھ ڈالے، کسی ایسی زمین کا تمنائی ہے جہاں گلاب ونسترن جڑ پکڑ سکیں، پھل پھول سکیں۔ لیکن کوئی نہیں جانتا؛ نہ بابو، نہ سیوتی اور نہ گلابو کہ وہ زمین کرۂ ارض کے کون سے اسٹیشن پر ہے۔ 'خیر' ہے نہیں؛ سب کچھ بھادوں کی اماوس کے اندھیرے میں گم ہے۔

خیر کی عدم موجودگی کو جتاتا، اماوس کا ایسا گھنا اندھیرا صرف سیوتی لال اور گلابو ہی کو نہیں بلکہ ابوالفضل صدیقی کی متعدد کہانیوں کے کرداروں کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ بیشتر کہانیوں میں ایسے کردار صورت پذیر ہوئے ہیں جو خیر سے تہی ماحول کے اندھیرے کو نمایاں کرتے ہیں؛ اور یہ بات اس طرح بھی کہی جاسکتی ہے کہ ابوالفضل صدیقی نے کہانیوں کے زیرِ بیان ماحول کے اندھیرے اور خیر سے محرومی کو نمایاں کرنے کے لیے کئی کردار خلق کیے ہیں۔ ایسے کرداروں اور ان کے گرد تنے کسے ماحول کی استطاعت بھر تفہیم کا آغاز، استاد سیوتی لال اور گلابو ہی سے کرتے ہیں۔

2

اور جب قصبوں میں نوروز منایا جاتا ہوتا، جھولے پڑتے، تیجیں تیوہار ہوتا، تمام کا تمام دیہات کا ماحول رنگ، رس، خوشبو اور گیتوں میں گم ہوتا، تو سیوتی لال کا تین پشت سے معمول تھا کہ پرانے باغوں میں بن جیسے رقبوں کے اندر تحقیقی جنون کے سفر میں کہیں گم ہوتا، اور جب کالی کالی گھٹائیں اس گھٹاٹوپ ماحول کو اور بھی زیادہ گمبھیر بنا دیتیں تو اس کا جی پُروائی کے جھونکوں کی لہک کے ساتھ اور بھی لہرا اٹھتا۔ مونجھ کے ریشے کاندھے پر لٹکائے، چھال چھیلنے والا چاقو جیب میں رکھے اور بیلچہ بغل میں دبائے، وہ کسی خاصے کے تخمی آم کی تلاش میں اس دشوار گزار قدیم باغوں کے ماحول کے اندر اپنا بے سنگِ میل سفر جاری کیے ہوتا۔ اور جب ان قدیم درختوں کے نیچے پسار میں ٹپکا ہوا کوئی آم

Scanned with CamScanner

چکھ کر دریافت کر کے پسند کرتا تو وہیں کہیں آس پاس کی جھاڑیوں کی گھاس میں سے کوئی اُبھرتا ہوا پچھلے سال کا پپیا اسٹاک کے لیے تلاش کر کے کھاندتا اور قدیم ماوراء التاریخی درخت کی کوئی ہونہار، موقعے کی شاخ کے ساتھ قلم بندی کر کے آگے بڑھ جاتا۔ اور یہ ڈھن اس کی آبائی 'توریثی' تیسری پشت میں چل رہی تھی؛ اور آج تو اس کی جوانی کی شام تھی، اس کے باپ دادا، سب کی جوانیاں اسی شاداب صحرا نوردی میں گزری تھیں اور ان کے دریافت کر کر کے لائے ہوئے اور قلم باندھ باندھ کر ترقی دیے، بنائے سنوارے، پروان چڑھائے آموں کی تعداد بھی کسی کو معلوم نہ تھی۔ اور وہ ان کے آقا، زمین کے ان مالکوں کے نام سے موسوم ہو کر، جن کے نام سرکاری کاغذات میں اندراج چلے آتے تھے، ان کے حرفِ غلط کی طرح گمنام معدوم ہو گئے تھے، اور تیسری پشت میں ان کی میراث ایک گلابو اسم با مسمیٰ بیٹی تھی اور ایک سرخہ آم کا درخت۔ سو اول الذکر کنیا ذات، پرایا دھن تھا اور آخر الذکر کی ملکیت کا وہ قانونی مقدور نہ رکھتا تھا؛ دونوں ہی دوسروں کا مال تھے، اور مالی کو اس کا، سماج اور قانون کے دونوں صورتوں اور پہلوؤں سے، اچھی طرح اندازہ بھی تھا اور وہ اس پر صابر بھی چلا آتا تھا، اور دوسرے پہلوؤں سے دل کو سمجھائے ہوئے بھی تھا۔ (ص 175 تا 176)

... اور اب سیوتی لال مالی نے پیار بھری، پکارنے والی مخصوص آواز بلند کی: "گلابو! گلابو! کدھر ہے؟ ذرا سرکار کو تو اپنا سرخہ پیش کر۔"

اور کہیں گلاب کی جھاڑیوں میں سے گلابو نمودار ہوئی تو فاروقی صاحب چکا چوند ہو گئے۔ حسنِ صحرائی وفطری رعنائی اور خلقی تندرستی کا مجسمہ، اور ستم یہ کہ اپنے آپ سے بے خبر۔ حویلی والے بیگماتی مخصوص انداز میں سلام کیا اور چھپر کے اوپر رکھے ہوئے رات کے بسے آم نکالے، جن پر اوس نے تمام رات خنکی اور تری برسائی تھی، اور کاٹ کر ایک قاش بڑے سلیقے کے ساتھ پیش کی۔ فاروقی صاحب پھڑک اٹھے۔ ایسا سرخہ عمر میں پہلی مرتبہ زبان وتالو سے گزرا تھا۔ ستم یہ کہ خوشبو بالکل ہی انوکھی تھی، یعنی نمایاں سہ آتشہ عرقِ گلاب میں ڈوبا ہوا تھا۔ اور اس خوشبو والے سرخے کو کھا کر فاروقی صاحب سوچ میں گم ہو گئے اور پروان چڑھا کر اور کاٹ کر کھلانے والی کی شخصیت میں تو پہلی نگاہ میں گم سم ہو گئے تھے۔ اور گلابو سیوتی لال کی بیٹی تھی، نسل ارذل شودر زادی، جس نے بابا آدم کے اس فائن آرٹ جیسے کلچر میں گوناگوں بیش بہا اضافے کر کے اور اگریکلچر کے اس شعبے کو تمدن کی روشنی کے،

Scanned with CamScanner

گوناگوں لذتوں کے رنگوں رخوں سے چمکایا تھا۔ (ص 179)

... فاروقی صاحب مردم شناس اور قدر شناس آدمی تھے؛ ساتھ ہی سوچ اور عمل میں اپنے طبقے میں سب سے علیحدہ اور ٹھوس حقائق میں یقین رکھنے والے۔ گلابو کا سرخہ آم چکھا گیا، پیٹ بھر کھایا، اور دل ہی دل میں اپنے ان بیٹریں اور مرغے لڑا کر تماشا دیکھنے والے ہم نشینوں کے درمیان ممولے اور شہباز کی ٹکر کرانے کے تماشے کا فیصلہ کرلیا... (ص 180)

❊

ابوالفضل صدیقی نے گلابو کا اُگایا ہوا سرخہ آم کھانے والے فاروقی صاحب کا تعارف کہانی کے پانچ صفحات (149 تا 153) میں پیش کیا ہے، جس کا اختصار یہ ہے کہ فاروقی صاحب روہیل کھنڈ ڈویژن میں ایک چھوٹے سے شہر کے معمولی حیثیت والے مضافاتی زمیندار ہیں لیکن انھوں نے ہندوستان اور یورپ کی زرعی یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے، آم کی کاشت اور باغبانی کے ماہر ہیں، دسیوں نئے آم ایجاد کر چکے ہیں اور اپنی دریافتہ قلموں کی فروخت سے انتہائی مالدار زمینداروں میں شمار ہونے لگے ہیں۔ حالانکہ وہ جواں سال ہیں مگر ملک بھر کے بوڑھے زمینداروں میں برابر کا درجہ رکھتے ہیں۔

وہ اس سال، غالباً 1926 کے دو ایک برس بعد، اودھ اور روہیلکھنڈ کے بڑے بڑے باغ داروں کے درمیان ہر پانچویں برس منعقد ہونے والے آموں کے مقابلے کا اہتمام کرنے آئے ہیں۔ اس سے قبل وہ خاں صاحب اور آغا صاحب نامی بڑے باغ داروں کے اُس تنازعے کا فیصلہ کرانے آئے تھے جو مقابلے میں پیش کیے جانے والے آم کے قلمی پودوں کی چوری کے باعث پیدا ہوا تھا اور نوبت خون خرابے تک پہنچنے والی تھی۔

کہانی سے نقل شدہ اقتباس 2 کی آخری سطور میں ''ممولے اور شہباز کی ٹکر'' سے مراد یہ ہے کہ فاروقی نے گلابو کے کاشتہ آم کو اس مقابلے میں شامل کرانے کا فیصلہ کرلیا جس میں روہیلکھنڈ کے آغا صاحب، اودھ کے خاں صاحب اور ان جیسے سماجی مرتبوں والے باغ دار اپنے اگائے ہوئے آم اور ان کے قلمی پودے پیش کرنے والے تھے۔

فاروقی کے اس فیصلے کا عام ردعمل بیان کرنے کے لیے ابوالفضل نے مقابلے کی مجلس عاملہ کے

ارکان کی گفتگو خلق کی ہے، جو مکالمہ نگاری پر مصنف کی فنکارانہ گرفت کی مظہر ہے۔ اس گفتگو میں طبقاتی طرزِ فکر کے وہ تقریباً تمام پہلو جھلک رہے ہیں جو جاگیردارانہ معاشرے کی پہچان تھے۔ علاوہ ازیں، فاروقی کے طرزِ عمل سے مصنف اپنے قاری کو ایک ایسے متوازی رویے کی آہٹیں محسوس کرا رہا ہے جو اس معاشرے کے تعلیم یافتہ افراد میں بیسویں صدی کے ربعِ دوم سے پنپنا شروع ہو گیا تھا۔ فاروقی کے پیکر میں مصنف کا یہ احساس بھی نقش ہوا ہے کہ طبقاتی طرزِ فکر کا اندمال علم کی ہی روشنی سے ممکن ہے۔ اسی مکالمے کے دوران، فاروقی کی زبانی مصنف نے اپنے قاری کو عدل و مساوات کا وہ ضابطہ یاد دلانے کی کوشش کی ہے جس سے پہلوتہی نے افراد اور معاشروں کے عمل کا رُخ شر کی جانب موڑ دیا:

> خان بہادر نے کہا، "میاں فاروقی صاحب بہادر، آپ شریف زادے ہیں، ذرا بزرگوں کی روایات کا پاس کرو۔ ہماری نہیں تو اپنی ہی عزت کا خیال کرو—"
>
> فاروقی صاحب نے بات کاٹ دی۔ "میرے بزرگوں نے تو وہاں غلاموں کو سپہ سالاری دی اور فتح کے بعد سربراہی عطا کی اور بہادر غلام کے سر پر ہندوستان کا پہلا تاج پہنایا اور نسلاً بعد نسلٍ غلاموں سے شہنشاہی کرائی۔ قبلہ، میری کچھ نہ پوچھیے، اگر آپ ارذل شودر کو بھی میرے مقابلے پر ڈال دیں گے تو میں اُس کا چیلنج ایسی ہی خوشی کے ساتھ قبول کروں گا جیسے کسی راجپوت ٹھاکر سید پٹھان کا۔" (ص 197)

یہ سطور حالانکہ آئندہ اقتباس میں بھی شامل ہیں مگر یہاں ان کا اندراج اس امر پر زور دینے کے لیے کیا گیا کہ جب ابوالفضل صدیقی معاشرے کی طبقاتی تقسیم کو ہدف بناتے ہیں — اور یہ اکثر ہوا ہے — تو ان کے ذہن و دل کے کسی نہ کسی گوشے سے یہ آرزو جھلک اٹھتی ہے کہ کاش آدم زاد اپنے ساقط وقار و آبرو کی بحالی کے لیے عدل و مساوات کے ازلی ضابطے اور اُس کی حقیقی روح کو حرزِ جان بنا لے۔

ایک کردار کے اظہارِ خیال کو بہ اصرار ابوالفضل صدیقی کی آرزو قرار دینے کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے اس کردار کے جو خواص کہانی میں بیان کیے ہیں اُن میں یہ بات بھی شامل ہے:

> ... (فاروقی نے) خاص آم کے موضوع پر ایک کتاب لکھی جو تھیسس کا درجہ رکھتی تھی۔ اُس کا اُردو ترجمہ کیا جس سے تمام ہندوستان کے زمیندار اور نرسری مینوں نے استفادہ کیا— اس کو رموزِ باغبانی کا اردو نام دیا"... (ص 149)

Scanned with CamScanner

ابوالفضل صدیقی کی کہانیوں کے ان تینوں مجموعوں: آئینہ، افسانہ اور بجو اور مکھی کے گرد پوش پر مصنف کے تعارفی کلمات میں بتایا گیا ہے: ''ایک کتاب رموزِ باغبانی کے نام سے 1950 میں چھپی تھی۔'' کہانی میں نہ صرف اپنی کتاب کو فاروقی صاحب سے منسوب کرنا بلکہ سیوتی لال سے اُس کی ملاقات (ص 183 تا 190) کے موقعے پر، اور کہانی کے دیگر حصوں میں بھی، آموں کی کاشت، آموں کی اقسام، آموں کے باغات اور آموں سے وابستہ روایات۔ در سوم وغیرہ کے بارے میں بے شمار معلومات۔ کے بیان بھی یہ غمازی کرتے ہیں کہ فاروقی کے پیکر میں ابوالفضل صدیقی نے اپنی شخصیت کے کئی رنگ شامل کیے ہیں۔

3

... مجلسِ عاملہ کا اجلاس مقابلے کے انعقاد سے ایک روز قبل ہوا کرتا تھا۔ مجلسِ عاملہ سب سے بڑی باڈی تھی۔ اراکین مقابلے میں آنے والے آموں کے متعلق معلومات کا، اور اگر پھل آ گئے ہوتے تو ان کا، سرسری جائزہ لیتے تھے۔ سطحی اعتراض، ٹیکنیکل عذرداریاں پیش ہوتی تھیں۔ اجلاس ہوا تو ایک مخصوص نام کو مقابلے میں آنے سے اراکین نے کچھ پس و پیش اور ذرا غور کیا اور سیکرٹری سے کچھ سوالات استفسار کیے، کیونکہ مقابلے میں آنے والا تمام شرکاے مقابلہ کی بہ نسبت چھوٹا آدمی تھا؛ مگر فاروقی صاحب نے اس کا کیس پلیڈ کیا کہ مقابلے کے لیے آئینی طور پر چھوٹی بڑی حیثیت کی شرط نہیں ہے، درحقیقت یہ بہتر سے بہتر آم تحقیق ہو جانے کی کسوٹی ہوتی ہے۔ کوئی لائے، اچھا آم تحقیق ہو جانا چاہیے، اور اس طرح یہ تحقیق چھوٹوں بڑوں سب کے مفاد میں ہے، اور آئین کے اندر پہلی شق شرط عام مقابلہ ہے، اور یوں اعلیٰ سے اعلیٰ آم کی تحقیق ہو جاتی ہے۔''

مجلسِ عاملہ میں ایک مقتدر رئیس پڑھے لکھے خان بہادر قسم کے بھی تھے۔ بولے، ''مگر اس کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ کوئی ادنیٰ آدمی اپنا آم مقابلے پر لا کر ہمارے برابر آ کھڑا ہو۔''

فاروقی صاحب نے ادب سے کہا، ''اگر ادنیٰ سے ادنیٰ [آدمی، اعلیٰ آم] پیدا کر کے پیش کرتا ہے تو وہ اعلیٰ آدمیوں کے بھی مفاد میں ہے؛ اور مقابلے پر ادنیٰ غلام نہیں، اعلیٰ آم آئے گا۔ اور غلام بھی کوئی اعلیٰ چیز ہمارے کلچر کو دیتا ہے تو تمدن سازی کے ضمن میں اس کا کارنامہ زندہ رہے گا۔ اعلیٰ

Scanned with CamScanner

ایجادودریافت صرف اعلیٰ طبقے کی اجارہ داری تونہیں ہے، اوروہ توچھوٹوں بڑوں سب کے مفاد میں ہے۔ یہ نہ دیکھیے کہ کس نے دی ہے بلکہ [یہ دیکھیے کہ] کس پائے کی چیز دی ہے۔''

مگر باہر یہ چیز کچھ زیادہ پھیلی نہیں، میلے کا ٹیمپوتفریح اتنی زیادہ تھی کہ گم ہوکر رہ گئی۔ تاہم پہلے اندر پینک (panic) پھیلی۔ مجلس عاملہ کے صدر کچھ زیادہ ہی جز بز تھے۔

''دیکھیے مسٹر فاروقی، آپ ہمیں میں سے ایک ہیں اور آپ اپنی روایات کو جانتے ہیں۔ کسی ادنیٰ طبقے کے فرد کے آم کو مقابلے میں شریک نہیں کیا جاتا رہا ہے آج تک، لیکن روہیلکھنڈیوں کے متعلق انکشاف ہو چکا ہے کہ پچھلے مقابلوں میں اپنے کاشتکاروں کے آم رکھ دیے تھے لاکر۔''

''جناب، یہ کوئی نئی بات تونہیں، قبلہ۔ روہیلیوں نے تو اپنے سربراہ بھی چھوٹے طبقے میں سے عظیم آدمی تلاش کر کر کے بنائے ہیں،'' فاروقی صاحب نے نہایت نیاز مندانہ انداز میں کہا۔

''لیکن آپ تو پڑھے لکھے آدمی ہیں، میرے خوردوں میں ہیں۔ کیا عرض کروں۔ آپ ایک ادنیٰ غلام کو اتنے بڑے بڑوں کے سامنے لا رہے ہیں، سوچ لیجیے۔''

ایک روہیلکھنڈی چوہان ٹھاکر صاحب نے جواب دیا، ''خان بہادر صاحب، پھر کیا کیا جائے! روہیلکھنڈیوں کی طاقت یہی چمار چوڑے، کسان لودھے، دُھنے، جلاہے، مولازادے جھوجھے تھے۔ روہیلکھنڈی ٹھاکر راجپوت اور روہیلے پٹھان تو انھی کی فوج بنا کر اِدھر پنجاب تک سکھ سرداروں کو، اُدھر دکھن میں بنگش پٹھانوں کو، اور بیچ میں دلّی کے تخت کے ٹھیکیدار مرہٹوں کو اور آپ کی جانب شاہِ اودھ اور انگریز بہادر کو للکارا کرتے تھے۔''

''خیر چھوڑو بھی، سیوتی لال! (گالی) ہوں! خود بھگتے گا مینڈھا ہاتھی سے ٹکر لے کر۔ اور آپ لوگ بچانے کے لیے نہ آئیں گے، مقابلے پر تو لے آئے!'' ایک اودھ کے راجہ صاحب نے کہا اور کرسی پر ترچھے ہو گئے۔

فاروقی صاحب کے منھ سے بے ساختہ نکلا، ''لاحول ولا قوۃ! یہ ادنیٰ و اعلیٰ، چھوٹے بڑے، ٹھاکر برہمن، سیّد، مغل پٹھان یا غریب امیر کا مقابلہ نہیں ہے۔ میرے محترم، یہ اچھے سے اچھے آم کی دریافت کا میلہ ہے۔ اور یہ ٹھیک طے جبھی ہو سکتا ہے کہ ہر ایک آم کے چیلنج کو برداشت کیا جائے اور جانچ تحقیق کے لیے میدان میں لایا جائے۔''

Scanned with CamScanner

ایا۔ برہمن، راجہ صاحب نے بات کاٹ دی، ''ہاں بھئی، کلجگ ہے کلجگ! اب للو پنجو شرفا کے سامنے آ رہے ہیں۔ بھلا مقدر — ہمارا مالی، ہمارا غلام، ہمارے مقابلے پر! آپ تو رئیس زادے ہیں، شیخ، فاروقی، خاص عرب کے۔''

خان بہادر صاحب نے کہا، ''میاں فاروقی صاحب بہادر، آپ شریف زادے ہیں، ذرا بزرگوں کی روایات کا پاس کرو۔ ہماری نہیں تو اپنی عزت کا خیال کرو —''

فاروقی صاحب نے بات کاٹ دی، ''میرے بزرگوں نے تو وہاں غلاموں کو سپہ سالاری دی اور فتح کے بعد سربراہی عطا کی اور بہادر غلام کے سر پر ہندوستان کا پہلا تاج پہنایا اور نسلاً بعد نسلٍ غلاموں سے شہنشاہی کرائی۔ قبلہ، میری کچھ نہ پوچھیے، اگر آپ ارذل شودر کو بھی میرے مقابلے پر ڈال دیں گے تو میں اس کا چیلنج ایسی ہی خوشی کے ساتھ قبول کروں گا جیسے کسی راجپوت ٹھاکر سیّد پٹھان کا۔''

خاں صاحب نے تلخ ہو کر ان چوہان ٹھاکر صاحب کی جانب روئے سخن کرتے ہوئے کہا، ''لاحول ولا قوۃ! چھوڑو جی بلبیر سنگھ۔ ہاں جناب، ذرا ان سے پوچھو، ان مسٹر فاروقی صاحب بہادر سکریٹری نمائش و مقابلہ، کیا نام اُس کا ہمیں منظور ہے — سیوتی لال مالی نا؟''

''جی نہیں قبلہ، گلابو دختر سیوتی لال مالی۔''

''ہوں! یہ بھی کوئی روہیلکھنڈی راجپوتنی ہوں گی؟ یہ گلابو، کوئی راج کنواری — ہیں نا؟''

''عورت نہیں ہیجڑے مقابلے پر لاؤ! مالن نہیں جھنگن — مقدر اپنا! آپ سیکرٹری جو ہیں،'' مجمع میں سے پیچھے سے کوئی بڑبڑایا۔ فاروقی صاحب نے چونک کر دیکھا۔

''جی ہاں، جی ہاں، سیوتی لال مالی،'' مسٹر فاروقی نے کہا۔

خاں صاحب نام لکھتے ہوئے بڑبڑائے، ''اجی روہیلکھنڈی چوہان والا لکھایئے!'' اور یہ کہتے ہوئے اپنے ساتھی راجا بلبیر سنگھ کی جانب مخصوص دادرسی طلب نگاہوں سے دیکھا اور بڑی بڑی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بلبیر سنگھ بڑبڑائے:

''ہاتھی سے مینڈھا ٹکر لے گا، بھگتے گا۔'' (گالی)

بات حافظ رحمت خاں روہیلہ اور شجاع الدولہ سے وارن ہیسٹنگز تک اُلٹی قلابازیاں کھاتی، ماوراء التاریخی دور میں جا پہنچی تھی اور پرتھوی راج، جے چند اور محمد غوری و قطب الدین ایبک کے گرد

Scanned with CamScanner

چکر لگا رہی تھی؛ وہ تو خیریت گزری کہ راجہ بلبیر سنگھ کے سر پر سے نکل گئی اور خاں صاحب نے نزاکت کا اندازہ کر کے آئی گئی کر دی۔ اور دوسرا ہی دن مقابلے کا تھا۔ آرے آرے ہو گئی کہ رئیسوں کے مقابلے پر ایک ادنیٰ مالی نئے سیکرٹری صاحب لے کر آئے ہیں۔ پٹھان، ٹھاکر، راجپوت کے مقابلے پر ایک شودر! اور اس شہرت کے ساتھ ہی مسٹر فاروقی کی پوزیشن کو اس چھوٹے بڑوں کے تمام مجمعے میں حیرت، تعجب، غم و غصہ، قنوط، سنک کے انداز میں ہر شریکِ جشن نے اپنی اپنی فکر و استعداد کے مطابق محسوس کیا کہ سیوتی لال مالی تو سامنے پڑنے کی ہمت نہ کر سکا، تاہم مالی کی معصوم نوخیز لڑکی گلابو، جو بیگمات، رانیوں اور راج کنواریوں میں صبح ہی صبح پھول مہندی لے جایا کرتی تھی اور حویلیوں میں جس کی کھلونے کی طرح پذیرائی ہوا کرتی تھی، اسی طرح کا ایک کھیل والا مشغلہ سمجھ کر تیار ہو گئی۔

علی الصباح مسٹر فاروقی نے سیکرٹری کی حیثیت سے مقابلے کا انعقاد کیا اور ججوں کے سامنے اُدھر اندر آم پیش ہو رہے تھے، اِدھر باہر "جتنے منہ اتنی باتیں" کے بجائے جتنے منہ اور ایک ہی بات تھی۔ "یہ اچھے انگریز منش سکتر صاحب بہادر لا کر مسلط کر لیے! مقابلے پر کمین کھڑا کر دیا۔ کوئی مالی، بھلا یہ کوئی شرافت ہوئی۔"

"یہ کون سی عنایت ہے۔ ویسے تو یہ بھی خاندانی شیخ ہیں، اور شیخ ہو کر پھر یہ دوغلا پن دکھلایا، حیرت ہے۔"

"انگریزی پڑھے، ولایت پلٹ! یہ وضعداری کیا جانیں بیچارے! اور پھر شیخ تو شیخ ہوتے ہیں۔ اپنے آپ الگ رہے اور بیٹھے بیٹھے تماشا دیکھ رہے ہیں۔ اگر آج اپنا کوئی مقابلے میں ہوتا تو یہ مالی کا آم مقابلے میں پاس بھی نہ ہوتا۔ بُرا زمانہ آ گیا۔ چودھویں صدی ہے چودھویں۔ قربِ قیامت! غربا شرفا شریفوں، امیروں، رئیسوں کے منہ آ رہے ہیں، دیکھو نا۔"

"اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی — مالی آ گیا سارے اودھ روہیلکھنڈ، مرشد آباد، دربھنگہ، اجی پورے ہندوستان کے سامنے مقابلہ کرنے! اللہ خیر کرے، زمانہ کیا کیا دکھائے۔"

"کلجگ ہے کلجگ! راون نہیں چڑھ آیا تھا مہاراجہ رام چندر جی پر؟ کیا نتیجہ ہوا؟ آج تک (گالی) ہر سال جل رہا ہے (گالی)۔ پوری کڑی ہندوستان بھر میں لعنت ماری پھر رہی ہے۔ بھئی یہ روہیلکھنڈی کبھی اودھ والوں سے تو بنا کر چلے ہی نہیں، ہمیشہ چوہانوں، تومڑوں، راٹھوروں، بھٹیلوں

کے بھیس میں چماروں، کسانوں کی فوج لے کر اودھ پر چڑھے، اور خود مٹ گئے اور اودھ کو بھی میٹ دیا۔"

"یارب العزت! تو ہی نگہبان ہے شریفوں کی عزت کا آج۔"

"اجی خاں صاحب، عزت تو گئی اسی گھڑی جب ایک ادنیٰ شودر غلام آپ کے مقابلے پر کھڑا کر دیا اس روہیلے فطین شیخ نے، ہم سب شریفوں کے سامنے۔"

"اجی صاحب، سب ملے ہوئے ہیں یاں سے واں تک! ان روہیلوں نے تو اپنے تخت پر ادنیٰ جاٹ بٹھائے ہیں۔ تاریخ کھول کر دیکھ لیجیے۔ ان کے یہاں شرافت، نجابت، وراثت کب چلتی تھی؟ بس جو ذرا دل چلا سردار چمک جائے، وہی تخت پر بٹھا کر اچھے اچھے روہیلے پٹھان سردار اُس کے سامنے جھکا کرتے تھے۔ یہ کیا جانیں شرافت، نجابت، وراثت کیا چیز ہوتی ہے۔"

اور ایک روہیلکھنڈی شیخ نے جواب دیا جو یہ تمام چہ میگوئیاں سن رہے تھے، "لیکن ان انگریز منش صاحبزادے مسٹر فاروقی کے ہاتھ میں انتظام تو اودھ والوں ہی نے دیا۔"

"ہاں بھئی دیا، اودھ ہی والوں نے دیا! پھر اودھ ہی والے بھگت بھی رہے ہیں،" ایک اودھ کے ٹھاکر صاحب بولے۔

"کیوں؟ کیا روہیلکھنڈی اور یہ غریب مرشد آبادی اور سارے کے سارے جنوبی مشرق اس توہین میں نہیں شریک ہیں کیا؟" شیخ بولا۔

"ہاں میاں، ہمارا ہی جوتا ہمارا ہی سر! پورے ملک کے شرفا سے ایک ادنیٰ شودر کی ٹکر کرا دی اس فطرتی روہیلکھنڈی شیخ نے۔ ڈیڑھ صدی کا انتقام لیا ظالم نے۔ یہ تو اس شیخ کے ہاتھ انتظام دینا ہی غلط تھا۔ کسی روہیلے پٹھان یا ساداتِ امروہہ، ساداتِ بارہہ کے کسی شریف نجیب الطرفین غریب آدمی کو دے دیتے۔ کم از کم اُس کو شریفوں کی عزت کا پاس تو ہوتا۔ یہ شیخ تو بڑا فطرتی نکلا صاحب! سب کے سر پر جوتا گھموا دیا مفت میں، غضب رے غضب!" (ص 194 تا 200)

❋

اس مجلسِ عاملہ میں ابوالفضل صدیقی نے ہر دو مذاہب سے تعلق کے دعویداروں کی متعدد ذات برادریوں کو گرمِ گفتگو دکھایا ہے تا کہ زبان کے نیچے چھپے ہوئے لوگ، اپنے بول بات سے قاری

Scanned with CamScanner

پر منکشف ہوں اور سمجھ لیا جائے کہ ان گرم گفتاروں کے نزدیک۔ اعلیٰ، روایت، شرافت، عزت، وراثت، کلجگ، شیخ، سیّد، مغل، پٹھان، راجپوت، برہمن اور رام چندر جی۔ کے معانی کیا ہیں، اور یہ لوگ معانی کے اس جال کو کس کس طرح اپنی ذات اور طبقے کی اغراض کے۔لیے استعمال کرتے ہیں۔

تین طویل کہانیوں کے مجموعے انصاف کی اولین کہانی ''دھارا'' (صفحات 5 تا 98) میں بھی ابوالفضل نے ایک گفتگو خلق کی ہے۔ اس میں شریک افراد بھی سماج کے اُسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جس سے محولہ بالا مجلسِ عاملہ کے ارکان۔ یہ لوگ راج کنور ایشر سنگھ: مقلب بہ سنگھ بابو، کی دعوت پر اس کی آبائی جاگیر میں سیر و شکار کے لیے آئے ہیں۔ درجِ ذیل گفتگو کی ابتدا تو سیوتی نامی لڑکی کے حسن و جمال کے ذکر سے ہوئی ہے لیکن آگے بڑھتے بڑھتے اُن رویّوں اور افکار کا بھرپور اظہار بن گئی ہے جو محوِ گفتگو افراد کے ماحول اور ذہنوں میں عورت ذات کے لیے اختیار کیے جاتے ہیں۔ اس گفتگو میں بھی ابوالفضل صدیقی نے ہر شخص کی بول چال کے مخصوص ڈھنگ، اس کے طبقے اور علاقے کی بولی ٹھولی، اس کے آبائی پس منظر اور طرزِ فکر کو اتنی عمدگی سے منعکس کیا ہے کہ قاری کو مکالمے پر ان کی خلاّقانہ گرفت کی داد دیے ہی بنتی ہے۔ اس گفتگو کے بین السطور سے بار بار ایک لرزہ خیز حیوان کی جھلک ابھرتی ہے۔ اختتامِ گفتگو پر ابوالفضل صدیقی کے لاسٹ اسٹروک جیسے فقرے نے اس حیوان کی صورت و طینت کے تمام زاویے قاری کی روح پر کھول دیے ہیں۔ ''...اور نوکروں کی آمد پر سب چہرے یکدم ہموار ہو گئے۔''

4

...اور جب دس بارہ روز سے جنگل میں منگل ہو رہا تھا، بڑی مکمل چکڑی جمع تھی۔ راجپوتی تواضع، دیہاتی مہمان نوازی کا سنگھ بابو بڑے جوش کے ساتھ بھرپور مظاہرہ کر رہے تھے۔ رزم و بزم پورے زور پر تھی۔ شکار اور شراب، ضیافتیں، دھماکے، نغمہ، ہوحق، دوڑ دھوپ —— جشنِ جمشیدی دنگ تھا۔ اور ایک صبح جب سنگھ بابو بستر سے اٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ چودھری نے اسے جھنجھوڑ دیا اور اس کے اوپر سے لحاف اور فردوں کی تہیں کھوٹنا شروع کیں۔ ''یا وحشت تیرا ہی آسرا ہے! خیر تو ہے، صبح ہی

صبح!'' سنگھ بابو چودھری کا انداز پہچان کر آنکھیں ملتے ہوئے منہ کھولا اور چودھری سامنے کھڑا کھلکھلا رہا تھا۔

''کیوں بے نامردے، اوں! اور یہ ہم نے تو آج دیکھا! ایں! سویرے ہی سویرے تو میموں سے گوبر تھپڑایا کرتا ہے؟'' چودھری نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

اور سنگھ بابو نے جمائی لے کر منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مسکرا کر کہا، ''ہوں اوں، اماں باڑے میں، وہ ہماری چمریا کی لونڈ یا سیوتی دیکھ لی ہو گی تم نے...'' اور پھر ایک انگڑائی لے کر کھلنڈرے سے انداز میں سلسلۂ کلام جاری رکھا، ''ہاں، وہ سویرے ہی آ جاتی ہے کام پر، گوبر کوڑا صفائی کرنے کرانے۔''

''وہ کیا نام ہے سیوتی؟ اوہو سیوتی! ابھی تمھاری سیوتی تو سیوتی ہی ہے،'' چودھری نے کہا۔

اور سنگھ بابو نے ایک قہقہہ سا مارا اور بات آئی گئی کرتے ہوئے کہا، ''ہاں وہ بے چاری چمریا کی لنڈیا سیوتیا...''

''ابے گدھے! منہ تو دیکھو۔ احمق تمام خدائی کے! دانت کھول رہے ہیں، اپنی حماقت پر آپ خندہ فرما رہے ہیں۔ وہ بے چاری چمریا کی لونڈیا کہ کافر قتالہ؟ اور تم ٹھاکر بچے اب تک زندہ ہو بے غیرت! اور وہ گوبر کوڑا کرتی ہے! کیسے بھولے انداز میں فرما رہے ہیں ٹھاکر جی، جیسے منہ پر آنکھیں نہیں۔ اندھا تمام خدائی کا...''

اور سنگھ بابو نے چودھری کی بات کو بالکل اس طرح جس طرح وہ ہمیشہ سے اس کی مذاقیہ باتوں اور ہرزہ گوئیوں کو لیا کرتے تھے، لیتے ہوئے کہا، ''کیوں، کیسی ہے؟''

اور پھر اس طرح جیسے کسی بچے کی طفلانہ پسند پر مسکراتے ہیں، اس کی جانب دیکھ کر مسکراتا رہا اور چودھری نے اپنے مخصوص انداز میں کہا، ''کیسی ہے؟ ہوں، نالائق مجھ سے پوچھ رہا ہے! ویسے تو بڑے نمبری جا کی بنتے ہو، معلوم ہوتا ہے نرے باتونی ہو یار! دنیا بھر کی لفاظی میں میدان جوتتے ہو... بس دیکھ لی تمھاری ٹھکرایت!''

''ہوں تو پھر کیسی ہے؟ سچ بتاؤ۔ تمھیں پسند آئی ہماری چمریا؟ چودھری گوبر کا لبالب بھرا ٹوکرا ایک سانس میں اٹھا کر گھورے پر لے جاتی ہے۔ اس کے جوہر بھی معلوم ہیں کچھ؟''

''ارے یار، وہ تو جوہر ہے!'' چودھری نے کہا اور مخصوص انداز میں سنجیدگی کے ساتھ مذاق کرتے ہوئے سنگھ بابو نے اس کے منھ سے بات لے کر کہا، ''اور ایک چمریا ہی کیا! ایں جانب کے یہاں تو جو چیز نظر پڑے گی ایسی ہی نظر پڑے گی۔ اوں! اور آپ نے وہاں اُدھر ہی اصطبل میں میری چینی گھوڑی نہیں دیکھی، کیسی پری پیکر ہے؟ اور پھر جس وقت دوگاما قدم چلتی ہے تو پیٹھ پر بھرا کٹورا رکھ دو، کیا مجال جو بوند چھلک جائے! اور وہاں تمھیں میری بھوری بھینس اور گوری گائے نظر نہیں پڑی؟ ایک دھار دو دو تین تین دھڑی دوہاتی ہیں۔ ایک چمریا ہی کیا، یاروں کے یہاں جو چیز دیکھو گے نمبر ایک دیکھو گے! اور تم نے واں باڑے میں میری ہریانہ جسٹ نہیں دیکھی؟ ٹریکٹر کی ٹرالی جتنا وزن لے جاتی ہے، اکیلی لیے لیے پھرتی ہے۔ اور تانگے میں جوت دو دوست، جیپ کا ریکارڈ رہ آ جاتا ہے... کہاں تک دیکھو گے یاں، اور کیا کیا! اور ہاں، میرے کتے روہیلکھنڈ چھوڑ تمھارے اودھ تک دکھا دو! ایسے کٹر، گلدار کے پرخچے اڑا دیں، سانبھر کو اٹھا کر پٹخ دیں، ہوں اور آں وہ۔''

اور چودھری نے بات کاٹتے ہوئے کہا، ''ابے چپ بھی رہ یار! نا اہلا تمام خدائی کا! ہم سمجھ گئے، باتیں ہی کرنا آتی ہیں اور کچھ نہیں۔ ہوں، ویسے تو بڑے بنتے ہو، تینوں ترلوک دکھائی پڑ جاتے ہیں، ایک ایک کونے میں نونو پھوڑتے پھرتے ہو، اور گھر میں ایسی مونڈلی ہیں کہ پاؤں تلے کی دکھائی نہیں پڑتی۔''

''کیسی دکھائی نہیں پڑتی؟'' سنگھ نے اپنے اسی الھڑپن کے انداز میں کہا۔

''کیسی بتاؤں؟ ایسی کہ ٹھاکر صاحب وہ جو ہیں تمھاری بڑی نکیلی ٹھکرائن رانی، جنھیں تمھارے پتاجی سرآنکھوں پر رکھ کر تمھارے سر منڈھ گئے ہیں اور جن کے گونے دونے کی تم اور تمھاری ماتاجی دونوں دو برس سے گھڑیاں گن رہے ہو، سو دوست اُن کی چوکھٹ کتنی ہی اونچی ہو اور ناک کیسی ہی لمبی ہو، مگر جو اس چمریا کے پاؤں کی ایڑی کے برابر بھی نکلیں۔''

اور سنگھ بابو نے قہقہہ لگایا اور کھلنڈرے انداز میں کہا، ''تو پھر میں کیا کروں؟''

''ابے کرتا کیا! خر دنہیں تو میرے بتائے جان جائے گا... اور میں تو یہ کرتا کہ اُن ٹھکرائن کو لا کر اس گوبر پر لگاتا اور چمریا کو رانی بنا کر حویلی میں بھیجتا۔'' چودھری نے تمسخر کے ساتھ کھسیانا انداز بنا کر کہا، اور سنگھ بابو نے قہقہہ لگایا۔ ساتھ ہی بستروں میں اِدھر اُدھر سب دوست ہنس پڑے اور چودھری

اسی انداز سے کہتا رہا، ''اماں ہنستے ہو؟ رونے کا مقام ہے۔ واللہ، اِس نے تو ہم سب راجپوتوں کی ناک کٹادی۔ اجی یہ بقال مات کر دیے۔ کیسے ٹھاکر کے گھر میں پیدا ہوئے اور چمریا پکار اپنی نامردی چھپاتے ہو! ارے بھئی، یہ نہیں جانتا کہ عورت مرد کی غذا ہے۔ پھر گھوڑے گھاس کی یاری کس نے فرمائی؟ اور دونوں طرف یہ دیوانی جوانی! توبہ توبہ! حرام! صاحبو، ذرا اٹھ کر دیکھو تو، کیسی آگ سی بھڑکی ہوئی ہے، اور اس نامردے پر آنچ نہیں۔''

اور سنگھ بابو نے ذرا جھپک کر سنبھلتے ہوئے کہا، ''اور چودھری، یہ بتاؤ ہماری چمریا تمھاری چودھرائن کے مقابلے پر کیسی ہے؟''

''یہ کیا پوچھنا ہے ایں! اور ہم تو آج بدلنے کو تیار ہیں، کہیے تو کل بھیج دیں تیرے گوبر کوڑے کی صفائی پر، ایک چھوڑ ستر چودھرائن۔ کچھ ہم تیری طرح کوئی وہ اندھے دھندے تو نہیں کہ ہیرے کنکر میں فرق نہ کریں،'' چودھری نے تمسخرانہ سنجیدگی سے کہا۔

اور سنگھ بابو نے گردن اٹھا کر اس کا چہرہ بغور دیکھا۔ صبح ہی صبح اٹھ کر پیگ لگالیا کیا؟ اور پھر ذرا سنجیدگی سے ختم کرتی ہوئی سی بات کہی، ''چھوڑ یار چودھری، بس رام رام۔ ہمارے یہاں رعایا کو بہن بیٹی سمجھتے چلے آئے ہیں۔''

''ارے، رام رام نہیں تو پھر اور کیا کیا! ابھی اُدھر جو گئے تو دیکھ کر بے اختیار منھ سے سبحان اللہ نکلا ہی ہمارے — آں اور پھر تیرے اوپر لعنت اللہ!''

اور سنگھ بابو نے پھر بات کا رخ بدلنا چاہا اور زیادہ سنجیدگی سے کہا، ''نہیں بھیا چودھری، ہمارے پُرکھوں سے گاؤں کی بہو بیٹی ماں بہن برابر رہی ہے۔'' اور پھر اپنی اخلاقی روایت کی داد مسٹر پربت سنگھ کی جانب دیکھ کر چاہی جو اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئے تھے اور ایک سگریٹ سلگائے، رگ میں لپٹے، مسکرا مسکرا کر ان دونوں بے تکلف دوستوں کی چھوٹ دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے کہا:

''دیکھیے سنگھ بابو، ہم اور آپ اس وقت مادّیت اور اصلیت کے دور میں ہیں، اور خدا کے فضل سے اس وقت ہم میں یہاں کوئی بھی ایسا نہیں جو تعلیم یافتہ نہ ہو۔ یاد رکھیے کہ بہن، بہن ہی ہوسکتی ہے اور بیٹی بیٹی ہی — اور کوئی چمریا دومڑیا تو در کنار، ہر ٹھکرائن راجپوتنی بھی ہماری بہن بیٹی نہیں ہوسکتی۔ اور بھئی، آج کل تو ہر چیز کا سایکالوجیکل اور سائنٹیفک تجزیہ ہو چکا۔ اور وہ تو سگی ماں بہن بیٹی وغیرہ جیسے

Scanned with CamScanner

رشتوں میں انٹرکورس بیالوجیکل ریسرچ کے مطابق نسلِ انسانی کے لیے مضر اور قاطع ہے، ورنہ آپ کی ان اخلاقی قدروں پر بھی کبھی کی ضرب پڑ چکی ہوتی... اور آج آپ تعلیم یافتہ ہو کر ایک چماری کو بہن بنا رہے ہیں۔''

اور ان کے منھ سے بات لے کر چودھری پھر بول پڑا، ''جی ہاں ٹھاکر صاحب، بارہ برس دلی میں رہے، بھاڑ جھونکا! پانچ برس کانپور اور پھر پانچ برس مکینیکل فارمنگ کے بعد بھلا نوکِ زبان تک رہنے والی اخلاقی قدریں! دنیا بھر کی ہر عورت ماں، بہن نانی نواسی وغیرہ۔ اور گاؤں کی چماری! اب کیا کہوں، اور پھر ایسی کافر! آپ کی شاید ہمشیرہ عزیزہ! تو پھر جورو بھی کوئی غریب بنے گی؟ ایں؟ اور پھر بابا، اللہ نے آنکھیں دی ہیں۔ ذرا کھول کر یہ دیکھو کہ چماری کے روپ میں ترکن کہ فرنگن... اور یہ ماں بہن بنانے کے لائق ہے یا کچھ اور؟... اور ماں بہن بنانے کو پورا گاؤں پڑا ہے۔ سیکڑوں کانی کھتری، ٹیڑھی میڑھی موجود ہیں۔ چاہے ماں بناؤ چاہے نانی کہو۔ مگر بندۂ خدا، اس کافر ادا، غارت گرِ ایمان و آگہی کو تو بہن کہہ کر اپنی بدکورذوقی اور مجبوری کا ثبوت مت دو۔''

''نہیں بھئی یار چودھری... نہ یہ آج تک ہمارے یہاں ہوا، اور... اوں... اس لیے وہ یہ بات ایسے ہو نہیں ... نہیں ہو سکتی۔''

''جی ماما، آج کیا بات کیسے نہیں ہو سکتی؟ کیا مطلب، تمھارے یہاں جو آج یہ سب کچھ ہو رہا ہے یہی سب ہوتا چلا آ رہا ہے؟ یہ کتھے کا جنگل اور فیکٹری کی اسکیم، مکینیکل فارمنگ اور کیا کیا! اور یہ تو تمھاری Un-natural approch ہے۔'' اور انھوں نے مسٹر پربت سنگھ کی جانب دیکھا اور مسٹر پربت سنگھ نے کہا:

''لارڈ بائرن کہتا ہے: But who can view the ripen rose nor seek to wear''

''جی خیر، وہ تو لارڈ بائرن تھا، ہمارا ملّا ہوتے ہوئے بھی کیسا رنگ تھا! ایسی ہی کوئی کھلی سیوتی دیکھ کر کھل اٹھا:

چو یابد بوئے گل، خواہد کہ بیند
چو بیند روئے گل خواہد کہ چیند

یہ لیجیے، اب تو کچھ گنجائش ہی نہ رہی۔''

''لو، فارسی سے بھی تائید ہوگئی!'' پربت سنگھ نے نیم مزاحیہ انداز میں کہا اور پھر ذرا سنجیدہ ہو کر سائنٹیفک انداز میں بولے، ''بھلا آپ کے یہاں یہ روایاتی رشتے داریاں بگھاری جاتی ہیں، اور ملوں اور فیکٹریوں میں کیا ہوتا ہے؟ ہر نوجوان مزدورن انگلیوں پر رکھ لی جاتی ہے۔ اور خیر یہ آپ کی چماری جیسی اوں، یہ آں ایسی لونڈیا! یہ کہیں جا پھنسے تو خیر قیامت ہی آ جاتی۔ اور منیجر، جنرل منیجر چھوڑ، ڈائریکٹر اور جنرل ڈائریکٹر تک گھڑدوڑ مچ جاتی۔ ویسے مسلمہ امر ہے، مل فیکٹری میں ہر جوان عورت کو خواہ کیسی ہی کالی بھدی کیوں نہ ہو، بس عورت ہو — اوں آں، وہ تو، کسی نہ کسی چھوٹے بڑے اسٹاف ممبر کے سر ہونا ہی پڑتا ہے... اور ایں، میں آپ سے پوچھتا ہوں، کل کو جو یہ کتھا فیکٹری کے جنگل کی اسکیم اور مال کی سپلائی کے سلسلے میں یہیں کام پر جائے گی تو بھئی معاف کرنا سنگھ بابو، منیجر، کنٹرولر، کیمسٹ، بوٹینسٹ وغیرہ جو آئے دن یہاں دورے میں بنے رہیں گے، آپ کی طرح اخلاقی اندھے تو نہ ہوں گے... وہ تو بھئی، جیسا کہ انگریزی فارسی میں بھی کہہ چکے ہیں، دیکھیں گے اور پھر ہوں، بھیڑ تو جہاں جائے گی مڑے گی! دور کیوں جاؤ، ہمارے پہاڑ ہی ہیں، دیکھ لو، پرانی ٹریڈیشن چلی آتی ہے۔ ہر ڈومرا اپنی لونڈیا پہلے مہینے فارغ ہوتے ہی زمیندار پٹیل نمبردار کے گھر پہنچا جاتا ہے، ہوں، اور جب تک وہ رکھے اس کے ساتھ رہتی ہے اور پھر جب پھر مکھیا پٹواری وغیرہ سے گزرتی گزارتی چار چھ مہینے میں کہیں جا کر بکتی بکاتی ہے تو دھرم کے آدھے دام زمیندار کو چڑھا جاتا ہے، کہیے۔''

''ارے صاحب! دنیا جہاں کا سررشتہ ہے۔ یہیں کا بابا آدم نرالا ہے،'' چودھری نے پربت سنگھ کے منھ سے بات لے کر ذرا جھٹکے سے کہا اور پھر ادھر اُدھر بستروں پر لیٹے، بیٹھے، لڑھکے رئیس زادوں کی جانب نظر گھما کر کہا، ''یہ باپ، بیٹی، بہن، بھائی، نانی، نواسی کی حماقتیں ہم نے ان روہیلکھنڈیوں میں ہی سنیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان رشتوں کے ناموں کی آڑ پکڑ کے اپنی کمزوری چھپاتے ہیں۔'' اور روہیلکھنڈی رئیس زادے کچھ چونکے سے، مگر چودھری پوری لسانی کے ساتھ مسٹر پربت سنگھ کو مخاطب بنائے سب کو سناتا رہا۔

''اور پربت سنگھ، اوں آں، اور ہمارے یہاں تو آپ سے بھی پہلے، ایں آں، اور اتنا بھی انتظار نہیں کرتے — پہلے ہی پکڑوا لیتے ہیں۔ جہاں کوئی لونڈیا ذرا ناک نقشے سے درست اچھی

Scanned with CamScanner

اُبھرتی نظر آئی، ہاں...اور آپ کے واں تو خیر آدھی پرتی قیمت چڑھونے میں آتی ہے اور ہمارے یہاں اگر بکتی بکاتی ہے تو سب کی سب رقم بقایا لگان کے سود میں سپاہیہ ہو جاتی ہے۔ اور بھائی صاحب، یہ روایتیں اب تک انھیں روہیلکھنڈیوں نامردوں میں ملیں گی۔" چودھری نے پھر ایک کڑی سی چٹکی لی۔

اور جیسے روہیلکھنڈ کے ساتوں ضلعوں میں کھلبلی سی مچ گئی اور چودھری کی چوٹ پر اور سب کے سب روہیلکھنڈی رئیس زادے اپنے اپنے بستروں میں اچھل پڑے اور لال ناہر سنگھ راٹھور اور کنور نوبہار سنگھ تو مڑا یک منھ بول پڑے۔

"ارے چودھری صاحب! بھلا ہم سب روہیلکھنڈیوں کو کیوں بدنام کرتے ہیں آپ! یہ ان چوہان نگر والوں کی کچھ پرانی آن چلی آتی ہے آج تک۔ بدنام کنندہ نکونامے چند۔ ٹھیک کہتے ہیں آپ، نہ معلوم نامردے ہیں کہ کون، جو کچھ بھی آپ کہیں حق بجانب۔ مگر اس میں شک نہیں کہ پہلے تھی بہت سے خاندانوں میں کچھ یہ ہی بات۔ مگر بھئی، جیسا کہ آپ نے ابھی فرمایا، ہماری طرف یہ نیچ قومیں صورت شکل سے بہت گری ہوئی ہوتی ہیں، تو پھر یہی روایت ٹھیک تھی۔ چلو، اور پہلے بھی اگر ان میں کوئی ذرا نکیلی سرج جاتی، جیسا کہ ابھی آپ نے فرمایا کہ ہم آج کل سب کچھ وہی کر رہے ہیں جو ہمارے باپ دادا کیا کرتے تھے، اور پہلے تو ہم سمجھتے ہیں کہ وہ ایسی غلطی نہیں کرتے تھے کہ ایسی غذا کو جیسی آج سنگھ بابو کے سامنے ہے، اپنے اوپر حرام کر کے نہ چکھیں۔ ماں بہنیں بیٹی بنانے کے لیے ہزاروں کالی بھجنگی کالی کھتری پڑی ہیں۔"

اور ان کے منھ سے صاحبزادہ معشوق زماں خاں نے بات لے کر کہا، "اور اللہ رکھے، اُن کی کیا تھی، اے صاحب! ہمارے جدامجد کی، جن کا ابھی حضور نے نام لیا۔ اے ہے، خیر سے ایک ایک کے ہزار ہزار پلے بندھی رہتی تھیں۔ آپ ہاتھیوں چڑھتے چڑھتے پھرتے تھے، پیچھے پیچھے بیگماتوں، لونڈیوں، باندھیوں کی ہزار پالکیاں ہواداریں چلی آتی تھیں۔ حکیم کمر بند میں بندھے بندھے پھرتے تھے، سیکڑوں کشتے، طلائیں، معجونیں لیے۔"

اور مسٹر پربت سنگھ اور چودھری دونوں صاحب معشوق زماں سے اس دوران میں متعارف ہو چکے تھے اور اُن کے کلاسیکل ڈانس اور گولی لگانے کا فن، دونوں کمالات جو انھوں نے وراثت اور روایات میں پائے تھے، چند روز کے قیام ہی میں بچشم خود دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے تھے۔ اُن کی

Scanned with CamScanner

جانب مسکرا کر دیکھا اور مسٹر پربت سنگھ نے کہا:

''ٹھیک فرماتے ہیں آپ معشوق میاں! لین پول لکھتا ہے کہ راجہ مان سنگھ کے پندرہ سو حرم تھیں۔''

اور چودھری نے اُن کے کلام کو بالا کیا، ''اور ہمارے پیا جانِ عالم کی نہ معلوم کتنی! رونگٹے رونگٹے پر ایک ایک۔ اور بغیر ان کے پورا پورا انتظام ناممکن تھا صاحب! بالکل صحیح، اور ہمارے اب بھی دو چار بڈھے آنکھوں دیکھے نکل آئیں گے۔''

اور سب روہیلکھنڈی شہزادوں نے اپنے اٹھارویں صدی کے سردار آقازادہ مردان علی خاں صاحب بہادر روہیلہ کی جانب دیکھا جن کے جدامجد نے روہیلکھنڈ کے سات اضلاع کے ایک چھوٹے سے یونٹ کو وارن ہیسٹنگز اور شجاع الدولہ جیسی طاقتوں سے ٹکراؤ کا اعلیٰ شعور دیا تھا، اور بات چودھری سے ہو رہی تھی، جو ایک اودھ کا شہزادہ تھا جہاں کے تمدن کی اعلیٰ اقدار کو دہلی کے تمدن کے ساتھ ملا کر ایک انفرادی روہیلکھنڈی کلچر نے جنم لیا تھا۔ اور نوابزادہ مردان علی خاں کے نامور جدامجد حافظ رحمت خاں کی مورتی کی ہر سال دسہرے پر آج تک سب روہیلکھنڈی راجپوت پوجا کرتے ہی ہیں۔ لہٰذا اس مرتبہ خاص طور پر نوابزادہ مردان علی خاں اپنی تاریخی سیادت کو چودھری کی وجہ سے اپنی اس مخصوص پارٹی میں ممیز کر رہے تھے اور بُت بنے ہوئے تھے اور اپنی خاندانی سیادت کا ان سب کے درمیان اظہار کیے بیٹھے تھے۔ ان کے متوجہ ہونے پر انھوں نے اپنے حلق سے ہونٹوں تک بھرے تہہ بہ تہہ اور پیک سے آزاد کر کے بولنے کے لیے منھ خالی کرنے کو اِدھر اُدھر دیکھا اور جب کوئی خدمتگار نظر نہ آیا تو ذرا جھک کر برابر کے اسٹول سے اگالدان اٹھایا اور نہایت نفاست کے ساتھ خوشبودار پیک تھوک کر گوہر افشانی کے لیے تیار ہوئے، اور پھر ''ہوں'' نکال کر ڈیڑھ دو منٹ چپ رہے، جیسے قطعی و آخری محاکے کے لیے درست ہو کر سامعین کو متوجہ کیا اور پھر محققانہ انداز میں فرمایا،

''ارے صاحب، کہاں پہنچے آپ حضرات بھی، واجد علی شاہی اور اکبری ادوار میں! آج دیکھیے نا، زندہ مثال سامنے ہے ہمارے ہز ہائی نیس شیو کرن بہادر سنگھ آف ... کے تین سو سے اوپر رانیاں موجود ہیں۔ اور یہ تو رہا آپ کے پنجاب کا، اور ہمارے روہیلکھنڈ میں چھوٹے بڑے دیہاتی رؤسا کی یہی صورت ہے جو کنور دیپال سنگھ نے بیان کی۔ اور پہلے تو ہمارے دیہات میں چھوٹی قومیں بستی ہیں۔

Scanned with CamScanner

اور خال خال کبھی کوئی... اوں آں، اگر کوئی کہیں قبول صورت دیہاتن ابھرتی ہے تو یہ لوگ بلا تکلف پکڑ بلاتے ہیں۔ اور رہا ہم... آں اُن لوگوں کا رجحان ذرا صنفِ نازک کی جانب ہوں— آں ذرا کم ہی ہے۔ اور چودھری صاحب وہ، اوں، آپ کی اس غذا کی غذائیت زیادہ راس نہیں انھیں... اُوں!'' اور انھوں نے صاحبزادہ معشوق زماں خاں کی جانب تصدیق طلب نظروں سے دیکھا۔

اور صاحبزادہ صاحب نے نگاہیں اٹھائیں، پھر بدستور جھکا کر مخصوص انداز میں ہاتھ چلاتے ہوئے، گویا نس نس سے پھڑک کر، اپنی ناک میں سے نغمہ چھوڑتی آواز میں بول پڑے، ''اور دور کیوں جاؤ، اے حضت، یوں تو ہمارے سرکار خلد آشیانی ہز ہائی نیس مرحوم ومغفور کے خود خیر سے آج سوا سو سے زیادہ بیگمات اللہ رکھے بیٹھی ہیں، چوڑیاں پھوڑے، اللہ کی بندیاں۔ حالانکہ اللہ بخشے، حضت مرحوم کا ذوق مائل بہ ایرانی تھا مگر پھر بھی— اور نوابزادہ صاحب، آپ نے پنجاب کی بتادی اور نہ بتائی تو یہ اپنے دکن کی! یہ ہمارے وزیر دکن مہاراج، آج دیکھ آؤ جاکے نا، آنجہانی کے نہ معلوم کتنی سیندور مانگ اُجاڑے...''

اور اتنے میں چائے آگئی اور بات کٹ گئی اور نوکروں کی آمد پر سب چہرے یک دم ہموار ہو گئے اور صاحبزادہ، لال، نوابزادہ، راج کنور، سب اپنے اپنے نسلی روپ کے لبادے چڑھا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور چائے کی میز کی جانب متوجہ ہو گئے، جس پر بجز ان کی اپنی اپنی مخصوص غذاؤں کے اور سب غذائیں سج رہی تھیں۔ (ص 24 تا 36)

❁

اسی کہانی میں دھارا اور چتر سنگھ (عرف چتریا) نامی کرداروں کا ایک مختصر مکالمہ (اقتباس 5) قلم بند کرتے ہوئے ابوالفضل صدیقی نے روہیلکھنڈ کی دیہی بولی ٹھولی اور چتریا کی باتوں میں وہاں کا نسوانی محاورہ خاص طور سے استعمال کیا ہے۔ علاوہ ازیں مجموعے جوالامکھ کی کہانی ''ٹکر'' (صفحہ 71 تا 94) میں ایک خانہ بدوش مستی ترارہ اور ناہر سنگھ نامی ٹھاکر کی گفتگو (اقتباس 6) ان کے علاقائی لب ولہجے کی مثال پیش کرتی ہے۔ اقتباس 4، 5 اور 6 سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابوالفضل صدیقی نے غالباً شعوری طور پر مختلف علاقوں کی زبان کے رنگ اور افراد کے طرزِ گفتار اپنی کہانیوں میں محفوظ کیے ہیں۔

Scanned with CamScanner

5

...اور چتریا نے اپنی آنکھوں کے مخصوص قسم کے آڑے ترچھے انداز سے نرت کے ساتھ فاتحانہ تیوروں سے دھارا کی جانب دیکھا، کولھے مٹکا کر اور ہاتھ نچا کر کہا،''ایں، لے ری، نہ تو کو نہ موکو، لے چولھے میں جھونکو...'' اور پھر مٹک کر رہ گیا اور دھارا کے مستفسرانہ اشارے پر کہا،''راج بابو کی آنکھ چڑھ گئی وہ تیری سیوتی، اونھ!'' اور بھنویں مٹکا کر اور گردن تھرکا کر:''اب لے لیجیے سنگھ، کلموئے واری جا...''

اور دھارا اس کی آج بالکل نئی بات پر کچھ چونک سا پڑا؛ اور وہ سنگھ بابو کو بجز اس پہلو کے اور سب پہلوؤں سے اچھی طرح پہچانتا تھا، اس نئے انکشاف پر اسے یقین نہ آیا۔ اس نے کہا،''ارے چتریا، سنگھ بابو کو کاہے کے لیے سنگ پیست ہے۔ ہمو اہم بھی پہچانت ہیں سنگھ بابو کو۔ معلوم ہے تو بڑا جانی کار ہے، ہم تم نبٹیں گے۔''

''ارے ئن رے، اب تو ہم تیرے سامنے سے ہٹ گئے، اب تو ہے اور سنگھ بابو — ہاتھی سے گنا لینو ہے، سنبھل جارے کلموئے۔''

''ارے چتری سنگھ، ہمیں تو تیری ٹھکرائت دیکھنی ہی (تھی)۔ سنگھ بابو کو ہر معاملے میں ڈھال نائے بنا ان کے یہاں سب کچھ بھئی (ہوئی) ہے، بہے (یہی) نائے بھئی ہے۔''

''ارے گنگا ماتھے (گنگا اُٹھاتا ہوں)، تو کل سکارے (سویرے) دیکھ لے۔ باڑھا میں جتنی دیر سیوتیا گوبر کوڑا اجھاڑ بڑھار کرت ہے، سنگھ بابو پیچھے پیچھے پھرت ہیں۔ اور کوئی دن بات ہے اٹھائے لیں گے مار جھپٹا چیل کا سا۔ ہماری نہ مانے، کل آنکھ سے دیکھ لیجیے۔''

''بس چتری، تمھاری جے (یہ) مکاریاں ہم بہت دیکھت رہے ساری عمر۔ سنگھ بابو بیچارے کو کاہے کے لیس بیچ میں لگائے بات کرت ہے۔''

''دھارا، کیسی بات کرت ہو! چھوٹی گنگا کو ہماری پیٹھ ہے اور بڑی اور (طرف) ہمارا مونہہ! سنگھ بابو تو آج کل میں پکڑ لیں گے۔''

''ارے چپ رہو، کیوں بکت (بکتے) ہو! بیکار میں بدنام کرت ہے (کرتا ہے) سنگھ بابو کو...''

Scanned with CamScanner

''سنگھ بابو، سنگھ، سنگھ بابو اور بھیا دھارا، ہم تو ہٹ گئے چھوڑ میدان۔ دیکھیں اب تم کیسے بیر بکر ماجیت ہو۔ ہاتھی میڑھا کی ٹکر ہے، تیری سنگھ بابو کی چھوٹ ہے۔''

اور دھارے جیسے ایک کہربائی جھٹکے سے ذرا ڈھیلا سا ہوا اور پھر تن گیا۔ ''ارے سنگھ بابو کی تو ہماری پانچ برس کی چھوٹ ہے۔ اب جے کتھا کو جنگل لگالیں تو دیکھی جائے گی — ہم تو بٹنے کے لیے آپ بیٹھیں ہیں، کل نہیں آج سہی!''

''بس دیکھ لی تمھاری سامتی! دھارا ان اپنے نہ مُچھیا (بغیر مونچھوں والے) لونڈوں کے سامنے باتیں مارو کرو، چتری کے سامنے جے باتیں مت مارو کرو۔'' اور پھر طنزیہ انداز کو اور تیز کر کے سلسلۂ کلام جاری رکھا، ''پھارم پر تم نے اور تمھارے ان بگلا بھگت گورو جی نے بہت اپا ڑی۔ باپ دادا کی چار بیگھے پکڑیا گانٹھ سے دے کے چھٹے۔ اور کتھا کو جنگل تو اجھے دور ہے، اساڑھ میں دیکھو تو پہلے آج اس جھپٹ کو تو روک لے مٹی میں دکھائی دے گو (دکھلائی دے گا)۔ اور کانپور سے پرلی اور! چڑھائے لیے جیسے مڑھا (گھر)، جہاں تیرا نال گڑھا ہے،'' چتریا نے کہا اور دھارا پی کر چلا گیا۔...

(ص64 تا66)

6

خانہ بدوش کو راٹھور گڑھ کے قریب ٹھہرے ہوئے دوسرا روز تھا کہ شام کے وقت ناہر سنگھ نے اُسے بلوالیا اور کہا:

''کیوں رے مندار ی، اپنا مینڈھا بیچت ہے؟''

''ہے ٹھاکر جی! جے ہمرے کھانے کمانے کا ٹھکرا ہے، بیچ کیسے دیں؟''

''پچاس روپیہ لے اور چھوڑ مینڈھا۔''

''ناہیں سرکار... راجہ جی... بیچت ناہیں۔''

''اچھا پچتر لیو اور چھوڑو۔ دے رتی ہمارے ہاتھ مینڈھا کی!'' ٹھاکر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''نا بابا! جے تو ہمارے پیٹ کا دھندا اور پریم سوک (شوق) کا سہارا ہے،'' ٹھاکر کے انداز کا ٹھیک مقابلہ سا کرتے ہوئے کہا۔

Scanned with CamScanner

''اچھا چل، جارے منداری سو روپیا تو رے ہاتھ دھرے اور مینڈھا ہمیں پکڑائے دے،''
ٹھاکر نے اپنی پندار میں آسمان کی بلندیوں سے بولتے ہوئے کہا۔

''نا راجہ جی، تیری گدی بنی رہے! سو روپیا کے دن بیٹھ کے کھائے گو منداری؟ ویسے مینڈھا تیرو ہے، میرے راجہ! کہے تو آج باندھ دیئوں گھیر میں — سو اور پچاس روپیا کی کہا بات...''

اور ٹھاکر میں جیسے یک دم مخصوص کھلاڑی والا جذبہ بیدار ہو گیا — جیسے ایک رنگ سا آیا۔ وہ کچھ سنبھلا اور تیوروں میں خود بخود مساویانہ انداز پیدا ہو گئے۔ اب اس نے اپنی اس اقتصادی شکست کا دوسرے پینترے مقابلہ کرنا چاہا — بالکل اسی لہجے اور تیور سے جیسے وہ کسی برابر والے مدمقابل دوست سے معاملے والی بات کر رہا ہے۔

''اچھا تو پھر سنیو گسائیں جی، ایک ایک ٹکر دیکھیں گے۔ دیکھیں تو جرا کیسی نٹیا ہے تمھاری! سیر بھر پکی چاندی پہ تو لات ماردی۔''

''ہے سرکار! تیری میری کہا لڑائی — ہاتھی کی ٹکر ہاتھی روکت ہے۔ راجہ ہاتھی، منداری مینڈھا۔''

''نا گسائیں جی — میں کہا بات — مینڈھا لڑت ای اے ہیں اور پالیئی لڑان کو جات ہیں...'' (اس میں کیا بات ہے۔ مینڈھے لڑتے ہی ہیں، لڑانے ہی کو پالے جاتے ہیں۔)

''اے راجہ! تو راجہ، ہم پرجا — راجہ پرجا کی کہا لڑائی؟''

''نا گسائیں جی، ہم تو لڑائیں کل سوبرا کو... جرور... بد کے۔''

''پھر سوچ لے ٹھاکر! ٹھاکر باپ اور منداری بیٹا! — باپ بیٹا کی کیا نج؟''

''اوں ہوں! ہم تو دیکھیں گے دو ٹکریں۔ دیکھیں تو کیسی ہے تمھاری نٹیا کس بل کی۔''

''میرے مالک! منداری تیرو واڑ نٹیا تیری! بوؤ (وہ بھی) مینڈھا تیرا جیو (یہ بھی) مینڈھا تیرا — پھر ٹکر کران کی کہا ماری جات ہے؟''

''نائے! ہم کل سکارے (سویرے) کو ٹکر دیکھیں۔''

''اچھا تو پھر، راجہ جی کی جے کہن ہے، تو کریں تیار مینڈھا کو...'' (ص 77 تا 79)

❁

Scanned with CamScanner

یہ بتانے کے لیے کہ نوکِ زبان سے خود کو اعلیٰ روایت اور شرافت وعزت کے وارث قرار دینے والے، شیخ مغل، سید، پٹھان، راجپوت، برہمن، بہ باطن کس درجے پر فائز ہیں، ابوالفضل صدیقی نے گلابو کو پولیین کی سیڑھیاں چڑھتے دکھا کر (اقتباس 7) اپنے قاری کی بصارت وسماعت پر اِن خواص کے چہروں مہروں اور آوازوں سے ادا ہوتی اصلیت کا ویسا ہی بولتا ہوا حمام کھول دیا ہے جیسا کہانی ''دھارا'' (اقتباس 4) میں دکھایا تھا۔

7

مقابلے کے آم پہلے بارہ دری کے ایک کمرے میں جمع کیے گئے۔ خوبصورت، سرخ سبز نیلے پیلے کاغذ اور رنگین ڈھکنوں سے ڈھکی ہوئی ٹوکریاں، اندر آموں پر چاندی کے ورق لگے ہوے۔ باہر سے جو آم بذریعۂ ریل پارسل آئے تھے ان کا کوئی نمائندہ اگر ساتھ نہیں آیا تھا تو سیکرٹری کو خود اپنے اہتمام سے پیش کرنا تھے۔ کسی منچلے شاعر مزاج شوقین نے برف کی سل میں آم جما کر اور سل توڑ کر پیش کیے، کوئی روئی کے نرم گالوں میں لگا کر لایا اور کوئی شیشے کے جہازی مرتبانوں کے اندر؛ کوئی پھولوں میں سجا کر اور کوئی نفاست کے ساتھ صندل، آبنوس، ہاتھی دانت کی پٹاریوں میں لگا کر۔ اور نمائش شروع ہونے سے ذرا قبل گلابو سر پر اپنے آموں کی ڈلیا لے کر پہنچی، دونوں ہاتھوں سے انگڑائی کی صورت سر پر سنبھالے؛ ویسے ہی جیسے بچپن سے دیوان خانے کے صحن سے گزرتی پھول مہندی کی ڈلیا لیے زنان خانے کی ڈیوڑھی میں جایا کرتی تھی۔ ماحول سے بے خبر، بھولے پن کے ساتھ گزرتی چلی جاتی اور حویلی میں پہنچ کر بیگموں، بہوؤں اور راج کنواریوں، صاحبزادیوں میں اس طرح گھل مل جاتی جیسے یہ انھیں میں سے ایک ہے۔ مگر اس وقت پولیین کی پہلی سیڑھی سے ساتویں سیڑھی تک چڑھتے چڑھتے چودہ ریمارک ہو گئے۔ نوجوان زمینداروں میں بزرگوں کی موجودگی کے سبب صرف ناک بھوں چلی اور ٹھنڈی سانسیں بھری گئیں۔ منچلے جواں سال لوٹ پوٹ ہو کر آپس میں دو ایک جملوں تک رہ گئے۔ گدگدی کو دبانے کے لیے غیر شعوری طور پر آہستہ آہستہ ہاتھ چھاتی تک پہنچ گئے، دو ایک کھنکھار پڑے، کسی نے ہلکا سا آوازہ کسا؛ اور تو اور، جھک سفید بوڑھوں تک کے چہرے ہموار ہو گئے اور ہائے! اپنا زمانہ یاد آ کر جیسے مسلط ہو گیا۔

Scanned with CamScanner

''آ من انگوری ہے ——اجی...''

''اجی آ من فرنگن...''، ''ہوں ہوں، آ من حسن آرا...''، ''بھئی یہ تو آ من عروس ہے...''، ''کیا بکتے ہو یار، برانڈ آف رشیا!''، ''ارے ارے گلابو ہے، وہ سیوتی لال مالی کی لونڈیا...''، ''اوہو ہو، کیسے رنگین پر پُرزے نکالے ہیں ظالم نے! چیت کی تتلی ہو رہی ہے، پچرنگی تتلی!''، ''بھادوں کی دھنک کہو...''، ''اجی یہ اپنا آم نمائش میں لے کر آئی ہے یا خود؟''، ''یہی تو دریافت ہے سنتے ہیں روہیلکھنڈی انگریز منش سیکرٹری صاحب بہادر کی!''، ''بچیے میرے مالک!''، ''کون جیت پائے گا اس سے! کیا روہیلکھنڈ سے ساتھ لائے ہیں صاحب بہادر؟''، ''نہیں جی، وہ سیوتی لال اُستاد مالی کی بیٹی ہے۔''

اور ان آوازوں ریمارکوں کے درمیان معصوم چال چلتی، الھڑ پن سے دلوں کو پامال کرتی، مسٹر فاروقی کی رہنمائی میں ججوں کے بورڈ کے سامنے جا پہنچی۔ اور یہ آخری اُگز بٹ تھی۔ اس سے پیشتر جج تھوڑی بہت بحث تمحیص، مقابلے میں آنے والے ہر آم کا نام، موجد کا نام اور حسب نسب سنتے رہے تھے اور چکھ چکھ کر نمبر دیتے رہے تھے، اور سب سے آخیر میں گلابو کی باری آئی۔ کیلے کے پتوں سے منڈھی پوری ٹوکری یوں ہی اٹھا کر سامنے والی لمبی چوڑی میز پر رکھ دی۔ ججوں نے دریافت کرنے والے کا نام پوچھا تو بولی، ''گلابو مالن۔'' مزید تعریف پوچھی تو کچھ بولنے کی کوشش کرنے لگی، لیکن مسٹر فاروقی نے لقمہ دیا:

''دختر سیوتی لال مالی۔''

مقام کا نام پوچھا تو لڑکی سمجھ نہ سکی، لیکن فاروقی صاحب نے عجیب بات بڑھائی۔

''اودھ روہیلکھنڈ۔''

جج کچھ کوشش و پیچ میں پڑے مگر یہ ان کے جیورس ڈکشن کی بات نہ تھی، انھیں تو آم کا درجہ طے کرنا تھا؛ یہ مہمل سا جواب انھوں نے جوں کا توں نوٹ کر لیا۔ آم کا نام پوچھا تو لڑکی تو کیا جواب دیتی، یہ چیز گڑھنا فاروقی صاحب بھی بھول گئے تھے؛ ذرا ٹھٹکے، پھر گھونٹ سا لے کر برجستہ بولے، ''جی گلاب خاص... گلاب خاص... گلاب خاص ہے نا؟ ایں گلابو؟'' اور گلابو نے اثبات میں سر ہلایا اور آم تراش کر قاشیں ججوں کو پلیٹ میں رکھ کر پیش کیں۔ چکھ کر جھوم ہی تو اٹھے۔ ادھر گلابو نے

ڈلیا کے اوپر سے کیلے کا پتا ہٹایا، جیسے دیسی گلاب کے پھولوں سے لبریز ٹوکری! ساتھ ہی آم کی مخصوص خوشبو کے ساتھ ہلکی ہلکی گلاب کی خوشبو بالکل ناک میں پہنچی تو چونکے۔ اِدھر قاش منھ کے اندر پہنچتے ہی یہ گلاب کی خوشبو بالکل نمایاں ہوئی۔ بے اختیار منھ سے سبحان اللہ نکلا اور گلابو جلدی جلدی قاشیں کاٹ کاٹ کر پلیٹوں میں رکھنے لگی۔ حسب نسب اور اصلی تخمی درخت کی جائے وقوع پوچھی تو کوے کی کھا کر پھینکی گٹھلی سے آگے پتا نہ تھا، مگر وہ تخمی نودھا ابھی تک موجود تھا جس کی یہ قلمیں لی تھیں۔ قلمی درخت اسی نودھے سے قلم لے کر تیار کیے گئے تھے اور یہ اسی کے قلمی آم تھے۔

''مگر اصل درخت کا پتا کیوں نہیں چلا؟'' ایک جج نے پوچھا۔

''سرکار، یہاں سے وہاں تک کئی لکھ پیڑے ہیں۔ ان میں پچھلے دو سال سے کھٹے درخت کاٹنے کی جو مہم چلی ہے کہ اسی میں کہیں پر غلطی سے کٹ گیا۔ یا پھر بہت سے درخت ہر سال سوکھ جاتے ہیں، کئی برس تلاش کیا مگر پتا نہ چلا۔ اتنے بڑے جنگل جیسے باغوں میں کوئی شمار قطار نہیں، کیا ہوا۔''

ایک جج نے تخمی پودے کی جائے وقوع پوچھی تو گلابو نے بتائی کہ اس کے باپ کی گلاب باڑی ہے۔

جج نے مسکرا کر کہا، ''یہ گلاب خاص کی وجہ تسمیہ ہے۔''

مسٹر فاروقی نے برجستہ کہا، ''جناب والا، اس کی خوشبو پر آپ نے غور نہیں فرمایا۔ ہم سب جانتے ہیں کہ گلاب کی خوشبو آم میں آج تک نہیں پائی گئی، باوجود کوشش کے نہ دی جا سکی۔''

ایک جج نے اظہارِ خیال کیا، ''آمن فرنگن کا روپ، آمن دسہری کا قدوقامت، ثمر بہشت چونسے کی صاف شیرینی اور خاص الخاص شاہ آباد کا کیف ولطافت اور آمن عروس کی خوبصورت سڈول شکل وشباہت — آم ہے کہ ہمہ صفت موصوف۔ اللہ اللہ پھر آم، آمن نہیں! اور خوشبو! جیسا آپ نے فرمایا، یہ تو اپنی جگہ پر صرف اسی نُسخے میں پائی گئی ہے۔ جیسے گلاب خاص تو خارجی وداخلی ہر اعتبار سے خاص گلاب ہی گلاب ہے۔''

گلابو نے نہایت آزادی کے ساتھ کہا، ''جی، اور سرکار پال میں یہ خوشبو اور نکھر جاتی ہے،'' اور ٹوکری میں سے چند دانے پال کے برآمد کیے اور قاشیں پیش کیں۔

''واہ وا! پھلتا لدتا کیسا ہے؟ کتنا اونچا ہے؟ ڈنٹھل کا کیسا ہے؟'' ججوں نے سوال کیے۔

Scanned with CamScanner

اور گلابو بولی، ''سرکار، درخت سفید ملیح آبادی کے برابر اونچا ہوتا ہے۔ لدتا اتنا ہے کہ پہلی نگاہ میں دیسی گلاب کے پھولوں کی بہار میں بہت بڑی لدی ہوئی جھاڑی معلوم پڑتا ہے۔''

ایک جج نے ٹوپی دیکھ کر کہا، ''ڈنٹھل کا بھی مضبوط ہے چونسے کی طرح۔ پھر نیچا درخت ہے، ہوا دھوپ زیادہ نہیں ستا پاتی ہوگی۔''

''سرکار، جتنے آم چھٹ کر لگتے ہیں، تقریباً سب کے سب لگے رہتے ہیں۔ اور ہاں سرکار، پال میں لگا کر بھول جائے تو سڑتا نہیں۔ پکنے کے بعد سوکھتا ہے اور سوکھ کر ہی رہ جاتا ہے۔ اور ہاں سرکار، اس کی کچی کینڑی پال اُٹھ جاتی ہے۔ پھر ایسے پال میں کیف کم ہوتا ہے اور ہاں، شیرینی بھی اتنی نہیں ہوتی۔ کچی کینڑی کے پال میں اتنا تیز سرخ رنگ بھی نہیں آ پاتا۔''

اور بالاتفاق رائے سب ججوں نے اس پنج سالہ کا بہترین آم گلاب خاص کو قرار دے کر پانچ سال کے لیے اس کو آموں کا بادشاہ قرار دیا اور کپ، تمغہ گلابو مالن پر سجا دیا۔ باہر اک کہرام سا مچ گیا۔ گلابو سفید ساڑھی پر سنہرا تمغہ سجائے، چاندی کا کپ ہاتھ میں لیے نکلی۔ مقابلے کے شرکا پر تو مران سی پڑ گئی۔ بعض کو غش سا آ گیا... (ص 201 تا 205)

❋

گلاب خاص کا پانچ سال کے لیے آموں کا بادشاہ بن جانا، درحقیقت علم اساس ''فاروقی صاحب کی روشنی طبع'' (ص 206) کا نتیجہ ہے، جو سنہری تمغے اور چاندی کے کپ کی صورت، گلابو کی ساڑی اور ہاتھ میں دمک اٹھا ہے۔ لیکن اصل تزئین سے نابلد ٹھاکر، برہمن، سید، مغل، پٹھان اِسے شودر گلابو کی کامیابی اور اپنی اہانت تصور کر رہے ہیں۔ ابوالفضل صدیقی نے اس تصور کا اوّلین ردعمل جس ڈھنگ سے ملفوظ کیا ہے وہ اُن کی قوتِ بیان میں اقدار اساس فکر ونظر کی گھلاوٹ کے بغیر قطعاً ممکن نہیں تھا:

8

... گلابو سفید ساڑی پر سنہرا تمغہ سجائے، چاندی کا کپ ہاتھ میں لیے نکلی۔ مقابلے کے شرکا پر تو مران سی پڑ گئی۔ بعض کو غش سا آ گیا۔ جب ذرا آگے بڑھی تو دیہاتیوں کسانوں کے مجمعے میں سے اندر مہاراج کی لیلا، وشنو جی کی جے کا جے کارا گونجا۔ زمینداروں کے ملازموں، حالیوں موالیوں،

Scanned with CamScanner

مقدموں نے ڈپٹا، مگر جب تک اس مجمعے کے درمیان سے گزرتی رہی، جے کارے پر جے کارا گونجتا ہی رہا۔ میلوں مربع آراضی پر ایستادہ باغوں کا درخت درخت جیسے اُلٹا ہو گیا۔ پھنگیاں تحت الثریٰ میں گھس گئیں، جھکڑا موسلا جڑے فضائے بسیط میں پھیل گئیں۔ پیچ در پیچ، جال در جال، جیسے ہر پرانے باغ کے درخت درخت کا حلیہ بدل گیا۔ جن کے اندر سے زمینداروں کے حالی موالی مالی پرانے درخت دریافت کر کر کے نئی قلمیں باندھتے اور مالکوں کے نام سے موسوم کرتے چلے آئے تھے اور ہر مقابلے میں پیش کر کے گمنام سپاہی کی قبر پر اپنے آقا کے نام کا کتبہ نصب کرتے چلے آئے تھے، اور آج کسانوں کے تیوروں میں سے ہزار ہا سال بعد آقاؤں، زمینداروں سے دوئی کے انداز چھلکے تھے، اور اس رنگ، رس، خوشبو کے اجتماع میں ازلی جھکی گردنیں بلند ہو گئیں... (ص 205)

❄

مصنف نے ان چند سطروں میں ''آقاؤں'' کے ہزار ہا سالہ پندار کی شکست کا جو ظاہری اور تخیلی منظر خلق کیا ہے وہ گویا ان کے مختل حواس کی ایک پینٹنگ ہے جس میں قیامت بردوش آندھی اور دھرتی کو دُھری تک ہلا دینے والے زلزلے کے لرزہ خیز گہرے سیاہ اسٹروک شامل ہیں۔ ''آقاؤں'' کے لیے دہشت پہ مستزاد دہشت وہ گردنیں بن گئیں جنھیں ہزاروں برس بعد بلندی کا خط میسر آیا ہے۔ اسی باعث ''آقاؤں'' پر مراں سی پڑ گئی، بعض کو غش آ گیا۔

صدیوں سے قائم و مستحکم کو متزلزل دیکھ کر ''آقاؤں'' کا ردعمل ابوالفضل صدیقی نے ان پاروں میں بیان کیا ہے:

9

... گلاب خاص کی سرخی، ملاحت، شیرینی، حلاوت، سب کچھ فاروقی صاحب کی روشنیِ طبع میں سمو کر گلاب خاص والی غریب پر بلا بن کے سوار ہو گئی۔ یوں بھی اس جیت کا پبلک ریلیشننگ خاص ہی ہوتا تھا پھر مقابلے میں آنے والی کے کامیاب مقابلے سے زیادہ گلاب گوں رخساروں کی تمتماہٹ، ''پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے،'' اس کے لب کی تازگی، نرگسی آنکھوں کے گلابی ڈورے — گلاب خاص آم کی تعمیر میں خالق وشنو نے جیسے اسی گلابو کی بچی ہوئی تھوڑی سی مٹی سے

کام لیا تھا۔ مگر گلاب خاص کا سارا کیف، شیرینی، رنگینی، خیر گی اور تمتماہٹ — جیسے تاریکیاں اُمڈ پڑیں۔ گلاب جیسی سندر اور تازہ ہستی کملا کر رہ گئی، سہم گئی۔ لوگ اس کے شریر کے کنچن کو لوٹ کر کجلا دینے اور روح کی چاندی کو سنولا دینے کے لیے جھپٹ پڑے۔ ویسے خاں صاحب اور آغا صاحب دونوں ہی اپنے طبقے کے محترم بڑے بوڑھے تھے — بزرگ، سنجیدہ، جوان جوان پوتوں، نواسوں اور نواسیوں کے دادا نانا۔ جھک سفید دودھ برف میں ڈھلی ہوئی مقطع ڈاڑھیاں، ایک عرصے سے حج بیت اللہ کے سفر کی نیت کیے ہوئے، بقیہ عمر یادِ الٰہی میں بسر کرنے کا تہیہ کیے ہوئے بیٹھے تھے، بس حکم اور کشش کے منتظر تھے۔ روزِ ازل روحیں لبیک پکار چکی تھیں، مدتوں سے اللہ اللہ کر رہے تھے۔ خاں صاحب نے تو مدتیں ہوئیں عمر بھر کی چڑھی ڈاڑھی اتار لی تھی، یک دم بیٹھے بٹھائے حجام کو اشارہ کیا اور اس نے سنبھال کر پھر چڑھا دی، مگر انمل بے جوڑ ہو گئی۔ سفید ڈاڑھی لٹکی اور کالی چڑھی صحیح معلوم ہوتی ہے، اور دوسرے ہی روز حجام نے خضابِ لاجواب ستارۂ صبح مارکہ گھول کر لگا دیا اور پھر جو چڑھائی تو چہرے کی جھریاں بھی تناؤ میں غائب ہو گئیں اور 'ساٹھا سو پاٹھا' ضرب المثل کے مطابق جوان ہو گئے۔ اور پرانے بزرگوں سے سنتے چلے آ رہے تھے کہ اگلے وقت میں تو ساٹھ برس کی عمر سے پاجامہ پہننا شروع کرتے تھے۔ اور اس حساب سے پچھتر کی عمر میں پہنچ کر خاں صاحب ابھی لڑکپن میں تھے، اور نوجوان بھی نہیں، نوخیز تھے۔ آغا صاحب، ایرانی نژاد، اُنہی کے پیٹے میں۔ کھچڑی بال تھے اور چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح دمکتا تھا۔ دور سے جھرّیاں ضرور ایسی نظر آتیں جیسے بڑھیا چرخہ کات رہی ہے۔ دونوں کو اپنی اپنی گردنوں کے نکلے ہوئے مستانہ وار خم پھر سے تجدید کرنے پڑے۔ اور دونوں ہی قبض کا شکار تھے، اور قبض کشا گلقند آفتابی دونوں ہی کے نسخے میں لکھا ہوا تھا، اور دوا کے لیے پوری گلاب باڑی اور گلابو، سیوتی لال، سارے کے سارا غٹ سے نکل جانے کی سوچ رہے تھے۔ زر سے تو بے نیاز تھے، زن، اور زمین کا قضیہ اٹھ کھڑا ہوا، اور زن کے لیے رسہ کشی میں قضیۂ زمین بر سرِ زمین، گلاب باڑی کی چھاتی پر جریب کھنچنے لگی۔ اور دو زمینداروں کے درمیان جب جریب کھنچتی ہے تو زمین بے چاری کانپ کانپ کر اپنے محور پر ڈانواڈول ہو جاتی ہے، اور جریب کی زنجیر کی کڑیوں کے ساتھ کبھی قطبِ شمالی اور کبھی قطبِ جنوبی کی سمت جھک جھک جاتی ہے۔

... سیوتی لال کی پھلوار کی پٹی پر بندوبستِ اراضی کے سرکاری پختہ مقام سے ناپ ناپ کر

Scanned with CamScanner

جریب گھٹوں کی زد میں آئی۔ یہاں اس وقت چار مُڈھ مینڈھ تھے: ٹھاکر جسبیر سنگھ چوہان، آغا صاحب، خان بہادر صاحب، اور چوتھا جس کا نام ابھی ہوا میں درج تھا، بے فیت کا حولدار، ان سب پر اکیلا بھاری، خان بہادر صاحب کا نوخیز بھتیجا اور آغا صاحب کا ہونے والا داماد، چھدّن میاں، جس کا ابھی تیورس سال مونچھوں کا کونڈا ہوا تھا۔ (ص 206 تا 208)

❀

یہاں خاں صاحب اور آغا صاحب کے حلیوں اور رویوں کے بیان میں جو طنزیہ لب ولہجہ اور زہر خند بروے کار آیا ہے اس کی شدید سفاکی کا سبب غالباً ابوالفضل صدیقی کا یہ احساس بھی ہے کہ دونوں بوڑھے بظاہر تو ''مدتوں سے اللہ اللہ کر رہے تھے،'' مگر حقیقتاً اس الوہی ضابطے کی روح سے ہنوز محروم ہیں جو تاریک اور بے اساس باطن کو تابندہ بنیادیں اور خارج و باطن میں بھادوں کی اماوس سے دفاع کا بل بوتا مہیا کرتا ہے۔

خان اور آغا کے بعد ایک چوہان کا طرزِ فکر و عمل بیان کرتے ہوئے ابوالفضل صدیقی نے ایک ایسے آئین کو اپنا ہدف بنایا ہے جو، بہ وجوہ، ان کا اہم ترین ہدف رہا ہے، کیونکہ نہ صرف اس کہانی میں مذکور عہد، غالباً بیسویں صدی کا تیسرا عشرہ، بلکہ آج اکیسویں صدی میں بھی اس آئین کی شقیں، نت نئے الفاظ و اسالیب میں مٹھی بھر آدم زادوں کو بربریت کے ایسے پاٹھ پڑھا رہی ہیں جو بنی نوع انسان کی کثیر تعداد کو خطِ آدمیت سے بہت، بہت نیچے، بس سانس لینے کی اجازت دیتی ہیں — مشروط اجازت۔

10

ایک اور شریکِ کار اور گلاب باڑی کے جریب گھٹے کی اُلٹ پلٹ میں سہیم جائیداد جسبیر سنگھ چوہان تھے۔ انھوں نے شروع میں اِگر دگر کی۔ بات منوجی تک جا پہنچی۔ ٹھاکر جی نے جب راون سے یہ سرزمین چھینی تھی تو اس کے ساتھ تمام حشرات الارض بھی تو ہاتھ آئے تھے، جو راجپوتوں کے لیے جنسِ اعلیٰ پیدا کرنے میں کیچوے گبریلے والا کردار ادا کیا کرتے تھے؛ جنھیں زمین کھود جوت کر اور کھاد کی گولیاں بنا بنا کر اِدھر اُدھر پھیلانے کی خدمت انجام دینے کے بعد، خود صرف مٹی چاٹ کر جینے

کا جواز پیدا ہوتا تھا، اور یہی صورت سیوتی لال مالی اور گلابو مالن کی تھی۔ ایک گلاب کا کیڑا تھا تو دوسری گلاب خاص کے بور کی مکھی۔ دونوں ہی راجپوتوں کے شامہ وذائقہ کے راستے روح کو فرحت اور جسم کو توانائی بخشنے کے ازلی ذمے دار۔ اور گلاب خاص ہو یا گلاب، دونوں ہی دوسرے روز صبح کے سونگھنے، چوسنے کے بعد کوڑے کے ڈھیر پر نظر آتے ہیں۔ اور ٹھاکر جسبیر سنگھ کی نگاہ کیا بلکہ جیسے ہاتھ میں ہی گلابو اور سیوتی لال کا مقدر چلا آ رہا تھا۔ ویسے ان کیڑے مکوڑوں کے بازار کی دنیا میں ہر سکہ چل رہا تھا، حتیٰ کہ ٹھاکر جی کی دس ہزار سال پرانی ملت دوتی بھی، جس کی ریکھا تحریر سب مٹ گئی تھی مگر پھر بھی دمک رہی تھی، اور آغا صاحب وخاں صاحب کی ضرب بھی، اور ملکہ وکٹوریہ کا کلدار ٹکسال والا بھی۔ بلاشبہ ٹھاکر جی نے راون کا گھر لوٹ کر انھیں منوجی کے قلم سے شودر قرار دیا تھا، مگر منوجی کا آئین خاں صاحب اور آغا صاحب نے بھی برقرار رکھا تھا۔ حتیٰ کہ سات سمندر پار دور دیس کی رانی بھی ٹھاکر، آغا صاحب، خاں صاحب، سب کے گھر لوٹ کر منوجی کے کوڈ پر چلی۔ لہٰذا اس قانون کی رو سے ہر راجپوت ہر مالن پر یکساں حق رکھتا تھا: ٹھاکر جسبیر سنگھ، خان بہادر صاحب، آغا صاحب، سب کے سب اور دور دیس کی رانی ملکہ وکٹوریہ کا آئین دستور بھی، حتیٰ کہ چھدن میاں بھی۔ ادھر سیوتی لال مالی کو بلا سان گمان ایک نوٹس عدالتِ مال کا تینوں زمینداروں کی جانب سے موصول ہوا۔ ''ہرگاہ کہ تم نے اپنی کاشتہ اراضی پر بغیر اجازت درختِ انبہ نصب کر لیے ہیں لہٰذا ہفتے بھر کے اندر وجہ بیان کرو کہ تم کو حقوقِ کاشت سے محروم کر کے کیوں نہ اراضی کاشتہ سے بے دخل کیا جائے۔ تاکہ جانو کہ اگر درخت انبہ ایستادہ اراضی تمھاری ملکیت نہیں ہیں لہٰذا بے دخلی کے قانون سے بچنے کے لیے اگر نصب کرنے کو چھپانے کی غرض سے تم درختانِ ایستادہ کو کاٹو گے تو علاوہ بے دخلی کے چوری، مداخلت اور نقصان رسانی کے جرم کے مرتکب ہو گے۔'' ٹھاکر جی نے خود عدالتِ مال جا کر یہ نوٹس جاری کرایا، اور چونکہ وہ کاشتہ پٹی تینوں زمینداروں کے محالوں پر پڑتی تھی لہٰذا تینوں کے دعوے پر جاری ہوا۔ یہ اودھ اور روہیلکھنڈ کے بڑے زمینداروں کی تاریخ میں پہلی چیز تھی، ورنہ عدالتِ مال سے رجوع کرنے کے بجائے قضیۂ زمین خود طے کیا کرتے اور تعمیلِ حکم اپنے حالیوں موالیوں کے ذریعے ریڈی جسٹس کے طرز فوراً کرا لیتے۔ اور لطف یہ کہ وہ جو کچھ فیصلہ کرتے، وہ عدالت کے فیصلے سے کم وبیش اور کم بر بنائے انصاف نہ ہوا کرتا۔ اور سیوتی لال مالی تو دیوانی اور مال کے جملہ قوانین سے مستثنیٰ تھا اور

Scanned with CamScanner

فوجداری کے جرم کا ارتکاب اس کی ذات سے ممکن ہی نہ تھا...(ص 210 تا 211)

❁

عدالت کا نوٹس سیوتی لال اور گلابو کی طرف بڑھتی بھادوں کی اماوس کا پہلا قدم ہے، جو اُن ساعتوں میں وجود پا چکا تھا جب گلابو کا گلاب خاص آموں کا بادشاہ بنا تھا اور "کسانوں کے تیوروں میں ہزار ہا سال بعد آقاؤں زمینداروں سے دوئی کے انداز چھلکے تھے،" اور ابوالفضل صدیقی کو محسوس ہوا تھا کہ "گلاب خاص کا سارا کیف، شیرینی، رنگینی، خیرگی اور تمتماہٹ جیسے تاریکیاں بن کر اُمڈ پڑیں۔"

بھادوں کی اماوس کے اِس ابتدائی غبار سے اُس تصادم کے واضح منظر کا بھی آغاز ہوتا ہے جو کہانی میں ابوالفضل نقش کرنا چاہتے ہیں۔ نام نہاد چھوٹے بڑے طبقے کے اس تصادم کا بیج تو اُسی وقت پڑ گیا تھا جب گلابو کا گلاب خاص مقابلے میں شریک ہوا تھا۔ اب اُس بیج سے اکھوا پھوٹا ہے اور وہ تصادم منظر عام پہ آ گیا ہے جو اول اول مکالموں کے پردے میں تیور دکھا رہا تھا۔

11

...[اس تصادم کا ایک فریق، سیوتی لال] اپنے آقاؤں کی نفسیات خوب ہی سمجھتا تھا اور پھر تینوں دیوان خانوں میں اس کے جاسوس آقاؤں کے دائیں بائیں لگے ہوئے تھے۔ وہ نوٹس پا کر بھی کسی کے پاس عذر داری، معافی خواہی کے لیے نہ گیا اور اماوس کی رات میں اس کو ٹھاکر جی کی سرکردگی میں چھاپہ پڑنے کی یقینی اور حتمی خبر ملی۔ اس کو معلوم تھا کہ پدمنی کہیں جنمے، یہ تو چھتریوں کا آسمانی مقدر اور زمینی حق ہے۔ اور آج اسی زمینی حق کے لیے اس نواح کے تمام چھتری دیوانے تھے۔ اور یہ آگ تو زنار کے پاک مقدس دھاگے کے نیچے ہی چھاتی کی انگیٹھی میں دہک سکتی ہے، چھتریوں کا یقین ایمان تھا، لیکن اگر اس نوعیت کی چنگاری کسی شودر کے اندر تحفظ کے لیے بھی اک ذرا کے ذرا چٹختی ہے تو منوجی کے کوڈ کی کتاب آپوں آپ بند بھی ہو جایا کرتی ہے، اور گنگا جمنا اُلٹی بہہ کر گنگوتری جمبوتری پر بڑی اونچی تربینی بناتی ہیں۔

"میں اپنے بازوؤں کی مچھلیوں کو نہ مرنے دوں گا، خواہ بوند بھر پانی نہ ہو! میں ہر قانون سے

گریز کروں گا خواہ منوسمرتیوں کا آکاش سے نازل آئین کیوں نہ ہو۔ جس نے قانون قبضۂ اراضی بنایا ہے، وہ ان بکرماجیتوں کے ہاتھ اپنی غیرت حمیت نہ بکنے دے گا۔ وہ اپنی گلابو بیٹی کو سندر ہی رکھے گا— گلاب خاص کی طرح بے داغ، امرت بھری، ظاہر باطن رس سے جوں کی توں پڑ...

(ص 211 تا 212)

❁

آئندہ اقتباس میں ابوالفضل نے سیوتی لال کے خلاف متحدہ محاذ کے شریکوں کا جو احوال بیان کیا ہے وہ صرف ایک چھدن، ایک آغا، ایک خان یا ایک ٹھاکر کا نہیں بلکہ یہ سب اپنے اپنے طبقے کا احوال درشار ہے ہیں۔ دین دھرم کے لحاظ سے الگ الگ نظر آنے والے یہ طبقے اپنے اپنے مفادات کے لیے ایک ہیں، اور مل جل کر اُس معاشرے کی اصلیت منکشف کر رہے ہیں جو شان وشوکت اور باوقار آداب کے پردوں میں ہوا و ہوس کا پالنہار ہے۔

محاذ کے شرکا میں اپنے مجوزہ شب خون کی کامیابی کے یقین اور لازماً حاصل ہونے ہی والی غنیمت کی ہفتے وار تقسیم کے تعین سے ابوالفضل اپنے قاری پر واضح کر رہے ہیں کہ اس نوع کے طبقے اپنی کامیابی کو ایک اٹل روایت تصور کرتے تھے۔

بھادوں کی اماوس جیسے تاریک منصوبوں پر بے محابا عمل کرنے والوں کے مقابلے، سیوتی لال کو ابوالفضل نے ایسا کردار بنایا ہے جس میں ہزارہا سال سے آقائیت برداشت کرنے والے کسانوں کے تیور مجسّم ہو گئے ہیں، اور اب وہ خارجی اسباب سے بے نیاز، اپنی عفت وعزت کی حفاظت کے لیے اپنے بازوؤں کی مچھلیوں کو نہ مرنے دینے کا عہد کر رہا ہے۔

12

... ادھر چھدن میاں کی جوانی دیوانی تھی، خسر، تایا، نانا، سب کے باؤلے بڑھاپوں کے مقابلے پر خم ٹھونک کر آ گیا۔ اور نادری حکم کچھ اس منصوبے سے جاری کیا تھا کہ سیوتی لال مالی دیوان خانے کے پائیں باغ میں ایکڑ بھر رقبے پر ڈھا کر گراس کا لان لگائے —ایک ٹینس کورٹ اور دو بیڈمنٹن کورٹ۔ جتنے مزدور درکار ہوں، بیگار میں پکڑ لے۔ گلاب باڑی سے دیوان خانے کے

Scanned with CamScanner

شاگرد پیشے میں منتقل ہو جائے، تین کوٹھریاں اپنی رہائش کے لیے پسند کرلے۔ اور یہ سب کچھ تینوں بزرگوں کے آدابِ عشق میں خلل اور منافی تھا۔ چنانچہ آغا صاحب نے تو بیٹی کے تنسیخ نکاح کا دعویٰ دائر کرنے کے لیے اپنے دیوانی والے وکیل کے پاس جانے کا ارادہ کیا۔ بوڑھے خان بہادر نے بے فیت کے حوالدار بھتیجے کی بھاوج سے شکایت کی اور اپنے بڑھاپے کے عشق میں دراندازی و رقابت سے باز رہنے کی استدعا بھی کرائی۔ جبکہ ٹھاکر صاحب کے اندر پچاسی نوے فیصد چوہان پر تھوی راج کے ساتھ اب ہزار سال بعد دس پندرہ فیصد ہیمو بقال بھی شامل ہو گئے تھے، انھوں نے سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے، سنجوگتا کو دن دہاڑے اٹھا کر لے آنے کے بجائے تھوڑا اندھیری رات کے پردے کا سہارا بھی لینا مناسب خیال کیا۔ تینوں بزرگ نہایت ہی وسیع القلب اور ایک دوسرے کے حق میں نہایت متواضع واقع ہوئے تھے اور ساتھ ہی ساتھ سمجھتے تھے کہ اگر چڑیا نوجوان کے آہنی جال میں جا پھنسی تو پھر ان تینوں میں سے ہر ایک کی مٹھی سے باہر ہوگی۔ سر جوڑ کر مشورہ کیا، جس میں صاحبزادے بھی زیر بحث آئے۔ ٹھاکر جی نے آغا صاحب کو دوستانہ ڈانٹ پلائی — بھلا اس خارجی عشق کے چکر میں پردہ نشین بیٹی بہو کو کیوں درمیان میں لایا جائے؟ حویلی حویلی ہے، دیوان خانہ دیوان خانہ — کنواری پردہ نشین بیٹی کیوں مطلقہ بنائی جائے؟ رئیسوں کے بچوں کی بیگم رانی تو اور ہوتی ہے، اور نہ معلوم کتنی اور کیا کیا اور کون ہوا کرتی ہیں۔ نکاح ہو گیا، مرے پار یا بھرے پار، ڈولا جائے گا اور جائے گا، جنازہ نکلے گا اور نکلے گا... اور خود اسی بھادوں کی اماوس کی رات کو فتح کرنے کا بیڑا اٹھایا اور اس وسیع القلبی کے ساتھ کہ بزرگیِ عمر اور سیادتِ نسلی کے تقاضے کے تحت پہلے ایک اٹھوارے آغا صاحب قبلہ کی تحویلِ خلوت میں رہے گی، دوسرے اٹھوارے آغا صاحب بکمال عنایت اس کو خاں صاحب بہادر کی تحویل میں دے دیں گے، اور خاں صاحب بہادر دو اٹھوارے اپنی خلوت دکھا کر حق بحقدار رسید، منوجی کے دستور کے مطابق، اس شودر کو ٹھاکر جی کے حوالے عمر بھر کے لیے کر دیں گے۔ اور یہ تبادلے کا چال چلن اس طبقے میں دائمی روایت چلا آتا تھا۔ سواری کی گھوڑیاں، گھوڑے، شکاری کتیاں، کتے، لڑنے والی بٹیریں، مرغے اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر ہوتے رہنے کا رواج تھا ہی۔ اسی طرح ملازموں، خدمتگاروں، حالیوں، موالیوں کے پارسل ہوتے رہتے تھے۔ اور گلابو انھی جنسوں میں سے تو ایک تھی۔ اور ایسی تحفے تحائف کی سال دو

سال پیچھے رؤسائے کرام میں تکرار ہوتی رہتی تھی۔ مفت میں صاحبزادے صاحب نے ان چیونٹیوں بھرے کباب میں ہاتھ ڈالا اور بزرگوں کے اکل وشرب میں چونچ ڈبوئی۔ یہ بچارے تو مع چیونٹیوں کے کباب سٹ سے نگل جایا کرتے، اور اس معاملے میں سب کے سب بزرگ یورپ کے جنگ عظیم کے اتحادیوں سے زیادہ پُرخلوص واقع ہوئے تھے۔ صاحبزادے بھی تینوں بزرگوں کو خوب پہچانتے تھے، لیکن بیچارے خام کار تھے، یہ نہ سمجھتے تھے کہ یہ اتنے پہنچے ہوئے بزرگ نکلیں گے کہ ایسا پیارا سمجھوتا کر جائیں گے، اور اس جہلِ مرکب میں گرفتار ہو گئے کہ میرے سامنے پڑنے کی ان کی سفید بزرگی ہمت نہ کرے گی۔ (ص 212 تا 214)

❀

متحدہ محاذ میں شامل افراد کے طرزِ فکر کے حقیقی تعارف کے بعد ابوالفضل نے سیوتی لال مالی کا تعارف بھی ایسی ہی ہنرمندی سے رقم کیا ہے کہ فردِ واحد کے وسیلے سے اس کے پورے طبقے کا احوال قاری کے ذہن و دل پہ نقش ہو جاتا ہے:

13

سیوتی لال مالی، ازلی خدمتی، ابدی شودر، حیاتِ انسانی کی ضامن اہم ترین شق، اعلیٰ غذاؤں اور بیش بہا نفیس و لذیذ پھلوں کے قدیم ترین، ماوراء التاریخی چھپے خزانوں، دفینوں کا محقق، موجد بے قرار متلاشی۔ بزرگوں کی پیدا کردہ ارضی تمدن کی یہ گوناگوں نعمتوں کی دولت برآمد کر کر کے کھلے بازاروں عام کرنے والا میدانِ تمدن کا وہ پیادہ ہیرو تھا جس نے خودرو بنوں کی حد تک پہنچے ہوئے قدیم تخمی باغوں کے اندر سے، ایجاد کی حد تک تلاش و تحقیق کر کر کے، سیکڑوں نادر اور بہمہ صفت موصوف اقسام کے آم پیدا کیے اور قلمیں باندھ باندھ کر ان کی اصل حقیقت نکالی تھی اور درخت پروان چڑھا چڑھا کر مشرقی معاشرے پر نت نئی قلم کاریاں اور طلاکاریاں کی تھیں۔ نمائشوں، مقابلوں میں اپنا نام چھپا کر اپنے آقا کے نام کا بول بالا کیا اور بابا آدم کے اولین اور اصلی کلچر کو بیسویں صدی کی زمین کے او پر وقت کے دوش بدوش مجلا و مزین کیا۔ آج اسی نوعیت کی صرف ایک ایجاد کے جرم میں جامِ سقراط بہ لب تھا، اور یہ اس کی گلاب خاص کی تحقیق تھی جو روشنیِ طبع بلا بن کر کمبخت پر کریا کا پھول بن کے نازل

ہوئی تھی۔ اس ایجاد کے طریقۂ نزول سے وہ اپنے اوپر گلاب خاص کو وشنو جی کی دَیا تصور کرنے کے جہلِ مرکب میں گرفتار ہو گیا تھا، اور یہی سوچ شوشنکر کا عتاب بن گئی تھی۔ اور وہ تو اپنی ماتا بدل گلابو بیٹی ہی کو اپنے وشنو مہاراج کی دیا تصور کیا کرتا تھا، اور گلاب خاص تو اسی کنیا کے ہاتھ کا کرشمہ اور وشنو جی کی کرامت تھا۔ مگر وہ یہ بھول گیا کہ اس کا مقدر ازل سے آج تک نصیبِ غبار رہا ہے اور اس کا حصہ منو جی کے سنہرے قلم سے پکے بٹے ہوئے زنار پوشوں کے دھاگے میں بندھنا لکھا ہوا ہے۔ اور ہر آواز کلامِ دیگراں ہی بالا کرتی رہی ہے اور سیوتی لال کا نام تو ہمیشہ موسومِ دشمناں ہی ہوتا چلا آیا ہے، اور اس کی تالیفیں مضمونِ اغیار رہی ہیں اور تصانیف پر جلی قلم غیر مصنفین کا نام ٹھپہ ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ عمر بھر لاتعداد تحقیق، دریافتیں دوسروں کی جھولی پلّے میں پڑی رہنے کے بعد حادثاتی طور پر اپنی صرف ایک ایجاد وشنو جی کے پرشاد کے طور پر دھوکے سے اپنے پلّے بندھی رہ جانے کی پاداش میں آج وہ اس حد تک دار و گیر کی زد پر ہے کہ وہ زمین کا ذرا سا ٹکڑا جس پر وشنو جی کا امرت بھرا یہ عطیہ اس نے امانت رکھا تھا، اس سے بھی اس نصب کرنے کے قصور میں محروم ہو رہا ہے۔ اور اس اراضی نے اس قصور میں خود ہی اس کو اور اس کی بیٹی کو اور اس کے گلاب خاص سب کو اُکھیڑ دیا ہے۔ منو جی کے مرتبہ قانونِ قبضۂ اراضی کے مطابق صرف زمین کے مالک ہی کو آم کا درخت نصب کرنے کا حق ہے، اور زمین کا مالک آم ہی کیا، ہر درخت کا جو اراضی پر ایستادہ پایا جائے یا خودرو اُگ آئے، مالک تصور ہوتا ہے۔ اور سیوتی لال اپنے حق میں زیادہ سے زیادہ گلاب کی فصل اگانے کا مجاز تھا، گلاب خاص کا اُگانا اس کو اس کے اس حقِ کاشت سے بھی محروم کرتا تھا۔ اور گلاب خاص کا درخت تو زمیندار کا حقِ قانونی ہے اور ملکیتِ توریثی ہے۔ وہ شودر تھا اور اپنی ذات کے لیے ارذل جنس پیدا کرنے کا حق لے کر پیدا ہوا تھا۔ اس کا مقدر بھینی بھینی خوشبو والے خوش رنگ پھول آقا کے لیے اُگانا تھا اور چنتے وقت سے لے کر گجرے گوندھتے وقت ناک پر کپڑا لپیٹ لینے کا حکم تھا، ورنہ پھول جوٹھن ہو جاتے۔ وہ پھولوں اور پھلوں کے پودوں کی جڑوں میں کیچوے گبریلے کی خدمت انجام دے کر صرف روئیدگی بالیدگی کا ضامن تھا؛ آم کھانا اس کے لیے ایسا ہی تھا جیسے کسی پھل میں کیڑے پڑ جاتے ہیں اور آقا کے حق پر خیانت دست درازی تھی... (ص 215 تا 217)

...اس کے گوندھے سہرے تو ازل سے دوسروں ہی کے سر سجاتے اور گھر بساتے رہے تھے

اور اس کا ازلی مقدر سبک سری اور بے گھری تھا۔ وہ شودر تھا، برہما کی پیٹھ کے میل پسینے کی گھناؤنی پیداوار اور خالق کے جذبۂ نفرت وحقارت کی تخلیق ارذل، ردِ خلق مخلوق، دھرتی پر بوجھ۔ پھر منو جی کی نظرِ کرم نے اس کی خدمت کو ذرا دوسری نوعیت کے خانے میں بٹھایا تھا، اور اس کی خدمت اپنے ذہنی نابالغ، ڈاڑھی مونچھوں والے کودک، خام کار آقاؤں کا کھلونا بنا کر رکھی تھی۔ پھول اُگا کر سنگھانا اور میٹھے میٹھے پھل پیدا کر کے کھلانا، زنار پوشوں کے بدن اور روح کے لیے تغذیہ فراہم کرنا اس کا فرض تھا، اور اس خدمت کے سبب یہ دوسرے شودروں کی بہ نسبت ان زنار پوش آقاؤں کے ساتھ ذرا مختلف اور قریب فاصلہ رکھتا تھا۔ اور سیوتی لال اس قربت کے طفیل ان آقاؤں کی نفسیات کا بڑا محرم تھا اور ان کے جنم پتر والے برہمنوں، نجومیوں اور نام دھرنے والے بانوں سے بھی زیادہ ان کے ماضی، حال، مستقبل کو پہچانتا تھا، اور اس وقت تو بات ڈھکی چھپی نہ تھی۔ سیوتی لال تو سیوتی لال، اس کی نوخیز ناسمجھ بیٹی بھی سمجھ رہی تھی کہ یہ کلجگ کی ڈھیل کی سزا ہے، نہ گلاب باڑی کاشت کرنے کی قانونی بے ضابطگی اور نہ گلاب خاص آم کا درخت نصب کر لینے کی خلاف ورزی کی پاداش ہے؛ یہ کلجگ کے تقاضے میں شودر کی کوکھ سے گلابی رنگ کی گلابو بیٹی جننے کی پاداش ہے کہ وہ آج اس جرم میں داروگیر کی زد پر ہے اور اس کی بیٹی کی عصمت سرِ بازار اور اس کی انا سرِ دار ہے۔ (ص 219 تا 220)

❋

کہانی کے آخری ساڑھے بارہ صفحات میں سے اوّلین ساڑھے تین صفحے سیوتی لال کے اُس جہاد کا باب ہیں جس سے وہ اپنی انا اور بیٹی کی عصمت کی حفاظت کے لیے گزرا ہے۔ اس باب میں ابوالفضل نے اپنی رواں دواں نثر کے ذریعے سیوتی لال، گلابو، زمین، آسمان اور زمین و آسمان کے جملہ مظاہرہ کو زندہ وفعال دکھایا ہے۔ خالقِ کائنات کی ایک اشرف ترین تخلیق، اپنے وسیلے سے جنمے پنپے پودوں پیڑوں کو گویا اُسی طور کلھاڑے کی زد پر لے رہا ہے جس طور خالقِ کائنات کی زائیدہ بھادوں کی اماوس نے ماحول کے چپے چپے، خان، آغا اور ٹھاکر کے ریشے ریشے کو اندھیاری میں لتھیڑ رکھا ہے۔ سیوتی کا کلھاڑا، اپنی سینچی پالی گلاب باڑی کے گوشے گوشے کے لیے ویسا جابر وقاہر بن گیا ہے جیسے خان، آغا اور ٹھاکر، گلابو اور سیوتی کے لیے ہیں۔ عصمت وانا کے تحفظ میں سیوتی لال کے ہاتھوں گلاب باڑی میں برپا منظر "بازوؤں کی مچھلیوں کو نہ مرنے" دینے کی قسم کا پاس بھی ہے اور اس

قسم کو جنم دینے والی، بارہ ہزار سال سے جاری، دہشت خیزی کا جواب بھی؛ سنگین و سرد خاموشیوں کے پروردہ سفاک عمل کا پرشور ردعمل — جو بہرحال پیدا ہو ہی جاتا ہے۔ جوابی عمل کی زد پہ وہ سب کچھ ہے جو سیوتی لال کی آنکھوں اور ہاتھ کی حدود میں ہے۔

سب کچھ زندہ ہے: گلاب باڑی پیڑ پودوں سے؛ پیڑ پودے پھول، پتوں اور پھلوں سے؛ پھول خوشبو سے؛ پھل ذائقوں بھرے رس سے۔ زمین زندہ ہے اپنی کوکھ سے نکلے، گود میں جکڑے، چھوٹے بڑوں درختوں سے اپنے حشرات سے؛ آسمان زندہ ہے برہما، شوشنکر اور وشنو سے، کوثر و تسنیم سے، بیکنٹھ سے...

مگر — آج — زندہ زمین کی زندہ گلاب باڑی، سیوتی لال کے ہلاکو کلھاڑے کی زد پر — اور زندہ آسمان بھادوں کی اماوس کی لپیٹ میں مقہور ہے۔

14

آج بھادوں کی اماوس تھی، سال کی تاریک ترین اور ہر رات سے بھیانک رات، بوجھل، کالی، کیچڑ بھری؛ بھانت بھانت کے حشرات الارض جنم لے کر پوری طرح پروان چڑھ چکے تھے، اور مجرموں کو روزِ روشن کی طرح دعوت دے رہی تھی اور گناہوں کو آغوشِ مادر کی طرح پناہ۔ اور سیوتی لال کے محلاتی ہم عصر دوست جاسوس شروع ہی سے پوست کندہ صورتِ حال سے آگاہ کرتے رہے تھے، اور آج رات کا آخری حصہ اس پر چھاپہ پڑنے اور بیٹی کو اُٹھا کر لے جانے کے لیے سازش کا میزانِ کل تھا۔ ویسے کئی روز سے سازش کا کام اور تفاصیل باپ اور بیٹی دونوں ہی کے کانوں میں انھی مستند ذرائع سے پہنچ رہی تھیں، مگر دونوں میں یہ موضوع زیرِ بحث آنا تو درکنار، اشارتاً کنایتاً بھی تبادلۂ خیال میں نہ آیا تھا، اور سیوتی لال بھی اس سال کی تاریک ترین رات کا اطمینان کے ساتھ منتظر بیٹھا تھا، اور تجربے کار باپ اور ذہین بیٹی دونوں ہی دل ہی دل کے اندر طے کیے بیٹھے تھے کہ ''یہ کرنا ہے'' اور ''وہ نہیں ہونے دینا'' ہے۔ اور ایسے مقامات پر تو دو ہوں تو تیسرا اندر والا راستہ بتا دیتا ہے، اور اگر اکیلا ہو تو چھٹی حس سمجھا دیا کرتی ہے کہ ''یوں کرو، یوں نہ کرو۔'' اماوس کی سیاہ پوش، جرم پناہ رات کا آخری نصف حصہ چھاپے اور اغوا کے لیے متعین تھا تو اس کے اول شروع حصے کو ہی دفاع کے لیے

Scanned with CamScanner

منتخب کیا۔ اور سیوتی لال کو بھی فرار کا صحیح موقع اسی اماوس کی اندھیری کالی چادر کی آڑ میں ہو سکتا تھا۔ آج کٹیا میں چولھا گرم نہ ہوا تھا۔ وہ پہر بھر رات گئے تیندوے کی طرح اٹھا اور شودر کے اندر سے بارہ ہزار سال پرانا مفلوج آدمی ساؤنٹھا ہو گیا، اور راجپوت کا وار خالی دینے کے لیے، اپنا ناموس بچانے کو سیوتی لال راجپوتی طور سے اٹھ کھڑا ہوا اور مالی باغبان، جس کے حیات آفریں اور خوشبو و رنگ اور رس پیدا کرنے والے رومانی ہاتھ کا ہمیشہ بیلچہ ہی مقدر تھا اور نمو پروان مقدس پیشہ تھا، آج اس ہاتھ میں کلھاڑ انظر آیا — بھگوان شوشنکر مہاراج والا ہتھیار! اس نے اپنا ازلی مقدر، وشنو جی کا عطا کیا ہوا فردوسیں اوزار بیلچہ، جس کے پھل دیتے سے اس نے زمین پر جنت کی پینٹنگ نقل کی تھیں، کرۂ ارض کی فضا میں رنگ و بو کے غبارے اڑائے تھے، کوثر و تسنیم کی موجیں بہائی تھیں اور امرت کی پھواریں برسا برسا کر گلی گلی گھر گھر عام کی تھیں، نہ معلوم کہاں پھینک دیا؛ اور اس جہاں بیز و بہار آفریں گلاب پاش سے ہاتھ میں کلھاڑا دیکھ کر شاید وشنو جی کی بھی آنکھیں حیرت اور افسوس کے ملے جلے انداز میں ایک دفعہ کو جھپک گئی ہوں گی۔ اور مالی باغبان کے ہاتھ سے، اس کی ازلی اور شاید ابدی تاریخ اور مقدر میں پہلی مرتبہ، کلھاڑا بجا، موت کی مہیب ضرب گونجی، دھما دھم، دھما دھم، چٹاخ پٹاخ، چٹاخ پٹاخ، ایک دو تین چار پانچ چھ سات... ضرب پر ضرب اور ضرب ... اور دیکھتے دیکھتے گلاب خاص کا اصل بڑا تخمی درخت، جس کے متعلق اب عام عقیدہ یہ ہو گیا تھا کہ وشنو جی طوطے کوے کے چولے میں بیکنٹھ (جنت) کا پھل لا کر بو گئے ہیں، اور پوجا ہونے کی نوبت آنے والی تھی، اڑاڑ ادھڑام، شودر کی بے کفن لاش کی مانند کریا کا ایندھن بن کر لمبا لمبا زمین پر دراز ہو گیا؛ جس کے پھل نے راجپوتوں کو شکست دینے کا قصور کیا تھا، اس راجپوتی سنسار میں اسی طرح کیفرِ کردار کو پہنچ گیا جیسے رام اور راون کے ساتھ ہوا تھا۔ اور اپنے ہاتھ سے اپنے پاؤں میں شودر کے سینے پر سونے کا تمغہ سجنے اور چاندی کا کپ پکڑنے کی پاداش میں کلھاڑی ماری اور اصل گلاب خاص کا فتنہ ختم کر کے سیوتی لال اس سم شیریں کو نیست و نابود کرنے کے لیے بڑھا، اور چاروں قلمی درخت بے چارے تو بس ایک ہی ایک ضرب میں زنار پوشوں کو چیلنج کرنے کے قصور میں زمیں بوس ہو گئے۔ یاں سے واں تک گھاس اور گلاب کی جھاڑیوں میں کچے گدر گلاب خاص کے پھلوں کا فرش ہو گیا، اور وہی ہوا جو بارہ ہزار سال سے ہوتا چلا آیا تھا۔ اور اب مالی نے اک ذرا اطمینان کا سانس لیا۔ چند گہری سانسیں لیتے ہی گملوں

کی قطار پر نگاہ جا پڑی جن میں گلاب خاص کی یک سالہ، دو سالہ قلمیں نصب تھیں، ہونہار، اٹھتی ہوئی، اپنی پروان چڑھانے والی گلابو کی طرح ساٹھن، گلبدن سی۔ نرم نرم نیلوفر کے سے سبز ڈنٹھل، گلابی ریشمی کونپلیں، سبز شاداب مخملی پتیاں۔ گلاب خاص کی تمام تر رنگینیاں، شیرینیاں، ننھے منے وجود کے اندر بالیدگی اور تاریخ سازی کے لیے تڑپ رہی تھیں۔ جڑ سے ڈیڑھ دو فٹ اونچی پھنگیوں تک سب کچھ ایسا جیسے کوئی نوخیز بچی اپنی گڑیوں کے لیے رنگ برنگے ریشمی کپڑوں کے ننھے ننھے ملبوس تیار کرتی ہے — اور قلمیں تیار کرتے ہوئے گلابو کے اندر گڑیاں کھیلنے والی لڑکی کے ہی تو جذبات متحرک ہوتے تھے۔ شاداب، مضبوط، چمکتی ہوئی ہونہار گلاب خاص کی قلمیں، جڑ، تنا اور شاخ جس کے ننھے منے وجود کے اندر کرۂ ارض کی اولین متمدن مخلوق آدم وحوا کے جوڑے کا زمردیں شادابیوں والا شفاف قوس اندر قوس کلچر جھلکتا تھا — حیات کی ضامن حرارتِ غریزی اور توانائی کی تولید کا ضامن تھا، ازل سے ابد تک اور ابد سے ابد تک اگلی پچھلی تمام نادر مدتیں اور ادوار انگڑائیاں لے لے کر اپنے مضبوط کندھوں پر سنبھالے ہوئے تھا اور یاں سے واں تک، واں سے یاں تک، کرۂ ارض تا باغِ فردوس، زندگی کی لہر بنا جاری وساری تھا۔ رنگ، رس، خوشبو کا یہ قافلہ زندگی کا دھار املائے ہوئے رواں دواں تھا، گملوں کی قطار۔

اور اب سیوتی لال، نہ مالی، نہ باغبان، ہونہار چکن چکن پات بروا کی گملوں میں کھڑی قطار پر آٹوٹا۔ اور آن بان والے قرونِ اولیٰ کے راجپوتوں کی طرح جیسے بیٹیوں کا گلا گھونٹنے لگا۔ بیدردی کے ساتھ اوپر چوٹی والا نرم ریشمی پتیوں والا گچھا مٹھی میں دباتا، اکھیڑتا جاتا اور دور پھینکتا جاتا۔ جب اُکھیڑتا اُکھیڑتا دو سالہ قلموں سے یک سالہ قلموں تک اُس سرے سے اس سرے تک پہنچا اور وشنوجی کے اتارے ہوئے اس امرت پھل کے دھرتی سے نیست ونابود ہونے کا آخری وقت آ لگا اور اسی سال کی، صرف ابھی کی بندھی نازک نوخیز، ہونہار صرف دو بالی قلمیں باقی رہ گئیں، جو بچاریاں اپنے برابر والی ساتھنوں کے انجام کو پہنچنے کے لیے سرِ تسلیم خم کیے سہمی سہمی کھڑی تھیں، اور سیوتی لال پر شادان پر دبوچ لینے کے لیے اس طرح جھپٹا جیسے شکرا گوریا پر ٹوٹتا ہے... (ص 220 تا 223)

❁

قہر کے ہر منظر کی طرح — یہ قہر بھرا منظر بھی ختم ہوا چاہتا ہے۔

ابوالفضل صدیقی نے اُس گلاب خاص کی خالق کو غیظ وغضب کی خاتم بنایا ہے، جو مقابلے میں اول آ کر پورے طوفان کا سبب ہوا — اور اب مقہور وفنا آشناز میں بوس ہے۔

مگر گلابو تو جننی ہے — ماں، زمین — جو اپنی کوکھ سے نکلے فساد وشر کے باعث بند نہیں جاتی؛ کسی پُر خیر کی توقع میں فعال رہتی ہے: ماں، زمین۔

15

...اِسی سال کی، صرف ابھی کی بندھی، نازک، نوخیز، ہونہار، صرف دو بالی قلمیں باقی رہ گئیں... سیوتی لال پرشاد، اُن پر دبوچ لینے کے لیے اس طرح جھپٹا جیسے شکرا گوریا پر ٹوٹتا ہے، تو اندھیرے میں زبانِ خلق کے بجائے پیٹ کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی ایک غوں غراہٹ سی سنائی دی اور گلابو اپنے دونوں بالے بچے پودوں اور سیوتی لال کے درمیان آ گئی — جیسے ماں کا قطب مینار حائل ہو گیا، بیٹوں کو بچانے کے لیے ماں کی دیوارِ چین آ کھڑی ہوئی۔ "میں نیں نیں غوں غوں..." اور مامتا کی شدت کے آثار سے سیوتی لال کی راجپوتی نوعیت کی حدت اک ذرا کے ذرا انفعال سا بن گئی اور دوسرے ہی لمحے جیسے وہ بے دست وپارہ گیا، اپنی فطرت وجبلت پر پلٹ پڑا، شاید نادم وخجل، اور اس کا ہاتھ تو خلافِ جبلت ومنافیِ فطرت عمل پر دنیا میں پہلی مرتبہ حرکت میں آیا تھا۔ اس نے تو چمن بندیاں، باغبانیاں فطرت میں ودیعت پائی تھیں، اور تربیتی آبائی ماحول میں یہی گھٹی میں بھی پڑا تھا۔ وہ فطرت، جبلت اور تربیت کا متناسب امتزاج تھا۔ شیر نی گھاس نہیں کھایا کرتی، نہ گائے چیر پھاڑ کر کے گوشت، اور آج تو کچھ ایسا ہی ارتکاب ہوا تھا۔ رنگا رنگ خوشبو دار شہد بھرے پھول کھلانے والا، میٹھے امرت میں بھرے پھل پروان چڑھانے والے بیکنٹھ اور جنت کی تربیت کا حامل سیوتی لال، منفی، خلاف جبلت اقدام پر منفعل ہو کر رہ گیا — نادم وخجل — اور اس کے مضبوط ہاتھ تو ازل سے آج تک پہلی مرتبہ اس نہج پر حرکت میں آئے تھے۔ اور اس نے شکست سی کھا کر ہتھیار ڈال دیے، کلھاڑا دور پھینک دیا۔ اُدھر فطری عمل کی اس کارفرمائی سے ناآشنا، ناکتخدا دوشیزہ کی اچھوتی چھاتیوں کے بلوریں پیالوں کے اندر ہلچل ہونے لگی۔ اس نے نوزائیدہ جڑواں بیٹوں کی ماں کی طرح لپک کر دونوں پودوں کے گملے اٹھا کر دائیں بائیں دونوں جانب گودوں میں دبائے اور اس عمل کے

ردعمل میں بھولی، لمس سے ناواقف دوشیزہ کے دونوں آنچلوں میں میٹھی میٹھی گھمر گھمر ہونے لگی، جیسے پہلوٹھی کی پیدائش کے ساتھ نوجوان ماں کی چھاتیوں میں دودھ کی گردش اٹھتی ہے۔ اس نے ماں والے پیار کے ساتھ ہی دونوں پودوں کو دونوں گودوں میں بھینچ لیا، اور اس بھینچنے کے ساتھ دونوں چھاتیوں کے اندر گلاب خاص کا رس گدگدانے لگا۔ کچی چاندی اور کچی چینی کے اتصال سے جلترنگ سی بج اٹھی، اور گلاب خاص کے دونوں نو بندش قلمی پودے نوزائیدہ جڑواں بیٹوں کی طرح دائیں بائیں گلابو کی دونوں گودوں میں تھے، اور گلاب خاص کا امرت رس، اس کی چھاتیوں کے بتیسوں دودھ کی دھاروں کی پھواروں کا فوارہ گلاب خاص کے اندر رواں دواں تھا۔ من دیگرم تو دیگری کے پردے درمیان سے معدوم تھے۔ منفعل باغبان مالی کلھاڑا تو پھینک ہی چکا تھا، اس منظر سے متاثر ہو کر جلدی سے پھر اپنا بیلچہ اٹھالیا اور سیوتی لال گلابو کی گنگا جمنی مثبت لہریں پھر ایک سمت سیدھی ہو گئیں اور گلاب خاص کے گملوں کے حلقوں میں پراگ کا سماں بندھ گیا۔ دونوں بھائی چپ چپ دودھ پینے لگے، تربینی کے بھنور اور دھار انظر آنے لگی۔ آدمی نے پودے کو پہچانا اور پودے نے انسان کو۔ اور جب دونوں گودوں میں دبے دونوں گلاب خاص کے پودوں کی نرم نرم، ریشمی، مخصوص خوشبو والی کونپلیں پتیاں گلابو کے رخساروں سے چھوئیں تو اس پر ہلکا ہلکا صبوحی والا کیف ساطاری ہو گیا، اس ماں کے سرور کی طرح جو اپنے بچے کو گود میں اٹھاتی ہے تو اس کے ریشمی بال رخساروں پر چھو کر پیدا کرتے ہیں۔ تخلیق کے عظیم فطری تعلق و عمل اور منشائے خالق، ہبوطِ آدم کی سب سے بڑی غایت کی مظہر، محبت، پیار اور یگانگت کی کارفرمائی۔ گلاب خاص کے نودھے پودوں سے گلابو کے گلابی مرمریں نوخیز مدھرے بدن تک، لہر اندر لہر، سلسلہ جڑ کے ریشے ریشے پتی پتی کونپل کونپل سے رگ رگ بال بال تک، بہ یک خون ہو کر ایک روگدگدا کر زندگی کو بیدار کرنے لگا اور روئے زمین پر حیات کی ایک نادر ترکیب وجود میں آئی۔ نا کتخدا نوخیز دوشیزہ اور نودھے، نوبندش پودے —— دونوں ہی پر شدید جننے اور جنے جانے والی میٹھی میٹھی بات بن گئی....

تاسف، ملال، ندامتؔ اور محرومی مختلف النوع حیات کا عجیب سا ملغوبہ بنا سیوتی لال، مالی، باغبان، بغل میں بیلچہ دبائے چل پڑا، اور بیٹی جیسے اپنے دونوں جڑواں بچے دبائے پیچھے پیچھے ہولی۔ ہولی دیوالی کے تیوہاروں پر دیہات میں لڑکیاں باپ بھائی، ماموں، چچا کے ساتھ پیچھے پیچھے ادھر

سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر میکے جاتی نظر آیا کرتی ہیں۔ گلاب باڑی پیچھے چھوڑی، پشتوں کی جنم بھوم پیچھے چھوڑی، گلاب خاص کی سوکھی لکڑی اور کچے آم بکھرے پڑے چھوڑے کٹیا پیچھے چھوڑی اور کٹیا کے کسی کونے میں سونے کا تمغہ اور چاندی کا کپ اوندھا پڑا چھوڑ، اور آدم وحوا سے بغیر قصورِ خوردنِ گندم صرف ایک پودا لگانے کے جرم میں جنت چھوٹی... (ص 224 تا 226)

❁

ترکِ بہشت کی اِن ساعتوں کو ابوالفضل صدیقی نے تقریباً چار صفحات کے ایسے واحد پیراگراف میں متشکل کیا ہے جو ایک فلم/ میورل کے مربوط شاٹس/ اجزا پر مشتمل ہے۔ پیراگراف میں آئے اسماوصفات کو ممیز کرنے کے لیے سکتہ (،) لگایا ہے، رواں تبصرے اور کیفیات حروفِ ربط کے ذریعے منسلک ہیں اور ایک کے بعد دوسری کیفیت ختمے (۔) کے بعد شروع ہوئی ہے۔

اس متحرک نقش میں، اپنی جنت سے ہجرت کرتے ہوئے باپ بیٹی کے گزشتہ وموجود کے تمام رنگ بھرے ہوئے ہیں۔ رنگوں کے خفی وجلی اسٹروکس اُن کیفیات کی نوعیت واضح کررہے ہیں جو گلابو اور سیوتی لال پر حال میں طاری ہیں اور یہ اشارے بھی دے رہے ہیں کہ ان کیفیات اور کیفیات کی نوعیتوں کے اسباب وعلل کیا تھے؛ کون تھے۔ تاحدِ نگاہ منظر پہ چھایا بے انتہا آسمان گویا اُن تمام اندھیروں کی لپیٹ میں آ گیا ہے جو اہلِ زمین کے سیاہ، بے خیر اعمال سے اُبلے ہیں: سیوتی اور گلابو ان کی زد میں ہیں لیکن گلابو کے پُرمحنت وشفیق بازو اندھیرے کی چھاتی میں چمکدار خنجر ہیں، اور آسمان والا کوڑا پُرمحنت وشفیق بازوؤں کا ہم صفت ہے، اور دونوں اپنی اپنی استطاعت بھر اندھیرے کی چھاتی چیرنا چاہتے ہیں۔ آسمانی کوڑے کی چمک بھری لہر فضا میں آسمان والے کا اسم، زمیں زادلبوں کی راہ سے باطن میں بھری روشنی کا مظاہرہ —— سب مظاہر —— آسمان، زمین، پیڑ، پودے، طیور، حیوان، رنگ، خوشبو—— روشنی تاریکی میں اُبھرتے ڈوبتے باہم گڈمڈ ہیں؛ گویا عناصر کو ایک بار پھر گوندھا جارہا ہے۔

16

اور انھوں نے ناسازگار ماحول کو خوب ٹھونک بجا کر منھ موڑا تھا اور پُرکھوں کی جنم بھومی سے مضبوطی کے ساتھ لات مار کر پیٹھ پھیری تھی، ہر راستہ مسدود اور ہر گلی بند پا کر یہ بے سنگِ میل سفر اور

Scanned with CamScanner

راہِ بے منزل اختیار کی تھی، مگر پھلوار کے دروازے پر پہنچ کر سرحد سے باہر قدم اٹھاتے جیسے خودکار انداز میں ان کی گردنیں آپوں آپ مڑ گئیں۔ اور سب کچھ تو بھادوں کی اماوس نگلے ہوئے تھی، آگے پیچھے، دائیں بائیں، اوپر نیچے، شش جہات میں تو اندھیریاں ہی اندھیریاں پڑی ہوئی تھیں، جیسے سارے جہان میں اندھیر بپا تھا، کوئی کسی کا نہ تھا، حتیٰ کہ ایک ہاتھ کو دوسرا ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا؛ مگر انھوں نے تو اندھیریاں چیر کر اندھیرے ہی میں سب کچھ دیکھ لیا تھا—— اپنا مقدر بھی، گلاب خاص کی جیت میں ہار کی فاش شکست بھی، اور اپنے آقاؤں کا مقدور بھی۔ البتہ گلابو کے مرمریں بازو اور صندلیں پہنچے گلاب خاص کے دونوں گملوں کو آغوش میں دبائے روشن بالذات گرفت کی طرح اندھیرے میں چمک رہے تھے، اور جیسے انھی کی رہنمائی میں وہ بھادوں کی اماوس چیرتے ہوئے بڑھ رہے تھے۔ کالے کالے بحرِ ظلمات جیسے تھپیڑوں کو چیرتا، پُروا ہوا کا بوجھل جھونکا سامنے سے بڑھ کر ٹکرایا اور پیچھے سے بجلی کا کوڑا لہرایا۔ عالم بقعۂ نور ہو گیا اور ساتھ ہی کڑا اڑا اڑا دھم—— دُنیا دہل اٹھی۔

سیوتی لال کے منھ سے بے اختیار نکلا: ''اوم برھم! ہے اِندر مہاراج، تمھاری لیلا!'' پی آں! پی آں! پی آں! چاروں سمت درختوں میں دُبکے ہوئے موروں نے چیخوں کا دور تک ایک آواز کا سلسلہ ملا دیا، اور قریب ہی کہیں ایک اکیلا گیدڑ ہوکا۔ اور یہ شور و منظر تو ان کے کانوں کے لیے نیا نہ تھا، مگر آج نیا اور نامانوس سا لگا جو آج تک معمول رہا تھا۔

سیوتی لال کی نگاہ اک ذرا کے ذرا تا حدِ نظر اپنے نصب کیے ہوئے باغوں کی قطاروں میں دوڑتی چلی گئی۔ درخت نصب کرنے کے ناپ کی یکسانیت، موزونیت کے سلیقے قاعدے کے مطابق اصطلاح میں ''رام تیور'' کہلانے والے طریقے میں لگائی ہوئی قطاروں کے باغ، ہر قطار ہر سمت اور ہر جگہ سے ایک ہی زاویے اور راست خط میں نظر آنے والی، یکساں و یک سمت جاتی ہوئی، جیسے شطرنج کے مُہرے قطار میں ایستادہ، رام سیوک مالی سیوتی لال کے سیدھے ہاتھ کی نصب کی ہوئی، کسی خوش فکر سلجھے ہوئے مصنف کی تصنیف کی سطریں لفظ لفظ کھلی ہوئی، عقل و معنی کے رنگ و رس سے بھری ہوئیں، سطر سطر تحقیق نادر ریسرچ سے پُر اور سب کی سب اس کی اپنی جانب رخ کیے، اس کی تحقیق کی شاہد، جیسے دور سے اس کو اپنی جانب کھنچتی بڑھتی دکھائی پڑیں، اور انھیں دور سے دیکھ کر خاص طور پر اس موسم میں اس کو اکثر یہ محسوس کر کے دل پر لہر سی اٹھا کرتی، جیسے یہ اس کے اپنے نوزائیدہ جواں سال

Scanned with CamScanner

بیٹوں ہی کی تو قطاریں ہیں، اس کے اندر بیٹوں کے باپ کے یقین واحساس کو سہارا دے رہی تھیں اور اولادِ ذکور کی محرومی کا شائبہ بھی اس کے شعور کے اندر کبھی نہ ابھرنے دیا تھا۔ اور اس کے یہ سپوت بیٹے تو خیر جاری تھے، رس رنگ اور خوشبوئیں، زندگی کی ضامن تمام شیریں نعمتیں عام کر کے بکھیر نے والے، انسان، حیوان اور طیور پر یکساں مہربان، اور انھیں کے قیام سے تو اس کی بغیر بیٹے والی زندگی عبارت تھی۔ اور اس کی گلابو بیٹی تو بیٹا تھی اور انھی قطار اندر قطار باغوں نے بیٹی کے اس باپ کو فردوسیں شیرینیاں اور رنگ و بو پاشیاں کر کے اولادِ ذکور کی محرومی کا احساس نہ ہونے دیا تھا۔

گلاب خاص کے متعلق کبھی کبھی صبح تڑکے اس کے شعور میں نیم خواب نیم بیداری کی کیفیت میں یہ آرزو ابھرتی جیسے یہ کوئی خوبصورت، سرخ سرخ، دمکتا ہوا لڑکا ہے، بڑا ہی شیریں دہن، بڑا ہی خوشبودار، اور جیسے وہ اپنی گلابو کو دلہن بنا کر اس کا پلو اس کے ساتھ باندھ دے گا اور بھونرے ڈال دے گا۔ اور آج ایک بیٹی اور ایک آم ہی اس کے تنہا رفیق تھے اور دوسرے جھونکے سے ساتھ ایک کڑک اور کوندنے کی چمک میں یہ قطاریں کی قطاریں اور بھی زیادہ واضح اور متحرک سی ہو کر سب کے سب اسے اپنی جانب چلتے ہوئے نظر آئے — یا شاید خود ہی ان کی جانب بڑھ رہا تھا۔ نہیں نہیں... وہ ان سے دور ہو رہا تھا۔ یہ تو سب اس کے ایستادہ، نصب کیے ہوئے تھے، اور یہ اس کا واہمہ، فریبِ نگاہ اور بھول تھی۔ ان کے پاؤں تو اس نے خود ہی باندھ کر پرورش کیا تھا اور تیری میری مٹی کی کیمیا سے مرکب زمین پر بنیاد رکھی تھی۔ اور اس کے یہ جواں سال بیٹے بھی تجھ مجھ کے ہو کر رہ گئے تھے اور دوسروں کی ولدیت میں بھر گئے تھے، اور وہ بیگانہ وار ان کے عین بیچوں بیچ سے گزر رہا تھا۔ اور اب کی مرتبہ پھر بڑے زور کا کوندا اور کڑک ہوئی۔ اس نے آس پاس دیکھا۔ یہ درخت اب بے ترتیب جھرمٹ سے کیے نظر آئے۔ قطاروں کا تسلسل و یکسانیت آخری قربت میں گم ہو گیا اور سیوتی لال مالی کو بغل میں دبا ہوا بیلچہ تیشۂ فرہاد سا محسوس ہوا۔ گلابو کو اس جھرمٹ میں ایک نوعیت کا خوف سا لگا۔ اس نے دونوں جانب دونوں گملے بازوؤں پنہچوں میں، جڑواں بچوں والی خائف ماں کی طرح، مضبوط بھینچ لیے، مبادا کہیں یہ میرے جائے بھی انھی میں نہ جا کھڑے ہوں، اور وہ دونوں بیگانے بن جانے والے اپنوں سے اس بن جیسے جھرمٹ میں تیز تیز قدم بڑھتے رہے، جن کے جڑوں کے ریشے ریشے جھگڑے جھگڑے موسلے موسلے سے لے کر شاخ شاخ پھنگی پھنگی پتے پتے پر کسی موقلم پینٹر آرٹسٹ

کے نام کی طرح ان کے دستخط ثبت تھے، اور اس وقت یہ انھیں بھوتوں کے غول بیابانی کی طرح ڈراؤنی مخلوق نظر آرہے تھے، اس ماحول میں اور اس مجمعے کے بیچوں بیچ جہاں اس نے خود کو آدمی کے بجائے چھتناور، شاداب آم کا درخت محسوس کیا تھا، اور انھی میں سے کوئی ایک خود اور اس کی بیٹی گلابو، شاید خود کو لڑکی سے زیادہ گلاب خاص محسوس کر کے، جو گرمی، ہوا اور پانی میں ایسی ہی رنگینیوں شیرینیوں، خوشبوؤں کے ساتھ پروان چڑھتی رہی تھی جیسا کہ اس کا گلاب خاص تھا، انھوں نے آم کے چھتناور درختوں کے ساتھ پھاگن چیت سے بھادوں کنوار تک لوؤں، دھوپوں، آندھیوں کا جم کر اور جھوم جھوم کر آنکھ سے آنکھ ملا کر ہر آفتِ ارضی سماوی کا مقابلہ کیا تھا اور انھی کے ذریعے اپنے اندر ''امرس'' کی تخلیق کی تھی۔ اور آج باپ اپنا بیلچہ بغل میں دبائے اور بیٹی اپنا گلاب خاص جڑواں بیٹوں کی طرح دائیں بائیں دونوں گودوں میں بھرے، عزت بچائے، فرار ہو رہے تھے، اور بھادوں کی سی کالی چادر کی آڑ آڑ جا رہے تھے جو پشتوں سے اُن کا مرغوب لباس رہی تھی۔۔۔۔ ان باغوں کے سلسلے کو پار کر کے آخری حصے پر پہنچ گئے جنھیں اس نے اپنی بے پایاں قوتِ بازو کی گرمی، پسینے کی کھاد اور اپنے بیلچے کی دھار کے زور سے برآمد کر کے ایستادہ کیا تھا اور اس خطّے کے کلچر کو پروان چڑھایا تھا۔ سامنے ریل کی پٹڑی نظر آئی اور اُس جانب ریلوے اسٹیشن کی سنگین عمارت — اور یہ کٹیا سے چلنے کے بعد اس کی اولین منزل تھی، بے سنگِ میل و بے نام ونشاں — آخری منزل پر پہنچنے کے لیے۔ پلیٹ فارم بک ہونے والے پودوں اور آموں کے پارسلوں سے پٹا پڑا تھا اور اندھیرے میں ان آم کے پارسلوں اور پودوں کی ٹوکریوں سے ٹھوکر کھانے سے بچتے ہوئے اُدھر پہنچے تو ایک مرتبہ پھر گردن آپوں آپ مڑی۔ مگر پیچھے کا جائزہ نہ لے سکے اور اب اتفاقیہ کوندے کی چمک بھی نہ تھی جو سہارا دیتی اور رہنمائی کا ذریعہ بنتی۔ گھنے باغوں کا سلسلہ، اس کے دست و بازو کے سلیقے کی ترتیب، بھادوں کی اماوس میں سب کچھ گم تھا، اور وہ بھی گم ہی ہو کر رہ گئے۔ سامنے اسٹیشن کی مٹی کے تیل کی درمیانی اونچائی والی مخصوص بتی کھڑی ٹمٹما رہی تھی اور اندھیرے کا پردہ چاک کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ گاڑی پاس کرانے کے لیے اسٹیشن ماسٹر اپنے کوارٹر سے لپکتا ہوا آ رہا تھا اور سامنے سے آتے ہوئے بڑے بابو نے اس کو پہچان لیا۔ اس کی زندگی کا یہ پہلا سفر تھا۔ وہ اسٹیشن تک بھی سال میں ایک آدھ مرتبہ شاذ و نادر ہی آیا کرتا تھا، مگر اس نواح کا جانا پہچانا اور اپنی نوعیت و سطح کا خاص آدمی تھا۔ ایسے بے

وقت اسٹیشن ماسٹر دور ہی سے دیکھ کر بولے:

''ارے استاد سیوتی لال، ارے بھئی کہاں؟ آج تم کہاں؟ خیر تو ہے، کدھر کا سامانِ سفر؟''

وہ بڑے بابو کو سلام کرنا بھی بھول گیا۔ جواب بھی نہ دے سکا اور بابو نکلا چلا گیا۔ اب اس نے پانچ روپے کا نوٹ چٹکی میں پکڑے، بکنگ آفس کی کھڑکی کے اندر ہاتھ بڑھایا اور بکنگ کلرک نے پہچان کر ضابطے کے استفسار سے گھریلو انداز میں بے تکلفی کے ساتھ اندر سے بانگ لگائی: ''اوہو، ایں آں، آج اُستاد سیوتی لال! کہاں کدھر آج چل پڑے بھئی، ایں؟'' تو بکنگ آفس کی کھڑکی کے سامنے اندر ہاتھ بڑھائے، مسافر بیچ بغلیں جھانک گیا۔ جہاں ہر مسافر گھر سے پوری اسکیم سفر بنا کر پہنچا کرتا ہے، اس نے بار بار دائیں بائیں دیکھا، جیسے آس پاس کی تاریکی میں مشورہ کر رہا ہے کہ ''کہاں جاؤں؟'' اور چھوٹے بابو کا اہم سوال بھی بڑے بابو کے چلتے ہوئے سوال کی طرح بے جواب رہا، اور ''کہاں؟'' کا سوال اس کے شعور میں جھنجھلا کر اندر ہی اندر گونجا۔ وہ ٹکٹ خریدنے والی کھڑکی پر اندر ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا اور اس کا سوال سن کر اس کے اندر نے جواب دیا: ''وہاں جہاں کی سرزمین کی مٹی اپنی چھاتی پر گلاب خاص کو کھڑا کر کے پروان چڑھا سکے اور جس فضائے بسیط کی ہوا پال پروان چڑھا کر چھتنار درخت بنا سکے اور گلاب خاص دیسی گلاب کے پھولوں کی جھاڑی کی طرح لد سکے۔'' وہ سرزمین کہاں اور کرۂ ارض کے کون سے اسٹیشن پر ہے؟ نہ تو بابو جانتا تھا نہ خود سیوتی لال اور نہ اس کی گلابو بیٹی ہی کو پتا معلوم تھا؛ نہ جریب کھینچنے اور گھٹے ڈالنے والا پٹواری چک تراش ہی کے نقشۂ شجر میں ہنوز اس کا حدودِ اربعہ پایا تھا اور نہ اس کا جغرافیہ قطب شمالی سے قطب جنوبی تک قابض دخیل ''مالک'' کہلانے والے زمینداروں نے ہی آج تک دریافت کر پایا تھا — سب کچھ بھادوں کی اماوس کے اندھیرے میں گم تھا۔ سیوتی لال بے چارہ کہاں کا ٹکٹ مانگتا اور بابو غریب کون سے اسٹیشن کا ٹکٹ کاٹتا۔ (ص 226 تا 230)

❋

آسمان وزمین پر مظاہر زخار ظہور کے اس سرے پر، جب ابوالفضل صدیقی دکھا رہے ہیں کہ قدیم کی قلموں کو آغوش کی پناہ دینے والے کا محافظ ہاتھ، جس کے بازوؤں کی مچھلیاں زندہ ہیں، اس سوال سے مفلوج پھیلا پڑا ہے کہ کہاں جاؤں؟ — تو غالباً بتا رہے ہیں کہ یہ تحریر قرن با قرن

Scanned with CamScanner

سے، زر، زن، زمین کے بہانے، خیر وحسن پر شر کی یلغار اور اس کے درمیان بقائے عصمت و انا کے لیے ہجر کا قصد ہے جو یہاں ''شرفا سے ایک ادنیٰ شودر کی ٹکر'' (ص 200) کی بنا پر پیش آیا ہے۔ اس قصے کے شودر کرداروں کے لیے کوئی گل زمین بھلے ہی نشان زد نہ ہو، مگر ان کا وجود اپنی کچھ قوتوں کی رمق پا گیا ہے۔ یہ قوتیں اپنے دیگر تمام ثمرات فنا کے گھاٹ اتار کر متروکہ جنت کی دو گلاب گوں قلمیں فضائے شر سے نکال لائی ہیں۔ آگے اندھیرے پار، ''مالک'' نہ ہوں گے، سیوک ہوں گے، فضا سازگار ہوگی؛ یہ قوتیں ان قلموں کو چھتنار درخت بنائیں گی جن پر ماضی، حال، مستقبل کی صعوبتوں، محنتوں کے پروردہ گلاب خاص اپنے سیوک کے لیے جھولیں گے، کہ زمین ذات نہیں دیکھتی، شودر کو بھی اس کی چھوئن کا صلہ دیتی ہے؛ وہ حدِ زماں تک مہربان ماں ہے۔

اسمبلاژ کے گزشتہ صفحات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ابوالفضل صدیقی نے ایسے ماحول اور معاشرت کی مفصل کہانیاں لکھی ہیں جن کے متعدد پہلوان کی نظر اور فہم کا اثاثہ تھے۔ نظر نے دیکھا کہ اس معاشرت میں زر، زن، زمین کے حصول کے لیے افراد کا عمل کیا ہے، حاصل شدہ زر، زن، زمین پر اختیار باقی رکھنے کے لیے افراد کے طور طریقے کیا ہیں؛ اور فہم نے پایا کہ حصول و اختیار کے اعمال و اطوار سے کیسے کیسے شر وقوع پذیر ہو کر حسن، خیر اور صداقت سے متصادم ہوتے ہیں۔

اپنے جانے پہچانے ماحول میں، خیر و شر کے (ازلی) تصادم کی کہانیاں خلق کرتے ہوئے ابوالفضل نے فہم و نظر کی بیشتر قوت اُن افراد کو دیکھنے اور سمجھنے پر صرف کی جو اُس ماحول و معاشرت کے زائیدہ ہیں، اُسے زندگی دے رہے ہیں، بلند و پست سے دوچار کر رہے ہیں اور اس میں (شعوری یا غیر شعوری طور پر) کسی پُر خیر تبدیلی کے خواہش مند ہیں۔ افراد کے ایسے اقدامات اور خواہشوں کو کہانی کا جزو بنانے کے دوران ابوالفضل نے ان کی عام نفسیات اور جبلّت کو بھی معقول توجہ سے دیکھا اور سمجھا ہے۔

ماحول و معاشرت اور افراد کے باہمی تفاعل سے وجود پذیر کہانیوں کو قاری کے ذہن میں پیوست کرنے کا موثر ترین وسیلہ ابوالفضل صدیقی کی زبان اور طرزِ بیان ہے۔ زبان ان کے ہاتھ میں نرم اور لوچ دار مٹی، موڈلنگ کلے (modelling clay) ہے، جس سے وہ نت نئے مناظر و مواقع اور نوع بہ نوع افراد کے ظاہر و باطن متشکل کرتے ہیں۔ فقروں کی متنوع نشست اور جملوں کی

نئی ساخت کے علاوہ شہروں، قصبوں اور دیہات کے خواندہ و ناخواندہ افراد کی ٹکسالی و علاقائی زبانوں کے الفاظ، محاوروں، کہاوتوں، اصطلاحوں اور ضرب الامثال کا ایک ذخیرہ ہے (جسے کوئی چاہے تو ''فرہنگِ ابوالفضل صدیقی'' کے نام سے ترتیب دے سکتا ہے) جو ان کی بے تکان نثر میں خاصی ہنرمندی سے استعمال ہوا ہے — اور یہ سب کچھ اُن کی کہانی کا قوام ہے۔

ابوالفضل صدیقی کی زیادہ تر کہانیاں اس باعث طویل ہیں کہ وہ مرکزی خیال یا احساس کی نہ صرف بنیادی وجہ بلکہ اُس کے (بظاہر) ضمنی اسباب وعلل بھی پورے پس منظر کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ نتیجتاً: خیال میں سے خیال اور احساس میں سے احساس پیدا ہوتے ہوتے کہانی ایسی طویل زنجیر بن جاتی ہے جس کا ہر چھوٹا بڑا حلقہ اپنے آپ میں بھی بامعنی ہوتا ہے اور (بالعموم) اپنے سے پہلے اور بعد کے حلقوں سے مل کر خود اپنے، اپنے سے پہلے اور اپنے بعد آنے والے حلقوں کے انفرادی و اجتماعی مفاہیم واضح کرتا ہے۔ اور چونکہ ابوالفضل صدیقی کی بنیادی دلچسپی انسانوں سے ہے، اس باعث ان کی کہانیوں کے ماحول اور واقعات کے ہر دائرے کا مرکزی نقطہ کوئی فردِ واحد، افراد کا کوئی طبقہ، انسانی احساسات ونفسیات کی کوئی جہت یا افراد کے طرزِ فکر وعمل کی کوئی نوعیت ہوتی ہے۔

گزشتہ صفحات کے پیشِ نظر بھی عرض کیا جاسکتا ہے کہ ابوالفضل صدیقی کس طور کہانی کے مرکزی وضمنی دائروں کی تشکیل — اور تزئین — کرتے ہوئے اس کے اختتام تک پہنچتے ہیں، لیکن اس پہلو کی وضاحت اور ابوالفضل کے احسان وفن کی مزید تفہیم کے لیے زیادہ مناسب محسوس ہوتا ہے کہ اُن کی ایک اور کہانی ''پھیر'' کو بھی اسملاژ میں شامل کرلیا جائے تا کہ یہ ایک کے بجائے دو پیروں پر آگے بڑھ سکے۔

کہانی ''پھیر'' (شمولہ آئینہ۔ صفحات: 324 تا 332) چھ حصوں پر مشتمل ہے۔ ''گل زمین کی تلاش میں'' کی طرح یہ بھی اُسی ازلی تصادم کا قصہ بیان کررہی ہے جس کا منبع زر، زن، زمین رہے ہیں۔ اس کہانی میں ابوالفضل کی فہم ونظر نے افراد کے ان اقدامات پر خاص توجہ دی ہے جو حاصل شدہ زمین پر گرفت کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے کے لیے اور زمین کے عطیات کو پُرجبر وسائل سے اپنی املاک بنانے کے لیے اختیار کیے جاتے ہیں۔

علاوہ ازیں، مصنف نے کہانی کے کچھ کرداروں کے اطوار اور کچھ کرداروں کے نسبی پس منظر

Scanned with CamScanner

اس طرح بیان کیے ہیں کہ تصادم کی جہات کے ساتھ ہی ساتھ معاشرے کی طبقاتی تقسیم کے بارے میں اس کے افکار بھی (جو سابقہ کہانی میں کچھ جھلکیاں دکھا چکے ہیں) قاری پر واضح ہوتے ہیں۔ اس عمل میں ابوالفضل صدیقی کا گہرا طنزیہ لب ولہجہ آدمی کے عجب ہمہ جہت تصادم، ایک دوسرے کے لیے اُن کے رویے اور تقدیر کے مقابلے ان کی بے بسی پر عجیب وغریب زہرخند کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

کہانی کے پہلے حصے میں مصنف نے بندہ علی نامی کردار کا تعارف، حسب عادت نہایت مفصل پس منظر کے ساتھ، بیان کیا ہے جس کا ایک منشایہ ہے کہ قاری پر بندہ علی کے اُس رویے کی بنیادیں کھل جائیں جو وہ اپنی ددھیال اور ننھیال والوں کے ساتھ اختیار کرنا چاہتا ہے۔

17

خورد سال مولا علی اپنے پچھتر سالہ باپ کی آٹھویں نکاحی نجیب بیوی کا بیٹا تھا۔ خالص سادات النسل، مگر نہایت غریب گھر کی نوخیز خوبصورت لڑکی، جس کو پیر فانی بڑے میر صاحب سید سردار علی شاہ نے سنتے ہیں کہ شادی سے تین چار سال قبل نظر پڑتے ہی، اس کے باپ کے افلاس کو معاف کرتے ہوئے، بچپن ہی میں تاک لیا تھا اور تین چار سال سے منتظر بیٹھے تھے، اور بیٹی میں شباب کی پہلی سرخی نمودار ہوتے ہی اس کے باپ سیّد ولایت علی عرائض نویس کے روبرو اپنی فرزندی میں لینے کی درخواست پیش کردی۔ ظاہر بات ہے کہ کم وبیش پچیس سال عمر میں بڑے داماد کو منشی سیّد ولایت علی نے کبرسنی معاف کرتے ہوئے ان کے بجائے ان کے املاک اور دولت کو فرزندی میں لیا... (ص 232)

... نوخیز بیوی نے سال اندر چاند سا بیٹا جنا، اور اس غریب سیّد کی بیٹی نے میر صاحب کی وہ بگڑی بنا دی جو اس سے پہلے سات اور سیدانیاں، رئیس زادیاں نہ بنا سکی تھیں۔ مگر اگلے سال بے چاری خود دق میں مبتلا ہو کر مر گئی — گویا مرتے مرتے میر صاحب کا دامنِ امید بیٹے کی نعمت سے بھر گئی۔ میر صاحب اسّی کی لپیٹ میں تھے۔ برسوں سے اس باب کو بند کر چکے تھے۔ اب شوق کے ساتھ پھر گود کھولی۔ اپنے گرد و نواح اور حالی موالیوں کا خوب اندازہ تھا، اور توریث کے دھارے

Scanned with CamScanner

کی رفتار کا بے تکا پن بھی خوب نگاہ میں تھا۔ اپنی تمام آبائی املاک نومولود مولا علی کے نام نہایت مضبوط قانونی ذرائع سے جیتی زندگی منتقل کر دی اور خود اپنی حیثیت نومولود کی بلوغت تک صرف ولی و سرپرست جیسی رکھی۔ لیکن ابھی مولا علی پورے چار سال کا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ بڑے میر صاحب خود بھی چل بسے۔ اور خوردسال بھائی کا قانونی اور قدرتی ولی و سرپرست بڑا بھائی بندہ علی ہوا، جس کو خاندان اور طبقے کی پنچایت اور ساتھ ہی مال کے متعلقہ سرکاری اہلکاروں نے بھی تسلیم کر کے قانونی شکل دے دی۔ اور اب چودہ سال کے لیے، جب تک نابالغ سنِ بلوغت کو پہنچے، بندہ علی اس کا مختارِ عام کارکن بن گیا؛ اس شرط کے ساتھ کہ کل آمدنی کا جمع خرچ سول جج کے روبرو ششماہی پیش کرتا رہے اور بچت نابالغ کے نام بینک میں جمع کرتا رہے۔ بندہ علی اپنے باپ، انھیں بڑے میر صاحب سردار علی شاہ کی اس متلون، شکاری، اندھادھند، خیرہ کرنے والی جبلت کا نتیجہ اور ہٹا کٹا زندہ سلامت نفر تھا، جس کی زد میں تیتر، بٹیر، مرغ زریں کے ساتھ ساتھ گل گیال، کنڈولیاں، گھوریاں، کوے اور چیلیں سبھی آتی ہیں۔ بندہ علی کی نانی کے ساتھ اس کی ماں رم کلیا چماری بچپن سے حویلی میں جھاڑو بڑھارو کا کام کرتی تھی۔ حویلی کی جوٹھن چاٹ چاٹ کر نہ معلوم کب ماں بننے کے قابل ہوگئی، کسی کو پتا بھی نہ چلا۔ ایک روز بیساکھ جیٹھ کی دوپہری میں اس کی [بندہ علی کی] نانی جھاڑو بڑھارو کرتے کرتے تھک گئی اور خاص بڑے میر صاحب کی دوپہر کی خوابگاہ کی صفائی کا کام بیٹی کے سپرد کر کے چلی گئی۔ رم کلیا نے بڑے میر صاحب کی خوابگاہ کا کواڑ اک ذرا کھول کر اور پردہ ہٹا کر جھانکا تو تاریک، نم ٹھنڈی خوابگاہ میں وہ تو کچھ نہ دیکھ سکی، لیکن میر صاحب نے، جو ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر دوپہر کی دوسری نیند کے لیے بستر پر لیٹے ہی تھے، جیسے سب کچھ بھانپ لیا۔ کواڑ کے کھٹکے اور پردے کی سرسراہٹ پر بڑے میر صاحب تو باوضو سو گئے اور شیطان جاگ پڑا اور میر صاحب کے بستر میں سے نکل کر رم کلیا کے پیٹ میں گھس پڑا۔ بلاشان گمان، جیسے کہتے ہیں ''چھوئے کا مو'' لگ گیا۔ اور ابرِ نیساں کے اتنے قطرے جو گنتی کے مقررہ پیمانوں سے باہر ہیں آسمان سے ٹپک ٹپک کر مٹی میں ضائع ہو جاتے ہیں؛ جس کو سیپی کے پیٹ کی آب میسر ہوتی ہے وہ گوہر بنتا ہے، اور اگر کوئی سیپی ہی ایسی ہو جس میں اندھیرا ہو تو بھلا ابرِ نیساں کا قطرہ موتی کیسے بن سکتا ہے۔ اور بندہ علی کا وجود بے آب سیپی کے پیٹ میں پروان چڑھتا تھا، لہٰذا کنکری ہی بن کر رہا، اور بڑے میر صاحب نے برتھ

سرٹیفکیٹ کے طور پر اسم بامسمی بندہ علی نام تجویز کیا تا کہ سند رہے اور وقتِ ضرورت کام آئے اور آئندہ نسلوں کی منڈی میں پہچانا جا سکے۔ ویسے بڑے میر صاحب نے اپنے طبقے کی جبلّت کے مطابق نجیب اولاد کے لیے کیا کیا جتن نہ کیے۔ پیر فقیر مجذوب اور ملا سیانے پوجے، قبروں پر سر رگڑا، ماہر حکیم نوکر رکھے۔ ساری جوانی اسی میں بتادی اور گوہرِ امید ہاتھ آیا تو بلا شان گمان، جب لبِ گور آ لگے۔ بہر حال وہ قبر میں اطمینان کے ساتھ گئے کہ توریث سادات کے راستے سے نہیں بھٹکی۔ لیکن آج گور میں پھر بے کل ہو گئے ہوں گے۔ سنتے ہیں کہ جب ایسے حادثے وقوع پذیر ہوا کرتے ہیں تو بزرگوں کی ہزار ہا سالہ قبریں پھٹتی دیکھی گئی ہیں۔ ساوتی تمدن کا اڑایا ہوا ہزار ہا سالہ قدیم روڑا شرعی قانونِ وراثت کے ریلے میں بہہ گیا تھا۔ (ص 233 تا 235)

❁

ان اجزا سے کوئی ساڑھے اُنیس صفحے آگے، کہانی کا باب دوم شروع کرتے ہوئے ابوالفضل صدیقی نے بندہ علی کی وجہ پیدائش کا ماجرا یوں بیان کیا ہے:

18

ایسی حرکتیں جیسی میر صاحب جیٹھ بیساکھ کی جلتی ہوئی دوپہری میں اپنی خنک و نم خوابگاہ کے اندر کر بیٹھے، میر و امیر صاحبان کا چڑیا چروٹے کی آپ بیتی والا ڈراما ہوا کرتی ہیں اور دن دہاڑے ہوتی رہتی ہیں، لیکن کبھی کبھی درمیان میں دستِ قدرت داخل ہو کر چلتے چلتے شوخی بھی دکھلا جاتا ہے۔ رم کلیا شودر کی لونڈیا تھی، جس کو خالق محرومیاں ہی محرومیاں عطا کر کے دنیا میں بھیجتا ہے۔ رنگ روپ، چال ڈھال، کچھ بھی تو نہ تھا۔ حتیٰ کہ ابھی ڈھنگ کے ساتھ پوری طرح جوانی بھی نہ چڑھ پائی تھی اور بچی ولڑکی کے بین بین ہی تھی، البتہ اٹھان بتا رہا تھا کہ عورت کی ڈنکی قسم میں سرجے گی۔ بڑے میر صاحب تو بڑے میر صاحب، کوئی چمار کا لڑکا بھی رُج کے ساتھ مشکل ہی سے اپنی چماری بنانے پر تیار ہوتا۔ ندامت کا سوال ہی نہیں، البتہ چھ سات ماہ بعد ایک مرتبہ کو میر صاحب سوچ میں پڑ گئے جب مقربینِ خاص کی زبانی چماروں کی پنچایت کا علم ہوا اور یہ کہ رم کلیا نے بڑے میر صاحب کا نام لیا ہے۔ بہر حال، ایسی بلندی و پستی کے اتصال کی زندہ مثالیں بھی اپنی برادری میں کوئی نئی چیز نہ تھیں،

Scanned with CamScanner

البتہ یہ سید اور شودر کے ٹکراؤ میں چنگاری سی چیخ جاتی تھی۔ حمل کے نمایاں ہوتے ہی اڑتالیس گاؤں کے چماروں کا اکٹھ ہوا، لیکن پنچ بڑے میر صاحب کا نامِ نامی سنتے ہی دم نہ مار سکے اور بالآخر فیصلہ رم کلیا کے باپ ہی کے سر رہا۔ چمار نے ہمت کر کے اور خاص کارندے کو اپنی حیثیت سے زیادہ نذر گذار کر باقاعدہ عرضی دی۔ اگر چاہتے تو ڈانٹ پھٹکار کر بھگا بھی سکتے تھے، مگر میر صاحب جہاں دیدہ بزرگ تھے، تولید و تناسل کے دوررس اثرات اور قانونِ وراثت کی لاٹھی کے بڑے اچھے محرم تھے؛ سمجھ سکتے تھے کہ اگر چماری چمار کے گھر میں سید بچہ جنمے گی تو آئندہ نسلاً بعد نسلٍ کیا کیا اندیشے اور مسائل ظہور پذیر ہو سکتے ہیں۔ خاموشی کے ساتھ چمار کو رقم دے کر راضی کیا اور لڑکی کو خوش خرید لونڈی بنا کر حرم خانے میں داخل کر کے ضابطے کی خانہ پری کر لی اور اس طرح شرعی مسئلہ بھی، پہلے نہ سہی بعد کو، سلجھا لیا، اور حویلی کے ایک ویران دور افتادہ گوشِ محل جیسے حصے میں ایک شب چماری بیگم نے لڑکا جنا۔ پیدائش کی خبر سن کر مادرزاد غلام کا نام سرکار نے خود ہی بندہ علی تجویز فرمایا۔ اسم بامسمّٰی تاکہ سند رہے اور وقتِ ضرورت کام آئے۔ اور بندہ علی اسی حویلی سے دیوان خانے تک اپنی مخصوص "ربیب" اور "انجب" والی سطح پر پل کر جوان ہوا — اس سے بھی کم اہم جتنے گئو خانے میں گایوں کے بچھڑے اور اصطبل میں گھوڑیوں کے بچھیڑے پیدا ہو کر پروان چڑھتے تھے۔ اس دوپہری کی مخصوص ساعت کے بعد میر صاحب نے پھر کبھی رم کلیا کے قریب جانا تو در کنار، پیچھے مڑ کر دور سے دیکھا بھی نہیں۔ بس صرف کئی کے ساتھ وہ بھی ضابطے کے مطابق سرکار کے جنازے پر چوڑیاں ٹھنڈی کرنے اور رنڈ سالہ پہنانے کے لیے ضرور لائی گئی۔

کہتے ہیں کہ بارہ برس بعد گھورے کے بھی بھاگ جاگتے ہیں۔ شودر تو منوجی کی کتاب میں کوڑے کرکٹ سے بھی ارذل لکھا ہوا ہے، لہٰذا اس کا مقدر کہیں چوبیس برس بعد جاگا۔ جب سال خوردہ بڑے سرکار اور ان کے بعد خورد سال سیدانی زادہ مولا علی دونوں اللہ کو پیارے ہوئے اور ابرِ نیساں کا اعماقِ بحر میں دبا ہوا قطرہ بندہ علی آب و تاب کے ساتھ نکل کر دُرِّ یتیم کی صورت منصۂ شہود پر آیا اور پورے تیئس سال بعد اس پر جوانی چڑھی۔ (ص 255 تا 257)

❁

بندہ علی کا تعارف اور رم کلیا کا احوال کہانی پڑھنے والے پر یہ تو واضح کرتا ہی ہے کہ اس کردار کا

ننھیالی پس منظر کیا ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ اشارے بھی دے رہا ہے کہ سردار علی شاہ کے اطوار کیسے تھے۔ جس طرح بیساکھ جیٹھ کی ایک دوپہر، ٹھنڈی خوابگاہ میں جاگنے والا شیطان، اور اپنی عمر سے پچیس برس چھوٹے ولایت علی کی بیٹی کو اس کے بچپن ہی میں تاک لینے والا شیطان، زمانی فصل کے باوجود، ایک ہی ہے؛ بالکل اسی طرح وہ ڈھائی تین سو نفوس بھی نسبا بندہ علی جیسے ہیں جو زمانہ گزشتہ میں سردار علی شاہ جیسے اطوار والوں کے باعث ''سادات اور دوسرے خونوں کے آمیزے سے'' پیدا ہوئے تھے۔

گور میں جاتے جاتے سردار علی شاہ کو حاصل شدہ اطمینان کا ذکر کرنے کے بعد مصنف کا فقرہ:
''لیکن آج گور میں پھر بے کل ہو گئے ہوں گے'' کہانی پڑھنے والے میں تجسس پیدا کرتا ہے کہ ''آج'' وہ کون سا حادثہ پیش آنے والا ہے جس کی نوعیت کے سبب''... بزرگوں کی ہزار سالہ قبریں پھٹتی دیکھی گئی ہیں۔ ساونتی تمدن کا اڑایا ہوا ہزارہا سالہ قدیم روڑا شرعی قانونِ وراثت کے ریلے میں بہہ گیا تھا۔'' (ص 235)

قبر میں اطمینان کے ساتھ جانے والے کو ''آج''، ''بے کل'' تصور کرنے کی جانب خفیف اشارے کے بعد، یعنی تفصیلی بیان سے پہلے ہی، مصنف نے ''شرعی قانونِ وراثت کے ریلے'' کا اثر اس باعث بیان کیا ہے کہ اس نے کہانی کا عنوان ''پھیر'' رکھا ہے۔ اقتباس 17 کے تمام اختتامی جملے، یعنی ''ویسے بڑے میر صاحب'' سے ''بہہ گیا تھا'' تک، اشارہ دے رہے ہیں کہ اس کہانی کا محوری نقطہ وراثت میں پیدا ہونے والے وہ پھیر ہیں جو کبھی افراد کی آزادی اور کبھی بے ارادہ و حادثاتی اقدامات و اطوار کے باعث پیدا ہوتے ہیں، مگر ان کے ایک بار پیدا ہو جانے کا مطلب یہ قطعاً نہیں کہ وہ ویسے ہی اطمینان بخش انداز پر ہمیشہ برقرار بھی رہیں گے۔ اُن میں نہ جانے کب کوئی اور پھیر پڑ جائے کیونکہ یہاں سب کچھ ہمارے ہاتھ میں تو نہیں ہے — ایک بالاترین ہاتھ بھی تو ہے جو اپنے ہونے کا ثبوت ہمارے عزائم کو فسخ کر کے (بھی) دیتا رہتا ہے۔

بڑے میر صاحب جس ''اطمینان'' کے ساتھ قبر میں گئے اُس میں اوّلاً سولہ سال کے لیے ''بے کلی'' یوں پیدا ہوئی کہ ''خورد سال بھائی (مولا علی) کا قانونی اور قدرتی ولی و سرپرست'' بڑا بھائی بندہ علی ہوا۔

کہانی بتاتی ہے کہ یہ "بے کلی" فوت یافتہ سردار علی شاہ کی قبر تک محدود نہ رہی بلکہ اس کا دائرہ اُن جیتے جاگتوں تک پھیل گیا جو سردار علی شاہ جیسے سابقین کے اطوار کا نتیجہ تھے۔

19

اسی قصبے کے طول و عرض کے موضعے میں جہاں سکونت تھی، اُسی نوعیت کی شاخ کے، جیسا بندہ علی تھا، ڈھائی تین سو نفوس پر مشتمل پندرہ بیس گھر آباد تھے جو پچھلے سادات اور دوسرے خونوں کے آمیزے تھے۔ سب کے سب کاشتکار لیکن ان ذرا قدیم مراعات کے حامل، ان کی کاشتہ اراضیاں بہت ہی کم اور ناقابلِ اضافہ شرح لگان پر موروثی حقوق کے ساتھ اور ناقابلِ بے دخلی شرائط پر ان کے قبضے میں چلی آئی تھیں۔ یہ مراعات سیّد بزرگوں نے اپنی حرکتوں کی پاداش میں اپنی خاص نسل کے تھوڑے سے حقوق کاٹ کاٹ کر تفویض کی تھیں۔ بقیہ ان میں اور عام کسانوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ معاشی اور معاشرتی رہن سہن، سماجی سطح کے اعتبار سے یہ ادنیٰ کسانوں سے مماثل تھے۔ حتیٰ کہ اسلامی ناموں کے ساتھ سیّد، شاہ اور میر بھی نہ لگا سکتے تھے۔ البتہ کاغذاتِ سرکاری میں قومیت "مولازادہ" بھری جاتی تھی۔...

...بڑے میر صاحب کے مرتے ہی تمام مزارعین کی نظریں شیر خوار مولا علی پر جم گئی تھیں اور مونچھوں کے کونڈے کی گھڑیوں کا حساب انگلیوں پر لگایا کرتے تھے، کہ کب لونڈی بچہ کارکن کی غلامی سے گلوخلاصی ہو۔ خاص طور پر یہ احساس ان مذکورہ مولازادہ گھرانوں میں نیش کی طرح متحرک تھا۔ جو بندہ علی ہی جیسے تھے اور عام کاشتکاروں اور دوسری قومیتوں کے بڑے حلقے نے بھی بہت کچھ انھی گھرانوں سے اکتسابِ خلش کیا تھا۔ غرض پورا علاقہ اس احساس کا شکار تھا۔
(ص 236 تا 237)

❋

مولازادوں کی یہ خلش اور بے کلی واضح کرتے ہوئے ابوالفضل نے بندہ علی کے ایک خاص رویے کی جانب اشارہ کیا ہے۔ اس اشارے پر مشتمل سطور مندرجہ بالا اقتباس کے وسط میں درج تھیں لیکن وہ سطور آئندہ اقتباس کے آغاز میں پڑھنے سے واضح ہوگا کہ ابوالفضل نے (علمِ نفسیات

کی واضح اصطلاحات میں) مولازادوں کی نفسیات کے مقابلے بندہ علی کے طرزِ فکر کی ایک جہت بالخصوص نمایاں کی ہے۔ بہ لحاظِ نسب مولازادوں کے مماثل ہونے کے باوجود، بندہ علی مزاجاً ان جیسا نہیں ہے۔ یعنی ابوالفضل صدیقی کا طرزِ بیان بتارہا ہے کہ کسی فردِ واحد کی افتادِ طبع اسے اجتماعی روش یا طرزِ فکر کے برخلاف عمل کی جانب بھی لے جاسکتی ہے — انحراف بھی تو انسانی فطرت کا ایک تقاضا ہے۔

20

...بندہ علی سہی چماری کا بیٹا تو ضرور تھا، مگر پرورش چمار کسان کے جھونپڑے میں نہ ہوئی تھی اور پل کر حویلی اور دیوان خانے ہی کے اندر، رئیس سیّد باپ کی دوسرے تیسرے درجے کی اولاد کے ضمن میں جوان ہوا تھا، اور ایسوں کی اپنی ایک مخصوص سطح ہوا کرتی ہے اور جس میں 'ایاز قدرِ خود بشناس' کے حدود نہایت راسخ رہتے ہیں۔... (ص 236)

...نابالغ آقا کے بدلے دولت، حکومت ہاتھ میں لے کر اپنی اصل نسل سے ٹکرا رہا تھا۔ قدم قدم پھونک پھونک کر دھر رہا تھا، مبادا کہیں لونڈی بچہ چماری زادہ کا تمغہ اوپر نہ اچھل آئے۔ اور آس پاس کے سارے کھرے سیّد پٹھان زمینداروں سے زیادہ نجیب و شریف سیّد بنا ہوا تھا۔ اس نے ریاست کا انتظام ہاتھ میں لیتے ہی عام کاشتکاروں میں نمایاں مراعات رائج کیں اور ان مخصوص مولازادہ ربیب گھرانوں پر تو اکرام کی بارشیں کر دیں۔ کیونکہ اسی چوبیس خاندان کے ایک جدّی بنی عمام تھے۔ پہلے تو بندہ علی ذرا ذی اختیار ایک کارکن تھا، تنخواہ دار ملازم سے کچھ ہی بہتر اور اک ذرا سی اچھی مختلف جیسی پوزیشن کا آدمی، یہ نئی نئی رسمیں ڈالتے، ان مولازادوں کو خاص طور پر مراعات دیتے دیکھ کر نگراں پنچایت نے محاسبہ کیا۔ تاہم انھیں اس نے مطمئن کر دیا کہ یہ لوگ اس کے اہل اور حقدار ہیں۔ پھر نیک کام تھا، ظلم تو نہ تھا۔ لیکن غریب ان مستفیض ہونے والوں کو مطمئن نہ کر سکا۔ ان کا منھ جتنا بھرا اتنا ہی زیادہ پھیلا، اور پتا نہیں کہ یہ تحت الشعور میں ہی تھا کہ شعور میں بھی کہ یہ لوگ اپنے ہی ربیب زادے کے ہاتھوں یہ مراعات پا کر ذہنی ناآسودگی کا شکار ہو جاتے تھے؛ جس کے ردِ عمل میں مطالبات فزوں تر اور بھرپور ا ہونے پر ناآسودگی بھی فزوں تر ہو جاتی تھی اور احسان کا میدان میزان

Scanned with CamScanner

محسوس ہوتا تھا۔ کتے کی فطرت کے خلاف یہ بندہ علی کا ہر نیا پھینکا ہوا لقمہ غپ سے منہ میں لے کر اٹھتے اور غرّاتے۔ انھیں یہ مراعات بڑے میر صاحب مرحوم کے روایتی اور کبھی کبھی نت نئے استحصالوں سے زیادہ کھلتیں۔ اور اس ٹھنڈی جنگ کے درمیان یہ عجیب حادثہ پیش آیا جس کا دور دور گمان نہ تھا۔ کبھی توریث کی اس الٹی گنگا کے دھارے کے موڑ پر جز بز ہوئے، لیکن جیسے ان مولازادوں کے محسوسات کے بیچوں بیچ شیل آ پڑا۔ یوں تو خورد سال مولا علی کا غم سبھی نے منایا، مگر اس پہلو سے کہ یہ موت مستقل طور پر اُن کی گردن اُنھیں جیسے ایک ارذل برادر کے ہاتھ میں پکڑا گئی، مولازادوں کے گھر گھر اکلوتے بیٹے جیسا قلبی ماتم ہوا... (ص 237 تا 238)

❁

مولازادوں کی ذہنی کیفیت پر مشتمل یہ پوری عبارت اور بالخصوص یہ فقرے کہ "مولازادوں کے محسوسات کے بیچوں بیچ شیل آ پڑا۔" "اُن کی گردن اُنھیں جیسے ارذل کے ہاتھ میں پکڑا گئی" اور "گھر گھر اکلوتے بیٹے جیسا قلبی ماتم ہوا۔" ابوالفضل صدیقی نے اس وضاحت کے لیے تحریر کیے ہیں کہ معاشرے میں صدیوں سے رائج تصورات اور رویوں کے نتیجے میں خود مولازادے بھی اپنے آپ کو "ارذل" تصور کرنے لگے ہیں۔ یعنی کوئی فریب صدیوں جاری رہے تو فریب دینے والے اور فریب کھانے والے دونوں ہی اس فریب کو اصلیت تصور کرنے لگتے ہیں۔ اس باعث بھی شر کو فوراً شر قرار دینا ضروری ہے، کیونکہ اگر وہ کچھ دنوں جاری رہ جائے تو خام ذہن افراد اور مفاد پرست طبقہ شر ہی کو خیر باور کرنے اور کرانے لگتے ہیں۔ غالباً یہی سوچتے ہوئے ابوالفضل صدیقی نے ان طنزیہ فقروں کی وجہ — یعنی "منوجی کے ایجاد کیے ہوئے ہتھکنڈوں" کے بارے میں اپنے افکار — براہ راست بیان کرنے بھی ضروری سمجھے ہیں۔

21

...اور تاریخ شاہد ہے، ساونتی روایت میں توریث کے لیے نجابت راسخ شرط چلی آئی ہے، اس کے بعد کوئی اور پہلو دیکھا جاتا ہے؛ حتیٰ کہ اہلیت اور کردار بھی نہیں۔ ثقہ اور عاقل غیر کفو کے مقابلے پر فاسق و فاجر، مخبوط الحواس، مجنون نجیب کا حق تسلیم کیا جاتا ہے، اور مولا علی کی موت اس طبقے

Scanned with CamScanner

کا اپنی نوعیت کا المیہ اور توریث ساونتی تمدن کا کچھ عجوبہ تھی۔ یوں تو اقتصادی طور پر کوئی بھی فرد متاثر ہونے کی شکایت نہ کرسکتا تھا کیونکہ دور دور بجز بندہ علی کے کوئی دعوے دار تو تھا ہی نہیں، ،مگر شرفا نجیب الطرفین کے کلیجے دہل کر رہ گئے۔ زرعی اراضی کی ملکیت کی توریث، جو سلطنتِ برطانیہ کا ایک جزو تھی، مالک تختِ برطانیہ کا ایک پایہ، نجابت کے راستوں سے بھٹکی تھی؛ اور یہ طبقہ ساز روایت وہ تھی جس کے تحفظ میں یارانِ روایت پناہ اور رندانِ خوں پرور نے اِدھر ڈیڑھ صدی سے اینگلو محمڈن لا اور ضابطۂ دیوانی کے مضبوط فیصلوں تک کو منوجی کے ایجاد کیے ہوئے ہتھکنڈوں سے زمیں بوس کر رکھا تھا، اور ساتھ ہی ساتھ اپنے ترتیبی ماحول پر مفید مطلب مذہبیت کا ملمع بھی چڑھا رکھا تھا۔ اور لونڈی بچے، انجب، ربیب زادہ تو کس شمار و قطار میں، حسب نسب والی خاندانی ماں کی جھولی میں سے خالص خون والی نجیب الطرفین بدنصیب بیٹیاں بھی زرعی اراضی کی توریث کے سلسلے میں عدم وجود برابر رہتیں۔ اور پھر یہاں تک کے بڑھ چکے تھے کہ محمدی قانونِ وراثت کی قینچی کو بالکل کھٹل کرنے کے لیے صرف فرزندِ اکبر ہی سب کچھ ہوا کرتا تھا، اور اس طرح معمولی سے زرعی اراضی کے رقبے کا مالک ولیم اور وکٹوریہ سے بھی بڑھ کر اپنا روایتی رشتہ قیصر و کسریٰ سے ملایا کرتا۔ چہ جائیکہ ارذل تولید، جسے ٹھیک سے لونڈی بچہ بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس ترکیب کے ساتھ بھی وارثت ہی کی روایت اور ضابطے کا تصور ہوتا ہے، ویسے معاشرے کے کسی شعبے میں کوئی مقام نہیں ہوا کرتا۔ حظِ نفس کی خاطر کم و بیش پولی گیمس پرندوں کی طرح، طرفین نہیں بلکہ اکثر یک طرفہ سی مرضی کے تحت، کسی ایسی ویسی کو ہتھیا لیا جس کو محاورے میں ''رستہ چلتی'' بھی کہتے ہیں۔ بسا اوقات اتفاقیہ، اور حتیٰ کہ کبھی کبھی حادثاتی طور پر ہی، دو جسم جمع ہو جاتے ہیں۔ تجیلی، نجیب الطرفین، پنچوں کی ہاتھ تھمائی، قاضی کی کندھوں دھری بیگم سے کہیں زیادہ رجولیت کے ساتھ، وقت کے وقت من تو شدم تو من شدی کے انداز میں حلول ہو کر پسند کرتے، لیکن اس کے عطا کردہ پھل سے حنظل کی طرح منھ بگاڑتے۔ یہ میوۂ شیریں فرزند تو فرزند، سواری کی گھوڑی کی طرح کے ڈالے ہوئے بچھیرے کی تعریف میں بھی نہ آتا، اور بسا اوقات باپ کو بیٹا پیٹھ کا اڈھیٹ محسوس ہوتا، اور مجسم انفعال۔ تاہم یہ اڈھیٹ اور انفعال اپنے وجود کے تو حامل ہوتے، اور بندہ علی تو ان سے بھی ارذل سطح کی مخلوق تھا۔ سچ پوچھیے تو نہ ماں کا ہی بیٹا، نہ باپ ہی کا پوت۔ (ص 339 تا 240)

❁

یہ وہی افکار ہیں جو ابوالفضل صدیقی، بہ طرزِ دیگر، ''گل زمین کی تلاش میں'' (اقتباس: 3) میں ظاہر کر چکے ہیں، مگر کیونکہ کہانیاں الگ الگ ہیں اور صورتِ حال بھی مختلف، لہٰذا قاری کے وجود کو ایک بار پھر زخمہ لگانے سے باز کیوں رہا جائے، کہ شاید یہ طرزِ بیان اُس کے جسم و جاں میں خفتہ صداؤں کو ماحول کی دولتِ بیدار بنا دے۔

کہانی کے تقریباً پونے دو صفحات میں بیان شدہ یہ افکار، بالواسطہ طور پر، اُن واقعات کی راہ بھی ہموار کر رہے ہیں جو مولازادوں اور اُن جیسے دیگر افراد کی ذہنی بے اطمینانی کے نتیجے میں پیش آنے والے ہیں، اور کہانی میں ایک پُر تجسس موڑ بھی پیدا کرنے والے ہیں۔

22

بلا سان گمان علی الصباح حویلی سے مولا علی کی موت کا بلیٹن جاری ہوا، کہ رات کو کھانا کھا کر اچھا خاصا سویا، آدھی رات ایک تے ہوئی، صبح ہوتے ہوتے چٹ پٹ ہو گیا، اور بستی میں تمام دن حیرت، رنج اور مصروفیت کا دور دورہ رہا۔ سہ پہر تک رونا دھونا، کفن دفن سب کچھ ہو گیا، اور قانونِ وراثت کے صاف شفاف کوثر و تسنیم سے نکلے ہوئے دھارے نے چپکے سے راستہ بدل کر گندے پانی کی نالی کی جانب رخ کر لیا۔ اور ہم چشم برابر کے تعزیت کنندگان کو، جو بیرونِ بستی دور و قریب سے تجہیز و تکفین میں شرکت کے لیے جمع ہوئے تھے، وہ دھارا جو اپنی شفاف جھیل کی سطح سے ہٹ کر نابدان میں کود جاتا ہے، اس دھارے کا راستہ فوراً ہی نظر آ گیا، لیکن قہرِ درویش بجانِ درویش، بجز اس کے اور کوئی مفر بھی نہ تھا کہ پسماندگان میں صرف بندہ علی ہی کو تعزیت کریں۔ اور ایسی مثالیں سننے میں تو آئی تھیں لیکن اس نواح میں اس نظام کے قیام کے بعد یہ پہلی تھی، اور محمدی قانونِ وراثت کا ساونتی روایت کو زبردست چیلنج اور بے زنہار وار تھا۔

تمام شرفا کے کان کھڑے ہو گئے۔ تلوار کے زور سے پیدا کی ہوئی روایت اور ملکیت اک ذرا بائیں ہاتھ کا کھیل جیسی معمول کی حرکت کے سبب گڑھے میں گر رہی تھی۔ پچھلی صدی ہوتی تو لام بندی اور فوج کشی ہو جاتی، اور بزرگوں کی قبریں پھٹنے اور ناکیں کٹنے سے بچا لی جاتیں، مگر کینہ پرور انگریزی

دور کا برا ہو، اور مرحوم مولا علی تو طبقے کی ناک ہی جیسے جدِ امجد کا بیٹا تھا جن کی تاریخی روایت کے تحت دوست دشمن سب دل ورنہ زبان سے سیادت تسلیم کرتے چلے آئے تھے؛ اور اس طرح اس مقتدر خاندان کی وراثت یوں یکا یک غیر کفو، بلکہ ارذل ہاتھوں میں پہنچ جانے پر تمام طبقے میں ایک نوعیت کی ذہنی بے چینی تھی۔۔۔۔(ص 241 تا 242)

❁

ہر طبقے کے ذہن میں پیدا شدہ بے چینی سے ایک سازش وجود میں آئی تو اسے مزید واضح کرنے اور سازش کے نتائج ڈرامائی انداز میں منکشف کرنے کے لیے ابوالفضل صدیقی نے مولا علی کے سوئم کا منظر خلق کیا:

23

اور آج مولا علی کا سوئم تھا۔ بستی میں میلہ لگا ہوا تھا، شہر، قصبات اور دیہات کے بھی چھوٹے بڑے جمع تھے۔ چوبیس گھنٹے پہلے تمام متعلقہ کاشتکاروں میں موت کی تفصیل بیان کرتے ہوئے، جس میں اتنے بڑے رئیس کو ایک ڈاکٹر بھی نصیب نہ ہوسکا تھا، خواہ مخواہ اپنے کو گنہگار سا محسوس کر رہا تھا۔ سب سے بڑا کانٹا متعلقہ کاشتکاروں کے، خاص طور پر بندہ علی کے ددھیالی قرابت دار مولازادوں اور ننھیالی چماروں کے دل میں کھٹک رہا تھا کہ یہ انھیں جیسا اب تک تو خیر حاکم ہی تھا، اب کمبخت مالک بھی ہوگیا، اور دوسرا چور تو خیر سایہ تھا اور اس پر چھائیں میں یہ چور پناہ ڈھونڈ رہا تھا کہ "چماری بچے نے یہ مرتبہ سیدانی زادے کو زہر دے کر حاصل کیا ہے۔" اور اسی سائے میں بندہ علی کے برابر والے رئیس بھی پناہ لیے ہوئے تھے، ویسے منھ سے اس حادثے کو ہر پہلو سے قضا و قدر کے سر تھوپ رہے تھے، اور دل بھی یہی گواہی دیتا تھا کہ ایسا ہی ہے بھی، اور زبان بھی یہی بولتی تھی۔ حالانکہ اس میں کسی وقت ذو معنویت کی جھلک پیدا ہو جاتی، کیونکہ دماغ کا جی یہی چاہتا تھا کہ بات زہر دے کر قتل کر دینے والی رہے تا کہ ہماری نسلوں کو اس حرامی چماری بچے کے سامنے کسی پہلو سے تو سر بلندی رہے۔ لیکن قاضی کا دھرا کندھوں پر، تلخ گھونٹ اتار اتار کر تعزیت، فاتحہ اور تعینِ وراثت کے تمام رواتی معمولات برت رہے تھے۔ زبان تک تو آنے کا سوال ہی نہ تھا، دماغ کی بات آنکھ یا چہرے کی ہلکی

Scanned with CamScanner

سی حرکت تک بھی نہ آ سکتی تھی، تاہم ہر کھوپڑی کے اندر کھچڑی یہی پک رہی تھی۔

سوئم کی فاتحہ خوانی ہوئی۔ جگہ جگہ کارندوں نے اپنے متعلقہ کاشتکاروں سے روپیہ روپیہ دو دو روپے والی روایتی نذر وصول کرنے کے لیے بستر اور بوریے بچھائے۔ ایک بوڑھا حجام ایک طشت لیے ڈیوڑھی کی جانب سے مجمعے کی جانب بڑھتا نظر آیا۔ یہ حویلی میں سے بندہ علی کی چماری بیگم بوڑھی بیوہ ماں نے سجا کر بھیجا تھا، اوپر زرکار مخملی جزدان میں لپٹا ہوا قرآنِ پاک، اس کے نیچے غلافِ کعبہ کے ٹکڑے میں لپٹی ہوئی ماوراء التاریخی نوعیت کی دستار، جو موروثوں اور وارثوں کے سروں سروں مکے مدینے سے یہاں تک بجتی چلی آ رہی تھی۔ حلقہ کیے ہوئے ہم چشموں کے درمیان حجام نے ضلع کے سب سے اونچی حیثیت کے زمیندار کے سامنے طشت پیش کیا جنھیں نجیب الطرفین سادات کے علاوہ سات مرتبہ حج بیت اللہ اور اُنچاس دفعہ سنگِ اسود چومنے کی سعادت بھی حاصل تھی اور تمام برادری میں ''حاجی میاں'' کے لقب سے پکارے جاتے تھے اور سب رئیسوں میں مقتدر خیال کیے جاتے تھے۔ روایتی انداز میں انھوں نے پہلے کلام پاک کو بوسہ دیا، آنکھوں سے لگایا، پھر کچھ دعائیں زیرِ لب پڑھ کر بندہ علی پر دم کیں اور پیشانی پر تین مرتبہ انگلیاں پھیریں، قرآن پاک سر سے اونچا اٹھا کر ہوا دی۔ گویا چماری کا داغ اُڑا کر حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا، اور پھر بسم اللہ کر کے ٹھیٹ عربی بندشوں والی دستار باندھی۔ بندہ علی نے کھڑے ہو کر اک ذرا جھک کے پہلے حاجی میاں کو، پھر تمام مجمعے کو عاجزی کے ساتھ سلام کیا۔ عام مجمعے میں لڈو اور چنے بٹنا شروع ہوئے۔ پٹواری، گودا ور اور قانون گو رات ہی سے جمع تھے، وراثت کی بنا پر اندراجِ نام اور داخل خارج کے لیے رپورٹوں کے فارم بھر کر تیار کر چکے تھے۔ سلام کر کے بیٹھتے ہی بندہ علی کے سامنے دستخطوں اور ان سربرآوردہ پنچوں کی گواہیوں اور تصدیقوں کے لیے بڑھائے ہی تھے کہ سب کے سب ہکا بکا رہ گئے۔ تھانے کا انچارج پولیس افسر، معقول تعداد سپاہیوں کے ساتھ، جیسے کہیں یہیں سے آس پاس کی زمین نے اگل دیا۔ حلقہ بھر کے ہی باون گزے جمع تھے اور ان کے بیچوں بیچ بندہ علی، دس گزی پگڑی سجائے، سربلند بیٹھا تھا، لیکن تھانے دار قطعاً نہ جھینپا اور دندانہ وار رؤسائے عظام کے مجمعے میں قانون اور ضابطے کا متحرک اسٹیچو بنا اس طرح داخل ہوا جیسے بھیڑوں کے گلے میں تیندوا آ پڑے، اور پیشتر اس کے کہ کوئی بڑا کلغی دار ہمت کر کے تھانے دار سے کچھ استفسار کرے، اس نے بندہ علی کے ہاتھ میں وارنٹ

Scanned with CamScanner

گرفتاری تھماتے ہوئے ضابطے کے چند مخصوص قانونی الفاظ ادا کیے: ''آپ کو مولا علی کے زہر خورانی وقتل کے شبے میں گرفتار کیا جاتا ہے۔'' اور جب تک ان باون گزوں میں سے کوئی اس قانون اور ضابطے کے روبوٹ سے ایک آواز نکال کر مخاطب ہو ہو، اس نے مشینی انداز میں کھٹ کھٹ سے ہتھکڑیاں چڑھادیں... (ص 243 تا 246)

❋

بندہ علی کے ددھیالی و ننھیالی قرابت داروں کے ذہنی بے چینی کے مزید بیان اور سازش کے انکشاف کے علاوہ اس منظر سے ابوالفضل صدیقی نے ایک کام اور بھی لیا ہے، یعنی انھوں نے اپنے قاری کو'' حاجی میاں کے لقب سے پکارے'' جانے والے شخص کی ایک جھلک دکھائی ہے۔ اس شخص کو ابوالفضل کہانی کے حصہ دوم (صفحات: 255 تا 272) کے مزید بارہ صفحات (260 تا 272) پر ایسا کردار بنانے والے ہیں جو'' پیر فانی بڑے میر صاحب سید سردار علی شاہ'' کا زندہ روپ محسوس ہو گا۔ کہانی کی ابتدا ہی سے سردار علی شاہ کو فوت شدہ دکھانا ابوالفضل کی فنی مجبوری تھی۔ وہ ایسا نہ کرتے تو کہانی کا مرکزی خیال'' وراثت میں پیدا ہونے والا پھیر'' پوری طرح واضح کرنے میں کئی دقتیں پیش آ سکتی تھیں اور کہانی موجودہ پُرکشش ابتدا سے محروم ہو سکتی تھی۔ یہ مجبوری نہ ہوتی تو عین ممکن تھا کہ مصنف سردار علی شاہ کے اطوار بھی ویسی ہی تفصیل سے بیان کرتا جیسے کچھ صفحات بعد'' حاجی میاں'' کے اطوار بیان کرنے والا ہے۔

راقم الحروف کے اس خیال کی وجہ، کہانی میں سردار علی شاہ کی زندگی کے دو حسبِ ضرورت مختصراً بیان کیے گئے واقعات ہیں۔ پہلا'' جیٹھ بیساکھ کی دوپہری میں''، ''نم ٹھنڈی خوابگاہ میں'' ان کا عمل۔ دوسرا، لیکن کہانی کے آغاز میں ہی بیان شدہ، ایک غریب گھر کی نوخیز خوبصورت لڑکی کو اُس کے ''بچپن میں تاک'' کر اسّی سال کی عمر میں اپنی'' آٹھویں نکاحی'' بیوی بنانا۔ یعنی اگر کہانی کے فنی دروبست اجازت دیتے تو ابوالفضل'' حاجی میاں'' سے منسوب اطوار کو سردار علی شاہ سے بھی بہ تفصیل وابستہ کر سکتے تھے، لیکن ظاہر ہے کہ انھوں نے ایسا نہیں کیا، تاکہ کہانی کا آغاز پُرکشش بن سکے۔ یہ کشش قاری کو جلد از جلد مرکزی خیال تک لے جا سکے اور کہانی میں ایک ایسا مکمل کردار شامل کیا جا سکے جو'' سات مرتبہ حج بیت اللہ اور اُنچاس دفعہ سنگِ اسود چومنے کی سعادت'' (ص 245) حاصل کر

چکا ہو، جو ''حرام کو حلال کرنے کی شرعی ترکیبوں'' (ص 260) سے واقف ہو اور جسے ''متوسمر تیوں کا اختراع کیا ہوا'' (ص 254) سبق بھی یاد ہو۔

بندہ علی کی گرفتاری کا واقعہ جتنے ڈرامائی انداز میں پیش آیا، یعنی ابوالفضل نے ڈرامائی انداز میں رقم کیا، اتنی ہی جلدی اختتام پذیر بھی ہو گیا، یعنی ایک تفصیل نگار نے اختصار برتنا چاہا تو پورا واقعہ بہ مشکل پونے چار صفحات میں آغاز سے انجام تک رقم کر دیا۔

یہ واقعہ ایک مختصر پل جیسا ہے جو کہانی کو ایک سے دوسری نوعیت میں لے جا رہا ہے، مرکزی کردار کو ایک سے دوسرے رویے میں پہنچا رہا ہے اور ددھیال و ننھیال کے اعزا سے کلی انقطاع کے بعد بندہ علی کو ایک ایسے کردار ''حاجی میاں'' سے ہم رشتہ کر رہا ہے جو اسے ایک نئے رویے کی زمین پر قدم جمانے کے لیے قوت عطا کرے گا، تربیت دے گا، اور ایک آہنی کمک بھی مہیا کرے گا۔ حاجی میاں کے یہ اقدام کہانی کے آئندہ اجزا میں بیان ہوں گے۔ درج ذیل اقتباس میں ابوالفضل نے بس اتنا اشارہ دیا ہے کہ بندہ علی نے اپنے اوپر آیا الزام دھونے کے لیے جو اقدامات کیے وہ ''حاجی میاں کی رہنمائی میں۔''

24

بندہ علی کو اس (مولازادوں کی اڑائی ہوئی) افواہ کی چراند تو سوئم سے ایک روز قبل دفن کے دوسرے ہی روز سنگھائی پڑ گئی تھی اور وہ سوئم کا مرحلہ طے ہو جانے کے بعد سدِباب اور ازالے کے متعلق سوچ ہی رہا تھا، لیکن یہ اُدھر پولیس کے کان تک بھی پہنچ گئی۔ جیل کی حوالات میں اس کے پیروکار اور وکیل اس سے اطمینان کے ساتھ باضابطہ اور ضرورت پڑے تو جیل کے اہلکاروں کے زر خرید تعاون کے ذریعے بے ضابطہ طور پر نجی رابطہ قائم کیے رہے۔ بندہ علی کو ان کے ذریعے حالات کا علم ہوتا رہا اور جیل کے اندر سے وہ ہدایتیں اور رہنمائی کرتا رہا، اور اس کو بڑی حیرت اس بات پر ہوئی کہ اس کے ننھیالی قرابت دار چمار اس کیس کے سب سے اہم گواہ بنے ہوئے ہیں اور پولیس انھی کے ذریعے وہ زہر فراہم ہونے کا ثبوت تراش رہی ہے جس سے مولا علی کا قتل ہوا، اور یہی ثبوت مقدمے کی سب سے زیادہ اہم اور مضبوط شق تھی؛ بقیہ مولازادے، ددھیالی بنی عمام، تو زیادہ سے زیادہ قیاسی گواہ

Scanned with CamScanner

ہو سکتے تھے۔ اب پولیس، بندہ علی اور اس کے پیروکاروں وکیل وغیرہ سب کی نگاہیں کیمیکل اگزامنر کی رپورٹ کی بے چینی سے منتظر تھیں جس پر بہت کچھ دارومدار تھا۔ اس نوعیت کے کیس ڈھول کے پھندے ہوتے ہیں اور پہلا فلوک جو پولیس لگاتی ہے، وہ خود شسے میں گرفتار ہوتی ہے۔ قانون اس سے زیادہ کر بھی نہ سکتا تھا کہ سرِ محفل بندہ علی کو ہتھکڑی چڑھا کر پولیس لے گئی اور حوالات میں بند کر دیا، اور دوسرا اقدام مولا علی کی سڑی لاش اکھڑوا دینا تھا۔ مگر شروع سے آخر تک، پانچ ہفتے کی مدت میں، سب کچھ مفت کی چراند اور سڑاند ثابت ہوا۔ پہلے تو سببِ موت زہر خورانی ثابت کرنا تھا، پھر قیاسی شہادت کی چولیس بھڑا کر عدالت میں اس کا مرتکب بندہ علی کو ثابت کرنا تھا۔

حاجی میاں کی رہنمائی میں بندہ علی کے قانونی مشیروں اور نجی پیروکاروں نے پولیس کے فلوک کے جواب میں فلوک لگایا اور کیمیکل اگزامنر کی رپورٹ پر کیس کا انحصار کر دیا، اور یہ فلوک تیر بہدف پڑا۔ کیمیکل اگزامنر نے سببِ موت ہیضہ قرار دیا جس کے جراثیم متوفی کے پیٹ کے مواد میں پائے گئے، اور ایک مہینے سوا مہینے کے اندر ہی اندر بندہ علی یہاں سے لے کر وہاں تک تھانہ، عدالت العالیہ اور تراحم خسروانہ کی تمام منازل ایک جست میں طے کر کے مونچھیں اینٹھتا، بے لاگ اور بے داغ، چھوٹ کر گھر آ گیا۔ (ص 248 تا 249)

❁

بندہ علی نے مرحوم چھوٹے بھائی کی فاتحہ بڑی دھوم دھام سے کی کیونکہ اس کے لیے تو یہ "دو چندسہ چند تقریب تھی۔" (صفحہ 250) یعنی خاندانی روایت پر عمل، ایک بڑی ملکیت کی توریث اور قتل کے مقدمے سے برایت — یعنی وراثت کے دریا میں پڑنے والے حادثاتی پھیر کا مکمل اندمال۔

25

خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔ چھوٹے بھائی کا ماتم بڑھانے میں بڑے بھائی نے بہت ہی جھوم جھوم کر اقدام کیا۔ ایسی خیراتیں، ایسی دعوتیں، مختلف نوعیت کے مہمانوں اور دوستوں کے میلے — بس ناچ گانے اور شہنائی کے علاوہ بڑی سے بڑی تقریب میں جو کچھ ہوا کرتا ہے وہ سب ہوا؛ اور ان کی جگہ بھی

بڑی بڑی خوش الحان قرائتیں گونجا کیں۔ معمولی حیثیت کے لوگوں میں بھی چہلم کی فاتحہ میں دو روز لگ جاتے ہیں، اور بندہ علی نے تو پورے دس روز منایا، اور مولا علی کی موت سے ٹھیک چالیسویں دن وہی کڑی بندش والی اپنے بزرگوں کی پگڑی سجا کر اور وہی عبا چغا پہن کر قل میں بیٹھا جو سوئم کے روز حاجی میاں پہنا گئے تھے... (ص 250 تا 251)

❁

یعنی — پگڑی، عبا اور چغے کو لگے حاجی میاں کے ہاتھوں کا لمس اس نئے بندہ علی کو سر سے پاؤں تک چھو رہا ہے۔ تن بدن کے بعد بندہ علی کے ذہن پر حاجی میاں کے اثرات اور ان کی زبانی بندہ علی کو ملنے والے ابتدائی، بنیادی اسباق وغیرہ کا بیان ابوالفضل نے اس طرح شروع کیا ہے:

26

حاجی میاں، جو علاقے کے ان درمیانی حیثیت کے سیّد زمینداروں میں زمینداروں کے رقبے اور اپنے زہد و اتقا کی وجہ سے سب میں ممتاز تھے اور چھوٹے بڑے سادات کے سب جتھے ان کا لحاظ داد پاس کرتے تھے اور پٹھان روسا آلِ رسولؐ اور نسلِ فاطمہؓ ہونے کے گہرے احساسِ عقیدت کے زیر اثر بہت ہی جھک کر سامنے آتے تھے اور غلامی پر فخر محسوس کرتے تھے؛ پھر سونے پر سہا گہ، برابر کے سادات میں بھی حاجی میاں چمکتے تھے، یہ ان کی خداداد عقل و دانش تھی۔ تمام طبقے کے پُرخلوص مشیر خیال کیے جاتے تھے اور بندہ علی ان کا بڑا اکرم محسوس کر رہا تھا کہ باوجود خالص سیّد النسل ہونے کے مجھ چماری زادہ ننگِ سادات کے سربراہوں کی خاندانی توریث کی پگڑی اپنے ہاتھ سے سجا کر وارث ہونے کا اعلان کیا اور پیشانی پر مخصوص آیت قرآنی دم کر کے چمار کا دھبا مٹایا اور اپنے ہاتھ سے سادات کی مہر ثبت کی، چہلم کے دعوت نامے پر بھی ہم چشموں نے شرکت کی۔ حاجی میاں سب سے پہلے تشریف لائے اور مجمع چھٹ جانے کے دو تین روز بعد تک تشریف فرما رہے، اور اسی دوران میں ملوکیت کے تمام کامیاب راستوں کی نشان دہی کر گئے، جو ازلی مادرزاد غلام رئیس زادے کے دماغ میں پہلے سے تھے ہی، صرف اک جرأتِ رندانہ کے ساتھ قدم اٹھانے کا مسئلہ تھا، اور راستہ ہموار و چکنا اور سیدھا تھا کہ ہر منزل، جس کی بھی جانب رخ کر کے اک ذرا باگ اٹھا دو، زیرِ قدم تھی۔

Scanned with CamScanner

حاجی میاں نے بتایا کہ ظلم کے پیٹ سے احسان کھینچا جاتا ہے۔ ''دنیا ایک متھا ہے، ایک گنا ہے، جتنا دباؤ گے اتنا ہی میٹھا میٹھا رس نکلے گا،'' اور یہ موٹو تو وہ اپنے باپ دادا کے وقت سے سنتا دیکھتا چلا آیا تھا کہ ''ہمارے یہاں آؤ گے تو کیا لاؤ گے؟ ہمیں اپنے یہاں بلاؤ گے تو کیا کھلاؤ گے؟'' ''عورت مرد کی غذا ہے،'' وغیرہ وغیرہ۔ منوسمریتوں کا اختراع کیا ہوا، برہمن وراجپوتی سبق کا پورا آموختہ یاد کرا دیا، جو اس کے ماحول میں کوئی چیز نہ تھا، مگر اس کے اندر والا محض اس ڈر سے کہ کہیں میری چھاپ عریاں نہ ہو جائے، اس کو اس کے عملی مظاہرے سے روکے ہوئے تھا۔ لیکن کلجگ کی نشانیوں میں کبھی کبھی یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ شودر کے گدلے متعفن نابدان کو جوش آتا ہے تو گنگا جمنا اور برہم پتر کے سب سیلابوں سے اونچا نکل جاتا ہے اور جل پتری کا سماں دنیا کے سامنے آجاتا ہے۔ حاجی میاں اور ان کی قطار کے چند اور بزرگوں نے کوئی نئی بات تو بتائی نہیں، معلوم باتیں کہی اور سنی ہوئی سنائیں، اور دیکھی بھالی بتائیں، مگر جیسے اس کا دماغ بھق سے ہو گیا، چودھسوں طبق روشن ہو گئے۔ اندر والے چمار نے کسی کونے کھدرے انگڑائی لی اور سید پر بھی چڑھ گیا۔ (ص 253 تا 255)

❁

بندہ علی میں اس انگڑائی کے وسیلے سے ابوالفضل صدیقی غالباً یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ چھوٹے بھائی کی موت کے بعد حاصل شدہ قوتوں کے باوجود بندہ علی نے انکسار و اخوت کا جو پُرخیر راستہ اختیار کیا تھا وہ اُس کے سادہ لوح ددھیال و ننھیال والوں کی نفسیاتی کجی کے باعث مڑتے مڑتے اب ایسی سمت میں چلا گیا ہے جہاں خیر معدوم اور شر حاوی ہونے والا ہے۔

کہانی میں جہاں جہاں بندہ علی کی ننھیال یا ددھیال والوں کا ذکر آیا ہے، وہاں ابوالفضل نے اُس طبقاتی نظام کے کسی نہ کسی پہلو کو لازماً طنز کا ہدف بنایا ہے جس نے ان آدم زادوں کو خطِ آدمیت سے نیچے، بہت نیچے، زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا ہے۔

ابوالفضل صدیقی کا یہ عمل، جو کبھی کبھی کہانی کے فطری بہاؤ میں رکاوٹ بھی بنا ہے، قاری کو باور کراتا ہے کہ یہ طبقاتی نظام اپنی زد میں آئے ہوئے آدم زادوں پر احساسِ کمتری کی اتنی تہیں چڑھا چکا ہے کہ وہ اس کمترین حالت ہی کو اپنی اصلیت تصور کرنے لگے ہیں۔ ان تہوں کو شق کرنے والا کوئی (اتفاقی) امکان پیدا ہوتا ہے تو وہ اُسے بہ وجوہ استعمال نہیں کر پاتے۔ نتیجتاً ہر غیر مستعمل امکان ان

Scanned with CamScanner

تہوں پر ایک تہہ اور بن جاتا ہے۔

جس طرح مولازادے اپنے احساسِ کمتری کے باعث نہ سمجھ پائے کہ بندہ علی کا رویہ ان کی سربلندی کا ایک امکان ہے، اسی طرح ابوالفضل صدیقی کی کہانی ''انصاف'' کا ڈتی نامی کردار بھی ایک (اتفاقی) امکان کو اپنی کمتری ختم کرنے کا وسیلہ نہ بنا سکا۔

ابوالفضل صدیقی کی تین طویل کہانیوں کے مجموعے انصاف میں شامل کہانی ''انصاف'' کا یہ کردار چودھری شہباز خاں نامی زمیندار کے اُس گھوڑے کا سائیس ہے جو ''بال بھنوری کی ارفع اور مبارک مانی ہوئی روایات پر نہ صرف سولہ آنے پورا اترتا ہوا بلکہ ایک سے ایک سعد نشانی سے مزین'' (ص 102) ہے۔

موسمِ گرما کی ایک دوپہر، ڈتی اصطبل کے کام سے نمٹ کر گھر واپس جا رہا تھا تو اس کا گزر ایک زیرِ تعمیر مکان کے قریب سے ہوا۔

27

... کھدائی کرنے والے مزدور تقریباً نصف گہرائی تک بنیادوں کی کھائیاں کھود کر چلے گئے تھے اور جاتے وقت انھیں پانی سے لبریز کر گئے تھے تاکہ بعد دوپہر جو کام جوڑیں تو زمین پانی جذب کر چکی ہو اور کھدائی میں آسانی ہو۔ ڈتی چمار تیز تیز قدم اٹھاتے، ایک لمبی بنیاد کے کنارے کنارے چلتے رہے۔ خلاف معمول اس بنیاد کا تمام پانی ایک مخصوص جگہ پر جمع ہو کر جذب ہو چکا تھا اور اس جگہ پر ایک بڑی کڑھائی کے قطر کے برابر زمین شق ہو گئی تھی۔ یوں تو ڈتی چمار کے پاؤں یہاں متحرک تھے لیکن ان کا دماغ گھر کی رسوئی میں گرم گرم مسّی کی روٹیوں کے گرد گھوم رہا تھا۔ تاہم نگاہ جا پڑی تو غیر معمولی امر پر تجسس سا ہوا۔ ٹھٹکے اور غور سے دیکھا۔ مٹی اور پانی کے مزاج کے محرم تھے اور یہ منافی سی بات تھی کہ بغیر کسی غیر معمولی وجہ کے یہ صورت رونما ہو۔ یہاں پر کبھی کوئی درخت تھا جو اوپر سے کاٹ لیا اور جس کی جڑ کا ٹھونٹھ زمین کے اندر باقی رہ گیا ہو؟ نہیں کبھی نہیں، یہاں پر نہ درخت تھا نہ کبھی کسی نے کاٹا۔ پینتیس سال کی ان کی یادیں اس ماحول سے وابستہ تھیں اور نہ معلوم کتنی پشتیں انھیں اس ماحول میں بیت گئی تھیں۔ وہ ٹھہر گئے اور کھائی کے اندر اتر گئے۔ پاؤں سے اس شق حلقے کی گیلی مٹی کو

Scanned with CamScanner

دبایا تو امید کے مطابق نیچے سے خالی ہونے کا اندازہ ہوا۔ اِدھر اُدھر نگاہ جو کی تو قریب ہی ایک پھاوڑا پڑا نظر آ گیا۔ اٹھا کر ایک ہاتھ جو مارا تو پہلی ہی ضرب میں جھنکار ہوئی، کسی دھات کی چیز سے ٹکرایا۔ مٹی کا بھاری لوندا پھاوڑے پر اٹھا کر جو پھینکا تو یہ موٹا کڑا نظر آیا اور ایک دو تین چار پانچ پھاوڑے گیلی مٹی ہٹانے کے بعد ایک عجیب ساخت کا برتن نظر آیا جس کے ڈھکنے پر کڑا لگا ہوا تھا اور برتن کی ساخت سے اندازہ ہو گیا کہ یہ چیز نہ گھنسام تیلی کی ہے، نہ مزدوروں معماروں کی، بلکہ کھدائی کے بعد پانی پڑنے سے ٹیلے کے اندر سے برآمد ہوئی ہے۔ وسوسے دماغ میں گھر کرنے لگے، جیسے کسی چور کے ہاتھ میں بلا ارادہ کوئی مال آ پڑے۔

ڈلّی چمار نے گھبرا کر ماحول کا جائزہ لیا۔ ایک جانب خاموش بستی تھی، دوسری جانب سنسان پڑے ہوئے، سنگلاخ کھیتوں کا تاحدِ نگاہ سلسلہ، جس پر دھوپ میں گیس کی دیواریں سی چل رہی تھیں۔ کسی ذی روح کا نظر آنا تو درکنار، دور کی کوئی آواز کان میں نہ پڑی۔ انھوں نے ایک گہرا ہاتھ پھاوڑے کا مارا اور برتن کو جمی ہوئی تلی سے اکھیڑا اور کڑا پکڑ کر ہاتھ میں لٹکانے کی کوشش کی، لیکن اندازہ ہوا کہ برتن اپنی جسامت کے تناسب سے زیادہ وزنی ہے۔ اونٹ کی چوری نیورے نیورے، کیا کرتا، جب لٹکا کر لے جانا قوت سے باہر تھا تو مجبور اُسر پر جھاڑن کا اینڈوا بنا کر رکھا اور اس کے اوپر دھر لیا، اور دونوں ہاتھوں کا سہارا دیے چل پڑے۔ گاؤں کی مخصوص سنسان دوپہری میں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ کون کس جگہ سے کیا چیز اکھیڑ کر لے گیا، اور وہ گھبرانے لگے تھے۔

چماری آخری روٹی سینک رہی تھی۔ خلاف معمول بوجھ سر پر لیے، اور وہ بھی ایسا کیچڑ آلود حولق برتن اٹھائے دیکھ کر متحیر ہو گئی۔ روٹی چھوڑ کر مجسم سوال بنی دوڑی ہوئی قریب آئی، اتارنے میں سہارا دیا، اولتی کے نیچے رکھا۔ ڈلّی نے دھونے کے لیے پانی لانے کا اشارہ کیا۔ متحیر چماری پانی کا گھڑا لٹکا کر لے آئی اور گلے سے پانی ڈالنا شروع کیا۔ ڈلّی نے پانی کی موٹی دھار کے سہارے رگڑ رگڑ کیچڑ دھوئی تو خیر کڑا تو ظاہر تھا، مگر کڑے کے نیچے ڈھلواں ڈھکنا تھا۔ ٹھونک ٹھونک اور پیچ پیچ کر بڑی مشکل سے مخصوص طریقے سے جما ہوا ڈھکنا کھولا۔ پانچ ہزار سال کا تاریک اور سپاٹ ماوراء التاریخی ورق کھل کر بیچ بیچ سامنے آ گیا۔ چوکھونٹے گرد آلود ٹکڑے بھرے ہوئے تھے ایک ٹکڑا اٹھا کر رگڑ رگڑ کر دھویا اور کھرپی کے پھل سے کھرچا تو جگہ جگہ سے چمکدار سونا نظر آیا۔ ٹکڑوں کے نیچے راجہ اشوک کے

زمانے کے طلائی سکے بھرے ہوئے تھے۔ کل سونے کا وزن تولوں میں تو کیا، سیروں میں حساب کیا جاتا تو تیس پینتیس سیر سے کم نہ تھا۔ ڈلی چمار کا ماتھا تو برتن کی جسامت اور وزن کے عدم تناسب ہی سے ٹھنک گیا تھا، اور اب تو سب کچھ اندیشہ آنکھوں کے سامنے تو جیسے ہمالیہ پربت لڑھک کر آ پڑا۔ عورت پہلے تو سمجھی نہیں اور جب ڈلی نے لڑکھڑاتی ٹوٹی زبان میں بتایا کہ گھنسام تیلی کا جو مکان ٹیلے پر بن رہا ہے، اس کی بنیاد میں سے برآمد ہوا ہے اور سب کا سب سونا ہے، تو پہلے تو گھگھیا پڑی اور پھر ڈر سے مغلوب ہسٹیریائی سے انداز میں جیسے اپنی مخصوص آواز سے بالکل مختلف آواز میں بولی: "ہے ماتا! ہے لچھمی دیوی! تیری لیلا۔ دیا! دیا ماتا!" اور یہ آواز بھیانک چیخ کے تسلسل کی شکل اختیار کر گئی اور جب عورت پھر سنبھلی تو پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔....

اور لچھمی دیوی کا ٹھکانا تو ہر جگہ اونچی جاتی میں بھی نہیں ہے، اور یہ تو کچھ ویش ہی کے گھر میں سہاتی ہیں، اور شودر کے جھونپڑے میں تو کنچن کی چمک بجلی بن کر پڑا کرتی ہیں۔ منوشاستروں میں ویدوں کے اشلوک کانوں میں پڑنے پر پگھلا ہوا سیسہ بھرنے کا فتویٰ ہے اور سونے پر اگر شودر کی نگاہ بھی پڑ جائے تو آنکھوں میں گرم گرم سونے کی سلائیاں گھسیڑنے کا حکم ہے۔ صبح سے شام تک زیادہ سے زیادہ تیس چھٹانک موٹے اناج کا آٹا ہضم کر سکنے والا شودر تیس سیر سونے کا بار کیسے اٹھاتا۔ بوند بھر میں چھلک پڑنے والے ظرف پر بحرِ ہند کے طوفان پھٹ پڑے۔ یہ تو وہ بوجھ تھا کہ معاشرے کے معاشرے اور قومیں کی قومیں اور تاریخ کے کتنے ہی بھرے پُرے دفتر بلا ڈکار ہضم کر جانے والے پنڈت جی کے سامنے آ جاتا تو ان کا پیٹ بھی پھٹنے لگتا۔ تاہم ڈلی چمار اور شودروں سے مختلف تھے؛ انھیں چودھری کی قربت کی سعادت نصیب تھی۔ روزانہ گھوڑے کی لید پیشاب بٹور کر، گھاس کا گٹھا کھرپی رکھ کر، ہری بانات کی وردی بھی پہنتے اور چھوٹے چودھری کی پیٹھ سے فٹ بھر کے فاصلے پر ٹم ٹم کے پیچھے کھڑے ہو کر گاڑی کی گھنٹی کے ساتھ سامنے چلنے والی سواریوں کو ڈانٹتے بھی جاتے۔ انھوں نے جیسے دم توڑتے سنبھالا، ہمت کر کے چپکے سے چماری کو جھڑک کر چپ کیا اور سونے کی چٹان کے تلے سے یہ سُنڈا بلبلا کر نکلا۔ خواص کے ساتھ اعصاب بھی مجتمع ہوئے۔ اس سنہرے خواب کو سمجھنے کی اور اپنی فکر و استعداد کے مطابق تعبیر لینے کی بھی کوشش کی اور اس کا داغ داغ خستہ شکستہ وجود چمار کے خول میں سے افتاں خیزاں کیسے ہی نہ کیسے نکل کر باہر آیا اور ویش کا الٹا سیدھا

Scanned with CamScanner

بہروپ بھرا، جلدی سے کوٹھرے کا ایک کونا کھودا اور برتن اٹھا کر اس میں دفن کر دیا اور دو ہزار سال قبل مسیح کا دفینہ بیسویں صدی عیسوی کے سورج کی ایک کرن دیکھ کر پھر سربستہ راز بن گیا۔ مگر اس کے پہلے کتنے مالک تو صورِ اسرافیل کے منتظر، نہ معلوم کہاں کہاں دفن ہوں گے، البتہ آج کا مالک تو جیسے اس کے ساتھ اسی کونے میں ہی دفن ہو گیا۔ اوڑدی بظاہر بیٹھے تھے مگر دراصل وہ چار فٹ نیچے زیرِ زمین سفر کر رہے تھے اور شور و ویش ان کے اندر کشتی لڑ رہے تھے۔ وہ صبح کے راتب میں وہی لقمے کھائے ہوئے تھے، مگر حالت اتنی غیر تھی کہ بھوک تو بھوک، اس چلچلاتی دوپہری میں من بھر بوجھ لاد کر لانے اور چار چھ انچ فیٹ گہرا گڑھا کھودنے کے باوجود بدنصیب کو پیاس بھی نہ لگی تھی۔ گڑھا پاٹ کر برتن دفن کر کے اور اس کو اچھی طرح لیپ پوت کر برابر کرنے کے بعد غیر اختیاری طور پر اس کا ہاتھ کمر پر گیا، تمباکو کی لٹکتی ہوئی تھیلی نکالی اور چلم پر تمباکو جمائی، چولھے میں سے کرید کرید کر اُپلے کی آگ کے انگارے دھودھو کر اور توڑ توڑ کر چلم بھری اور کوٹھرے اور سائبان کے درمیانی دروازے پر چوکھٹ کی ٹیک لگا کر آ بیٹھے۔ نگاہ اس کونے پر مرکوز ہو گئی۔ دوسرے تیسرے گہرے زوردار کش میں جب چلم کی آگ میں سے بالشت بھر لو اٹھی تو احساس ہوا کہ ارے وہ چلم پی رہا تھا۔ گھبرا کر ماحول کا جائزہ لیا اور پھر وہیں پر چلم الٹ کر نئی تمباکو جمائی اور وہی آگ وہیں سے بٹور کر پھر رکھ لی اور پھر لمبے لمبے کش اور تیسرے چوتھے ہی کش میں پھر بالشت بھر لو کے ساتھ چلم کی ساری تمباکو سونت گیا۔ اسی طرح تیسری اور چوتھی چلم پر وقت کا احساس ہوا۔ ماحول کا جائزہ لیا۔ چماری ایک جھلونگا چارپائی پر پوٹ سی پڑی ہوئی، جیسے دردِزہ میں کراہ رہی تھی۔ مختصر سے صحن میں ایک کونے میں کھڑے ہوئے بیر کے درخت کے سائے نے وقت کا احساس دلایا۔ چھوٹے چودھری کے لینے کے لیے ٹم ٹم کچہری لے جانا ہے، اور اس کو ہوش سا آیا اور معاملے کی سنگینیت اور شدت کا کچھ کچھ نمایاں احساس ہوا تو گردن سے لے کر کمر کے زیریں حصے تک جیسے برف کی سلائی دوڑتی چلی گئی۔ تمام وجود تھرّا اٹھا اور معدے بلکہ سینے کے زیریں حصے سے زیرِ ناف تک لہریں اٹھیں اور اترتی چلی گئیں، جیسے پیٹ کا تمام نظام ساتھ چھوڑنے کی حد تک ڈھیلا پڑ گیا۔ بمشکل افتاں و خیزاں گھر سے لپک کر بنجر پر کھڑی ہوئی جھاڑیوں میں پہنچ سکا۔ رفعِ حاجت کے لیے بیٹھا تو محسوس ہوا کہ سلسلہ لامتناہی ہو رہا ہے۔ کیسے ہی نہ کیسے فارغ ہو کر چلا مگر الٹے پاؤں پلٹ جانا پڑا، پھر وہی لہریں پہلے سے زیادہ ہو رہی تھیں۔ اب کی مرتبہ سینے

کے بالائی حصے سے نیچے رانوں تک سنسناتی نیچے اتر رہی تھیں، جیسے اس کے بدن کا سامنے والا حصہ جسم سے علیحدہ ایک بے جان ڈھیلی مردار کھال کی تھیلی ہے، اور اب کی مرتبہ ٹھیک سے جھاڑیوں تک بھی نہ پہنچ پایا راستے ہی میں بیٹھ کر جانا پڑا، رقت فزوں تر تھی اور بیٹھا تو جیسے تسلسل کے سبب کمبخت کو اٹھنے کی گنجائش ہی نہ تھی، گویا آج تمام جسم کی رطوبت اسی طرح بہہ جائے گی۔ اور ایک سانس بھی اچھی طرح سکون نہ ہو پاتا تھا، کہ اک ذرا اٹھنے کا ارادہ کرتے ہی دوسری لہریں پھر چل پڑیں مگر کیسے ہی نہ کیسے طبیعت پر قابو پایا، قریب کے گڑھے میں بھرے ہوئے پانی سے اُلٹا سیدھا آبدست لے کر چلا گیا، لڑھکتا اور گرتا پڑتا گھر میں داخل ہوا۔ بڑے زور سے پیاس چمک اٹھی تھی، پوری ایک لٹیا گھڑے میں بھر کر چڑھا گیا۔ کچھ توجہ ہی اور طبیعت کو سنبھال کر اصطبل کو روانہ ہو گیا، جیسے کوئی بے جان مشین۔ جلدی جلدی گھوڑے پر برش پھیرا اور گاڑی میں لگا کر کچہری سے چھوٹے چودھری کو لوا لایا۔ اس کے بعد اصطبل میں اپنے تمام مقررہ کام معمول کے مطابق انجام دیے۔ چراغوں تلے گھوڑے کے نیچے پوال بچھایا اور توبڑا چڑھایا اور جب گھوڑے نے دانہ کھالیا تو توبڑا اتار کر چلا آیا۔ اس وقت عمداً اس نے اپنے راستے کو چھوڑ دیا، جیسے کوئی مقروض قرض دار کا یا مجرم محتسب کا سامنا بچا کر راستہ چلتا ہے، اور کافی چکر کاٹ کر دوسری جانب ہو کر گھر پہنچا۔ گھر کے قریب پہنچ کر اس کے قدم چوروں کی طرح پڑنے لگے اور معمول سے زیادہ ہی دبے پاؤں گھر میں داخل ہوا۔ صحن میں بیری کی شاخوں میں سے چھن چھن کر پڑتی ہوئی متحرک چاندنی، جیسے چڑیلیں سی ناچ رہی تھیں۔ متوحش چماری اولتی کے نیچے دہلیز پر ٹاٹ بچھائے ڈھیر سی پڑی تھی۔ اندر نگاہ ڈالی تو جیسے کوئی آسیب زدہ مکان، چماری نے نہ روٹی پکائی تھی دونوں میں سے نہ کسی کو ضرورت ہی تھی؛ دوپہر کی ویسی ہی پڑی تھی۔ متوقع اور پہچانی ہوئی آہٹ پر چماری چونک پڑی۔ جیسے ملیریا کا بخار اترنے کے بعد کی حالت جیسی کوئی صورت۔ اٹھ کر گرتی پڑتی صحن میں پڑے ہوئے پیڑھے پر آ بیٹھی۔ ایک پیڑھی کھسکا کر ڈتی بھی گنہگار، چور ڈاکو سے بنے، قریب کو بیٹھ گئے۔ دونوں میں سے کسی کی ہمت نے آغاز کلام کا یارا نہ دیا۔ دو تین منٹ یوں ہی بیٹھے رہے، البتہ اس دوران میں کئی بار گردن اٹھا اٹھا کر غیر اختیاری طور پر کوٹھرے کے دروازے پر نگاہ پڑتی رہی اندھیرے میں شاید چمار کے اندر سے کوئی مبہم خوف اُبھرا، ذرا حلق صاف کر کے ایک آواز سی نکالی اور جیسے وہ نہیں کوئی اور بولا: ''اری آج دیا نہیں بارا؟

ایں۔'' چماری اس کے حکم پر ہونکاراسی دیتی اٹھی۔ چھپّر میں سے مٹھ بھر پھونس سونتا، چولھے پر جا کر بھوبل میں دبی ہوئی اُپلے کی آگ نکالی اور پھونس رکھ کر پھونکیں ماریں اور پھونس جل اٹھا، روشنی کے سہارے طاق میں رکھا ہوا چراغ اُٹھایا اور بتی کو آگ دکھائی، اور چراغ روشن ہونے پر محسوسات بدلے۔ اب ایک دوسری نوعیت کا خوف سینے سے نکل نکل کر اردگرد تیرنے لگا، جیسے وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے ڈر رہے تھے۔ نہ عورت نے ہی کہا اور نہ ڈلّی ہی نے کھانے کو مانگا۔ اپنے اپنے بچھونوں پر پڑے رہے۔ دونوں کو اپنے اپنے محسوسات کے مطابق اُچھلوں ڈوبوں، کابوس سی نیندیں آئیں۔ عورت پر ہسٹریائی انداز کا دوسرا رخ طاری رہا، جیسے مستان نے دبوچ رکھا ہو، اور ڈلّی کو کسی کسی وقت نامعلوم خوف اس کو اس حد تک لے کر پہنچ گیا کہ جی چاہا کہ اس وبال کو کونے میں سے کھود کر گھر سے نکال باہر کروں اور پچھواڑے والی جوہڑ میں پھینک آؤں۔ بارے خدا خدا کر کے پو پھٹی اور کوّوں کی پہلی آواز پر بستر چھوڑ کر اصطبل کی جانب جیسے رہزنی سی مار کر بھاگ پڑا۔ کیونکہ اس کو خوف ہوا کہ پیٹ میں پھر لہریں اُٹھ رہی ہیں، مبادا کہیں کل کی طرح پھر دست نہ جاری ہو جائیں اور خیال بانٹنے میں ہی عافیت جانی۔۔۔ (ص 108 تا 116)

❄

ڈلّی اور اس کی بیوی کا یہ نفسیاتی احوال ابوالفضل صدیقی نے اپنے خاص طنزیہ اسلوب میں بیان کیا ہے۔ اسلوب کا پردہ ہٹائیں تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ یہ احوال مصنف کی گہری انسانی ہمدردی پر مبنی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ طبقاتی نظام کے اسیر افراد — ڈلّی، اس کی بیوی اور بندہ علی کی دوھیال ونھیال والے — ہر اُس امکان کو بروئے کار لائیں جو اس چنگل کے خاتمے کا سبب ہو سکتا ہے۔

کہانی ''انصاف'' کے آئندہ اجزا میں مصنف نے بتایا ہے کہ ڈلّی نے دفینے کا کچھ سونا چوری چھپے فروخت کیا اور حاصل شدہ رقم کو گیہوں کی روٹی، پوری کچوری اور گلگلے پکوانے پر صرف کرنے لگا۔ ڈلّی کے اس عمل کو ابوالفضل اس کی خفیف سی جرأت باور کرانا چاہتے ہیں جس کا سبب ان کے نزدیک یہ ہے کہ ''۔۔۔ ڈلّی چمار اور شودروں سے مختلف تھے۔ انھیں چودھری کی قرب کی سعادت نصیب تھی۔۔۔'' (اقتباس: 27) اور:

28

وہ روزانہ سبز بانات کے بہت سے گول گول چمکدار بٹن اور لال لال فیتے لگی وردی پہن کر، سر پر لیس کا چوڑا پھا لگی نیچی بندش کی پگڑی سجا کر اور کمر سے چمڑے کی پیٹی کس کر چھوٹے چودھری کے پیچھے کھڑے ہو کر کچہری جایا کرتے، اور پگڑی پر چمکدار پیتل کا کٹا ہوا چھوٹے چودھری کے نام کا بیج بھی دور سے چمکتا ہوتا، جو ڈتی کے رعب پر چار چاند لگا دیتا۔ وہ اونچے پہیوں والی خوبصورت ولایتی ٹمٹم کے پیچھے لگے ہوئے سائیس کے فٹ بورڈ کے اوپر چھوٹے چودھری کی پیٹھ سے اٹھارہ انچ کے فاصلے پر سینہ تان کر کھڑے ہوتے اور آٹھوں گانٹھ کمیت، خوبصورت چال چلنے والا گھوڑا، تیکھے تیوروں اور گردن کے متکبرانہ خم کے ساتھ اینڈ اینڈ کر چلتا ہوا، وجیہہ مالک اپنے ہاتھوں میں راسیں لیے گدی پر بیٹھا ہوتا۔ زرق برق سائیس پیچھے کھڑا چتر بردار کی طرح چمکتا ہوا۔ ہلکی سبک رفتار ٹمٹم مضافات سے شہر جاتی ہوئی سڑک پر گزرتی تو رعب اور حسن اور طاقت کا امتزاج دیکھنے کے لیے لوگ ٹھٹک جاتے، سلام کرتے۔ کانوں میں تیر کی طرح گھسنے والی گھنٹی کی آواز سے اگر سڑک خالی نہ ہوتی اور سامنے والی سواری بچنے میں ذرا سستی دکھلاتی تو ڈتی کی ڈپٹتی ہوئی آواز گونجتی: ''دبے رہو! بچے رہو!'' اس وقت ڈتی کے بھی ہونٹوں اور گردن میں مخصوص خم نظر آتا۔ چھوٹے چودھری اجلاس کے دروازے پر پہنچتے تو سامنے کھڑا ہوا تعینات پولیس انسپکٹر قاعدے کے مطابق کھٹ سے سلیوٹ دیتا، جو چھوٹے چودھری کو تو غالباً نظر بھی نہ آتا مگر ڈتی کے رگ وپے میں اس کے بھاری بوٹ کی آواز اتر جاتی، اور پھر اوپر کو اٹھ کر آنکھوں میں سرور آ جاتا۔ سینہ پھلا کر ذرا گردن ٹیڑھی ہو جاتی۔ ٹمٹم موڑتے ہوئے وہ پولیس والے کی جانب گہری نگاہ ڈالتے اور پولیس والا اک ذرا مانوس تیوروں سے اپنے حاکم کے سائیس کی جانب دیکھتا، اور ڈتی جیسے اپنے آپ کو حکومت میں شریک ہی محسوس کرتے اور اصطبل تک خالی ٹمٹم لیے ہلکے سرور میں واپس آتے۔ ... (ص 103 تا 104)

❋

ڈتی کو روزانہ کچھ دیر کے لیے میسر پُر وقار وردی، پگڑی پر چودھری کے نام کا بیج، چودھری کی پیٹھ سے قربت، سامنے والی سواری سے ''دبے رہو'' کہنا، پولیس والے کے مانوس تیور اور انتہا یہ کہ

Scanned with CamScanner

اپنے آپ کو حکومت میں شریک ہی محسوس کرنا — جسے ابوالفضل نے ایک صفحے اور پونے دو سطروں میں بیان کیا ہے — بھلے ہی کچھ دیر کے لیے ہوتا ہو، مگر یہ ہر روز کی کایا کلپ، ڈی پر بالواسطہ طور سے یوں اثر انداز ہوئی کہ ان پر طاری نسلی احساسِ کمتری کی تہوں میں کہیں خود اعتمادی کی ایک خفیف سی کرن کلبلا اٹھی جس کے طفیل میں ان کے چوکے چولھے نے اعلیٰ ذات والوں جیسے چکنے چپڑے کھانوں کا منھ دیکھا۔ ڈی نے بیماری کے بہانے گھر بیٹھ کر جسمانی آرام حاصل کیا اور جب متعدد وجوہ کی بنا پر چودھری شہباز خاں کو شبہ ہوا اور ڈی سے اس کے خوشحالی کے اسباب باتوں باتوں میں اُگلوانے چاہے تو ڈی نے اپنے وجود سے برتر ہوشیاری برتتے ہوئے ایسا کوئی جواب نہیں دیا جو چودھری کو چھپّر میں گڑے دفینے تک پہنچا سکتا۔

لیکن جب متعدد ذرائع سے چودھری اور علاقے کی پولیس کو ڈی کی تحویل میں پرانے سونے کے زیور اور ٹکڑے ہونے کا یقین حاصل ہو گیا تو پولیس نے ڈی کے گھر پر چھاپہ مارا۔ وہ اس وقت گھر میں موجود نہ تھا۔

29

... لل ٹگی پولیس کی جماعت کو دیکھ کر چماری گھگھیا پڑی اور پھر گھگھیائی آواز کا خائف، ہسٹریائی انداز ہو گیا۔ جیسے اختیاری طور پر چھپّر سے باہر آ گئی اور صحن میں بیری کی جڑ سے لپٹ گئی۔ گلا کٹتی ہوئی بکری کی آواز جیسے چھری کی دھار کے نیچے سے بلند ہوتی ہے۔ چمار کے گھر کی کائنات کیا، چند منٹ میں کانسٹبلوں نے پورا گھر روئی کی طرح دُھنک کر رکھ دیا۔ چند سانسیں سب نے ایک ذرا سوالیہ سی لیں، اور دوسرا اقدام شروع ہوا۔ ہیڈ کانسٹبل نے اپنی ڈانڈ اُلٹی ٹیک کر اس کی گول موٹھ سے جگہ جگہ کا فرش دھم دھمانا شروع کر دیا۔ سب متوجہ ہو گئے اور سب سے زیادہ چماری۔ اس کی وہ آواز بدل گئی، ہسٹریائی انداز شدید ہو گیا، تشنج میں خائف بندریا جیسی حرکتیں کرنے لگی اور جیسے اس کرب سے چھٹکارا حاصل کرنے کا انداز پیدا ہوا۔ بیری کے تنے سے علیحدہ ہو گئی، بھیانک کراہتوں میں اندر رینگ گئی اور اس کونے میں پہنچ کر "ہے ماتا، ہے پچھی دیوی! دیا، دیا، دیا کرو،" اور پھر جنون کی حد تک پہنچے ہوئے ہسٹریائی انداز میں اس کونے کو لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

Scanned with CamScanner

ہیڈ کانسٹیبل ادھر زمین ٹھونکتا ہوا پہنچا تو اشارہ کر کر کے بتانے لگی" ہیاں ہیاں پچھی مائی ہیاں !..."
(ص 154 تا 155)

❄

ڈ تی کی بیوی کی یہ حالت غالباً اس وجہ سے ہوئی کہ اُسے تا حال کسی کا یا کلپ کا موقع میسر نہ آیا تھا، جبکہ ڈتی کو مدتوں بھلے ہی کچھ دیر کو سہی، مگر ہر روز، ایسا موقع حاصل رہا۔ حالانکہ ڈتی حاصل شدہ دفینے کی صورت میں پیدا امکان کو حقیقتاً بروے کار لا کر احساسِ کمتری سے کلّی رہائی کی راہ نہ نکال سکا مگر اس نے بیوی کے برعکس کچھ عرصہ ضرور خود اعتمادی کی کرن سے قوت حاصل کی۔ دفینے کی صورت میں پیدا شدہ امکان کو کلیتاً غیر مستعمل رکھنے والی اردھانگنی کے یکسر تاریک احساسِ کمتری نے ڈتی کو جیل کے اندھیرے میں دھکیل دیا اور وہ یقیناً احساسِ کمتری کی ایک اور دبیز تہہ میں دب کر" جھلونگا چارپائی پر پوٹ سی پڑی رہ گئی" ہو گی۔

کہانی " دھارا " کا ایک کردار مسمّی دھارا بھی ڈتی کا ہم ذات ہے۔ ڈتی میں خود اعتمادی کی کرن پیدا کرنے والی وجوہ چودھری سے قربت، ہر روز شاندار وردی اور کچہری جانے آنے کا سرور ہیں، لیکن " دھارا " میں ابوالفضل نے روشنی کے جو اسباب، نہایت سوچے انداز میں یکجا کیے ہیں وہ ان سے زیادہ پُرقوت اور معنی خیز ہیں:

" وہ جوان ہو کر بھی دو آنے یومیہ اور دو روٹی سے زیادہ ترقی نہ کر سکا تو گاؤں کے بڑے بوڑھوں کے سمجھانے کے باوجود شہر بھاگ گیا" (ص 10) اور کانپور کی ایک مل میں نوکری کرنے لگا۔ دھارا نے اپنی اور دیگر ملوں میں کام کرنے والوں کے مطالبات منوانے کے لیے ایجی ٹیشن (ص 12) کی راہ اختیار کی۔ " مزدوروں کے ایک بڑے جلوس کے آگے آگے ہڑتال" (ص 13) کے نعرے بلند کیے۔ " سر پھٹا ہوا، خون میں لت پت، ہتھکڑیاں پہنے ہوے، بہت سے پولیس کے جوانوں کے درمیان کشاں کشاں" (ص 13) جیل گیا۔ وہ 1938 کی اس انچاس روزہ ہڑتال کا ایک پیش رو بنا جس کی بنا پر مزدوروں نے اپنے مطالبات منوائے اور اس ربع صدی میں مزدوروں کا سب سے بڑا کارنامہ شمار ہوئی۔ (ص 13)

Scanned with CamScanner

کانپور کی برسرِ راہ ملاقات میں دھارا کو سنگھ بابو نے یہ تاثر دیا کہ جب وہ زراعتی کالج کی تعلیم پوری کر کے گاؤں لوٹیں گے تو دھارا کو ساتھ لے جائیں گے اور اپنی زمینوں کا مختارِکل مقرر کریں گے، یوں دھارا سے اپنی لڑکپن کی دوستی نبھائیں گے۔

گاؤں واپسی پر دھارا کے مشاہدے و فہم کے مظاہروں کے ذریعے ابوالفضل صدیقی اپنے قاری کو محسوس کراتے ہیں کہ ایک وسیع تر ماحول اور جمہور سے دردکا رشتہ کرتے ہوئے دھارا میں ڈتی سے کہیں زیادہ خود اعتمادی اور اس سے بھی کچھ بڑھ کر وہ روشنی قدم جما چکی ہے جو انفرادی شعور اور پھر اجتماعی شعور کو خفتگی سے رہا کرتی ہے۔ راجنی گاؤں میں محدود ڈتی کو میسّر آدھے پونے گھنٹے یومیہ کی کایا کلپ کے مقابلے دھارا کو گاؤں چھوڑ کر شہر جانے، وہاں مل میں کام کرتے ہوئے اپنے ہم حال افراد سے قربتوں نے اور اُن کے دکھوں میں عملی شرکت کے متنوع مراحل نے اس کی کایا کے ظاہر و باطن اس درجہ منقلب کر دیے کہ وہ زمین اور اس کے عطیات کو نت نئے حربوں سے اپنی گرفت میں رکھنے والوں کے رویے بھی پہچاننے لگا، اور ڈتی کے برخلاف اپنی قوتِ خوداعتمادی کو خلق شناسی اور خلق کے دکھوں میں شرکت سے دولتِ بیدار بنانا بھی سیکھ گیا۔ بہ الفاظِ دیگر: گاؤں پہ طاری شر کی دبیز تہہ پار کرنے کے طفیل میں دھارا کو معاشی خیر و شر کی گہری تمیز اور حصولِ خیر کے لیے جمہور کے اجتماعی عمل کی دوررس معنویت کا ایقان حاصل ہوا۔

30

... اپریل 1940 تک سنگھ بابو امتحانات دے دلا کر رخصت ہو گئے اور تھوڑے ہی عرصے بعد دھارا فوراً اُن کے پیچھے پیچھے نیا زراعتی سال شروع ہونے سے قبل ہی جیٹھ میں چمر گونے پہنچ گیا، تاکہ نئی اراضی ٹھیک وقت پر سنگھ بابو اُسے دے سکیں اور اساڑھ کی پہلی بھرن پر وہ اپنا ہل بیل کھڑا کر دے۔ مگر اُس نے تو وہاں اور ہی رنگ پھیلا دیکھا، اور سنگھ بابو اس کے پہنچنے سے تین ماہ پیشتر پہنچ چکے تھے۔ جدید قانونِ قبضۂ اراضی کا جنوری سے نفاذ ہو چکا تھا۔ وزارت کی کرسیاں اپنے نوکر چھوڑ کر جیلوں میں چلے گئے تھے اور سنگھ بابو کے ہاتھ میں علاوہ پرانے لینڈ ایکوزیشن ایکٹ کی تلوار کے جدید قانونِ قبضۂ اراضی یو پی کی دفعہ نمبر 171 بے دخلی کاشت کا نیا خنجر دیے گئے تھے، جس کو اُن کے

Scanned with CamScanner

بوڑھے مختارِعام اور مقدم نے چھ مہینے میں بڑے زور سے اپنے زراعتی کالج پلٹ آقا کی نئی اسکیم کے مطابق استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور سنگھ بابو نے پہنچتے ہی پرانی لینڈ ایکوزیشن ایکٹ کی تلوار پکڑی جس کی دھار دفعہ 171 جدید قانونِ قبضۂ اراضی ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کے خنجر سے کہیں زیادہ تیز تھی، اور ان کے پہنچتے پہنچتے اسی جولائی سے ان کی اسکیم ابتدائی جامہ پہن گئی۔

اور دھارا نے گاؤں میں پہنچتے ہی جائزہ لیا کہ سنگھ بابو زمین دینے کے بجائے الٹی لے رہے ہیں، اور صدیوں کی بٹی ہوئی زمینیں اپنے قانون اور لوہے کی مشین سے پھیر پھیر کر اپنے گرد لپیٹ رہے ہیں۔ پہلے تو اُن کی اپنی بھوک دیکھ کر دھارا کی ہمت اُن سے اُن کا کانپور کا پیہم وعدہ یاد دلانے کی نہ پڑی، مگر کانپور میں رہ کر اور مل میں مزدوری کر کے اُس میں ذرا بے باکی سی آ گئی تھی، اور لاکھ چمار سہی اور رعایا، مگر تھا تو ان کے ساتھ کا کھیلا؛ جب ایک روز ذرا چمکایا تو انھوں نے بکمال شفقت اپنے جدید آلات کے گودام کی جانب اشارہ کیا اور اس نے مشفقانہ ہدایت کے ساتھ کہ ''بس اک ذرا کی ذرا ہنسلی کھرپی لے کر فیلڈ مین کے پاس تک چلے جایا کرو اور شکل دکھا دی، حاضری بھر جایا کرے گی اور شام کو مزدوری ہری ہو جایا کرے گی۔'' اور دھارا راج بابو کی اس پیش کش پر دل ہی دل میں گھٹ کر رہ گیا، اور وہ سمجھ تو گاؤں میں پہنچتے ہی گیا تھا کہ سنگھ بابو زمین بانٹنے نہیں آئے ہیں بلکہ نئی ساخت کے ہنسلے کھرپے اور دو آنے یومیہ اور دو روٹی بانٹ سارے گاؤں کی پیداوار سمیٹنے۔ اور کچھ دنوں بعد جب فارم کے مزید پھیلاؤ میں عدالت سے اُس کو بھی اپنی چار بیگھے موروثی اراضی کی بے دخلی کا نوٹس ملا تو ''آ ؤ بیر، الٹا کر گھر کا بھی لے جاؤ'' وہ سانپ کی طرح بل کھا کر رہ گیا۔ اگر چہ کانپور کی کمائی کے مقابلے میں اُس اراضی کے چھوٹے سے ٹکڑے کی کوئی وقعت نہ تھی اور اس کی پیداوار سال چھ مہینے پیچھے ہولی دیوالی جب وہ شہر سے تیوہار منانے آیا کرتا تو اس کی دس بارہ دن کی پوری مٹھائی سے زیادہ نہ ہوتی تھی، مگر جب اس کی نظر گاؤں کے اندر ان بڑے بڑے خاندانوں کی جانب گئی جن کے پاس موروثی کاشت کے اتنے کافی رقبے تھے جو بآسانی ان کے کفیل تھے اور اب جن کی بے دخلیوں کے بعد اُن خاندانوں کے جملہ افراد کے ہاتھوں میں سنگھ بابو کی کھرپی ہنسلے کے بینٹ (دستہ) کے سوا کچھ نہ رہتا تھا اور صبح وشام دو آنے یومیہ اور دو روٹی کی بھیک جھولیوں میں پڑ جاتی تھی تو اس کے خون میں جھاگ اٹھنے لگے اور وہ سچ مچ چٹیل سانپ کی طرح بل سے کھانے لگا، اور نوٹس بے دخلیِ کاشت تو عدالت سے لینڈ ایکوزیشن

ایکٹ کے مطابق سنگھ بابو کی صرف ایک فارم قائم کردینے کی درخواست پر گورنمنٹ ایڈ ڈپلان کے مطابق سب کو ایک ہی مضمون کے جیسے مشین سے کٹے ہوئے چارے کے ایک برابر کے ٹکڑے، اسکیم کے پھیلاؤ کے مطابق یکے بعد دیگرے چلے آتے تھے، جس میں بڑے ٹھاکر جی کی طرح پاس جاکر رونے پیٹنے، داد فریاد کرنے کا بھی کوئی سوال نہ تھا اور نہ عدالت ہی میں جواب دعویٰ عذرداری کی گنجائش تھی۔ طرفین کی بھٹیوں میں لوہا گرم تھا کہ ایک پرانے نیتا جی لیڈری کا ہتھوڑا نہائی لے کر دوڑ پڑے اور وہ دھارا اور اس کے جوشیلے چٹیلے نوجوان کا خام مواد پکا ہوا تیار دیکھ کر ہی جو آئے تھے۔ مگر سنگھ بابو بھی پرانی سیاست کے پروردہ اور نئی پالیسی کے ساختہ پرداختہ تھے، فارم کے قیام کی اسکیم میں ایک معقول رقم پہلے ہی سے علیحدہ کیے بیٹھے تھے جس کا ایک حصہ عدالت کی ''متفرقات'' کی خرید میں خرچ کر چکے تھے؛ بوڑھے نیتا جی کو بھی خوب پہچانتے تھے اور جانتے تھے کہ شیر بوڑھا ہو کر آدم خوری پر اتر آتا ہے اور بھیڑیا پرہیزگاری پر۔ اور رقم ''متفرقات'' کی پہلی قسط پر نیتا جی کا حلق رُندھا اور دوسری رقم پر تو وہ اپنی چڑھائی کے علاوہ ان کے پہلے کی چڑھی چڑھائی اتارنے لگے اور ساتھیوں میں نہایت ''چابک صوتی'' کے ساتھ اُلٹی الاپنے لگے، اور تیسری قسط پر تو فارم کی تکمیل کرا کے نہ صرف کسانوں ہی کو چھوڑ گئے بلکہ کچھ ترکِ دنیا ہی کر گئے اور لیڈری کا کاروبار اور دیش سیوا کی ٹوپی لنگوٹی بڑے بیٹے کو سونپ کر بقیہ عمر مالا ہی پکڑے رہنے میں اس جنم کے لیے تیر کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ دھارا نیتا جی کے اس طرح چھوڑ کر بھاگ جانے پر بہت گھبرایا اور اس کے پاؤں بھی اکھڑے، مگر کانپور نہ گیا اور اپنی بن سری والنٹیئر فوج کی قیادت کا دم بھرنے لگا۔ اس کا جی اپنے ان ساتھیوں کو سنگھ بابو کے رحم و کرم پر چھوڑ کر چلے جانے کو نہ چاہا جنھوں نے اس کی آواز پر آواز اٹھائی تھی، مگر نیتا جی کی قیادت میں اس کے کندھے کا سہارا لے کر میدان میں آئے تھے۔ (ص 14 تا 17)

❋

اپنے گاؤں سے الگ، کانپور میں سنگھ بابو اور دھارا نے لگ بھگ پانچ برس بتائے۔ اس مدت میں دھارا نے عامۃ الناس کی درسگاہ سے یہ آگاہی تحصیل کی کہ دکھ کا دکھ سے رشتہ استوار ہو جائے تو شر کے دبیز اندھیروں کو چاک کر سکتا ہے لیکن''... سنگھ بابو اپنی گھٹی میں پڑی زمینداری کی سیاست پر اگریکلچر کالج کی تعلیم و تربیت سے جلا پا کر جیسے کچھ شراب دو آتشہ بنے واپس پہنچے تو چمر گونٹے میں فتنہ

محشر جلو میں اور قیامت در رکاب نظر آئے۔" (ص 17)

ابوالفضل صدیقی نے ان دونوں کرداروں کے حصول میں فرق کی جانب کئی بالواسطہ اشارے کیے ہیں۔ قیامِ کانپور میں دھارا کا احوال اور سرگرمیاں بیان کرتے ہوئے ابوالفضل صدیقی نے یہ فنکاری برتی ہے کہ مل میں ایجی ٹیشن کی تیاری کے چندے کی مہم، احتجاجی جلوس اور زخمی حالت میں دھارا کی گرفتاری کے موقعوں پر سنگھ بابو کو بطور ناظر پیش کرتے ہوئے دونوں کے رویوں کا فرق واضح کیا ہے مثلاً:

31

... سنگھ بابو کے پانچ چھ کالج کے دوست ان کے ساتھ تھے اور سب کے سب ٹیکسی پر سیر کو نکلے تھے۔ دھارا مزدوروں کی ایک جماعت کے ساتھ ایک گولک لیے چندہ کرتا پھر رہا تھا۔ اس نے سنگھ بابو کے قریب آکر مجملاً وہ مطالبات بیان کرنا شروع کیے جن کے سلسلے میں اس مل کے خلاف جس میں وہ کام کرتا تھا اور اس مل کے علاوہ اور کئی ملوں کے مقابلے پر ایجی ٹیشن کرانا چاہتا تھا اور جس کے اخراجات کے لیے وہ چندہ کرتا پھر رہا تھا۔ سنگھ بابو نے اسے مسکرا کر کچھ کہنے سے روک دیا۔ اپنے ساتھیوں کے درمیان شانِ ریاست اور فیاضی دکھانے کا انھیں اس سے بہتر موقع نہ تھا۔ انھوں نے مخصوص مربیانہ پہلو لیے ہوئے ایک ذرا جاگیردارانہ استغنا کے ساتھ کہا۔

"وہ سب سن لی تمھاری اور اخباروں میں . . . ہوں، پھر مجھے تو تمھاری شکل ہی کافی ہے۔ مطالبات اور ایجی ٹیشن ہڑتال سے مجھے کیا غرض۔ دھارا، بتاؤ کیا دوں؟" اور پھر داد طلب نظروں سے ساتھیوں کو مڑ کر دیکھا اور جو کچھ دھارا نے جواب دیا وہ سنا بھی نہیں اور ساتھیوں سے بولے، "ہمارا اپنا چمار، پشینی نمک خوار!" اور یہ کہہ کر انھوں نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر مٹھی بھر ایک ایک اور پانچ پانچ روپے کے نوٹ بڑھائے اور دھارا نے مسکرا کر گولک بڑھائی اور سنگھ بابو نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا، "اوں... یہ تو اس میں گھسیں گے بھی نہیں مجھ سے۔ یہ لو، تم ٹھونستے رہنا،" اور پھر اپنے ساتھیوں کی جانب متوجہ ہو کر فخر یہ کہا، "یہ یہاں چلا آیا۔ ہے پھنکار میں۔ اس کے باپ دادا سات پشت میری ڈیوڑھی پر پل کر مر گئے۔" (ص 12 تا 13)

Scanned with CamScanner

❁

اس منظر میں بالخصوص سنگھ بابو کی ''شانِ ریاست''، ''جاگیردارانہ استغنا'' کی نمائش اور دوستوں کو بتانا کہ ''ہمارا اپنا چمار، پشتینی نمک خوار''، ''اس کے باپ دادا سات پشت سے میری ڈیوڑھی پر پل کر مر گئے'' ظاہر کر رہا ہے کہ ابوالفضل اپنے قاری کو محسوس کرانا چاہتے ہیں کہ سنگھ بابو بھلے ہی کالج میں پڑھ رہا ہو، مگر ہنوز اپنی اُسی آبائی روش کا اسیر ہے جو آدم زاد کو ذات پات کے بلند و پست میں رکھ کر اپنی بالادستی کے وسائل برقرار رکھتی اور انھیں مستحکم تر بناتی رہتی ہے۔ یعنی کالج کے پانچ برسوں میں سنگھ بابو اپنا آبائی و شخصی شر زائل نہ کر پایا، جبکہ مل مزدوری کی اتنی ہی مدت میں دھارا اپنے اعمال کا رخ اپنی ذات کے باہر اور دوسروں کی فلاح و بہبود کے لیے معین کرنا سیکھ گیا۔

بندہ علی کی ننھیال ددھیال والے اپنی پسپا نفسیات کے باعث ایک مثبت امکان گنوا بیٹھے، یعنی بندہ علی سے منفصل ہی رہے۔ تو یکہ و تنہا بندہ علی مجبوراً حاجی میاں کے دکھائے اُس راستے پر چل پڑا جسے وہ جانتا تو خود بھی تھا مگر تا حال اُس سے گریز کا خواہاں تھا۔

ابوالفضل نے مولا علی کے سوئم (اقتباس:24) اور چہلم کی فاتحہ (اقتباس:25) پر یعنی گھر کے باہر حاجی میاں کے کچھ رنگ ڈھنگ اپنے قاری کی نظر سے گزار دیے تھے۔ آئندہ اقتباس کی ابتدائی چند سطور میں بندہ علی کے حالیہ مسائل اور طرزِ فکر کا مختصر ذکر کرنے کے بعد مصنف حاجی میاں کے اندرونِ خانہ اطوار بیان کر رہا ہے۔ اس بیان میں مصنف کی توجہ کا بڑا حصہ حاجی میاں کے ایسے اطوار و افعال نمایاں کرنے پر صرف ہوا ہے جو وہ عورت ذات کے لیے اختیار کرتا ہے۔ اس بیان میں کارفرما مصنف کی توجہ اور توجہ میں برتی گئی گہری سنجیدگی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ صنفِ نازک کے بارے میں کتنی دردمندانہ تشویش سے دوچار ہے۔ مصنف نے اپنی اس تشویش کے کئی نقش دیگر کہانیوں (جن کے اجزا اسمبلاژ میں شامل ہیں) میں بھی (مرد) قارئین کی نظر سے گزار کر مرد جاتی کو آنکھ نیچی کرنے پر مجبور کیا ہے۔ مصنف کے گہرے طنزیہ اسلوب کا پردہ (اس باب میں بھی) ہٹا کر دیکھیں تو محسوس ہوگا کہ وہ عورت کے تئیں مرد کے اس رویے کو، یعنی حسن کے ساتھ سراسر جبر و شر کے رویے کو، معاشرے کے اخلاقی زوال اور شر کی بالادستی شمار کر رہا ہے۔

Scanned with CamScanner

کہانی کے آغاز میں عورت کے تئیں سردار علی شاہ کے رویے کا ذکر کرنے کے بعد ابوالفضل صدیقی ایسے مناسب محل کے منتظر تھے جہاں حاجی میاں کے اطوار کی تفصیل کے ذریعے اپنے اس احساس کو مکمل ترسیل تک پہنچائیں جو اس کہانی کا ایک اہم نکتہ ہے۔ اب کہانی نے مناسب موقع دیا ہے تو ابوالفضل حاجی میاں کے اندرونِ خانہ اطوار بیان کیا چاہتے ہیں۔ حاجی میاں کے ساتھ ہی ساتھ ان کے گھر میں کام کرنے والے دو اور مردوں (جن میں سے ایک کو وہ اپنا بیٹا تصور کیے ہوئے ہیں) میں بھی ان جیسے اطوار کی نشان دہی سے مصنف نے قاری کو محسوس کرایا ہے کہ جب کسی معاشرے پر زوال کے قدم پڑتے ہیں تو ہر بڑا چھوٹا اُس کی زد میں آتا ہے اور شر کے بصری موہ میں پڑنے والے دراصل بصیرت سے محروم ہوتے ہیں۔

32

قتل کے الزام کے شعلوں میں سے صحیح سالم نکلنے کے بعد بندہ علی نے چمار کے صبر و برداشت اور سیّد کی دانش وجلال کو ملا کر جائزہ لیا تو بجز اس کے اور کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا کہ چمار تو خیر مطیع ہو جائیں گے، پولیس کے اثر اور اس کے سامنے سے ہٹ کر جیل چلے جانے کے سبب میدان خالی سمجھ کر مخالفت پر تیار ہو گئے تھے اور پھر ان سے بعد کو سمجھوں گا؛ پہلے ان مولازادوں سے نپٹ لوں، حالانکہ یہ بڑا کام تھا۔ دونوں ہی جتھے تھے جن میں سے ایک کے ساتھ باپ کی جانب سے، دوسرے کے ساتھ ماں کی طرف سے خون شامل تھا، اور ایک جمعے کے جمعے مسجد اور کلمہ گوئی کا شریک بھی تھا، حالانکہ جائیداد کی ملکیت ہاتھ میں آنے کے بعد بندہ علی ڈیڑھ سیّد بن گیا تھا۔ جیل سے واپس آنے کے بعد چشمہ شیریں کے گرد چیونٹی سے لے کر ہاتھی تک پھر جمع ہو گئے اور جھوٹی سچی کہانیاں گڑھ گڑھ کر اپنی اپنی عداوتیں اور بغض نکالنے کے لیے، ساتھ ہی ساتھ اظہارِ ہمدردی اور وفاداری کا مظاہرہ کر کے اس کے مقربین میں پہنچنے کے خیال سے، بندہ علی کو استعمال کرنا شروع کیا۔ بندہ علی نے اس سلسلے میں کیسے ہی اقدام سے قبل بہت سوچا اور پھر خوب سوچ سمجھ کر حاجی میاں کی خدمت میں حاضر ہو ہو کر خاص رہنمائی حاصل کی، جو چھوٹی ساوتی سیاست میں اپنی نظیر آپ تھے؛ ساتھ ہی ساتھ اس علاقے کے سب سے بڑے، زرخیز اور بلاانقطاع رقبے کے قابو یافتہ زمیندار تھے۔ پکے دیندار، پھر ہر نوعیت کی دولت کے

Scanned with CamScanner

ساتھ ساتھ سادات کی سعادت سے بھی مالا مال تھے، اور اس سب پر سونے پہ سہاگہ، کبرسنی کی بزرگی، ایک سے ایک بڑھ کر سعادتیں۔ اپنے طبقے میں ان کا درجہ محترم تھا۔ پچھتر کے پیٹے میں بھی بھاری بھرکم، بلند و بالا، سرخ سپید، انار دانہ سارنگ، دودھ میں ڈھلی ہوئی پوری چھاتی پر محیط بال بال تری ڈاڑھی۔ سر پر مکہ شریف اور مدینہ منورہ کے ہر حج کے بعد یکے بعد دیگرے سات رومال، نیم عربی، نیم ایرانی لباس، عبا و چغا، ہاتھ میں ہمہ وقت کھٹکتی ہوئی زمرد کی بیش قیمت تسبیح جس وقت اپنے نامی گرامی علاقے بھر کے سب سے اونچے ہاتھی کے گنگا ہودے میں بیٹھتے تو ہودا بھر جاتا اور ہاتھی سج جاتا۔

کراچی اور لاہور کے کاروں کے دولتمند شوقینوں کی طرح ازدواجی کاروبار میں حاجی میاں حرام کو حلال کرنے کی شرعی ترکیبوں کے راستے پندرہ سولہ سال کی عمر سے ستر پچھتر تک پہنچتے پہنچتے ہر دوسرے تیسرے برس ایک نیا ٹپ ٹپا ماڈل بدلتے رہے تھے، اور سال اندر ٹیکسیوں کی سواری کے نمبر شمار میں نہ آسکے تھے، حتیٰ کہ اچھی طرح صورتیں بھی یاد نہ رہ سکتی تھیں۔ لیکن اولادِ نرینہ سے محروم رہے اور یہ نعمت ہاتھ آئی بھی تو قدرت کی ستم ظریفی، سڑے گلے درخت پر ہی سے کیڑے لگے پھل کی صورت، جس کو ہاتھ میں لے کر دور پھینک دیتے ہیں۔ ایک ذرا جوان سی دکھائی پڑتی بیوہ زنان خانے کے باورچی خانے میں نئی نئی کام پر آئی۔ یہ باورچی خانہ صرف اسی کے چارج میں چلتا تھا۔ کھانا تو باہر مطبخ سے پکا ہوا مردانے زنانے میں تقسیم ہوتا تھا اور حویلیوں میں بھی آتا تھا، لیکن بیگموں نے یہ باورچی خانہ بالعموم کھانا گرم کرنے کے لیے یا کبھی کبھی اپنے ہاتھوں سے کوئی خاص کھانا بالخصوص پوری پکوان وغیرہ تیار کرنے کے لیے، ورنہ گرم گرم چپاتیاں پکوانے کے لیے قائم کر رکھا تھا۔ اتفاق سے چاروں بیگموں کو کسی ایک بڑی شادی کی تقریب میں شرکت کرنے کے لیے سفر پر جانا پڑا۔ ادھر حاجی میاں کو نزلہ و زکام اور ہلکی حرارت ہوگئی، حویلی سے باہر نہ نکل سکے، اور یہ اس خادمہ کی تقریبِ ملاقات کا موقع ہوا۔ نزلہ و زکام کی بیماری میں پرہیز تو چلتا نہیں ہے، تاہم خادمہ نے گرم گرم پھلکے دوڑ دوڑ کر پہنچائے، بڑے اہتمام کے ساتھ شوربہ بنایا اور میاں کو نجو کی چپاتیوں میں وہ مزہ آیا کہ بیگموں کی پوری، کچوریوں اور گلگلوں تک کو بھول گئے۔ ''خدمت'' اور ''خلوت'' دور دور تک میدان خالی۔ گرم گرم چپاتیوں کے بڑھتے ہوئے پینگ دوسرے تیسرے ہی دن گرم گرم بستر تک جا پہنچے اور پندرہ ہی دن کے اندر میاں نے الہ دین کا چراغ رگڑ کر نئی حرم سرا تیار کر لی۔ خادمہ مخدومہ بنتی دکھائی دی۔

بہر حال بیگمات یہاں تک تو بہت جز بز ہوئیں۔ وہ آرزو جس میں حاجی میاں کے والد مرتے دم تک رہے اور آج تک حاجی میاں مر رہے تھے، قدرت ادنیٰ سی بھٹیاری کے پیٹ کے اندھیری کوٹھڑی میں سے نکال رہی تھی۔ اور بیگموں کی جنگِ زرگری کی سازشوں کے درمیان تجو نے بیٹا جنا، جس کو سرکار کی نگاہ میں چاروں نکاحیوں نے سازش کر کے یہ اولاد والی بیل منڈھے نہ چڑھنے دی اور چرب زبانی سے اتنا گرادیا کہ سرکار اس کو اپنی داشتہ کے پیٹ سے نکلی رسولی سے زیادہ مختلف تصور نہ کر پائے۔ اور قدرت کی شوخی! یہ خاکی انڈا دھوبی بچہ بنا کر کچھ ایسا ہی بھیجا تھا — صورت شکل کے اعتبار سے چمپانزی، اور رنگ ادتانگ گوریلے وغیرہ کسی جنگلی مخلوق اور آدمی کا کراس نظر آتا۔ جوں جوں بڑھا، پتا چلا کہ دماغی صلاحیتوں سے بھی بالکل ہی ناکارہ ہے۔ ادھر بیگموں کی سازش بار آور ہوئی۔ روٹی پکانے والی کا بیٹا باورچی خانے کے برتن مانجھنے کی صلاحیت سے آگے تربیت پذیر نہ ہوسکا۔ اندر سے لے کر باہر تک سب کی تفریح کا ذریعہ بن گیا۔ بڑے منشی نے ''بڈا'' نام رکھ دیا، بوڑھی ماں کے ساتھ باورچی خانے میں رکابیاں چاٹتا اور ہانڈیاں مانجھتا، اس سے زیادہ صلاحیت نہ تھی۔ بڑی بیگم ویسے اس سازش کے معاملے میں اپنی تینوں ادھیڑ، جوان سوتوں میں کسی سے پیچھے نہ تھیں، لیکن خود تولید وتناسل کی عمر سے کبھی کی تجاوز کر گئی تھیں اور نا امید تو بھرا بھر جوانی ہی میں ہوگئی تھیں، اور امید سے ہونا تو ان تینوں میں سے بھی کسی کو نصیب نہ ہوا تھا، لیکن بڑی بیگم تو تارک الدنیا بھی ہوگئی تھیں۔ عبادت کا ہمیشہ سے شوق تھا، ادھر کارِ خیر کے مشغلے کے طور پر اپنی حویلی کے ایک حصے کو یتیم خانہ سا بنالیا تھا۔ خوردسال یتیم و یسیر بچوں کو تلاش کرا کرا کر لاتیں، لاوارث غریب نادار بچوں کی نوکرانیوں کے ذریعے اپنی نگرانی میں پرورش کراتیں۔ کئی لڑکیوں کی انھیں جیسے گھروں میں شادیاں کرا چکی تھیں۔ کتنے ہی لڑکے پال پال کر اور ٹرین کر کر کے اپنے اثر سے روزگار سے لگائے تھے۔ بھوتا باندی دیہاتی حجام کی خوردسال بیٹی تھی۔ طاعون جو پڑا تو بھرا گھر خالی ہوگیا اور یہ بدنصیب بچ رہی۔ چھما ہوئی تو بیگم کو پتا چلا کہ گلی کی کتیا کے پلّے کی طرح بستی میں پھرتی ہے۔ دور دور تک کوئی عزیز نہیں، اور حجاموں کی برادری تو بہت ہی مختصر اور محدود ہوا کرتی ہے؛ خبر سنتے ہی پکڑ بلایا اور پلنے لگی۔ صورت شکل جیسی دیہاتی حجاموں کی ہوا کرتی ہے ویسی ہی کالی کلوٹی لیکن مقدر نے طاعون کی وبا سے نائی کے جھونپڑے میں تو پناہ دے دی تھی، نواب کی محل سرا میں قضا وقدر کے چنگل نے آ دبوچا۔ چیچک نے چہرے پر

Scanned with CamScanner

سے سارا گوشت نوچ لیا اور چلتے چلتے ایک آنکھ بھی پھوڑ دی۔ جوان ہو کر خوبرو نہیں تو آدمی کا بچہ ضرور بن جاتی، مگر وہ تو چڑیل بن گئی۔ ویسے تو بڑی بیگم اب تک پہلی ماہواری پر ان بے سہارا لڑکیوں کے ہاتھ پیلے کر دیتی تھیں لیکن اس کی کھپت تو حجاموں ہی میں ہو سکتی تھی، اور بستی کے نائیوں کے لونڈوں کے اب پَر لگ گئے تھے؛ چھٹے مہینے بھاگ کر شہر جاتے اور ہیئر ڈریسنگ سیلونوں میں نوکری کرتے۔ دن میں ایک آدھ لڑکی کے بھی بال ڈریس کرنے کے مواقع بہم پہنچتے۔ جب بڑی بیگم نے ان میں سلسلہ جنبانی کرائی تو پتا چلا کہ یہ تو دیہات کی حجامنیوں میں مسیں ٹوٹتے ہی پہلو تہی کر گئے اور بھوٹا پہاڑ کی پہاڑ ہو گئی، یہاں تک کہ نظر آنے لگا کہ اب بھوٹا اسی گھر میں باندی بن کر رہے گی، چنانچہ بھوٹا کے ساتھ باندی کا لفظ بھی شامل کر دیا۔ بڑی بیگم کے پاؤں دباتی جس میں اس کو بڑا ملکہ تھا۔ کبھی کبھی اور بیگمیں بھی ہاتھ پاؤں دبوانے کے لیے بھی بلایا کرتیں۔ دسترخوان کی جھوٹن کھاتی۔ میاں لوگوں کی جوانی کا طول شبِ ہجر اور زلفِ معشوق سے زیادہ طویل ہوتا ہے اور ساری عمر شبِ وصل میں کٹتی ہے اور تا دمِ مرگ اور بلا استثنا کالی گوری ہر جوانی کو صدائے لبیک بلند رہتی ہے۔

حاجی میاں کو شکار کا بہت شوق تھا۔ تمام جاڑوں روزانہ کا معمول تھا کہ مغرب کے وقت بستی کے قریب چاروں طرف چھوٹے بڑے تالابوں پر دبک کر بیٹھ جاتے۔ یہ وقت قازوں کی چگائی کا تھا۔ مغرب کے وقت سے چھوٹے بڑے تنگ قیں قیں کرتے ہوئے آنا شروع ہو جاتے اور ساری رات آتے رہتے۔ اور تالابوں پر منڈلاتے وقت حاجی میاں فلائنگ شاٹ کرتے اور بالعموم رات کے گیارہ بجے کے اردگرد پلٹتے۔ اور آج چھوٹی بیگم کی خوابگاہ میں داخل ہوئے تو بیگم سو چکی تھیں اور بھوٹا باندی آہستہ آہستہ جسم دبا رہی تھی۔ کمرے کے اندر اگر کے دھوئیں اور جاڑے کے بستروں کی خوشبوؤں میں بسا ہوا ماحول جذبات انگیز بلکہ ہیجان زا تھا جس کا انھیں تالاب کے کنارے نم اور سرد فضا میں ہی تصور ہو چکا تھا۔ پہلی نظر کے ہلکے سے جائزے میں بیگم کے حسنِ خوابیدہ سے آنکھیں خیرہ سی ہو گئیں، دل مچل پڑا۔ مرمریں بانہوں اور پنجوں کے درمیان گلابی مہتابی چہرہ، خواب کے مخصوص اثرات میں کچھ اور ہی پھبن، بند غلافی آنکھیں کھلی ہوئی نرگس، نشیلی نوکدار انکھڑیوں سے بھی زیادہ مسحور کن، ہموار چہرہ، ایک جانب ریشم کے لچھے بے پروائی سے کنگھی و شانے سے بے نیاز۔ زرد ساٹھن کے تکیوں اور رضائیوں پر چھوٹی بیگم کا سونا اور سیندور بکھرا ہوا تھا اور دیوارگیری اور سبزی مائل

گلوب کی شعاعیں اس سب پر سہاگہ چڑھا رہی تھیں۔ تمام ماحول انتہائی متواضع تھا اور ایک سانس لیتے ہی جیسے میاں کے رگ و پے میں سرور دوڑ گیا۔ کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی بھوتا باندی چھوٹی بیگم کا بدن چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور دبے پاؤں چل پڑی۔ دوسرے تیسرے قدم پر جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو دالان میں کہیں دور سے پڑتی ہوئی مری مری پٹوں دار روشنی میں حیرت اور تجسس کے ساتھ اپنا اولا پڑے ہوئے گیلے اُپلے جیسا چہرہ موڑا اور اپنی واحد آنکھ سے استفساریہ اور یک گونہ حیرت کے انداز میں تعاقب کرتے ہوئے آقا کی جانب دیکھا اور کچھ ٹھٹکی تھی کہ کیا حکم دیتے ہیں۔ اس پر دادا میاں کے اندر بجلی سی لپک گئی۔ نجیب الطرفین سید کے اندر سے نہ معلوم کس کونے کھدرے میں سے جیسے ان حجام لونڈوں میں سے کسی نے جست لگائی جن کو بھوتا کو پسند کرنے اور جوڑ املانے کے لیے آمادہ کرنے میں بڑی بیگم کئی برس سے ریاض کر رہی تھیں، اور یہ خفتہ حجام جو گھر کے اندر ہی پل رہا تھا، میاں کے اندر سے ٹمی مرغے کی طرح پھرکی سا لیتا بھوتا پر جا پڑا۔ اور بھوتا باندی کی وارڈن بڑی بیگم سے لے کر میاں کی مقرب خاص اور منظور نظر چھوٹی بیگم تک ساری بیگمیں پڑی سوتی رہیں، اور بھوتا ایک زقند میں باندی سے بیگم بن گئی۔ اور سڑے ہوئے گندم کا نابدان تو ہر آدم زاد میں ہوتا ہے اور پیٹ میں بج جاتا ہے۔ بھوتا تو کانی کھتری تھی اور اس خمیر کے کیڑے تو اندھی لولی لنگڑی اپاہج میں بھی یکساں متحرک رہتے ہیں۔ حویلی والوں کی نگاہ میں بھوتا ایک سُنڈا تھی، جو صبح سے شام تک کھاتا ہے اور لوٹ صبح کو دکھا کر فضلہ خارج کر دیتا ہے۔ ویسے حاجی میاں کی اس بدذوقی پر بھی کسی کو تعجب نہ ہوا، ربڑی بالائی سے منھ موڑ کر گوبر کے چھینٹے پر منھ ڈال دیا۔ یہ وقت کی بات ہوتی ہے۔ چھوٹی بیگم کا کندن انھیں مٹی نظر آیا، بھوتا کا گوبر سونا دکھلائی دیا۔ اٹھوارے ہی مختلف قیاس آرائیاں کی گئیں۔ باہر تک بات پہنچی تو میاں نے اپنے بے تکلف ندیموں میں پہلے تو بریانی، تنجن، قورمہ، باقر خانی کھاتے کھاتے اُوب کر مسّی کی روٹی اور مرچ پودینے کی چٹنی کو جی چاہ لگنے والی بات کہی، پھر محققانہ انداز میں بھوتا کے اندر ایک مخصوص جنسی کشش کے سراغ کی نشان دہی کی اور پھر بعض مبصر ندیموں نے کہا: ''میاں کانی آنکھ، کھترا چہرہ، لکڑ سا قد، کرخت ہاتھ پاؤں سب ایک پلّے میں اور اکیلا کوراپنڈا ایک پلّے میں۔'' اور میاں کے انتخاب کی داد دی اور ان حجام لونڈوں اُلّو کے پٹھوں کو گالیاں دیں جنھیں شہر کی ہوا لگ گئی تھی، جن پر بڑی بیگم بھوتا کو قبول کرنے کے لیے مدتوں سے ریاض کر رہی تھیں۔

Scanned with CamScanner

اور بڑی بیگم کو اب تو برسوں کی گنتی بھی یاد نہیں آ رہی تھی کہ کب سے وہ میاں بیوی نہیں ہوے ہیں۔ ان کے بعد تو تین چار اور خارج ہو چکی تھیں، اور اب تو چھوٹی بیگم ہی سہاگن تھیں اور چڑھی ہوئی تھیں؛ بقیہ اور ان کے بیچ والی وہ جو تھیں وہ بھی اُتر چکی تھیں، اور بڑی بیگم تو بھول بھی گئی تھیں کہ وہ بھی کبھی بیوی تھیں یا ہمیشہ سے محرمات جیسی کوئی رشتے دار۔ بیچاری مدتوں سے بقیہ عمر یادِ الٰہی اور خدمتِ خلق میں بسر کرنے کا تہیہ کر چکی تھیں اور بڑی باعمل زندگی بسر کر رہی تھیں۔ رات بھر عبادتِ خدا اور تمام دن خدمتِ خلق۔ یتیم بچوں پر متعین خادماؤں کی نگرانی، اور انھیں قرآن پڑھانا۔ لیکن اکثر شب کی عبادتوں میں خلل واقع ہوتا اور کبھی کبھی تو تہجد حقیقت سے پھسل کر مجاز میں جا پہنچتی۔ جب میاں اور چھوٹی بیگم کی سمت سے بت بتاہٹ اور پھر کواڑوں کی کھٹ پٹ اور پھر چاپ سنائی پڑتی، وہ اپنے کمرے سے نکل کر اور دالانوں سے گزرتے ہوے صحن پار کرتے اور پیشاب کرنے کے لیے بیت الخلا جاتے تو رفعِ حاجت سے بھی زیادہ کوئی بات بڑی بوڑھی بیگم کے ٹھنڈے رگ و پے میں محسوس ہوتی، جس کی نمایاں علامت گرم گرم گیند جیسی کوئی چیز ناف کے نیچے سے لوٹتی ہوئی اوپر بڑھتی اور پھر نیچے اُترتی۔ بوڑھی عابدہ زاہدہ بیگم استغفار اور لاحول پڑھنے لگتیں، کچھ انفعال جیسی کیفیت طاری کرنا چاہتیں اور پھر تازہ وضو کر کے نیت باندھ لیتیں۔ وصل سے دستبرداری کے بعد بیتے دنوں کی یادیں بھی معدوم ہو کر حال کی حسرتوں میں ضم ہو گئی تھیں اور اب حسرتوں ہی میں زندگی کے مزے لیتیں۔ اور چھوٹی بیگم کو تو ان شب بیدار کی عبادت گاہ اور یتیم خانہ اپنے حصۂ رہائش اور خالص خلوت گاہ کے اتنے قرب میں کھٹکتا تھا لیکن بڑی بیگم نے نہ معلوم کیوں یہی حصہ پسند کیا تھا۔ اور اس کا پتا انھیں چھوٹی بیگم کی خلوت اکھڑ جانے کے بعد چلا، جب ادھر کا حصہ ویران اور خاموش ہو گیا، کہ دوسرے تیسرے روز دو ایک نوکرانیوں نے بھوتا پر جملہ چست کیا اور خوشبو تو صبح ہی کو نہ معلوم کیسے حویلی بھر میں سویرے ہی پھیل گئی تھی، اور مہینے اندر حجابِ نوعروساں بھی رخصت ہو گیا اور میاں کھلم کھلا چالو ہو گئے۔ چند روز بڑی بیگم کے کانوں میں بجاے بیت الخلا کی جانب سے جانے کی چاپ کے، چھوٹی بیگم کی خلوت سے تو تو میں میں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ بیگم بے چاری شیخ بیٹھا بیٹھا دیکھ، کیوں میاں بیوی کے درمیان پھٹے میں پاؤں اُڑانے جاتیں، البتہ اپنی وارڈ اور خاص الخاص اصیل بھوتا باندی سے کبھی کوئی تعرض نہ کیا۔ اور میاں بچارے یہ جوتی پیزار مستقل طور پر کیسے برداشت کر سکتے

تھے، مجبوراً وہ کمرہ ہی چھوڑ دیا بلکہ حویلی کے اس حصے ہی سے کنارہ کر گئے۔ اور ڈیڑھ ایکڑ پر تو حویلی پھیلی ہوئی تھی، ایک دورافتادہ سے ویران حصے میں ایک بڑے دالان دردالان کی بغلی کوٹھی خوابگاہ کے لیے انتخاب کر لی اور رات کو بڑی بیگم شوہر کی خدمت کا ثواب حاصل کرنے کے لیے بھوٹا کو حقہ لے کر بھیج دیا کرتیں۔ جس روز زین سواری زیادہ کی ہوتی یا شکار میں پانی کے اندر گھسے ہوتے تو ذرا اک پاؤں بھی دبا دیا کرتی۔ کچھ دنوں بعد شب بیدار بڑی بیگم کی عشا سے فجر تک عبادت میں خلل واقع ہو گیا۔ ان کی شب بیداری میں چھوٹی بیگم کے کھٹکے اور چاپ کو بڑا دخل تھا، سچ پوچھیے تو عبادت کا سچا لطف اور خضوع وخشوع سب رخصت ہو گیا اور پتا چلا کہ حقیقت ومجاز ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم تھے۔ چھوٹی بیگم کی کھٹ پٹ ہی سے ان کی رات کی نماز میں اور تلاوت عبارت تھی اور انھیں کی سرگرمیوں سے کسبِ حرارت کر کے وہ پیٹ کا گولہ متحرک ہو کر ذکرِ جہر کی صورت ٹھنڈی سانس بھر کر ہونٹوں سے نکلتا تھا۔ اور چھوٹی بیگم کے کمرے کا سکون ان کے اندر ایک عجیب نوعیت کا ہلکا ہلکا کرب سا بن گیا، جیسے بیک وقت دل میں میٹھی میٹھی جلن اور کانوں میں رس گھلنے والی بات نہ رہی۔ لیکن ادھر منجھلی، سنجھلی اور بچلی تینوں بیگموں کی ویران خلوتوں میں ٹھنڈک پڑ گئی اور سب پاؤں پھیلا کر سکھ کی نیند سونے لگیں۔ ماضی اور مستقبل سے تو سمجھوتا کر ہی چکی تھیں اب حال سے بھی مطمئن ہو گئیں اور کوئی خلش باقی نہ رہی۔ اور انھیں بیچاریوں کے سکھ چین کے خیال سے بھی بڑی بیگم نے کوئی تعرض نہ کیا ورنہ بھوٹا باندی میاں کی آبائی جاگیر کا حصہ نہ تھی، وہ خالصتاً بڑی بیگم کے اپنے ہاتھ کی ساختہ پرداختہ پروردہ پروان چڑھائی، ان کا مال جیسی کوئی چیز تھی اور وہ جس گھڑی چاہتیں روک دیتیں بلکہ سرے سے بھوٹا کو ہی نکال باہر کرتیں۔ البتہ چھوٹی بیگم کی چڑھی کمان اتر جانے کا انھیں قلق بھی تھا لیکن یہ تو میاں کے اور ان کے درمیان کا معاملہ تھا، اس میں ان کا کیا بس تھا۔

لیکن ان کی چین کی بنسی چند ہی روز بجی تھی اور بڑی بیگم کا خضوع وخشوع سال اندر ہی حیرت واستعجاب اور انتشار واندیشے میں لپٹ گیا۔ بھوٹا باندی نے عملی طور پر چھوٹی بیگم کی جگہ تو سنبھال ہی لی تھی؛ خیر وہ کوئی بات نہ تھی، ایسے اتار چڑھاؤ ازدواجی زندگی میں آتے ہی رہتے ہیں۔ پھر یہ بات نہیں، ان کے کمرے میں قدِ آدم آئینے لگے تھے اور وہ، اپنی پھبن میں مغرور، اس رات کے انتظار میں تھیں جب میاں کو بھوٹا باندی کی اصل شکل وشبیہ نظر آ جائے اور کسی شب قطامہ ناک چوٹی کاٹ کر

Scanned with CamScanner

نکالی جائے اور میاں خود ہی کچے دھاگے میں بندھے ادھر آئیں، یا خود میں ہی جا کر کسی بھی دن منا کر پکڑ لاؤں کہ گذشتہ را صلوٰۃ، کہ ایک دن حویلی کے اندران چین کی بنسی بجانے والیوں کے بھی سکون میں دھول پڑ گئی۔ سرگوشیوں میں بوائڑی کہ جیسے بھوٹا باندی کے اندر ٹائم بم دھر گیا ہے اور چھ مہینے کے اندر پھٹنے والا ہے۔ یہ میاں کی عمر بھر کی ناکام کوششوں کی نادر ترین کامیابی تھی۔ سب نجومی جھوٹے ہو گئے جو ہتھیلی پر غور و خوض کے بعد چپ ہو جایا کرتے تھے کہ میاں کے ہاتھ پر سب کچھ ہے مگر اولاد کی لکیر نہیں ہے۔ اور تو اور، ایک عمر سر پٹخ کر اور بھانت بھانت کے علاج کر کے وہ حکیم بھی نالائق ہو گئے جو اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ''میاں ہی کے اولاد نہیں ہے۔'' میاں کو امید بندھی اور بھوٹا بیگم کی امید سے سب بیگموں کی چاہ میں چرکین پڑ گئی اور سرکار کے سوکھے دھانوں میں پانی۔ اور نو مہینے بعد جب بھوٹا کے بطن سے لڑکی کی ولادت ہوئی تو پھر سب کو اطمینان کا سانس آیا کہ چلو کھودا پہاڑ، نکلا چوہا۔ بیگمیں بچاریاں اتنا حساب کتاب نہ جانتی تھیں کہ اولادِ ذکور نہ ہونے پر کل وراثت لڑکی ہی کو مل جاتی ہے۔ ان سب کے بیٹے نہ سہی، بھائی بھتیجے بھانجے تو تھے، اور حاجی میاں کی تو وراثت یہی بیگمات تھیں، اور میاں تو جیتی زندگی کے تھے، کھاؤ پیو چلے جاؤ۔

ویسے میاں کو یہ بتانے نہ تو روٹی پکانے والی خادمہ ہی آتی کہ بڈا ڈیوڑھی کے بوڑھے دربان نتھو خاں مرحوم کی کوشش کا نتیجہ تھا، اور بھوٹا باندی کے آثار کی بنیاد یہی مشعلچی لونڈا بڈا ہے، اور دونوں ہی مرتبہ میں میاں بیچارے کا تو صرف ہاتھ منھ دھو کر اور کلّی غسل کر کے سفید تولیے سے پونچھ لینے سے زیادہ دخل نہیں ہے۔ اب جو بھوٹا باندی نے بیٹی جنی تو میاں کا شبہ یقین راسخ سے ہم آغوش ہو گیا کہ سولہ سترہ سال قبل بڈا بھی انھیں کی ضرب تقسیم کا میزان تھا اور آج نوزائیدہ چاندی بی بی بھی انھیں کا حاصل ضرب ہے۔ بہر حال چاندی بی اپنے باپ اور ماں کی عقل اور شکل کا ہی امتزاج ہو سکتی تھیں۔ حویلیوں میں آنکھیں بھنویں چلیں اور بڈا کی جانب توجہ مبذول ہوئی، لیکن میاں کو بیٹی کی پیدائش کی خوشی اتنی تھی کہ اور کس شمار قطار میں تھے، چاروں بیگموں میں سے بھی کسی کی مجال کنکری پھینکنے کی نہ ہوئی، اور بھوٹا باندی کے ایسے بھاگ جاگے کہ باندی سے بڑھ کر بیگم کے زمرے میں داخل ہو گئی۔ اور ساونتی سلوات میں نجابت افاغنہ کی پیروی کرتی ہے اور افاغنہ صرف تخم میں یقین رکھتے ہیں، ان کے یہاں زمین کی کوئی اہمیت نہیں۔ بہر حال حاجی میاں کو اللہ نے چاندسی بیٹی عطا کی اور چاندسی بیٹی

برعکس نام نہادن زنگی کا فور تھی۔ سُرخ سپید، بلند و بالا، نجیب سیّد باپ کے بجائے کسی ریچھ کی اولاد نظر آتی تھی، اور اٹھارھویں سال میں بڈّانے بھی ہر مشعلچی کی طرح رکابیاں دیگچیاں چاٹ چاٹ کر ریچھ کی طرح کڑیل ہاتھ پاؤں نکالے تھے۔ مخبوط الحواس سہی لیکن گیہوں کے نابدان کے کیڑے تو پیٹ میں بجاتے تھے اور یہ کیڑے تو چھٹی حس اور ہاتھی کا پانچواں پاؤں بن کر ساونٹھے ہو جاتے ہیں۔ جوں جوں میاں کی بیٹی نے ہاتھ پاؤں نکالے، بڈّا سے مشابہت نمایاں تر ہوئی۔ حویلی والوں نے تو انداز دیکھ کر ہی بھانپا تھا اور چاندبی بی تو، آفتاب آمد دلیلِ آفتاب، روزِ روشن میں ان کی شبیہ کی زندہ تشکیل، نکھر کر سامنے آئیں۔ حاجی میاں بھی اندھے تو تھے نہیں اور اندھے کو بھی تاریکی کا ادراک تو ہوتا ہی ہے، بہرحال حسابِ دوستاں دردل، آں کہ پدر نتواند پسر تمام کند، ان کی نہیں تو ان کے بیٹے بڈّا کی کوشش کا نتیجہ سہی، وراثت کی گتھی تو سلجھ ہی گئی اور حق بحقدار رسید، بیٹی نہیں تو پوتی میں کلام کس مسخرے کو ہو سکتا تھا، اور میاں بی بی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔ جب حاجی میاں ہی کو مجسمۂ زشت روئی بیٹی نجیب الطرفین ذی النورین چمکتی دمکتی نظر آئی اور اس کے سیاہ تاب چہرے میں آئینے کی طرح اپنا عکس نظر آیا تو مجبور ہو کر ساری دنیا کو ایسی ہی دکھائی دی۔ اور چاندبی بی پر پُرزے نکال کر سیدھی ہوئیں تو ماں باپ کی داخلی وخارجی زشت روئیوں کا نہایت ہی بے تحاشا امتزاج تھیں، مگر حاجی میاں نے آنکھیں موندلیں۔ ساری دنیا کیسے اندھی ہو جاتی۔ برابر والے گھروں میں مشاطاؤں کے ذریعے بات چلائی چاہی تو چودھویں صدی کا اندازہ ہوا۔ کئی نوجوانوں نے باوجود اتنی بڑی توریث کی امید کے بھی انکار کیا اور جن برابر والے گھروں کے پیام آئے ان میں صاحبزادے نہایت ہی دور کی کوڑی لانے والے خلیفے قسم کے واقع ہوئے تھے اور حاجی میاں کی بیٹی سے نہیں، ان کی توریث سے شادی کر کے اس کے سہارے بقیہ عمر گلچھرے اڑانے کا منصوبہ بنائے ہوئے تھے۔ حاجی میاں ویسے تو ان صاحب لوگوں سے کہیں زیادہ پہنچے ہوئے بزرگ تھے، اس اکھاڑے کے پرانے کھلاڑی تھے۔ اللہ نے اپنی آبائی مالیت ہی بڑی اچھی بنائی تھی، پھر چھپر پھاڑ کر ایک بہت بڑی ملکیت بلاشان گمان مرحومہ پھوپھی کی وراثت سے بھی پہنچتی تھی، لیکن بیٹی کی توریث ایسے صاحبزادوں کے ہاتھ میں نہ دے سکتے تھے۔ یہاں تک کہ مولا علی کی موت نے بندہ علی کی شکل میں ان کی بیٹی کے لیے عرش سے دولھا اتارا اور ہر پہلو پر غور کر کے انھوں نے اس کو چاندبی بی کے لیے موزوں ترین شوہر سمجھا۔ ادھر

بندہ علی کا مقدر کھلا تو کھلتا ہی چلا گیا۔ موت اور شادی دونوں ہی راستوں سے حاجی میاں نے، بہت ہی خاموشی کے ساتھ اور اپنے طبقے کی روایات کے بالکل ہی خلاف، چہ میگوئیاں بچانے کے لیے سیدھے سادے طریقے پر نکاح کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ بندہ علی کے سماجی اور اقتصادی معاملات دُرست کرنے کے لیے اپنے اسٹاف کے مردِ آہن کو بندہ علی کے یہاں بھیج دیا، اور یہ مردِ آہن علاقے بھر کی مانی ہوئی شخصیت تھا۔ (ص 259 تا 272)

❁

حاجی میاں کا یہ احوال دو تین ہی بار پڑھنے سے محسوس ہو جاتا ہے کہ اس سے مصنف کا مدعا صرف یہ نہیں کہ قاری ایک بظاہر ''پکے دیندار'' لیکن ''ازدواجی کاروبار'' میں طاق زمیندار کی اندرونِ خانہ سرگرمیوں سے لطف اندوز ہو سکے۔ حالانکہ واقعات کے بظاہر سیدھے سادے بیان میں کہیں کہیں خود راوی/مصنف کی لطف اندوزی یہ بھرم پیدا کرتی ہے کہ وہ قاری کو بھی حاجی میاں کی رنگینیوں سے لطف اٹھانے کی دعوت دے رہا ہے، لیکن دیگر تمام کہانیوں کی طرح کہانی ''پھیر'' کا یہ حصہ بھی سہل ممتنع جیسی کیفیت کا حامل ہے اور غالباً کردار کی ظاہری دینداری نے مصنف کے مخصوص طنزیہ اسلوب میں استہزا کی شدت نے یہ بھرم پیدا کر دیا ہے۔ لہٰذا کہانی کی دوسری یا زیادہ سے زیادہ تیسری قرأت میں واضح ہونے لگتا ہے کہ بیان کا اصرار صرف ان رنگینیوں پر نہیں جن میں حاجی میاں شرابور ہے بلکہ حقیقتاً ایک اور ہی پہلو پر ہے۔

مندرجہ بالا اقتباس میں ''ایک ذرا جوان سی دکھائی پڑتی بیوہ'' ننجو، چار (موجودہ) بیگمات اور بھوٹا باندی کی زنان خانے میں موجودگی، اور ان سے پہلے ''حرام و حلال کرنے کی شرعی ترکیبوں کے راستے پندرہ سولہ سال کی عمر سے ستر پچھتر تک پہنچتے پہنچتے ہر دوسرے تیسرے برس ایک'' یعنی کم از کم بیس عورتوں کی آمد و رفت، غور کرنے پر ایسے مرد اساس معاشرے کا نقش ابھارتی ہے جو زن (اور زمین) پر ''قابو یافتہ'' رہنے کے لیے ہر نوع کی ''ترکیبیں'' اختیار کر سکتا ہے۔

یوں، کہانی کے اس جزو میں ابوالفضل صدیقی زمیندار حاجی میاں کو عورت کے تئیں جابر مردوں کا استعارہ بھی بنا رہے ہیں اور اُن (موجودہ) بیگمات وغیرہ کا احوال بھی رقم کر رہے ہیں جو، حویلیوں کی دیگر اشیا کی مانند بس برتی جا رہی ہیں — حاجی میاں کے ہاتھوں، دربان نتھو خاں کے

ہاتھوں، بڈا کے ہاتھوں— اور بصد خموشی۔

بے زبانی میں محصور اس شر آگیں ماحول میں ابوالفضل نے خیر کی ایک رمق ''بڑی بیگم'' کے روپ میں دیکھی ہے جس کے توسط سے وہ کہانی پڑھنے والے کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ شر سے شرابور ماحول/ افراد سے خیر کی کرنیں پھوٹ سکتی ہیں، بھادوں کی اماوس یوں بھی شق ہو سکتی ہے۔

کہانی سے مندرجہ بالا اقتباس کے لگ بھگ اختتام پر ابوالفضل صدیقی کا یہ لکھنا کہ ''ویسے میاں کو یہ بتانے نہ تو روٹی پکانے والی خادمہ ہی آتی کہ بڈا ڈیوڑھی کے بوڑھے دربان نتھو خاں مرحوم کی کوشش کا تھا اور بھوتا باندی کے آثار کی بنیاد یہی مشعلچی لونڈا بڈا ہے... '' اور چند سطور بعد یہ بتانا کہ ''... میاں کو بیٹی کی پیدائش کی اتنی خوشی تھی کہ اور کس شمار قطار میں تھے، چاروں بیگموں میں سے بھی کسی کی مجال کنکری پھینکنے کی نہ ہوئی... '' دراصل حاجی میاں کی پُر شر حویلی میں گلوگرفتہ عورتوں کی انتہائی بے زبانی کو واضح کر رہا ہے۔

مصنف کے یہ جملے، جہاں حویلی کی عورتوں کو ''عبا و چغا'' میں ڈھکے جبر و شر کی قیدی باور کرا رہے ہیں، وہیں یہ بھی محسوس کرا رہے ہیں کہ حاجی میاں بھی تقدیر کے ایسے جبر کا شکار ہے جس کی شدت کی انتہاؤں کا اندازہ خود اُس کو بھی نہیں ہے۔ وہ اولادِ نرینہ سے اپنی محرومی کا مداوا چاند بی بی کے ذریعے کر رہا ہے مگر نہیں جانتا کہ اُسی کے عائد کردہ جبر نے روٹی پکانے والی نجو کے ہونٹ سی دیے ہیں۔ وہ مجبور نہ ہوتی تو بتاتی کہ چاند بی بی، حاجی میاں کی بیٹی نہیں بلکہ ''ڈیوڑھی کے بوڑھے دربان نتھو خاں مرحوم'' کی اور اس (نجو) کی پوتی ہے، لہٰذا وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ اک نادیدہ و بالاترین ہاتھ نے ایسا پھیر ڈالا ہے کہ نجو اور نتھو کی پوتی، حاجی میاں اور اُن کی مرحومہ پھوپھی صاحبہ کی مشترکہ وراثت کی مالک بن رہی ہے۔ مگر کہانی پڑھنے والا جانتا ہے کہ اس پھیر کو مولا علی کی موت کے باعث سردار علی شاہ کی وراثت میں پیدا شدہ پھیر سے ملا کر ابوالفضل نے بھوتا باندی کی بیٹی اور رم کلیا کے بیٹے کی یکجائی سے ایسا سنگم بنا دیا ہے جہاں ''موت اور شادی دونوں ہی'' رم کلیا کے بیٹے کے لیے ہم معنی ہو گئے ہیں، کیونکہ دونوں ہی راستے کو اکب سے ہیں، جو ہیں کچھ، نظر آتے ہیں کچھ۔

کہانی کے باب دوم کا اختتام بندہ علی اور حاجی میاں کو نہ صرف چاند بی بی کے وسیلے سے ہم رشتہ دکھا رہا ہے بلکہ یہ بھی کہ حاجی میاں نے اس رشتے کو مضبوط تر بنانے کے لیے ''اپنے اسٹاف کے

Scanned with CamScanner

مردِ آہن کو بندہ علی کے یہاں بھیج دیا۔" حاجی میاں کے یہ دونوں اقدام، حاصل شدہ زمینوں اور ان کے عطیات پر گرفت مضبوط کرنے کے لیے ہیں — زمینیں جو اس کی بھی ہیں، بندہ علی کی بھی اور چاند بی بی کے عقد کے سبب دونوں کی بھی۔

بیٹی کے پیچھے پیچھے "اپنے اسٹاف کے مردِ آہن کو"، گویا جہیز میں، بندہ علی کے یہاں بھیجنے کی ایک وجہ حاجی میاں کے ذہن میں یہ بھی ممکن ہے کہ باپ کی موت کے بعد بندہ علی نے "ریاست کا انتظام ہاتھ میں لیتے ہی عام کاشتکاروں میں نمایاں مراعات جاری کیں اور ان مخصوص مولازادے ربیب گھرانوں پر اکرام کی بارشیں کردیں۔" (اقتباس:20)۔ یہ عمل آدابِ ملوکیت کی رو سے درست تھا، کیونکہ پُرخیر تھا، اور اس کا مرتکب آئندہ بھی ایسا ہی کچھ کرسکتا ہے لہٰذا بظاہر خیر نظر آتے مگر شرآگیں حاجی میاں نے وہ "مردِ آہن" بندہ علی کے یہاں بھیج دیا جو از ظاہر تا باطن شر ہی شر ہے،" اور بندہ علی کے سماجی اور اقتصادی معاملات" آدابِ ملوکیت کے مطابق "درست" کرسکتا ہے۔

یوں آئندہ صفحات میں ابوالفضل کی توجہ اُن طور طریقوں کی جانب مبذول ہو رہی ہے جو زمین اور اس کے عطیات پر جابرانہ گرفت قائم رکھنے کے لیے لازمی ہیں۔ یہ طور طریقے بھی انھوں نے ایک کردار ہی کے ذریعے نشان زد کیے ہیں۔ یہ کردار، سابقہ کردار کے توسط، سے اس طرح کہانی میں آیا ہے گویا سابقہ کا لاحقہ ہے، جیسے زن زمین اس طرح سابقہ و لاحقہ ہیں کہ بہ لحاظِ صفات و اثرات دو نہیں ہیں۔

33

"بڑے منشی جی"، "موٹے منشی"، "موٹا منشیا"، "کانا منشی"، "کھترا منشی"، "کالی بلا"، "دیو سیاہ"، "منشی جی شیر افگن خاں"، "ملکھاں سنگھ" اور کیا کیا — منشی کمال شیر خاں کے کتنے ہی اسم صفت اور القاب تھے جو ان کے مخالفین کے حلقوں میں زباں زد تھے۔ اپنے ضلعے کی مانی ہوئی واحد مردِ آہن کی علامت اور آس پاس کے اضلاع کی جانی پہچانی شخصیت، اور یہ لوہا خان صاحب نے اپنی بے پناہ جسمانی طاقتوں اور مخصوص بے پایاں دماغی صلاحیتوں کے بل پر منوایا تھا۔ وہ خودساختہ لوگ تھے جنھیں ایک آدمی نہیں بلکہ خیر کا نہیں تو شر کا ایک ادارہ کہتے ہیں۔ ویسے ایک گروہ ان کے

لوگ تھے جنھیں ایک آدمی نہیں بلکہ خیر کا نہیں تو شر کا ایک ادارہ کہتے ہیں۔ ویسے ایک گروہ ان کے مداحوں کا بھی تھا۔ وہ جگہ جگہ مثبت منفی تجربوں سے پہچانے جاتے، کہیں ظلم، دہشت، بربریت، استحصال بالجبر، عیاری، بے ایمانی، دھوکہ دہی، بعض مختصر حلقوں میں بہادری، تدبر، حکمت عملی، نمک حلالی، یک رنگی، وضعداری اور خوش اخلاقی کے اوصاف سے مالا مال خیال کیے جاتے: حالانکہ ان تمام خوبیوں کے باوجود دنیا میں ان کے سچے دوست مفقود کی حد تک کم اور دشمن زیادہ تھے۔ خداداد بے پایاں ذہانت اور بیباک جبلت، دونوں ہی صفتیں لے کر دنیا میں آئے تھے۔ بچپن ہی سے اپنے وقت کی بہترین لاٹھی اور بنوٹ کے فن کی تربیت نصیب ہوئی تھی جس میں ان کی خداداد جسمانی طاقت اور چستی پھرتی نے چار چاند لگا دیے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ دشمن کی پہچان اور موقع شناسی کی مخصوص ذہانت۔ رزم میں شکست نا آشنا تھے، پھر عقلمند رؤسا کی صحبت، ماہر وکیلوں اور چلتے ہوئے خانہ داروں سے کسب فیض نے ان کی خداداد ذہنی صلاحیتوں میں چار چاند لگا دیے تھے۔ تاریخی مقدر دو جملوں میں یہ کہ جس رزم میں اُترے مرد میدان ہی ثابت ہوئے، جس بزم میں بیٹھے سر پنچ بن کر چھائے رہے اور بڑی بڑی اہم اور پیچیدہ گتھیاں سلجھا کر ہی اٹھے اور دونوں ہی میدانوں میں ایک دفعہ کو تو واہ واہ ہوگئی۔ حالانکہ اعتبار سے آخر الذکر میں مستثنیات نظر آتے، جیسے خالق نے انھیں اپنے جذبۂ برہمی کی تشکیل بنا کر دنیا میں بھیجا تھا، اور تخلیق کا یہ غصہ پیدائش کے بعد ان کی موت تک داخلی اور خارجی دونوں ہی صورتوں میں کار فرما رہا۔ بچپن کی چیچک سے لے کر نوجوانی اور جوانی کی گونا گوں چوٹوں تک تمام بدن، چہرے اور سر پر قدرت جیسے اظہار برہمی کی تجدید کرتی چلی آرہی تھی، اور معرکے معرکے میں نت نیا میک اَپ کرتی رہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ صانع قدرت نے اس خارجی کریہہ المنظری کے ساتھ ساتھ داخلی ملمع نہایت چمکدار چڑھایا تھا، اپنے مطلب کی بات کرنے اور دل میں خود اترنے کی حد تک اتارنے کے فن سے آراستہ کیا تھا۔ ایسے مواقع پر ٹھیک کتابی اور لغوی معنی میں زشت روئی بھی ان کے مخاطب علیہ کی آنکھوں سے محو ہو جاتی، فطری درشت لہجے میں دودھ شہد کی دھاریں چڑھ جاتیں، وہ کوئی اور آدمی ہوتے۔ بات کرنے کا انداز بلا کا پُرتاثیر، وجود، آواز کی شیرینی، لہجے کی حلاوت، بشرے کی گھلاوٹ، مخالف سامع اور مخاطب علیہ کو مسحور کر دیتی اور ایک دفعہ کو غریب ان کی منطق کے آگے سر جھکا ہی دیتا۔ اور وہ ان کہی کہلا کر ہی رہتے، اور دل میں اتر

کر ہی مانتے۔ رندا کیا ہوا آبنوس کا لٹھا سا وجود، جو پہلی نگاہ میں ذرا دور سے چلتا پھرتا سنگ موسیٰ کا گھنٹہ گھر دکھائی پڑتا، پونے سات فیٹ قد جو دس گزسی اونچی بندش والی پگڑی کے ساتھ آدمی سے زیادہ دیوزاد کی حدوں میں نظر آتا۔ پھر یہ کہ یہ بلندی ان کے چوڑے چکلے ہاڑوں پر متناسب نظر آتی۔ وہ دوبانہیاں تھے، ان کے ہاتھ کندھے سے لے کر پنجے تک لمبائی میں ان کے قد سے بھی غیر متناسب تھے اور انگلیاں گھٹنوں کے محاذ سے بھی نیچے لٹکتی تھیں، ہتھیلیاں اور انگلیاں کلیاں کسی کھردرے درخت کی ٹہنیاں اور گدھے۔ اور ہاتھوں کی یہی قدرتی غیر معمولی لمبائی انھیں شمشیر زنی، لاٹھی اور کے بازی، ہاتھا پائی کے فن میں اپنے مدمقابلوں پر فوقیت اور سبقت کا باعث تھی۔ بھونرا سی سیاہ گھنی ڈاڑھی، جیسے باریک فولادی تاروں کے گچھے رخساروں پر چپکے ہوے اور بالوں کی نمو روش قدرتی طور پر بجاے نیچے کے اوپر کو چڑھتی ہوئی۔

جبڑوں، کنپٹیوں، رخساروں اور دہن کی گول گول سی اٹھی ہوئی موٹی موٹی ہڈیوں کی تعمیر چہرہ، سنگِ سیاہ کی پہاڑیوں کی چوٹیوں کا تصور دیتا ہوا، اوپر سے جھکی ہوئی چٹانوں کی طرح لٹکتی پیشانی جس کے نیچے گنجان بالوں والی چوڑی چوڑی جٹی ہوئی تاروں کے گچھے سی بھنویں جن کے اندر سے دو ہمہ وقت دہکتے شعلے سے متحرک نظر آتے۔ ویسے تو ان کی ہستی ہی بے پناہ تھی مگر منشی کمال شیر خاں کی آنکھیں ان کے تمام وجود میں سب سے زیادہ غضب کی تھیں۔۔۔ اپنی بات منواتے حتیٰ کہ اپنی من مانی کراتے ہوے ان آنکھوں میں سے ایک جوڑی اور آنکھیں نکل آتیں جو بات کرتے وقت لٹک لٹک کر رخساروں پر آ پڑتیں۔ اور دودھ کا دودھ پانی کا پانی کرنا تو بائیں ہاتھ کا کھیل تھا لیکن پانی کا دودھ بنانا یا دودھ کو پانی کر دینا بھی ان کے جبڑے کلے کے لیے کچھ ایسا ہی تھا، اور حق و ناحق، جنون وخرد، پاک ناپاک، حرام وحلال وغیرہ کا معیار ان کی اپنی کسوٹی پر پورا اترنا لازمی تھا۔۔۔ (ص 272 تا 275)

❁

کہانی ''بھیر'' کے تقریباً چودہ صفحات (272 تا 275) میں منشی کمال شیر خاں کے مندرجہ بالا حلیے کے علاوہ حاجی میاں کے لیے اُس کی پرتشدد اور شاطرانہ خدمات بھی بیان ہوئی ہیں تا کہ قاری سمجھ سکے کہ ایسی خدمات حاصل کرنے والا حاجی میاں دراصل منشی کمال جیسوں ہی کے زمرے میں

Scanned with CamScanner

آ تا ہے، بھلے ہی اس کے جبر وتشدد کا اسلوب اور ہدف مختلف رہے ہوں — اور چاند بی بی سے نکاح کے بعد منشی کمال کی خدمات بندہ علی کو منتقل کرنے کا مطلب غالباً یہ ہے کہ اب وہ مراعات واکرام کی بارشیں کرنے والے بندہ علی کے بجائے اسے از ظاہر تا باطن اپنا حقیقی پسر نسبتی بنانا چاہتا ہے۔

منشی کمال شیر خاں کا مندرجہ بالا چہرہ مہرہ دیکھ کر اسملاژ کے قاری کو یاد آیا ہوگا کہ ابوالفضل صدیقی نے حاجی میاں کا تعارف کراتے ہوئے بھی اس کے ڈیل ڈول اور لباس وغیرہ کی تفصیل بیان کی تھی جو اقتباس 23 اور 26 میں درج ہو چکی ہے۔ ابوالفضل صدیقی نے اپنی دیگر کہانیوں میں بھی مناسب مواقع پر اور بقدر ضرورت کہانی کے اہم کرداروں کی صورت شکل چال ڈھال، لباس اور طرز گفتگو وغیرہ کے منفرد پہلو یکجا بیان کیے ہیں۔

آئندہ تین اقتباسات میں کہانی ''دھارا'' کے تین اہم کرداروں کے چہرے مہرے اور طور طریقے ابوالفضل کے مصور قلم کی تین مثالیں ہیں۔ چتریا نامی کردار کی نقاشی میں انھوں نے ایک شوخ رنگ بھی شامل کیا ہے۔

34

اور دھارا اچھان سا نوجوان تھا جس پر نوجوانی بھرپور نشوں کے ساتھ جھومتی سی چڑھی تھی اور کانپور ملوں کی زندگی اور چمر گونٹے کی سیاست نے اُسے تپ تپ کر بجھا ہوا اور بجھ بجھ کر تپا ہوا فولاد بنا دیا تھا۔ دراز قد، پیچ در پیچ اعصابی رسیوں میں لپٹا ہوا جسم، چال ڈھال میں تلوار کی لپک اور بجلی کی تڑپ، جو دوسروں کی مصیبت میں متحرک نظر آتی، تیوروں میں شیر والے دم خم، جو اپنوں میں بیٹھ کر بھیڑ کی سی آنکھیں بن جاتے۔ ذلیل شودر کے گھر میں جنم پا کر اور سخت کوشی اور تلخ کامی کی گود میں پل کر بھی اس کے جسم تو جسم، آنکھوں سے زندگی کی شیرینیاں ذرا کم نہ ہوئی تھیں۔ وہ نوجوانی اور طاقت کا مجسمہ تھا، کام ومحنت کا پرزہ تھا اور اب تو چمر گونٹے میں آزادی کا سوال بنا ہوا تھا اور جیسے سب کی تقدیر کے بھٹکے ہوئے ستاروں کی لگام تھام کر راہ راست پر لانا چاہتا تھا۔ اُس کے لہجے میں شودر والا گھگھیاتا دانت نکالتا انداز نہ تھا۔ اس کی چال راجپوتوں سے زیادہ متوالی تھی۔ اس کا سینہ اور مونڈھے پٹھانوں سے کم بلند وبالا نہ تھے۔ وہ گردن اٹھا کر چلتا، تندگامی کے ساتھ قدم قدم پر جھنڈے گاڑتا ہوا، اور

Scanned with CamScanner

اپنوں میں اپنی بڑی بڑی، ہونٹوں پر پڑی مونچھوں کے نیچے ہمہ وقت مسکراتا سا دکھائی دیتا۔ اس کی کڑک پر ہوا میں گرہیں پڑ جاتیں اور ادنیٰ سی حرکات وسکنات میں زندگی مچلی سی پڑتی...

(ص44 تا45)

35

ایک نہیں ہزار کلجگ آ جائے مگر پچھی تو کبھی نہیں آتی، لیکن کہتے ہیں کہ کلجگ میں چمار کے گھر میں پدمنی جنم لیتی ہے، اور سیوتی اپنے باپ کے گھر میں کلجگ کی جیتی جاگتی نشانی تھی۔ گلاب کی پتی جیسا رنگ، صباحت و ملاحت کا زندہ نمونہ، بھرے بھرے نازک خدوخال، بیضوی چہرے پر اُبھرے ہوئے نقوش، کھڑی ستواں ناک، یاقوت کی تراشی ہوئی قاشیں سی دونوں ہونٹ جن پر سچے موتیوں کی لڑی سی دانتوں کی چھوٹیں، بغیر ہی مسکرائے مسکراہٹیں تڑپتی رہتیں، اور کشمیری سیب جیسے رخسار اور مرمریں پیشانی جس کے نیچے تلوار سی سُتی بھنویں بڑی بڑی اور آنکھیں جن میں بغیر ہی لگائے خمار کا جل کی لکیریں اور بھڑکی ہوئی ہرنی جیسے تیور، اور مجموعی طور پر آفتاب سا دہکتا ہوا چہرہ اور یہ سب کچھ ایک بلوریں صراحی جیسی گردن پر رکھا ہوا، جس کے دائیں بائیں اٹھے ہوئے شانے، جن کے ساتھ وی شیپ کے تناسب سے اُبھرا ہوا سینہ، جیسے مغل طرز تعمیر کی دو محرابوں کے سرے ملے ہوئے، اور اس کے پیچھے سیاہ ریشم کے دو لچھے سر سے پیر تک گندھے، جیسے پشتینی محنتوں کے سارے پیچ وخم اپنے کالے بالوں میں لپیٹے ہوئے، گلرنگ بانہیں جن کے گداز میں سخت کوشیوں کی جلا، شیشے کی طرح دہکتی، گول گول کلائیاں اور چھوٹے چھوٹے ہاتھ، اگر زور سے جھٹکا دے دے لکھوٹیاں (لاکھ کی بنی ہوئی چوڑیاں) ٹُوٹ کر جا پڑیں، گدرایا ہوا جسم جس پر موزوں قامتی بکھری سی پڑتی۔ بیساکھ جیٹھ کی آندھیوں اور ساون بھادوں کی پھواروں کا پالا ہوا وجود، دھان کے انکھوے کی طرح شاداب اور جنگلی بانس کے کلّے کی طرح تند، اور پھر محشر خیز چال چیت کی ہواؤں سے حرکت میں آئی ہوئی اور موسم بہار کے دیوتاؤں والا ناچ اپنے آپ سیکھی ہوئی اور سلامت روی اور یکسانیت کے ساتھ چلتی ہوئی، جلترنگ بجاتے چشموں کی آواز کے زیروبم سے بنا ہوا لہجہ، جیسے صانع قدرت نے سب کچھ بنا کر اور سکھا کر اتارا! (ص46 تا47)

Scanned with CamScanner

36

...اور چتریا بھی بانکا کہلایا تھا اگرچہ ظاہری و باطنی دونوں صورتوں سے وہ بانکے سے زیادہ ''بانکی'' تھا۔ پستہ قد، تنگ پیشانی، کوتاہ گردن، مٹیالا مٹیالا سا رنگ اور لوکی ماری امیا کی طرح چیچ سا چہرہ، بدن چور — اندر سے مضبوط اور باہر سے کمزور دکھائی پڑتا ہوا، چھوٹی چھوٹی ذرا کینڑی آنکھیں جن میں صبح شام دونوں وقت سرمہ لگایا جاتا اور سیاہی ہی سیاہی نظر پڑتی۔ ناریل سا سر جس پر سخت آہنی تارسے بال پیچھے سے، دو تہائی اوپر سر تک باریک کٹے ہوئے اور بقیہ ایک تہائی سامنے کو پیشانی پر چھجے کی صورت میں پڑے ہوئے، اچھی طرح کڑوے تیل میں تربتر، جو بہہ بہہ کر کنپٹیوں تک پہنچتا اور ہاتھوں سے چہرے پر مسل مسل کر مستقل چمک پیدا کرتا۔ کانوں میں سونے کی مُرکیاں اور انگلیوں میں چاندی کی انگوٹھیاں چھلے۔ کبھی کبھی چھٹے چھماہے ٹھڈی پر دس پانچ بال نمودار ہو جاتے تو کل چہرہ کھرچوا لیتا، مونچھوں پر نرم نرم چھدرے چھدرے گنجے بال جیسے بازار سے ایک آنے والی مونچھیں خرید کر لگالی ہیں اور ان کے اون میں بھی کیڑا لگ گیا ہے۔ ہاتھ میں بجائے لاٹھی کے برچھا، اظہار لٹھیا گیری میں لائسنس اسلحہ دھاردار سے مستثنٰی ہونے کا سرٹیفکیٹ، تمام جسم پر مردکی سی سختی اور چال ڈھال میں عورت کا سا لوچ اور نرت آواز میں صنفِ غالب کا لہجہ اور گفتگو میں صنفِ نازک کے محاورے... (ص 63 تا 64)

❋

کہانی ''پھیر'' کا تیسرا باب (صفحات تقریباً 28) منشی کمال کے ناک نقشے اور ان خدمات کی تفصیل پر مبنی ہے جو اُس نے اولاً حاجی میاں اور بعد میں بندہ علی کے لیے انجام دیں۔ اُن خدمات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اقتباس 33 میں منشی کمال کے صرف ناک نقشے کا بیان اس غرض سے درج کیا گیا کہ اسملاژ میں ابوالفضل صدیقی کی حلیہ نگاری کی ایک مثال شامل ہو جائے۔ لیکن منشی جی کی خدمات کی تفصیل کے بجائے اقتباس 37 میں کہانی ''پھٹا دودھ'' (صفحات 171 تا 245) کے ان چونتیس صفحات کا اختصار درج ہے جو ممّاں غنی حیدر خاں نامی شخص کے طور طریقوں کا احاطہ کر رہے ہیں۔ باوجودے کہ یہ طور طریقے ایک حد تک منشی کے مشابہ ہیں، لیکن مرتبِ اسملاژ کا خیال ہے کہ

Scanned with CamScanner

اس کے مقابلے میں ممّاں غنی حیدر خاں کہیں زیادہ توانا اور پُر جہات کردار ہے۔اس کی تشکیل میں ابوالفضل صدیقی کی بیشتر فنکارانہ صلاحیتیں اور اُس ماحول و معاشرت کا گہرا مشاہدہ بروے کار آیا ہے جو ان کی زیادہ تر کہانیوں کا پس منظر بنے ہیں۔حیدر خاں کے تمام سیاہ و سفید کے ساتھ ہی ساتھ آس پاس کے مرد و زن اور معاشرت کوائف کے رنگ ڈھنگ دکھا کر ابوالفضل نے حیدر خاں کو ایک عہد اور مخصوص ماحول کا جیتا جاگتا کردار بنا دیا ہے۔

کہانی ''پھٹا دودھ'' کا مرکزی کردار نجیب، تاریخ و عمرانیات کا پروفیسر ہے۔مصنف نے حیدر خاں کو پروفیسر نجیب کی یادوں کے وسیلے سے کہانی کا جزو بنایا ہے۔اسمبلاژ میں کہانی کے وہ صفحات اور عبارتیں شامل نہیں جو حیدر خاں سے غیر متعلق محسوس ہوئیں۔

37

... آج تمام رات کی ذہنی رستخیز کے بعد آدھی رات کھسے نور ظہور کے وقت صبح کاذب کے فریبِ نظر سپیدے کی روشنی میں ''اگلے وقتوں'' والوں میں سے انھیں اپنے ایک عم بزرگوار یاد آئے جن پر ساونتی دور کے اثرات کی چھاپ اپنے ساتھ والوں سے زیادہ گہری باقی رہ گئی تھی۔کوچ کے گدے تکیوں میں دھنسے، کچھ پاؤ سوتے اور کچھ پون جاگتے جیسی کیفیت میں، ممّاں غنی حیدر خاں جیسے اس وقت نصف صدی بعد ان کے سامنے آ کھڑے ہوے۔یوں تو وہ ان کے رشتے کے ماموں تھے لیکن کہیں بھی سگوں سے پیچھے نہ رہ جاتے تھے۔خاندان کے دوسری سطح کے پڑھے لکھے لوگوں میں تھے اور خاندان کو ایک واحد اکائی تصور کر کے فرد فرد کے معاملات میں گہرے خلوص، اور اس سے زیادہ سرگرم دنیاداری کے ساتھ دلچسپی لیا کرتے تھے... (ص 208)

... ممّاں غنی حیدر دیہاتی ضرور تھے لیکن بڑے سمجھ دار پرکھ والے لوگ تھے اور پرلے درجے کے ذہین، اس پر فارسی مکتب کی تعلیم، سونے اور ملمع کے فرق کو اچھی طرح پہچانتے تھے... (ص 209)

... جبکہ ممّاں خود اس نوعیت کے بزرگ واقع ہوے تھے جنھیں وقتاً فوقتاً بافیض آدمیوں سے کام پڑتا رہتا، اور کبھی کبھی تو فیض رسانی کی ایسی اونچی جست لگاتے کہ الہ آباد اور نینی سنٹرل جیل کی

Scanned with CamScanner

دیواروں کے پار آپڑا کرتے۔ ویسے وہ اپنے وسیع آدمیوں پر مشتمل کنبے میں اچھے آدمی خیال کیے جاتے تھے اور پچھلی صدی کے اواخر والی سرکشی کے بچے ہوئے خمیر سے اٹھی ہوئی جبلت کے تحت اپنے خاندان، بستی اور نواح کے ذرا مختلف سے آدمی واقع ہوئے تھے۔

ہم چشموں اور ہم نشینوں میں ذرا چھنکے چھنکے نظر آتے تھے...(ص210 تا211)

... ویسے ذاتی حیثیت سے وہ کھاتے پیتے درمیانی حیثیت کے زمیندار تھے جو کچھ کر کے کھانے سے اتنے ہی مستغنی تھے جتنے اونچے اور لمبے چوڑے لوازمات والے بڑے بڑے زمیندار ہوا کرتے ہیں، مگر یہ چھوٹی سی زمینداری، جس کے وہ مالک تھے، ابھی اس نصف صدی میں ایک بڑی آبائی ریاست کی حد تک لمبی چوڑی زمینداری میں سے وراثت در وراثت حصے بخرے ہو کر ان کو پہنچی تھی، لہٰذا روایات بڑی تھیں؛ اور چونکہ آبائی ریاست یکجائی و بلا انقطاع تھی لہٰذا تقریباً سو سوا سو میل مربع علاقے میں پشتینی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، اور ان کی بے پناہ قابو یافتگی اور بے پایاں ذہانت کے تحت تمام اہلِ خاندان نے اس دھاک کے تحفظ کا تنہا ان کو اجارہ دار بنا دیا تھا۔ لہٰذا اس پہلو سے وہ اس طویل و عریض آبائی وجدی بازی گاہ کے واحد شیر تھے جنھیں چیلنج کرنا تو درکنار، کسی میں مدافعت کا بھی یارا نہ تھا، اور ان کے حملے کو قضا و قدر کا طمانچہ سمجھ کر راضی برضا بیٹھ جاتا۔ ان کے نکتہ چیں اور خاص طور پر متعلقہ پولیس افسران ان کی اس قابو یافتگی پر علاقے کو "غیر آئینی ملک" کے طنزیہ لقب سے پکارا کرتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی ذات سے اس اپنی خاندانی ملکیت کی بانٹ اور اس کے آس پاس چار چار چھ چھ کوس تک غیر آئینی حرکتیں بھی سرزد ہوتیں لیکن اکثر و بیشتر "قتلِ موذی قبل ایذا" کر کے، اور کبھی کبھی جب فتنہ سر اٹھا ہی جاتا تو سامنا بچا کے کسی بغلی گھونسے کے ذریعے دبا دیتے۔ وہ رائے اور ہمت کا متناسب ترین امتزاج تھے، ظلم کے پیٹ سے احسان پیدا کرنے کا گر اور ڈیوائڈ اینڈ رول کا فن خوب آتا تھا...(ص211 تا212)

... ہر ایک کی ہر کام کے لیے آمادگی، جوڑ توڑ، حکمت عملی کے ذریعے، لڑاؤ اور حکومت کرو، دھمکاؤ زیادہ مارو کم، اور اگر مارنا پڑے تو اتنا مارو کہ پانی نہ مانگے، یکے بہ دلیری یکے بہ فریب، دو دن دیک پچکار چڑھاؤ اتار تھیں جن میں مرحوم شادی بیاہ برات میلہ ٹھیلہ، کیسا ہی مجمع ہو، اکثر معصوم اور دور سے دیکھنے والے تماشائی نظر آتے، بڑے ہی صلح کل، نرم جیسے ریشم، لیکن ساتھ ہی ساتھ ریشم کو تلوار کی

Scanned with CamScanner

دھار نہیں کاٹ سکتی۔ جہاں ہنگامہ ہونے والا ہو، مجال کیا جوان کے ہوتے ہوئے ہو تو جائے، اور جہاں نہ ہونے والا ہو وہاں بات کیا ہوئی جو نہ ہو ... غرض شیر اور لومڑی دونوں ان کی کھال کے نیچے بستے تھے۔ ہم چشم بالاتفاق رائے تسلیم کرتے اور اس پر کہنے سننے کی گنجائش نہ تھی کہ جب میدان میں اترنا پڑا تو لاٹھی کے فن میں ایسے ماہر ثابت ہوئے کہ قرن وسطیٰ کے سپاہیوں کی یاد تازہ کر دی اور کچھ ''بڑی'' کر کے رہے۔ ویسے رزم میں اور میدان میں اترنے میں ہمیشہ گھائی بچاتے رہتے۔ البتہ گوریلا فائٹ اور شب خون میں اکثر حصہ لیا کرتے۔ ادب کے میدان کے تو مرد نہ تھے۔ ویسے عالموں اور علاماؤں کے خاندان میں دوسری تیسری سطح کے پڑھے لکھے لوگوں میں سے تھے، مگر بے پناہ ذہانت کے ساتھ مصرفِ علم کے گُر کے اتنے اچھے ماہر اور علم مجلسی میں ایسے طاق کہ محفلوں کی جان، خوش فکر، شیریں گفتار، وجیہہ اور خوشرو بھی؛ رزم کے وقت جلالِ مجسم اور بزم میں جمال ہی جمال نظر آتے تھے اور داخلی اور خارجی ہر پہلو سے قدآور شخصیت کے حامل دکھائی پڑتے۔ اور دل موہ لینے میں تو طاق تھے، تکلم کے وقت مخصوص انداز اور شیر وشکر میں گھلی ہوئی آواز میں مونچھوں کے گپھوں میں سے گلاب جھانکتے، بحث کے وقت منہ سے بیلے کے پھول جھڑتے، اور غضب تو یہ تھا کہ آنکھوں پر بھی قادر تھے۔ مخاطب علیہ ان کی آنکھوں کی چمک اور تیوروں کی دمک سے خیرہ ہو کر لوٹ پوٹ ہو جاتا اور ایک دفعہ کو انھی کا ہو کر رہ جاتا۔ آنکھوں پر دوسری عجیب قدرت وقتِ ضرورت بغیر پیاز کے عرق میں ڈوبا رومال پھیرے پانی کی لڑیاں نکال لینا تھی۔ بلند و بالا قد، قوی ہیکل، شہزور، پٹے باز، لاٹھی اور کشتی کے فن میں یکتا، مشت زن، خاصے نشانے باز، پورے شہسوار — غضب کے کینہ پرور، ہتھکنڈے باز بھی اور کہیں کہیں پر بے پایاں خلوص بھی۔ جس سے مخالفت ہوئی اس کو ساری عمر چین سے نہ بیٹھنے دیا اور زندگی کا ایک دن بھی خیریت سے نہ گزرنے دیا، اور لطف یہ کہ اپنا ہر دن سکون سے کاٹا۔ اور بات جس کم نصیب سے دشمنی تک پہنچ گئی تو عدم آباد تک پہنچا کر ہی دم لیا۔ انتقام کے مواقع عمر میں شاذونادر ہی آئے۔ چھوٹے موٹے جو آئے بھی، کسی پر قرض نہ چھوڑ گئے اور ہمیشہ مع سود ادا کیا۔ البتہ بے چارے قرضے کی گٹھڑی سر پر لے کر گئے۔ شروع جوانی میں قتل، آتش زنی، بلوے وغیرہ کے سنگین جرائم میں قانون کی گرفت میں بارہا آتے آتے بچے اور تین چار مرتبہ پھنس پھنس کر عدالت سے کورے بچ کر گھر کو آئے بھی... تکلم کی خالص شہد والی شیرینی کے باوصف اور خواہ

گھاسلیٹ، گھی اور سیکرین میں پکی ہوئی ہوں، مگر عید کی سویوں جیسی لچھے دار باتوں اور شب برات کے حلوے جیسے نرم رویے کے باوجود ممتاں غریب کو علاقے بھر میں پیٹھ پیچھے سرگوشیوں، اشاروں، کنایوں میں چوپال چوپال بیٹھ بیٹھ کے ملاحیاں اور گالیاں اور حویلی حویلی گھر گھر کوسنے لعنتیاں ہی پڑتی رہتیں۔ لیکن ممتاں کا زمانہ بیل گھوڑے والا تھا اور دعا بددعا آج کل کی طرح اپالو اور لونا کی رفتار سے تو چلا نہ کرتی تھیں کہ کھٹا کھٹ ہارٹ فیل، ہیمرج، بلڈ بریشر، ورنہ ایر کریش کو لیجن وغیرہ کا بہانہ لگا کر رتی کھینچ لی؛ ان کے زمانے کی رفتار کے معیار سے رسی دراز کرنی پڑتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے خاصی لمبی عمر پائی۔ بددعائیں کہتے ہیں کہ عرشِ اعظم سے جا کر ٹکراتی ہیں لیکن ممتاں کو جتنی بددعائیں دیں سب کی سب بابِ اجابت سے ٹکرا کر ممتاں پر پڑنے کے بجائے الٹی دینے والوں کے منھ پر پڑیں، اور پھر ان سب بدخواہوں نے منھ کی جب کھائی جب یہ امید بر نہ آئی کہ ممتاں کا آخیر خراب ہوگا...

اور یہ ممتاں کی فتح کی انتہا تھی کہ نزع کی اذیت بھی انڈر کلوروفارم ہوئی۔ پروفیسر کو کل کی سی بات یاد تھی، وہ اس زمانے میں سینئر لکچرر تھے اور ممتاں کی موت میں شرکت کے لیے یونیورسٹی سے تین روز کی رخصت لے کر گاؤں آئے تھے اور سوئم کی فاتحہ پڑھا کر واپس گئے تھے...

(ص 213 تا 216)

...وہ کوئی ایسی ہستی تو نہ تھے کہ ترکے کی تعداد اور ورثا کے حصوں کے درمیان میں گھوم گھام کر رہ جاتی۔ ان کی زندگی کا دائرہ تو بہت وسیع رہا تھا، اور کردار کا کینوس بہت لمبا چوڑا، اور بازی گاہ لق و دق تھی۔ ذرا دیر میں بات آدھی صدی کے میہمان کے گرد گھومنے لگی، اور گھوم گھام کر سوئم کے دن ہی یومِ حساب آ گیا۔ پہلے تو مرحوم کے نام کے ساتھ رحمت کے سب کلمے اور بخشش کی تمام دعائیں اور جنت کی کل پیشگوئیاں لگا لگا کر ان کے دستِ خاص کے کیے ہوے سات قتلوں کی تفصیل ہوئی، جن میں سے چار اللہ بخشے خاں صاحب مرحوم نے دن دہاڑے درمیدان للکار کر کیے تھے؛ پھر ان تین کی تفسیر ہوئی جو، اللہ غریق رحمت کرے، مرحوم نے اندھیری رات میں سرانجام دیے تھے۔ خیر، اوّل الذکر چار تو ممتاں کی وکٹوریہ کراس جیسی چیزیں تھیں، ویسے وہ تین بھی، باوجود اندھیری راتوں میں سرانجام دینے کے، اول الذکر چار سے کم اظہر من الشمس نہ تھے، اور ان میں سے دو سے سچ پوچھیے تو ممتاں نے کبھی پنچوں میں بیٹھ کر انکار بھی نہ کیا تھا۔ اوّل الذکر چار، جیسا کہ بیان کیا، خان صاحب نے

درمیدان حریف کو للکار کر بہادری اور بنوٹ بازی کے فن کے اعلیٰ مظاہرے پیش کیے تھے جن سے دو دو چار چار سال بعد خان صاحب کی ساکھ دھاک بلند اور مضبوط تر ہوتی گئی اور اس سطح کو پہنچے جو انھیں آج بفضلہٖ حاصل تھی۔ بقیہ تین، جو اندھیری رات والے تھے، ان میں سے ایک ممّاں شرعی قسمیں کھا کھا کر الزام لگانے والوں کو مغلظات گالیاں دیتے دیتے غصّے میں آپے سے باہر ہو کر رو پڑا کرتے۔

یہ الزام ان پر ان کے نوجوان غیر شادی شدہ اکلوتے سالے کے قتل کا تھا جو بدنصیبی سے ان کا چچازاد بھائی اور شریکِ زمینداری بھی واقع ہوا تھا اور خان صاحب سے اپنے حصے کا بٹوارا کرنا چاہتا تھا اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتا تھا۔ ویسے موت سیدھی سادی طبعی سی ہوئی تھی، کوئی پیچیدگی نہ تھی۔ رات کا کھانا کھا کر چوپال بانوں کی بنی ہوئی کھری چارپائی پر سویا، جیسا کہ برسات میں بالعموم دیہاتی سوتے ہیں، برابر کے دالان میں ممّاں سورہے تھے۔ صبح کو مُردہ ملا اور دوپہر تک ''وقت آ گیا تھا''، ''وعدہ کم نہ زیادہ''، ''بس اتنی ہی لکھا کر لایا تھا''، ''ہائے ہائے کیسا کڑیل جوان تھا''، ''پھر مالک کی مرضی، اپنی کھیتی ہے کچی کاٹ لیں یا پکی کاٹیں، کوئی دم مارنے والا کون؟'' وغیرہ وغیرہ، خوشبوؤں، پھولوں اور سفید کفن میں کلمہ طیبہ کی پُررقت گونج کے درمیان دفن کر دیا گیا۔ مار پیچھے پکار تو ممکن نہ تھی۔ پھر خان صاحب کی بیوی ہی کو تنہا وارث چھوڑنا؛ پھر مرحوم کا آبائی زمینداری کے بٹوارے کا پیہم مطالبہ جس پر ممّاں بحیثیت قانونی نمبردار کل پر قابض تھے، خواہ مخواہ ممّاں غریب کی جانب پانی مرتا تھا۔ دفن بلکہ کفناتے ہوئے ہی آنکھوں ہی آنکھوں میں چہ میگوئیاں ہوئیں۔ غسال سے پوچھا تو ایک نے کہا کہ ٹیٹوے پر نیل کا نشان تھا، لیکن دوسرے نے کہا کہ اس نے نہیں دیکھا ... لہٰذا دفن سے لے کر سوئم تک کسی سے اور کسی کے درمیان سوال جواب تو ممکن ہی نہ تھے، بے چارے جمع ہو کر نہیں بلکہ ایک ایک کر کے مرنے والے کی چارپائی کا آنکھوں ہی آنکھوں میں معائنہ کرتے رہے اور نشانات سے اپنے اپنے دل ہی دل میں اس نتیجے پر پہنچے کہ کسی قدرے پتلی مونگیری بانس کی لیک دار لاٹھی کا ایک سرا عین ٹیٹوے کی سیدھ چارپائی کے سوکھے میں پھنسا کر اور ٹیٹوے پر سے گزار کر دوسرے کو جو دبایا تو لیک دار لاٹھی کا بانس کامیاب سے کامیاب پھانسی کے پھندے کی طرح کام کر گیا اور بس ایک ہی جھٹکے میں ٹیٹوا اچک کر گدی سے جا ملا اور نوجوان دوسری سانس نہ لے سکا، جہاں کا تہاں دھرے کا دھرا رہ گیا۔ اب یہ سب شروع سے آخر تک چولیں ہی بھڑانا ہوا، ورنہ وہاں اس وقت

کوئی کھڑا دیکھ تو رہا نہ تھا؛ لیکن اگر یہ واقعہ ہے تو اور جو کچھ ہے سو ہے لیکن خاں صاحب کے لاٹھی کے اس نادر استعمال کی داد دینی پڑتی ہے، جو ٹوٹی بھی نہیں اور بے آواز پڑی۔ خیر بہر حال، اندھیری رات والے تین کے تینوں ہی اگر خاں صاحب کے نام دھر دیے جائیں تو ان تینوں میں یہ نوجوان سب سے زیادہ خوش نصیب مقتول تھا، جس کو چار کا کاندھا اور دن دہاڑے قبر کا کونا اور نماز جنازہ وغیرہ، سبھی سعادتیں نصیب ہوئیں۔ بقیہ دو جن میں ایک جتھا بند روہیلہ پٹھان زمیندار تھا اور دوسرا گروہ بند روہیلہ چوہان ٹھاکر، جن سے خان صاحب کی لگتی چلی آئی تھی اور بات لاگ ڈانٹ سے بڑھ کر اس مقام پر آ لگی تھی کہ یا وہی رہتے یا پھر یہی، ایک کچھار میں دو شیر نہیں بسا کرتے، اور سچ پوچھیے تو غنی حیدر خاں یہاں پر کھرے قاتل کی تعریف میں نہیں آتے؛ اگر قاتل نہ ہوتے تو پھر مقتول ہوتے۔ البتہ خاں صاحب کی اس فنکارانہ خوبصورتی کی تعریف کرنی پڑے گی جو انھوں نے اس کام کو ٹھکانے لگانے میں دکھلائی، ایسی کہ دیکھنے میں نہ آئی۔ نہ اس روہیلے پٹھان کو گور کونا نصیب ہوا نہ اس ٹھاکر کو کریا کی چتا۔ پھر جتھے اور گروہ والوں نے دنیا چھان ڈالی، کہیں زمین پر نہ نگلنے کا نشان ملا نہ ہوا میں کہیں آسمان کو اڑ جانے کا سراغ ملا ...اوّل الذکر چار دن دہاڑے اور روزِ روشن والے خاں صاحب کے، جیسا کہ میں نے بیان کیا، ایک سے ایک بڑھ کر کارنامے ہیں ...(ص 218 تا 222)

... بہر حال سوئم کے روز حقوں کی گڑگڑاہٹوں میں بجز اس کے اور ہوتا بھی کیا۔ مماں کی ایسی نہ معلوم کتنی مجملاً اور بعض بعض ایک ذرا تفصیل کے ساتھ زیر بحث آتی رہیں۔ البتہ اپنے مخالفوں کے ہاتھ پاؤں تڑوانے اور سر پھڑوانے کی تعداد گنتی میں نہ آسکی؛ نہ وہ کھیت کھلیان اور چھپر گھروں کی آتش زنیاں ہی صحیح صحیح گن ملیں جو ان کے اشاروں پر سال چھ مہینے میں چار چھ مرتبہ (انتقام کا تو سوال نہیں) ان کے حلقہ بگوش انتظاماً کرتے کراتے رہتے تھے اور علاقے میں غذائی اور رہائشی توازن رکھتے تھے۔ مگر صرف یہی نہیں ہوا کہ مماں کے صرف جبر و قدر پر قابو پانے اور قانونی پنجے میں لینے ہی کی یکطرفہ مہمات بیان ہوتی رہی ہوں، فوری عدل، حقیقی انصاف، چٹ پٹ دادرسی، خصوصاً کمزوروں، بالخصوص یتیموں بیواؤں کا حق بجائے عدالت کے قلم کے اپنے زور بازو سے گھر بیٹھے دلوانے کی بھی بے شمار باتیں یاد آئیں۔ پھر دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دینے کے ساتھ چٹخے آئینے اور پھٹا دودھ جوڑنے کی کرامات کا بھی کھلے دل کے ساتھ تذکرہ ہوا۔ البتہ ان کا کچھ ایسی ہی ویسی نوعیت کا ایک ذرا

Scanned with CamScanner

بڑا کارنامہ اشاروں اشاروں، کچھ مخصوص دیہاتی اشاروں اور تشبیہوں وغیرہ کے ذریعے، اُچٹتے اُچٹتے سے مبہم لفظوں میں، ضمناً زیر بحث آیا جس کو سب سمجھ گئے۔ حسنِ اتفاق سے سوئم کی اس ٹکڑی میں نوجوان پروفیسر صاحب بھی پہنچ گئے، اور بات تو ممتاں غنی حیدر خاں کے متعلق ہو رہی تھی لیکن ضمنی حوالے کو وہ بھی پہنچ گئے۔ یہ ان کے لڑکپن کا چشم دید واقعہ تھا، اور آج بھی اُنچاس سال بعد رہ رہ کر ان کے دماغ کے صفحے پر کسی عدالت العالیہ کی قانونی نظیر کی طرح اچھل اچھل پڑتا تھا اور اٹل سماجی روایت کی طرح دل میں سے ابھرا ابھر آنکھوں کے سامنے آ جاتا تھا۔ (ص 225 تا 226)

... اللہ اکبر، کیسی بے برگ و گیاہ سنگِ خارا کی چٹان تھی اس نوخیز دیہاتن کی سوچ! — اور سوچتے سوچتے پروفیسر کی یادیں نصف صدی پیچھے اُلٹ کر چلنے لگیں اور فروعات و تفاصیل جلو میں ہو گئیں۔ نصیبن کیسی معصوم، کیسی بھولی، کیسی قبول صورت، کتنی اچھی۔ پردے میں بیٹھے سال بھی نہ بھرا تھا، اور یوں بھی رشتے کے کزن گھروں میں سگے بھائیوں کی طرح آتے ہی جاتے ہیں، کہ رشتے کے خالہ زاد بھائی جبار کے اندر شیطان گدگداتا ہوا جاگ پڑا۔ پھر نصیبن لڑکی بھی ہو گئی اور عورت بھی۔ سب روایتیں خراٹے لینے لگیں، اور اوپر سے نیچے تک ساری بندشیں کھل گئیں — اور تمام پردے تار تار ہو گئے۔ شیطان نے بھرپور شب خون مارا اور ایسا دھر دبایا کہ پہاڑ کا بوجھ دھر گیا۔ پھر نس نس بند بند جکڑتی چلی گئی۔ انہونی ہوئی اور طشت از بام ہو کر رہی — مگر دیہاتی فضا میں آسمان سے گری ہوئی تھالیاں گرتی تو ہیں لیکن جھنکار نہیں سنائی پڑا کرتی۔ ایک کا پردہ پورے گاؤں کا راز ہوا کرتا ہے، اور شریف بہو بیٹیوں کے تو سب بھائی ہوا کرتے ہیں۔ ویسے چشمکیں، مخالفتیں، عداوتیں، ٹھنڈی گرم جنگیں، الیکشن، مقدمے بازیاں اپنی جگہ چلتی رہتی ہیں لیکن اس مقام پر پورا گاؤں، ساری بستی موافق ہی موافق ہوا کرتی ہے۔ لہٰذا عملی طور پر اس کام کو انجام پذیر ہونے میں کوئی رکاوٹ یا سنگین قانونی گرفت کا خوف نہ تھا۔ بستی کے عمائدین، چھوٹے چھوٹے دلوں ہی دلوں میں خود اپنے سے مشورہ کر رہے تھے کہ کیونکر اس پُل صراط سے گزر اجائے۔ زبان کا تو ذکر ہی کیا، آنکھیں بھی تقریباً خاموش تھیں، یہ اور بات ہے کہ چار ہونے پر ایک دو باتیں بول اٹھتی ہوں۔ خاص طور پر بدبودبا کر ٹھکانے لگانے کا طریقۂ کار زیر بحث تھا۔ وہ بات تو بن نہ سکتی تھی جیسی کہ خال خال دیہات میں خودکشی کے واقعات ہونے کے ساتھ پولیس کے روزنامچے میں پنچایت نامہ بھروا کر شامل کر دیا جاتا ہے کہ

Scanned with CamScanner

''متوفی کا دماغی توازن خراب تھا اس لیے کنویں میں پھاند پڑا یا درخت کی شاخ میں لٹک کر خودکشی کر لی۔'' ... مگر یہاں تو سانپ کے منہ میں چھچھوندر اٹکی ہوئی تھی۔ بہرحال، پولیس افسر اندھا تو نہیں ہوگا۔ لاش کا پوسٹ مارٹم نہ کرائے، ضابطے کا معائنہ خود تو کرے گا ہی کرے گا۔ ذریعۂ خودکشی کے نشانات تو ذرا غور سے دیکھنے کے بعد نظر آئیں گے مگر دور سے دیکھ کر پہلی نگاہ میں بھانپ لے گا کہ کنواری لڑکی تقریباً پورے دنوں کی حاملہ تھی، اور یہیں سے معاملہ دوسرے ناہموار اور تاریک راستے پر جا پڑے گا۔ ... لہٰذا کوئی ایسے طریقے اختیار کرنے سے احتراز یقینی ہے جس میں پولیس کی مداخلت کا دور کا بھی امکان ہو۔ اور یہ ممّا غنی حیدر خاں کے بائیں ہاتھ کے کھیل تھے ... ویسے ممّا غنی حیدر خاں جتنے بیباک اور دلیر تھے، اتنے ہی محتاط اور دور اندیش بھی۔ اور بات کمبخت تو تیسرا مہینہ لگتے ہی وہ تو چھچھوندر کی بدبو کی طرح اڑوس پڑوس سے چار چار گھر اور چاروں طرف پھیل گئی تھی اور تیسرا مہینہ بھرتے بھرتے بے چاری کے پیٹ میں سچ مچ جیسے ہیضے کا کیڑا بیٹھ گیا، متلی، چکر، تراق پڑاق اُلٹیاں — بارہ چودہ کی عمر، عقل نابالغ، خود پون عورت، مورکھ، پہلے دو چار شاک کو تو ٹھیک سے سمجھ بھی نہ سکی کہ کن جھٹکوں کا ردِعمل ہے اور اس ساز کی بازگشت ہے جو پچھلے چار پانچ مہینوں سے اس کا خالہ زاد بھائی جبار بجاتا رہا ہے — اور پھر اس سرور کا ذہنی خمار آپوں آپ سمجھ میں آ گیا جو ایک گاؤں کی نوخیز کنواری ماں پر طاری ہونا چاہیے۔ یہاں تک کہ جس تند شراب نوشی کی ابتدا جذبات کے جوار بھاٹے میں زیر و زبر ہو کر ہوئی تھی اس کا خمار اسی رفتار سے بھونچال بن کر چڑھا، اور دردِ سر سے دردِ جگر تک جا پہنچا۔ انہونی ہو کر رہی۔ بات ناگن کی چال لہرا لہرا کر سرکی اور جو دن گزرا بڑھتی ہی چلی گئی ... جتنے منہ اتنی باتیں، سرگوشیوں میں ہر نیم حکیم اپنا اپنا نسخہ تجویز کر رہا تھا۔ کسی نے فوراً نکاح کی تجویز پیش کی، کوئی بولا، شہر لے جا کر ہسپتال میں پیدائش کرائی جائے، اور سب کی سب احمقانہ، ناقابلِ عمل اور بے سود۔ اونٹ کی چوری نیوڑے نیوڑے نہیں ہوا کرتی اور پیٹ کا وبال جب دو تین مہینے بعد یقینی اور زندہ حقیقت بنا اچھلتا کودتا سامنے آ جائے گا تو اس کا کیا جواب ہوگا۔ اور باتیں قانونِ وراثت، نماز کی امامت سے محرومی وغیرہ وغیرہ سے بڑھتی بیس سال آگے تک پہنچ پہنچ جاتیں اور بیس سے بڑھتی سات اور سات چودہ پشت اور صدیوں تک جا پہنچتیں، اور بستی بھر کے باپوں کے بیٹے احساسِ برتری جیسی کسی چیز میں مبتلا ہوتے ہوتے بال بال بچتے، ایک دوررس قسم کی فوقیت جیسی کوئی چیز قلب کی

گہرائیوں میں سے گردن بلند کرتی محسوس ہوتی؛ پھر بیچاری بے زبان لڑکی سے ہمدردی اس گردن اور سر کو ذرا نچلے بیٹھنے کی محرک ہوتی اور وہ طمانیت قلب کے ساتھ خاموش ہو جاتے اور جڑیں جہاں کی تہاں دل میں جگہ کرتی رہتیں۔ اور خمارزدہ ناسمجھ نوخیز لونڈیا یہ سب کچھ بغیر ہی سمجھائے سمجھ گئی اور شیطان تو معلم الملکوت ہے اور آتش الاصل اور یہ بے چاری تو ٹھنڈی مٹی تھی؛ اس نے تعلیم دی کہ چھت کے کڑے میں دوپٹہ باندھ کر لٹک جا، اور وہ اس پر بخوشی راضی ہو کر تل ہی گئی تھی مگر عین وقت پر گھر والوں نے بھانپ لیا اور اقدام کے فوراً قبل بچا لیا — اس کی جان بچانے کے لیے نہیں، پولیس کے پنچایت نامے اور پوسٹ مارٹم کے خوف سے، جس کے بعد یہ گھر راز گاؤں سے شہر اور شہر سے کچہری پہنچتا اور پھر سب کچھ ڈھکا چھپا روز روشن میں ظاہر ہو کر سڑی مٹی گاؤں واپس آتی۔ معاذ اللہ! جو انہونی ہونے کو رہ گئی، وہ اور ہو کر رہتی۔

... ویسے تو غنی حیدر خاں نصیبن کے کہیں تیسرے چوتھے شاخ کے یک جدی تایا چچا لگتے ہوں گے لیکن فی الحقیقت اس سلسلے میں وہ کسی پہلو نصیبن کے متعلق سگی بھتیجی سے کم ہمدردی نہ رکھتے تھے، اور اس کی ناک سگی بیٹی سے بھی زیادہ عزیز تھی، اور پھر نادم باپ کا سر اور آنکھیں مدد کے لیے سامنے جھکی ہوئی اور بے پایاں مامتا اور عظیم ترین دنیوی خوف میں لپٹی ہوئی بدنصیب ماں کے ملتجی آنسو غنی حیدر خاں کے روبرو تھے، اور کس غرض سے کہ اس فتنے کو اس طرح دبا دیں کہ آنکھ پھوٹے بیر جانے۔ اور درد کے کرب میں دونوں غنی حیدر خاں سے آنکھیں پھڑوانے کی خوبصورت صورت نکالنے کے لیے لیکن مشکل تو یہ تھی کہ کمبخت طریقۂ کار خود بھی پیش نہ کر سکے تھے اور مدبر اور دلیر غنی حیدر خاں کے دماغ میں ایک علی الصباح بھق سے روشنی آ گئی اور مسئلے کا حل نہایت سیدھا سمجھ میں آ گیا۔ اور غنیمت یہ تھی کہ برسات کا موسم تھا اور آج بھادوں کی اماوس (سال کی تاریک ترین رات) تھی، جو ایسے کام سرانجام دینے کے لیے نہایت موزوں ہوا کرتی ہے۔ اور غنی حیدر خاں نے مختصر سی بات ماں اور پھر باپ سے کی اور چند لفظ خود نصیبن سے کہے اور بقیہ استادوں کی طرح سب کچھ گزر رہا اور گزرنے والا پیٹ ہی میں رہا اور چند ہی لفظوں میں ان تینوں کے اندر والی بشریت کو اچھی طرح ٹھونک بجا لیا کہ تینوں اپنی اپنی جگہ پر مضبوط ہیں۔ البتہ ماں کے اندر والا ذرا تھرتھراتا ہوا تیار ہوا لیکن باپ اور بیٹی ایک سے ایک بڑھ کر راسخ تھے اور بہادری کا ماؤنٹ ایورسٹ اور نندا دیوی بنے ہوئے تھے...

Scanned with CamScanner

(ص 231 تا 236)

بات زیادہ چلنے والی نہ تھی، بس یوں ہی رینگ کر رہ گئی۔ یوں بھی شرافت کی پردہ داری لازم تھی، پھر دیوانے کا پاؤں درمیان میں تھا۔ غنی حیدر خاں کے دستِ خاص کا سرانجام دیا ہوا کام۔ کس بیر بکر ماجیت کی ہمت تھی کہ تبصرہ کر کے خاں صاحب کی آزردگی کو دعوت دیتا۔ ہونٹوں سے سنکتی کانوں میں سے سینے میں کو اُتری اور پیٹ کی گہرائیوں میں پہنچ کر ہضم ہو گئی ... ویسے اس نوعیت کے امور کی انجام دہی میں انھیں یدِطولیٰ حاصل رہا تھا اور ایک سے ایک نئی ترکیب اختراع کرنے میں مہارت تھی۔ مگر پروفیسر کو اچھی طرح یاد تھا کہ ممّاں غنی حیدر خاں نے اس مہم کی تکمیل میں بہت ہی سیدھا سادہ سامان کیا تھا، ایک بارہ گرہ کا ڈنڈا بھی تو ہاتھ میں نہ لیا تھا، اور نتیجہ ایسا بھرپور اور ٹھوس نکلا تھا کہ تارپیڈو مارنے والی سب میرین سے کم نہ تھا۔ بس دو گھڑے ریتے سے بھر کر اور گز گز بھر کے مونجھ کی رسی کے دو مضبوط ٹکڑے دریا کنارے کنڈے کے کرارے پر پہلے ہی رکھ آئے تھے۔ آدھی رات گئے جب ساون کی اندھیریاں بھادوں کی سیاہیوں سے گڈمڈ ہو کر بحرِ ظلمات کے جوار بھاٹے کا سماں باندھ رہی تھیں اور سیاہیوں کا یہ طوفان ساری کائنات کو نگلے ہوئے تھا، تو ممّاں غنی حیدر حرکت میں آئے... انھوں نے آدھی رات گئے اپنا رہلو (ہلکی پھلکی سبک رو بیل گاڑی) جوتا اور نصیبن کے دروازے پر جا پہنچے۔ اور دروازہ تو اندھیری رات میں اس وقت بھی کھلا ہوا جیسے چشم براہ تھا۔ نصیبن اندر دالان میں تیار بیٹھی تھی، ہمہ تن انتظار بنی۔ ممّاں کو دیکھ کر ایک مرتبہ کو ریڑھ کی ہڈی میں برف کی سلائی اوپر سے نیچے تک اور نیچے سے اوپر تک چڑھی اتری، موت کی ٹھنڈی جھرجھری رونگٹے میں دوڑ گئی، مگر پھر آپا سنبھالتی اٹھی اور جیسے تن کر موت سے ٹکرانے کے لیے تیار ہو گئی... آگے آگے ممّاں غنی حیدر خاں، پیچھے پیچھے مذبح کو قصائی کے رسّی کے سہارے جاتی بھیڑ کی طرح نصیبن چل پڑی۔ ماں سو رہی تھی، باپ سو رہا تھا، یا دونوں کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ نصیبن کا سوتا ہوا مقدر آدھی رات جاگ پڑا اور وہ سماج، روایت اور معاشرے کے تحفظ میں کمربستہ ہو کر میدان میں اتری، اور بغیر ہی ممّاں کا سہارا لیے ہوئے، رہلو کی نشست پر ذرا کمال مستعدی کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اس کام کے لیے ماں باپ، نصیبن، عزیز اقارب، پنچوں اور بستی والوں کے درمیان جیسے سب کچھ، بغیر زبان ہلائے، دلوں ہی دلوں میں اور کہیں کہیں آنکھوں ہی آنکھوں میں، خاص طور پر نصیبن کے ماں باپ اور ممّاں غنی

Scanned with CamScanner

حیدر کے درمیان بغیر ایک لفظ بھی بولے، قطعی طے ہو چکا تھا۔ خوب سوچ سمجھے منصوبے کے تحت ایک مانے ہوئے ثقافتی و سماجی کلیے پر عمل ہو رہا تھا، جس کی پشت پر ہر دور کا ٹھپہ اور قدیم سے قدیم مہرِ تصدیق ثبت چلی آ رہی تھی — اور آج سب سے گہری مہرِ تصدیق خود نصیبن نے مردانہ وار بڑھ کر لگائی تھی۔

گاڑی سبک رو تھی اور بیل شائستہ۔ خود غنی حیدر خاں کے ہاتھوں میں رسیاں تھیں۔ اشارے ٹٹکاری کا بھی سوال نہ تھا، جیسے مالک کے دل کی مرضی پہچان کر بیل تو بیل، رہلو کے پہیے خود ہی ٹھیک سمت چل رہے ہیں۔ ماحول سیاہ سناٹے میں گم تھا۔ گلی کے کتے بھی شاید ہمراز تھے، نہ معلوم کہاں چھپے دبکے پڑے تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے بستی کے آس پاس درختوں میں سے الو کی مخصوص کڑکڑاہٹ اس نم سیاہ ماحول میں ہیبت کا رنگ تیز تر کر دیتی۔ بستی سے کنڈا میل پون میل کے فاصلے پر تھا، چند منٹ میں یہ صدیوں کا چلا ہوا سفر رہلو طے کر گیا۔ کرارے پر دونوں گھڑے منتظر سے دبکے بیٹھے تھے۔ ویسے یہ کنڈا بارھوں مہینے اپنی مخصوص جائے وقوع کے سبب باؤلا رہتا تھا اور آج کل تو برسات تھی، جوشِ جنوں شباب پر تھا۔ ہندوؤں کے وبائی یا مار گزیدہ یا حادثاتی مرے ہوئے مردوں کی لاشیں، بجائے جلانے، کریا کرم کرنے کے، بہائی جاتی ہیں اور یہ کنڈا علاقے بھر کے ہندوؤں کا آبی قبرستان تھا، لہٰذا گھڑیالوں، ناکوں، مگرمچھوں اور گویوں، دنیا بھر کے آبی عفریتوں کا دسترخوان تھا۔ غنی حیدر خاں نے رہلو سے اتر کر رسی کے دونوں ٹکڑوں کے سرے دونوں گھڑوں کے گلے میں باندھ دیے اور پلٹ کر نصیبن کو رہلو سے اترنے میں سہارا دیا۔ مدھ کی بجائے آج بس بھرا نوجوان بدن یخ ہو رہا تھا جیسے برف کی سل۔ انھوں نے مشینی تیزی سے اس کا دوپٹہ اتار کر منھ میں ٹھونسا، اگرچہ نصیبن کے رویے سے فوراً ہی احساس ہو گیا کہ اس کی ضرورت نہ تھی، تاہم بہ نظرِ احتیاط، اور دوسرے بجلی کی سی پھرتی سے گھڑوں میں بندھی ہوئی رسیوں کے دونوں سرے پھندا بنا کر نصیبن کی پنڈلیوں میں کس دیے ... اور پھر باہمت سے زیادہ شہ زور اور شہ زور سے بڑھ کر باہمت غنی حیدر خاں نے نم ریتے سے بھرے ہوئے گھڑوں سمیت یہ پاپ کی پوٹ اپنے مضبوط بازوؤں اور چٹان سی چھاتی کے درمیان یوں بھر لی جیسے سڑے گلے پھونس کی گٹھڑی اور پھونس کی گٹھڑی میں تو لرزہ تھا اور جب ممتاں نے وزن تولنے کے لیے دبائی تو اندازہ ہوا کہ برف کی سل پگھل رہی ہے۔ وہ ٹھنڈے پسینے

میں شرابور تھی... ذرا جھولا دے کر اپنی گرفت کو جو چھوڑا تو اس سماجی بغاوت اور ثقافتی سازش کے سربستہ راز نے بارہ فیٹ کرارے کی اونچائی اور چوبیس فیٹ کنڈے کی گہرائی طے کر کے چھتیس فیٹ نیچے تلی پر جا کر دم لیا، اور آٹھ نو مہینے کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا۔ اس خوبصورتی کے ساتھ، سانپ مرانہ لاٹھی ٹوٹی اور ایسی بے آواز پڑی کہ ایک دفعہ کو رہتی دنیا تک بازگشت کا امکان نہ رہا۔ (ص238 تا242)

❊

کہانی ''پھیر'' کا چوتھا باب (ص 300 تا209) اسملاژ کے آئندہ صفحات میں من وعن شامل ہے۔ اس میں درج بندہ علی اور مولازادوں کی گفتگو کے توسط سے ابوالفضل صدیقی اپنے قاری پر نہایت جامع انداز میں واضح کر رہے ہیں کہ منشی کمال شیر خاں کی کارگزاریاں مولازادوں کی معیشت اور نفسیات پر کس کس طرح اثر انداز ہوئیں۔ حاجی میاں کا پسر نسبتی بننے سے پہلے بندہ علی کا طرزِ فکر کیا تھا، بعد میں کیا ہو گیا۔ اس کی موجودہ ذہنی حالت کے دیگر اسباب کیا ہیں۔ منشی کمال نے مختارِ عام کی حیثیت سے ایسے کتنے اقدام کیے جن کا علم بندہ علی کو بھی نہیں، اور ان اقدامات سے وہ بندہ علی کی رعایا کے ساتھ ہی ساتھ اُسے بھی اپنا بندی بنا چکا ہے (جیسے قبل ازیں، حاجی میاں کو پر تشدد و شاطرانہ خدمات کے عوض اپنے اقدامات کا قیدی بنا چکا تھا)۔ یوں، حاجی میاں کے بعد بندہ علی بھی از ظاہر تا باطن شر کا گرفتار ہو گیا ہے۔

38

موروثی اراضی سے بے دخلی کے بعد پہلی عید آئی تو قدیم رواج کے مطابق حسب معمول علاقے کے اور موروثی دخیل کاروں کے ساتھ مولازادے بھی نذر لے کر بندہ علی کے عیدملن حساب جلسے میں پہنچے، لیکن منشی کمال شیر خاں کے اشارے پر بندہ علی نے مولازادوں کی نذر لینے سے انکار کیا، کیونکہ یہ اعزاز صرف موروثی دخیل کار کاشتکاروں کے لیے مخصوص تھا۔ اور نہ ان سے معانقہ ہی کیا، کیونکہ اب ان کی پوزیشن وہ نہ رہی تھی جو پہلے تھی، اور فوراً ہی یہی تمام نذرانے یک مشت مولازادوں کے بجائے گویا ان کے جانشین کوڑی مل ساہوکار کے قبول کر لیے اور بڑی گرمجوشی کے

Scanned with CamScanner

ساتھ معانقہ کیا اور قدرے مقتدر نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ساتھ منشی جی کے اشارے پر چھوٹے منشی نے ادنیٰ طبقے کے لوگوں کے ساتھ عیدی دینے، انعام، فطرے وغیرہ کے لیے ان مولازادوں کو طلب کیا لیکن انھوں نے انکار کیا۔ تاہم اتنی ہمت نہ پڑی کہ جلسہ چھوڑ کر دیوان خانے سے باہر چلے جاتے؛ محفل میں آخر تک موجود رہے۔ عید کے اس اجتماع میں ذرا پھیکی سی رہی، اور مولازادے بہت آزردہ رہے، اور جب محفل اٹھ گئی تو تقریباً تخلیے میں مولازادوں نے اپنی شکایات بندہ علی کے روبرو پیش کیں۔ ان میں سے ایک مقتدر بزرگ نے، جو کسی زمانے میں بندہ علی کے والد بڑے میر صاحب کا مقرب رہا تھا اور مزاج میں دخیل تھا، کھل کر بات کی۔ یہ بوڑھا مولازادہ ثقہ آدمی تھا، قرآن پڑھا ہوا تھا، اور جب مسجد کا پیش امام نہ ہوتا یا کہیں باہر گیا ہوتا تو امامت بھی کر لیتا اور پانچوں وقت اذان دیتا۔ کچھ اس بات کا اور بہت کچھ باپ کے زمانے سے مزاج میں دخیل ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا:

"میاں، دولت اور زمین آنی جانی چیز ہے۔ آپ نے اپنے قانونی اختیارات کا فائدہ اٹھا کر ہم لوگوں سے زمین چھین لی اور مہاجن کو دے دی، لیکن اس گھڑی عید کی خوشی میں ہی ہماری نذر قبول کر لیتے۔ علاقے بلکہ ضلعے بھر میں ہم ویسے ہی کیا کم ذلیل و خوار ہیں، اور یہ بھری محفل میں آپ نے اور بھی ذلیل کر دیا۔ بہر حال ہمیں اس کی شکایت نہیں، نذر تو دخیل کاروں کی قبول کی جاتی ہے اور آج مقدر نے ہمیں کوئی بھی نہ رکھا۔"

"مگر اس میں میرا کیا بس۔ کیا میں نے لٹھ مار کر زمین لوٹ لی ہے؟ وہ تو قانون نے تمھیں بے دخل کیا ہے۔ جس طرح میرے دادا کے زمانے میں قانون نے تمھیں بہت کم شرح لگان پر کبھی دخیل کاری موروثی حق دیا ہوگا، اسی طرح آج اسی قانون نے تمھارا یہ حق ختم کر دیا۔"

بڈھے نے ایک لمبی سانس لی اور کہا، "ہاں میاں، میں نے کہا نہیں ابھی، زمین خدا کی ہے۔ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے، جس سے چاہتا ہے لے لیتا ہے۔ آپ کے بزرگوں کی مہربانی سے کبھی ہمارے بزرگوں کو پہنچی اور آپ کے ساتھ ہمارے لڑکے بنا کر نہ چل سکے، آپ نے واپس لے لی۔ آپ مالک ہی جو ٹھہرے۔ پھر ہاتھی بکرے کی لڑائی میں ہونا بھی یہی تھا..."

بندہ علی نے بیزاری کے ساتھ بات کاٹی، "ملاں، کہنا کیا ہے، وہ بتاؤ۔ اب کوئی گنجائش کہیں

Scanned with CamScanner

پر باقی نہیں ہے۔ مدتیں ہوئیں، اٹھارہ مہینے پہلے قانون اپنا پورا عمل ختم کر چکا۔ ہوئی کو ان ہوئی کرنا کسی کے بس کی بات نہیں۔''

''بتاتا ہوں میاں،'' ملاں نے کہا، پھر ایک تلخ سا گھونٹ لے کر آواز درست کی۔ ''عرض اتنی ہے کہ اب ہماری ذلت اور زوال کی انتہا ہو گئی ہے۔ چماروں نے اپنے طور پر کوڑیا مہاجن سے پہلی فصل زیادہ مزدوری طے کر لی تھی۔ چوری چھپے مولازادوں کے لڑکے بھی کام کر آیا کرتے تھے۔ پھر دوسری فصل سے اس نے تمباکو کی کھیتی اور بڑھائی اور تیسری فصل میں ولایتی کھاد ڈال کر پورے رقبوں پر تمباکو ہی تمباکو پھیلا دی۔ سونا رول رہا ہے، سرکار کو تو بس ایک دفعہ دائی پٹہ لیتے وقت ذرا سی رقم تھما دی۔

''ہاں میاں، یہ اس کا مقدر اور اللہ کی دین۔ اگر سرکار کو خود کاشت نہیں کرنا تھی اور زمین پھر کسی کو موروثی پٹے پر دینا تھی تو ہمیں سے حکم کرتے۔ اتنی رقم جتنی بیے نے سرکار کو جیب سے نکال کر دائی اور موروثی حقوق کے نذرانے میں دی، ہم سب جیب سے نہیں تو کہیں سے قرض دام کر کے سرکار کو دے دیتے...''

بندہ علی نے پھر بات کاٹ دی، ''بھئی ان بیکار باتوں سے فائدہ؟ سانپ نکل گیا گھسیٹن پٹیا کرو۔ تمھاری اس ایک بات کے میرے پاس ایک سو ایک جواب ہیں، لیکن نہ اس بات کے کرنے کی ضرورت ہے نہ میں جواب دیتا ہوں۔ وہ بات بتاؤ جو تم اب چاہتے ہو۔''

ملاں نے آواز درست کی اور کہا، ''بات اتنی سی ہے کہ جب سے بیے نے تمباکو کی کھیتی سب رقبے پر پھیلائی ہے، مزدوروں کی بہت کمی پڑ گئی ہے۔ اس نے بیشی اجرت پر کیا چمار، کیا مولازادے، سب کے سب مزدوروں سے کام کرانا شروع کیا تھا کہ ایک دن شام کو ڈیڑھ ڈیڑھ پاؤ جو کے آٹے پر ٹرخانا چاہا۔ جب مزدوروں نے سبب پوچھا تو کہا کہ منشی کمال شیر خاں کہتے ہیں کہ دستور دیہی واجب الارض کی جلد میں کھیت مزدور کی یہی مزدوری لکھی چلی آتی ہے۔ دوسرے دن جب کوئی مزدور کام پر نہیں گیا تو منشی جی نے صبح تڑکے ہی گھر گھر پر اپنے لٹھ بند تعینات کر دیے۔ جو نکلا اس کو پکڑ لیا، پھر جو گھر میں دبک گیا تھا اس کو اندر سے گھسیٹ گھسیٹ کر لے گئے اور کوڑیا مہاجن کے تمباکو کے کھیتوں میں ہانک ہانک کر مولازادوں اور چماروں کا ایک ایک جوان پہنچا دیا۔''

Scanned with CamScanner

''تو میرا اس میں کیا بس؟ میں نے ابھی بتایا نہیں تمھیں، وقت وقت کی بات ہے۔ قانون کے ہم تم سب بندے ہیں اور یہ دستور دیہی واجب الارض، شدآمد قدیم کا آئین ہے۔ اس پر حکومت کی ساری کیلی گھومتی ہے۔ تم لوگ اب کھیت مزدور ہو۔ ابھی تم نے خود ہی کہا، زمین خدا کی ہے، جس کو چاہتا ہے دیتا ہے، جس سے چاہتا ہے لے لیتا ہے۔ تم سے خدا نے چھین لی اور کوڑی مل مہاجن کو دے دی۔ اب وہ موروثی دخیل کار ہے، تم کھیت مزدور۔ اور کھیت مزدور کی اجرت چھ چھٹانک موٹا اناج ہے۔ انصاف یہی ہے۔ چاہو تو ابھی سوا سو برس پرانا قانون جلد بندوبست میں کھول کر دیکھ لو۔ اور اس کو انگریز نے مغلوں سے لیا ہے، اکبر بادشاہ کے زمانے کا جیسے کا تیسا اٹھا کر رکھ دیا ہے اور 'شدآمد قدیم' نام رکھا ہے۔ اس میں تو ہائی کورٹ بھی کچھ نہیں کر سکتی۔''

''جو میاں وہ تو سب کچھ صحیح کہہ رہے ہیں آپ، آپ کے بزرگوں کی جوتیاں سیدھی کر کے غلام کو یہ سب معلوم ہے...'' اور بڈھے کی آواز رندھ گئی۔ ''کل تک انھیں کھیتوں پر ہم گیہوں گنا اگایا کرتے۔ تھے تو ہمارا کام کرنے مزدوروں کے غول آیا کرتے تھے، اور آج ہمارے بیٹوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح منشی جی کیا، پیٹ کی آگ ہنکا کر لے جاتی ہے۔ پھر اللہ تیرا شکر ہے، جس حال میں رکھے، تیری مرضی۔''

اور بڈھے کا حلق بند ہو گیا، بندہ علی نے ذرا نرم ہو کر کہا، ''ملاں جی، اتنی دیر ہوئی، میں تمھاری بات نہیں سمجھا، چاہتے کیا ہو؟ مگر سمجھدار پڑھے لکھے آدمی ہو، تمھارے پیچھے میں بھی کبھی کبھی نماز پڑھ لیتا ہوں، وہ بات بتاؤ جو میں کر سکوں۔''

بڈھے نے بار بار ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، ''بس سرکار، اتنی عرض ہے کہ ہمارے بیٹوں کا مقدر اب تیرے میرے کھیتوں پر مزدوری رہ گیا ہے، اس میں منشی جی دخل نہ دیں مہاجن ہر طرح کی مزدوری بڑھانے پر تیار ہے، بلکہ وہ تو یہاں تک کہتا ہے اگر کسی کے گھر فصل بھر کھانے کو ہے تو کام کیے جائے اور پیداوار کی بچت میں پتی لے لے۔ لیکن منشی جی دھاندلی کرتے ہیں۔ نہ اس کا کام بھرپور ہونے دیتے ہیں، نہ ہماری مزدوری پوری ہاتھ آنے دیتے ہیں۔ اور مزہ یہ ہے کہ منشی جی کا یا سرکار دونوں میں کسی کا اس میں کوئی فائدہ نہیں، اور مہاجن بھی ایسے فائدے سے خوش نہیں۔ اس میں منشی جی کی شرارت ہے۔''

بندہ علی کے علم میں یہ بات نہ آئی تھی۔ پہلے تو اس کے منہ سے یہ نکلنے والا ہوا کہ ''میں منشی جی سے پوچھوں گا۔'' پھر زبان رک گئی اور تیور بدل گئے۔ ''بالکل ٹھیک ہے۔ ہم نے اراضی خود کاشت کرنے کے قانون سے چھوڑائی ہے اور بیے کو حقوق بھی دے دیے ہیں، آں، اوں... جو ہمیں حاصل ہیں۔ مفت، یوں ہی نہیں، بھاری رقم لے کر... ہوں آں... جو خود کاشت کرنے کی صورت میں کھیت مزدوروں اور رعایا پر ہمیں حاصل ہوتے تھے۔ بہر حال بنیا اراضی پر کھیتی کرنے کے بجائے روزگار سا پھیلا رہا ہے، جیسا کہ ابھی تم نے بتایا کہ تمباکو کی پیداوار سے سونا رول رہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ سونا رولنے کے لیے ممکن ہے کھیت مزدوروں کی اُجرت اپنے طور پر بڑھانا بھی چاہتا ہو، لیکن یہ تو نئی ریت پڑتی ہے۔ اگر کل کلاں کو ہم نے کسی رقبے پر خود کاشت کی تو کھیت مزدور ہم سے بھی یہی بڑی اُجرت اور پتی کا مطالبہ کریں گے۔ بنیا سالا ہماری پانچ سو سالہ بنی ہوئی شرح کو بگاڑنے والا کون ہوتا ہے؟''

بڈھا گھگھیا پڑا۔ ''میر صاحب، رحم کیجیے۔ ہمیں بستی میں پڑا رہنے دیجیے۔ خدا کے واسطے! اور سرکار کیا دستور دیہی شدآمد قدیم کے حقوق نذرانہ لے کر کسی نئے دخیل کار کو دیے بھی جا سکتے ہیں؟ یہ تو خدا سرکار کی زمینداری برقرار رکھے، زمیندار اور کاشتکار کے درمیان ہیں اور رہیں گے، کوڑی مل مہاجن زمیندار تو نہیں ہو گیا۔''

بندہ علی کو تاؤ آ گیا۔ ''ملاں، تمھارے پیچھے میں نے نماز پڑھی ہے، ورنہ اس بیرسٹری کرنے کا مزہ چکھا دیتا! کھیت مزدوری کیوں کرتے ہو، ہائی کورٹ میں جا کر وکالت کرو تم تو! سنو، بستی کے اندر گھر سے میرا قانونی حق ہے۔ قانونِ قبضہ اراضی کی رو سے جب کوئی موروثی دخیل کار اراضی سے بے دخل ہو جاتا ہے تو بستی کے اندر گھر سے بھی آپوں آپ بے دخل ہو جاتا ہے۔ اور یہ منشی جی کی مہربانی ہے، ورنہ چاہتے تو جس دن تمھاری اراضیوں پر دخل اور قبضے کی قانونی کارروائی کی ہے، اسی دن قانونی طور پر تمھارے چھپروں کا پھونس نوچ کر تمھارے گھر کھدوا کر برابر کر دیتے۔ اور آج تک ہمیشہ کسی وقت بھی زمیندار قانونی طور اس کا مجاز ہے۔ اور تم لوگوں کی کھوپڑیوں میں ابھی تک موروثی دخل کاریوں کے خناس کے انڈے رکھے ہوئے ہیں۔ ہوں! ایں؟ بھلا دیکھو تو، کہاں سے بول رہے ہیں!''

اس خلافِ امید سے دل فگار جواب پر مولازادوں کے وفد جیسے اراکین کے زخمی دل شق سے ہو گئے، چھاتیاں پھٹتی محسوس ہوئیں۔ بوڑھے ملاں نے لاچار سے شکایتی انداز میں جیسے رسمی نوعیت کا

Scanned with CamScanner

بیکار سا جواب دیا:

''میاں، آپ سے ایسے جواب کی امید نہ تھی۔''

اور بندہ علی نے پھر بات کاٹ دی۔ ''میرا جواب نہیں، یہ قانون کے من وعن لفظ ہیں۔۔۔'' اور پھر ذرا پہلو سا بدلا۔ تیوروں میں بے چینی کی نشانیاں اُبھریں، آواز، لہجہ اور انداز سب بدل گیا، اور سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ ''اور ہاں، یہ تو بتاؤ، پھر کیوں نہیں تھی ایسی امید؟ اپنے گریبانوں میں منھ ڈال کر دیکھو۔۔۔ ایں! بلکہ مجھ کو تو سنی سنائی جستہ جستہ پہنچتی ہے اور تم تو سب جانتے ہو۔ اور تم میں سے کون سا تھا جو کسی نہ کسی طرح ملوث ہی نہ ہو۔ باقاعدہ حملہ، ورنہ سازش، اور کچھ نہیں تو تماشائی۔ اور بڑے سرکار کی وفات کے بعد چھوٹے سرکار مرحوم کی کارکنی اور پھر بحمد اللہ اپنی ملکیت کے شروع زمانے تک دس سال کے عرصے میں اپنے ہاتھ سے میں نے مولازادوں کو اپنا سمجھ کر جو جو مراعات دیں اور جیسی جیسی چھوٹیں رعایتیں، جن کا قانون میں بھی کہیں پتا نہیں نہ روایت ہی میں تھیں، نوازا، ڈھیل دی اور طرح دی، ہر ہر پہلو سے بھرا۔ ان کا کہیں کسی اور زمیندار کے یہاں بھی سراغ ملتا ہے؟ اور تم نے قتل کا الزام تھوپ کر مجھے ٹھکراتے ٹھکراتے پھانسی کے تختے تک پہنچا کر ہی دم لیا۔ اور پھانسی کا پھندا اللہ کے کرم سے گلے میں سے نکلنے کے بعد بھی، خدا جانتا ہے، تمھیں میں نے دل ہی دل میں معاف کیا، اور اپنی شادی پر دعوت دی، جو بلاشبہ تمھاری بہت بڑی عزت افزائی تھی، لیکن تم نے اس کو بھی ٹھکرا کر مجھ کو گویا ذلیل کر کے للکارا۔ تم ایسے بڑھ گئے کہ اپنی حیثیت اور اصل نسل کو بھول گئے۔ شادی کی بھری محفل میں برابر والوں کے سامنے میری تذلیل ہوئی، میرا کھانا گھوروں میں دبایا گیا، کتوں نے کھایا، اوں، آں، ایں۔۔۔ اور تمھاری شہ پر پہلے چمار نمک حرام پولیس کے آلۂ کار بنے تھے اور اس مرتبہ بھی انھوں نے تمھاری ریس کی اور یہ بھوکے نمک حرام غلام بھی میری دعوت رد کر گئے۔ آج تم کس کے پاس معذرت کے لیے آئے ہو؟ ایں؟ بندہ علی کو ڈھائی سال پہلے پھانسی کے تختے پر سے گھسیٹ کر جیل کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ کوئی دقیقہ تو تم لوگوں نے باقی رکھا؟ چلے جاؤ مردودو میرے سامنے سے، محسن کش سؤر کے بچو۔ خون اترتا ہے میری آنکھوں میں! حرامزادو، تمھاری ہمت میرے سامنے آنے کی کیسے پڑی؟ سانپ سے بدتر! اور کھلانے والے پر تو سانپ بھی پھن نہیں مارتا۔ خصم مار کہیں کے۔ اگر کھیت مزدور بن کر نہیں رہنا چاہتے تو بستی چھوڑ کر کہیں اور جا بسو اور کوئی اور دھندا کر لو۔ اور یہاں رہو گے تو

Scanned with CamScanner

ڈیڑھ پاؤ جوار کے آٹے پر دن نکلنے سے دن چھپے تک کام کرو گے۔ ہوں، غاں، غوں... اصل سے خطا نہیں، کم اصل سے وفا نہیں، ٹھیک کہا ہے بزرگوں نے۔ کا کا نہ کرے سا کھا، یہ قول مصطفیٰ کا۔"

مجمعے پر مران پڑ گئی۔ لیکن ایک صاحبزادے جو ساتویں آٹھویں درجے تک پڑھے ہوئے تھے، بولے، "حضور! سید صاحب، اب کرم کیجیے۔ یہ بزرگوں کی امانت ہے، آپ کی تحویل میں زمینداری کے نام سے اور ہمارے قبضے میں دخیل کاری تھی۔ ہم بھی اسی جڑ کی شاخ ہیں جس میں آپ کی قلم لگی ہے۔ اتنا ذلیل نہ کیجیے کہ ہمیں چماروں کو ایک لاٹھی سے ہانکا جائے۔ قانوناً آپ کو اختیار تھا، پانچ سو پرانے مقبوضے چھین لیے اور مہاجن کو مسلط کر دیا۔ اور اللہ نے آپ کو تو بنائے ہی رکھا، ہم میں سے چند سر پھروں کی حرکتوں کے قصور میں ہم سب کو میٹ دیا آپ نے۔ اس وقت ہم لوگ منشی کمال شیر خاں کی ہی خفیہ ہدایت کے بموجب عید کی خوشی کے موقعے پر تلافیِ مافات میں نذر گذارنے حاضر ہوئے تھے۔ اگر آپ قبول فرما لیتے تو آپ تو آپ ہی رہتے اور ہم کھیت مزدور سے پھر دخیل کار تو نہ ہو جاتے۔ ہاں ذرا بھوبنی رہتی اور ہمارے آپ کے بزرگوں کی عزت۔ ہوں... وہ سمجھ لیجیے کہ ہم آپ سے ہیں اور آپ ہم میں سے۔"

اور بندہ علی اس انگریزی داں لونڈے کے جواب پر پہلے تو "سید صاحب" کے خطاب اور پھر "ہمیں اور چماروں کو ایک لاٹھی سے نہ ہانکیے" جملے پر اور "بزرگوں کی امانت اور تحویل پر" اور "جڑ، شاخ اور قلم" پر دل ہی دل میں بہت جز بز ہوا اور سب سے زیادہ یہ کہ اس انکشاف پر بہت متعجب ہوا کہ یہ لوگ نذر لے کر منشی کمال شیر خاں کی ہدایت کے بموجب آئے ہیں۔ لیکن سب پی گیا اور بھنا کر یہ کہتا ہوا اٹھ کر چل دیا:

"بھئی آپ لوگ میرے پاس بیکار آئے ہیں۔ میں باضابطہ منشی کمال شیر خاں کو مختارِ عام بنا چکا ہوں۔ یہ انھی کے طے کرنے کی چیزیں ہیں، مجھے ان سے سروکار نہیں — اور نہ اس میں کہنے سننے، اپیل مرافعے کی گنجائش ہے۔"

اور اس طرح منشی کمال شیر خاں کے فیصلے کا مرافعہ بندہ علی نے جوں کا توں انھی کے اوپر دے مارا اور فیصلہ جوں کا توں رہا اور منشی کمال شیر خاں نے نہایت عیاری کے ساتھ خود ہی تحریک کرا کر اپنے اس فیصلہ قطعی کو اور راسخ کرا لیا اور اپنی پوزیشن مزید مستحکم کر لی۔ (ص 300 تا 309)

❋

کہانی کا پانچواں باب (ص 309 تا 358) منشی کمال شیر کے وضع کردہ اس قانون کے انسانی ردِعمل کا قصہ بیان کررہا ہے کہ تمباکو کی کھیتی پر کام کرنے والوں کو دخیل کار کوڑی مل ساہوکار بھی وہی اُجرت دے گا جو دستورِ دیہی واجب الارض شدآمد قدیم کی رو سے زمیندار ادا کرتے آئے ہیں، یعنی صبح سورج نکلنے سے دن مندے تک کام کے بعد چھ چھٹانک موٹا اناج۔ اس قانون کو ساہوکار نے مجبوراً قبول کیا تو "تمام مزدوروں نے کھیتوں پر کام کرنے سے انکار کردیا۔" اپنی فصل محفوظ رکھنے کے لیے ساہوکار "بستی سے چار میل دور سے نئے چمار مزدور چوگنی اجرت پر لے آیا، لیکن خبر پاتے ہی بستی کے مزدور کھیتوں پر پہنچ گئے، جن میں چمار پیش پیش تھے۔ ... دوسرے گاؤں کے آئے ہوئے چمار ان کے اشارے پر کام شروع کرنے سے پیشتر ہی اٹھ کر چلے گئے اور کوڑیا مہاجن کو دن میں تارے نظر آگئے۔ ... مجبور ہوکر بے چارے نے منشی جی کی زنجیرِ عدل ہلائی اور تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا، اور خاص طور پر ایک چمار، پرکھوتا نامی، کی نشان دہی کی جو رنگ لیڈر تھا۔ نیز یہ بھی بتایا کہ ہر معاملے میں جس طرح پسِ پردہ ہمیشہ مولازادوں کا ہاتھ رہا کرتا ہے، اسی طرح اس میں بھی ہے: اور خاص طور پر اُن انگریزی داں صاحبزادے بابو خاں کا نام بتایا جنھوں نے عید کے روز گستاخی کی تھی اور بندہ علی خون کا سا گھونٹ پی کر رہ گئے تھے۔ منشی کمال شیر خاں کو تھوڑا غصہ آیا لیکن بیٹے نے ٹھنڈا کر دیا اور کہا کہ سرِدست آسانی کے ساتھ نرمی سے میرا کام چلتا کرادیں (ص 310 تا 311)

منشی کمال نے "اپنے خاص مقدم ملائم خاں کو چپکے سے پرکھوتا کو بلانے بھیجا... ملائم خاں پرکھوتا کی چھوٹی سی چوپال پر پہنچے۔ نہایت شیریں اور اپنائیت کے انداز میں کہا:

"پرکھوتا بھئی، منشی جی کا حکم ہے کہ کل چماروں کا بچہ بچہ کوڑی مل کے تمباکو کے کھیتوں پر پہنچ جائے..." (ص 312)

لیکن پرکھوتا نے اس کی شیریں آواز، اپنائیت اور منشی جی کے نام کا کچھ اثر نہ لیا۔ اُس نے اس حکم کو "انیائے"، "دھاندلی" اور "منشی جی شیر خاں کی اپنی اُپج" بتاتے ہوئے کہا کہ "اُجرت کی بات مہاجن اور مزدوروں کے بیچ رہے گی۔ مہاجن پوری اُجرت دے، بھرپور کام لے۔" (ص 313 تا 314) پرکھوتا اور ملائم خاں کی ردوقدح (از صفحہ 312 تا 324) پرکھوتا کے انکار سے

شروع ہو کر انکار پر ہی ختم ہوئی۔ آخر میں ملائم خاں نے اُس سے پوچھا:

39

''تو جا کر یہی کہہ دوں کہ ننگ پن پر اکڑتا ہے؟''

''ہاں جو چاہو کہہ دو۔ ننگا نہیں تو کیا دھن دولت، مال مویشی، دھرتی موروثی ہے میرے پاس؟''

اور منشی کمال شیر خاں سے ملائم خاں نے من و عن یہی آخری جملے بیان کر دیے۔ انھوں نے کہا:

''یار ملائم خاں، ایسی بھی کیا نرمی کہ میرے پاس اس کوڑی کے آدمی کا چیلنج لے کر آئے ہو؟ لاحول ولاقوۃ! لاؤ پکڑ کر سالے کو۔ کہتا ہے ننگا ہے، تو بس الف ننگا ہی کر کے لاؤ بیچ کی گلی سے، اور میرے سامنے منھ میں سے زبان باہر کھینچ کر قمچیاں لگاؤ زبان پر، ساری قانون گوئی نکال دو۔'' اور ملائم خاں نے چلتے ہوئے لاٹھی اٹھائی تو منشی کمال شیر خاں نے کہا، ''ارے رے رے! کس پر توپ باندھ کر جا رہے ہو، چمٹا پر؟ رکھو لاٹھی، رسّی لے کر جاؤ اور کمر میں باندھ کر ننگا گھسیٹتے ہوئے لاؤ، وہیں گھر کے اندر سے۔'' اور ملائم خاں نے لاٹھی رکھ کر رسّی اٹھالی اور چل پڑا۔ (ص 325)

ملائم خاں کی واپسی کے بعد پرکھوتا نے فیصلہ کیا کہ دو چار دن کے لیے اِدھر اُدھر ہو جائے مگر گھر سے بھی نہ نکل پایا تھا کہ ملائم خاں رسّی لیے آ پہنچا اور چاہا کہ اسے باندھ لے، مگر پرکھوتا مدافعت پر اُتر آیا۔ اُس کی بیوی بھی ملائم خاں سے گتھ گئی۔ اور

40

... نوجوان بیٹی خوف کے مارے گھگھیا پڑی۔ بدحواسی میں ماں اور باپ دونوں کو خاں صاحب سے علیحدہ کرنے کے لیے ماں باپ کے کپڑے کھینچنے لگی، اور اپنی بساط کے مطابق بیچ بچاؤ کی کوشش کرنے لگی، اور رو رو کر گھگھیا کر خاں صاحب سے رحم کی بھیک طلب کرتی رہی۔ اس فس جیسے رستخیز میں ظاہر بات ہے کہ گرج چیخ، ہائے وائے، بس بس، کے علاوہ جسمانی طاقت کا بھرپور

Scanned with CamScanner

استعمال ہوا۔ خاں صاحب کو پہلے تو چمار کی دور باش کی کوششوں میں دھکے لگے، جس میں وہ ایک مرتبہ پیچھے پڑی ہوئی پیڑھی میں الجھ کر گر بھی پڑے اور یہاں سے "مزاحمت بکار سرکار" کی عملی صورت پیدا ہوئی اور "دھینگا مشتی" خواہ حملے کی ہو یا مدافعت کی، اس میں پھول پان تو بٹا نہیں کرتے۔ چمار اور چماری دونوں سے جسمانی طاقت میں کہیں زیادہ گھٹے ہونے کا اندازہ کر کے خاں صاحب نے خان بہادری اور للکار، دھونس ڈپٹ سے زیادہ کام لینا چاہا، مگر جذبات سے مغلوب شودروں پر منو جی کا چڑھایا ہوا ازلی جادو بھی اس وقت چل نہ سکا اور خاں صاحب دارو گیر کی جدوجہد میں بیچ میدان شکست کھا گئے۔ اور ظاہر ہے جو کچھ ہوا اس کو ٹکسالی زبان میں ہاتھاپائی اور مار پیٹ ہی کہا جائے گا، لیکن دراصل خاں صاحب کی خاصی پٹائی ہوگئی جبھی چمار کی گلوخلاصی ہو سکی۔ اور چمار چماری تو ہوتے ہی اس لیے ہیں، ان کی کیا گنتی شمار، مگر خاں صاحب بہادر کی لات، گھونسوں اور رڈوں سے جو مرمت ہوئی وہ سنگینیت کے اعتبار سے علاقے بھر میں پہلی اور بہت بڑی واردات تھی، اور خاں صاحب جان چھڑا کر اور رتی وہیں پڑی چھوڑ کر اپنی لاٹھی اور خاص کمک لانے کے لیے بھاگے... (ص 329 تا 330)

❋

آئندہ (330 تا 345) صفحات میں ابوالفضل صدیقی نے ایک طویل منظر تحریر کیا ہے جس کا آغاز وہ زور آزمائی ہے جو پرکھوتا ملائم خاں کی گرفت سے بچنے کے لیے کر رہا ہے۔ معنوی لحاظ سے یہ زور آزمائی رتی کے پھندے سے بچاؤ کی بجائے مزدوری کے بارے میں منشی کمال کی "انیائے"، "دھاندلی" اور "اپنی اُپج" سے مدافعت کا اوّلین مظاہرہ ہے۔ اس مظاہرے کے گھٹتے بڑھتے دائروں اور بگڑتی سنورتی شکلوں اور نتائج کو ابوالفضل صدیقی نے آئندہ صفحات میں اس طور نقش کیا ہے گویا "شر کے ادارے" منشی کمال کی قائم کردہ تہہ در تہہ بھادوں کی اماوس نے نہ صرف "انگریزی داں صاحبزادے بابو خاں" بلکہ پرکھوتا اور اس کے تمام بھائی بندوں کی ازظاہر تا باطن آنکھوں پر پوری کھل کر آخر کار اُن کے انگ انگ میں قوتِ مدافعت و خود اعتمادی کے چراغ روشن کر دیے ہیں — جبکہ دوسری جانب بھادوں کی اماوس کو جاری و نافذ رکھنے کے خواہاں شر کے ادارے، ان چراغ قوتوں کو، بہ ہزار حیلہ، روشنیوں سے محروم ہی رکھنا چاہتے ہیں۔ بھادوں کی اماوس اور روشنی کی کبھی ہار تو

Scanned with CamScanner

کبھی جیت پر مبنی طویل پیکار کی ابتدا اس اقتباس سے ہوتی ہے:

41

... خاص کمک لانے کے لیے بھاگے اور بھاگ کر جو پلٹے تو ایک پر کھوتا اور اس کی جورو کیا، دنیا بھر کے چماروں کو نیست و نابود کر دینے کے قابل کمک کو ساتھ لیے، بگولے کی طرح سناتے اور سیلاب کی مانند اُلٹتے، فتنۂ محشر جلو میں اور قیامتِ کبریٰ بنے، جنگ باز خاں، شہباز خاں، گولی مار خاں وغیرہ وغیرہ اسمِ با مسمّٰی انقلاب کے ڈیڑھ دو درجن ساتھیوں کی رہنمائی کرتے ہوئے، سب کے سب آدم خور شیر کے تیوروں میں ڈوبے ہوئے۔ اور مہم کا مہیب ترین پہلو یہ تھا کہ اس جگہ پر چارج لینے اور کام سنبھالنے کے بعد منشی کمال شیر خاں آج پہلی مرتبہ بہ نفس نفیس میدان میں نظر آئے تھے۔ اس سے پیشتر آج تک اقبال کام کرتا رہا تھا لیکن اپنی پارٹی سے پچاس گز پیچھے گلی کے موڑ پر کھڑے تھے۔ ہاتھ میں صرف فتح پوری ساخت کا گھوڑے کا سخت کوڑا تھا۔ بشرے پر بلا کا اطمینان اور شعلہ سا آنکھوں میں تجسس اور غیظ کی ملی جلی نشانیاں تھیں۔ دارو گیر اور شکست و بست کسی نہ کسی شکل میں، شخصی ہو یا فوجی، حتیٰ کہ جمہوری، مگر بالادست طبقے کا ذریعۂ قیام اور طرزِ معاملت رہا ہے۔ پکڑ دھکڑ، جوتے کاری، گوشمالی، راعی اور رعایا، سرمایہ دار و محنت کش طبقے کے درمیان آئے دن کے امور ہیں، اور منشی کمال شیر خاں کی تعیناتی سے قبل بندہ علی کے یہاں بھی حسبِ ضرورت چلتے ہی رہا کرتے تھے، لیکن منشی جی اپنے ساتھ ملک الموت والی ہیبت لے کر نازل ہوئے تھے، اور یہاں نزلہ بن کر نہیں، فالج کی طرح کاشتکاروں کے سب سے زیادہ مضبوط گروہ موروثی دخیل کاروں پر گرے تھے اور وہ زہر میں بجھا کھانڈا چلایا تھا کہ ایک ہی وار میں رہتی دنیا تک جینے والے موت کے گھاٹ اتار دیے تھے۔ موروثی دخیل کاروں کی مسندِ ریاست کی ملکیت سے بھی زیادہ قدیم تھی ... [منشی کمال] ... موروثی کاشتہ اراضی سے بے دخل ہونے کے بعد کاشتکار کی نفسیات اور ردِعمل کے بڑے گہرے شناسا تھے۔ چنانچہ جیسے ہی ان کے آدمی چمار کو پکڑ کر لانے کے لیے لٹھ اور برچھے لے کر چلے تو ان کی چھٹی حس نے مبہم سے اندیشے کی بو سونگھی: "کہیں بے دخل شدہ مولازادوں کا جتھا چماروں کی پشت پناہی کے لیے تیار نہ ہو جائے!" ... اور جہاں دیدہ منشی جی اپنے آدمیوں کے روانہ ہونے کے ایک دو

منٹ کے اندر ہی اندر تقریباً پیچھے ہی پیچھے گدی پر سے اٹھ کر چل پڑے، نہایت خراماں خراماں، بڑے اطمینان کی چال چلتے ہوئے، کوڑا آہستہ آہستہ لہراتے۔ ویسے ان کے ذہن میں مدِ مقابل کیڑے مکوڑے تھے، لیکن یہ سمجھ کر کہ کہیں کوئی خاص مزاحمت مقابلے کی نوبت آجائے تو پیشتر اس کے کہ اپنے آدمی لٹھ برچھے چلائیں، وہ دور ہی سے ایک شیر کی سی دہاڑ نکال کر ہرنیوں کے گلے کی طرح منتشر کردیں — اور ایسے بارہا تجربے تھے — اور جب وہ چمر گونٹے کی لمبی گلی کے اس کنارے پر تھے تو سوڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر ان کے آدمی چمار کے دروازے پر پہنچ چکے تھے۔ انھوں نے شیر کی غوں میں لپٹی ہوئی آواز نکالی: ''لاؤ باہر... کو، ننگا کر کے، باندھ کر'' اور خلافِ امید پیچھے سے ایسے بہادر اور ہیبت وحکومت سردار کی آواز سن کر اس کمپنی کا فورس پورے ایک ڈویژن کا ہو گیا اور گھر میں داخل ہوتے وقت سب نے شیر کے حملے والی للکار دی اور اس کے ساتھ ہی منشی جی پھر شکار پر چلے ہوئے شیر کی طرح گرجے:

''لاؤ باہر... کو الف ننگا کر کے کھڑا، کمر میں رسّی ڈال کر، ذرا ہم بھی دیکھیں کتنا ننگا...''

اور ''میں تو ننگا ہوں، میرا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے!'' والی بات، کمزور کا ظلم زبردست کے اوپر — منشی جی اس کی نفسیات سے خوب واقف تھے اور اس سے بارہا دوچار ہو چکے تھے، لیکن ساتھ ہی ساتھ آدمی کو جسمانی طور پر زبردستی روزِ روشن میں ننگا کھڑا کر دینے کے مفلوج کن ردعمل اور اثرات کے بھی خوب شناسا تھے۔ چرب زبانوں کی زبان باہر کھینچ کر قمچیاں بھی لگوائی تھیں۔ منھ میں پیشاب کا نسخہ بھی نہایت مجرب اور تیر بہدف ثابت ہوا تھا۔ اور بارہا اس طرح بھی منھ بند کیے تھے کہ پھر کبھی آواز سنائی ہی نہ دی، لیکن جس نے اپنے آپ کو ننگا کہہ کر اپنی کمزوری کو طاقت بنا کر دھونس دی تھی، اس کو تو ہمیشہ روزِ روشن میں الف ننگا کرا کر ہی ذہنی اور جسمانی طور پر زیر کیا تھا، اور بغیر ایک قچی بھی جسم پر چھوائے، دن دہاڑے صرف عریانی میں جلوس نکال کر، جیسے جسم کا بند بند توڑ دیا تھا... مگر گھر کے اندر تو سناٹا تھا۔ جیسے ہی ملائم خاں تو اُدھر بھاگا تھا، چمار چماری شدید طوفان کی چڑھائی کے اندیشے میں اِدھر نو دو گیارہ ہو گئے تھے۔ البتہ نوخیز بیٹی کو گھر میں چھوڑ گئے تھے، کیونکہ انھیں اندیشہ تھا کہ ایسے موقعے پر بالعموم زمیندار کے آدمی غصّے میں پہلا اقدام گھر کو آگ لگا دینے کا کیا کرتے ہیں اور اگر آگ لگانے کا موقع نہ ہو تو کچی دیواریں زمیں بوس کرا دیتے ہیں اور چھپّر گھسیٹ کر بستی سے

Scanned with CamScanner

باہر گھوڑے پر ڈلوا دیتے ہیں، اثاث البیت جو کچھ ہوتا ہے لٹوا دیتے ہیں؛ اور اس ضمن میں ایسا وقت آپڑنے پر کمزور ترین مخلوق کو بہترین محافظ تصور کرتے ہوئے گھر میں چھوڑ گئے تھے، چونکہ یہ مضبوط اور راسخ دیہاتی روایت تھی کہ گاؤں کی بیٹی سب کی بیٹی ہوتی ہے اور سارے گاؤں کی کمزوری ہوتی ہے اور پاک امانت تصور کی جاتی ہے، لہٰذا کسی بھی قسم کے ظلم اور انتقام سے مستثنیٰ اور معصوم تصور کی جاتی ہے، اور پھر اس ہاتھا پائی میں اس کا رول خاص طور پر غیر جانبدار اور بیچ بچاؤ والا رہا تھا جس کا ملائم خاں کو بھی دھینگا مشتی میں اندازہ ہو رہا تھا، کہ ماں باپ کو کھینچ کھینچ کر باز رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے روتی گھگھیاتی رہی ہے، چنانچہ اس معصوم سے پرخاش انتقام کا کوئی امکان نہ تھا۔ لہٰذا اس کو ہدایت کر کے بھاگے تھے کہ اگر گھر کھدوائیں یا آگ لگائیں تو پاؤں پر گر کر، گڑگڑا کر، رو رو کر، باز رکھے، اور یہ کمزور کا آخری اور اکثر کارگر بھی ہتھیار ہوا کرتا ہے، لہٰذا گھر اور سوسائٹی کے کمزور ترین اور شاید موزوں ترین عنصر کو اس مہم کے لیے چھوڑ گئے تھے۔

اور ملائم خاں تو چنیل ناگ ہو رہا تھا۔ زدوکوب تو خیر یوں ہی سی تھی —— لات گھونسے دھکے، تھوڑی گالی گلوچ کا تبادلہ —— لیکن ارذل ہاتھوں توہین کے احساس میں اس کے روئیں روئیں سے چنگاریاں چیخ رہی تھیں۔ چمار چماری کے فرار ہو جانے کا اندازہ کر کے لڑکی کو دیکھتے ہی کلبی جنون کے کیڑوں نے خون میں ضرب اندر ضرب بپا کرادی —— اندھادھند اسی غریب پر آدم خور شیر کی مانند جھپٹ پڑا، اور اس کا اقدام درحقیقت آدم خور شیر سے بہت کچھ مماثل تھا بھی۔

آدم خور شیر جبلی طور پر آدم خور نہیں ہوا کرتا، اکثر انتقامی جذبے کے تحت آدم خور بنتا ہے۔ اس کا شکار اکثر عورتیں ہوتی ہیں۔ ایک ہی ادنیٰ سے حملے میں مار دینے کے بعد پہلا عمل جسم کے اوپر سے ملبوس تارتار کر کے ننگا کر دینا ہوتا ہے، پھر کھانا شروع کرتا ہے۔ بغاوت کا گردن زدنی جرم، آقا کا لامحدود حکم، ہر پہلو سے اپنی بے پایاں طاقت اور مدمقابل کا ضعف ہی ضعف، تاحدِ نگاہ میدان یکطرفہ اور خالی —— سبھی کا اور خاص طور پر ملائم خاں کا موریل سات خون معاف کی حد تک بلند ہو رہا تھا۔ ''غاؤں،'' جھپٹ کر بے چاری کی دو تین چیخیں سی، جیسے مرغی کے بچے کو چیل دبوچتی ہے، چھپّر میں سے سنائی دیں اور اس نے تو اسی جھپٹ میں آدم خور شیر والے انداز میں اسی سرعت کے ساتھ لپیٹ ہی لیا۔ دوپٹہ، لہنگا، شلوکا تار تار کر کے، اٹھتی جوانی بھرے بدن کو الف ننگا کر کے، باگ ڈور میں کس لیا...

Scanned with CamScanner

ملائم خاں کی پارٹی، کچھ رسیوں کی بندشوں بلوں، کچھ تناؤ ڈھیل کے ذریعے، تھوڑا بہت جھٹکوں، لاتوں اور لاٹھیوں کے ٹھونکوں سے پیٹھ کمر اور گردن پر الف ننگی لڑکی کو سیدھا کھڑا رکھنے کی مسلسل کوشش کرتی ہوئی، بے درنگ باہر لے آئی، اور سورج کی اربوں سال سے ایک رفتار چمکتی آنکھ بھی اس منظر کی تاب نہ لاکر جھپک گئی۔ لڑکی کو دنیا اندھیر نظر آئی اور دیکھنے والوں کو بھی کچھ ایسا ہی اندازہ ہوا کہ شاید قیامت آج ہی آجائے۔ خوردنِ گندم کی پاداش میں جنت بدر آدم وحوا نے اللہ تعالیٰ سے رو رو کر پہلی فریاد عریانی کی تو کی تھی جب فردوسیں لباس نے ان کے جسم کو چھوڑ دیا تھا۔ ستر پوشی کا تقاضا تو ذوقِ حفظِ زندگی سے کم شدید نہیں۔ حوا کی اس ارذل بیٹی نے بھانت بھانت کی ہسٹریائی چیخوں میں برہنگی کی اذیت سے پناہ مانگی، گڑگڑا کر رحم کی طرح طرح درخواستیں تو گھر کے اندر ہی ختم ہو چکی تھیں اور چھپّر سے صحن تک پہنچتے پہنچتے خوشامد، غصّے اور پھر عاجزی کے سب مدارج طے کر چکی تھی، گھر سے باہر گلی میں اس شدید فطری تقاضے کے تحت اور روح فرسا احساس سے نجات کے لیے آنکھ، زبان اور رسّی میں بندھے ہوئے ننگے جسم کی ہر دسترس سے کام لینا چاہا، مگر بے بس تھی۔ گلی میں چند قدم ڈالنے کے بعد فضا میں رحم کی عام بھیک طلب کی، اور فریادیں فلسفیوں اور دانشوروں کی فکر کو چھو آئیں، بستی کا اور کوئی آدمی نظر پڑا تو طبقۂ اناث کا درجہ یاد دلایا، مشرقی اور دیہاتی روایات کا حوالہ دیا، پکڑنے والوں کو ان کی اپنی مائیں، بہنیں، بیٹیاں یاد دلا دلا کر دہائی دی، پھر کوسنے اور گالیاں نکالیں۔ مگر جکڑی ہوئی رسّی اتنے مضبوط اور شاطر ہاتھوں میں تھی کہ بجز زبان کے اور کوئی عضو حرکت نہ کر سکتا تھا۔ زمین پر گر پڑنا تو درکنار، اک ذرا جھک بھی نہ سکتی تھی۔ اور چند قدم ڈالنے کے بعد اس نے اک ذرا آنکھیں جھکائیں تو بجلا گئی اور نہ معلوم کیسے سونل مچھلی کی طرح ایک ہاتھ رسّی کے بل میں سے نکل کر زیرِ ناف چپک گیا، جیسے مقناطیسی کشش کے ساتھ وہاں کا وہیں چپک کر رہ گیا ہو، اور اس غیر متوقع اقدام اور کامیابی پر دار و گیر کرنے والوں نے اپنی شکست محسوس کی۔ لاٹھی کے ٹھونکوں سے چھڑانے کی کوشش کی، پھر برچھے کی نوک سے خراشیں مار مار کر ہٹانا چاہا کہ منشی جی کے کام کی بھرپور تعمیل ہو، جس میں یہ ہاتھ ان کی غفلت سے نہ معلوم کیسے حائل ہو گیا تھا۔ مگر کامیاب نہ ہو سکے تو کلائی پکڑ کر چھڑانا چاہا لیکن اس نازک سی نوخیز لڑکی کی کلائی اور جسم میں فولادی شکنجے والی گرفت تھی، کھینچے نہ کھنچ ملی، جیوں کا تیوں وہ ہاتھ جہاں کا تہاں چپکا رہا، جیسے یہ اسی جگہ کا حصہ ہے۔ اور گلی میں چند قدم بڑھنے کے بعد لڑکی کے حلق

سے ذبح کرتے ہوئے ادھ کٹے گلے والی گائے کی آواز نکلی اور ننگے بدن کے ریشے ریشے پر جیسے آپوں آپ پھٹ کر پر نچے اڑ جانے والی کیفیت محسوس ہونے لگی، جیسے اندر سے ڈائنمو کا کارتوس مشتعل ہونے والا ہے اور راستہ تلاش کر رہا ہے۔ مگر اوپر سے قابو اتنا مضبوط تھا کہ ایٹم بم کے بس کا بھی روگ نہ تھا، جیسے وقت کا ٹیٹوا، مقدر کی گردن، سب کچھ شدید گرفت میں تھی۔ نہ معلوم کیسے ایک دفعہ اک ذرا ڈھیل ملی تو اپنا ایک بازو دانتوں تک پہنچ گیا اور جب تک دار وگیر والے چھڑائیں چھڑائیں، اُس نے کھال اور گوشت پٹھوں کے چیتھڑے اڑا دیے۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں سے خودکشی کی تمنا طوفان کی طرح اُمڈ اُمڈ کر رہ جاتی تھی۔ آس پاس کی دیواریں بھی اس کی رسائی سے باہر تھیں، گلی میں جگہ جگہ نیم اور بیری کے درختوں کے کھردرے، سخت، موٹے تنے بھی سر کی دسترس میں نہ تھے اور کنویں کی سنگین جگت بھی۔ ہر چیز جو ٹکرا کر اس کے سر کو پاش پاش کر کے بھیجے کو بہادے اور اس کو اس بے پایاں اذیت سے نجات دلا دے، اس کی رسائی سے باہر تھی، اور بستی کے قدیم کنویں کا بانس بھر گہرا پانی بھی اس کی ایک چھلانگ سے، بہت دور تھا جو برہنگی کی لعنت سے چھٹکارا دلا دیتا اور اپنی تاریک عمیق آغوش میں لے کر ستر پوشی کر دیتا۔ جب ساؤنٹھی ہو کر منشی جی کو دور سے گلی میں نظر آئی تو پہلی نگاہ پڑتے ہی ان کے ہونٹوں سے بھی ایک دفعہ لاحول نکل گئی اور ظالم نگاہ جھپک ہی گئی، اور اک ذرا کے ذرا خیال آیا کہ انھوں نے تو باپ کے لیے حکم دیا تھا، ان لوگوں نے باپ نہ ملا تو بیٹی پر تعمیل کر دی جوان کا مطلب نہ تھا۔ تاہم ملائم خاں کو اپنے ذاتی غصے کا بھی کچھ حق ملتا تھا، لہٰذا اب جو ہو چکا وہی ٹھیک ہے۔ ادھر ساؤنٹھی سخن پروری کا وقار بھی آڑے آیا، البتہ اتنا منھ سے نکلا: ''اور وہ... فرار ہو گیا کیا؟ ... جو ہمیں ننگ پن کی دھونس دیتا تھا۔'' مجمعے میں سے کسی نے کہا:

''چمار چمریا دونوں بھاگ گئے۔''

منشی جی نے ایک داخلی بل سا کھایا، پھر کی لے کر ہوا میں کوڑا پھٹکارا اور یہ کہتے ہوئے اینڈتے، بلوں پر بل کھاتے، کوڑا لہراتے آگے بڑھ گئے۔ ''اچھا لاؤ دُسری... کو باب عالی پر اسی طرح!'' اور چند قدم بڑھنے کے بعد پھر پلٹے، اور دوسرا حکم صادر کیا: ''بلاؤ بیلداروں کو، گھر کھدوا کر گدھوں کے ہل چلوا دو...'' اور پھر دو قدم ڈال کر گرجے: ''سپاہیوں کو بھیجو، شام تک باندھ کر دونوں... کو حاضر کریں، جائیں گے کہاں فرار ہو کر۔'' اور شیر کی طرح غراتے بڑھتے چلے گئے۔

Scanned with CamScanner

بربریت کا یہ مظاہرہ تانِ ظلم کی نئی راہ ایجاد کر کے چمار کے جھونپڑے سے بابِ عالی کی جانب اسی طرح گزرتا رہا۔ گلی میں گزرتے ہوئے اُلٹ کر جا پڑے۔ دروازوں پر کھڑی یا ادھر سے اُدھر گلیوں میں آتی جاتی عورتیں ہسٹریائی انداز میں بدحواس ہو گئیں اور چیخ کر بے ہوش ہو گئیں۔ ڈھائی ہزار نفوس کی آبادی کے موضعے میں کھلبلی مچ گئی، جیسے صبح ہی صبح مولا علی کی موت کی خبر حویلی سے باہر آتے ہی ہوا تھا۔ سمجھدار لوگ دم بخود رہ گئے۔ بوڑھی عورتیں سینہ کوبی اور بین کر اٹھیں۔ عورت، مرد، بچہ، بستی کا ہر فرد، خبر پر اپنی جگہ سے اٹھ کر ادھر کو بھاگ پڑا۔ کسی نوکر لڑکے نے بڑی بیگم کو دوڑ کر حویلی میں خبر کی۔ چمار زادی سیدانی بیگم چالیس سال قبل بڑے میر صاحب کی منکوحہ بنی تھیں اور چمار باپ کے جھونپڑے سے سیّد شوہر کے محل میں داخل ہوئی تھیں... تو اس کے بعد آج پینتیس چھتیس سال ہونے کو آ گئے تھے، ڈیوڑھی کے باہر قدم ہی نہ آیا تھا ...اور جوں ہی ملازم لڑکے نے باہر سے آ کر حویلی میں بتایا کہ کسی چمار کی لونڈیا کو دن دہاڑے مادر زاد ننگا کر کے باندھ کر لائے ہیں، بیگم جیسے کئی بچھوؤں کے ڈنکوں کی خلش سے بِکلا کر جا پڑیں۔ لوگ تو کہتے ہیں کہ ان کے اندر والی چماری، مگر درحقیقت سوئی ہوئی عورت تڑپ کر باہر آ گئی اور باہر آ کر بپھری شیرنی بن گئی۔ اپنے گوش محل سے اُٹھ کر سیدھی بہو (بندہ علی کی بیوی، حاجی میاں کی بیٹی) کی حویلی میں جا دھمکیں اور دو لفظوں میں صورتِ حال بتا دی، اور بہو بھی غصے میں بپھری ساس کے ساتھ ساتھ ہولی، اور ہزار ہا سالہ روایات کے قلعے توڑتاڑ کر اپنے طبقے اور حویلی و دیوان خانے کی تاریخ میں رخنہ ڈالتیں، منہ کھولے مردانے میں نکل آئیں۔ کئی نوکرانیاں "ہیں ہیں، کیا کرتی ہیں!" کہتیں پیچھے پیچھے ہو لیں۔ مردانے مکان میں بھگدڑ مچ گئی۔ جو ملازم حالی موالی جہاں تھا، اس نے وہیں کسی نہ کسی کپڑے سے منہ ڈھانک لیا۔ جسے فوراً کپڑا میسر نہ آیا اس نے آنکھیں میچ کر دیوار سے منہ بھڑا دیا، کونے میں گھستا ہی چلا گیا۔ اس ملازم لڑکے کی رہنمائی میں بڑی چھوٹی دونوں ساس بہو بیگمیں دیوان خانے کا وسیع صحن پار کر کے منشی کمال شیر خاں کی نشست گاہ اور دفتر کی جگہ پہنچ گئیں، جہاں جتھا اکٹھا تھا اور چمار کے بجائے چمار کی بیٹی کی روبکاری ہو رہی تھی۔ ایسے طبقے میں یہ روایت شکنی شاید کبھی سورج کی آنکھ نے بھی نہ دیکھی تھی۔ بیگمات کے یوں مخلا بالطبع یکا یک بے شان و گمان کمرے میں گھستے ہی پورے مجمعے کے منہ سے بے ساختہ مہمل سی چیخ بلند ہوئی۔ منشی کمال شیر خاں کو بھاگتے ہی بن پڑی۔ اور تو سب

Scanned with CamScanner

شکرے کے جھپٹے ہوئے چڑیوں کے جھنڈ کی طرح، جدھر کو جس کا منہ تھا اسی دروازے سے بھاگ پڑا، منشی کمال شیر خاں کو بھاگنے کا بھی موقع نہ تھا۔ ہیبت اور حیرت میں لپٹی چیخ ان کے منہ سے بھی نکل گئی۔ چوکی پر سامنے ڈیسک تھا، پیچھے گاؤ تکیہ اور دیوار، اسی چھوٹی سی تنگ جگہ میں عافیت سمجھی، جہاں کے تہاں سکڑسمٹ کر ڈیسک کے نیچے اوندھے منہ ڈھیر ہو کر سمو گئے، گدی اور تکیہ اوپر اوڑھ لیا۔ بیگمات نے برہنہ نسوانی جسم جو دیکھا تو ہسٹریائی انداز میں ان کے منہ سے بھی موت جیسی چیخ بلند ہو گئی۔ بہو تو بے ہوش ہو کر گر گئی، ساس نے اپنا دوشالہ اتار کر ڈال دیا۔ لڑکی مخبوط الحواس ہو رہی تھی، دوشالہ پڑتے ہی بے ہوش ہو گئی۔

اور اب چند ساعت کے لیے موت جیسا سناٹا تھا۔ بیگم نے خود کو سنبھالا، ایک نوکرانی کا دوپٹہ لے کر اوڑھا اور بدحواس بہو کو اندر لے جانے کا اشارہ کیا ہی تھا کہ دیوان خانے کے کسی حصے میں بندہ علی شطرنج کھیل رہا تھا، خبر پاتے ہی ننگے پاؤں ادھر بھاگا۔ پہنچا تو ماں اور بیوی دونوں کو زنجیر عدل ہلاتے بلکہ قانون ہاتھ میں لیے اس طرح دیکھا کہ ارسطو سے لے کر بندہ علی تک تاریخ خاموش تھی۔

''ہیں! ہیں! اتی! آپ! آپ کیوں؟ وہ وہ و، جو کچھ بات تھی مجھ سے کہتیں! اور بات کیا تھی؟''

مگر وہاں کوئی صورتِ حال بتانے والا باقی ہی نہ رہا تھا۔ منشی کمال شیر خاں اس خرگوش کی طرح جس کی پناہ گاہ پر بھوکی شیرنی آدھمکتی ہے اور لقمہ بنانے کے لیے راہ کی تلاش میں ہوتی ہے، ڈیسک کی بے معنی سی آڑ لیے، سانس روکے، چوکی کے گدے اور گاؤ تکیے کی دیوار میں ضم تھے۔ اور بپھری ہوئی شیرنی جیسی ماں نے بیٹے کے دو ہتڑ ماری اور جذبے میں بھر کر ایک مرتبہ دوشالے میں سے لڑکی کو دبکا ہوا ننگا ڈھیر کھول کر سامنے کر کے پھر ڈھانک دیا۔ حالانکہ دو ہتڑ کے ساتھ محاسبے اور جرم کی نوعیت پر جسم میں ایک مرتبہ کو سنسناہٹ تو ضرور ہوئی، مگر ساونتی وقار کا تحفظ آڑے آیا اور ضبط کر گیا، تاہم گھبرا گیا۔

''امی! امی! آپ اندر جائیں!'' اور بیوی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا، ''چہ چہ چہ اور انھیں... ان بچاری کو بھی نکال لائیں، توبہ توبہ! امی، آپ لوگ اندر آ جائیں۔''

اور بڑی بیگم پھٹ پڑیں۔ ''نہیں جاؤں گی تیرے باپ کے محل میں۔ ابھی قبر پر جا کر پانچ جوتیاں مارتی ہوں تیرے باپ نگوڑے کی۔ تیرے یہ نمک حرام درندے! عورت کی یہ بے حرمتی!

Scanned with CamScanner

لڑکی پر، بستی کی بیٹی پر یہ ستم!''

''امی، آپ اندر آ جائیں!'' اور نوکرانیوں کو بیوی کو سنبھال کر لے جانے کے لیے اشارہ کیا۔

''امی، میں سب نبٹ لوں گا۔ آپ اندر تو جائیں۔ یہ بزرگوں کی ناک کٹ رہی ہے کہ پردے سے بیگمیں باہر نکل آئی ہیں ... کبھی ڈیوڑھی کی چوکھٹ پار نہیں کی اس حویلی کی۔ سادات کو بھی بٹا... چہ چہ، کبھی ایسی کہیں ہوئی تھی۔''

''دور ہو جا میرے سامنے سے موذی! خدا کی مار تجھ پر، چلا جا ابھی! کون، تیری ماں ہے اور کس کا تو بیٹا ہے؟ اگر زیادہ باتیں کی تو ابھی عاق کر کے تیرے باپ کے گھر سے نکل جاؤں گی۔ یہ تو بڑا سید بنا پھرتا ہے! سادات کے یہ کرتوت ہیں! — ایں! وہ تو میں جانتی ہوں، نہیں تو سمجھتی کہ تو کسی کمینے کا وہ ہے۔''

''امی، حد سے نہ بڑھیے! یہ ریاست کے معاملات ہیں، آپ نہیں سمجھ سکتیں۔ آپ نے پردے سے باہر آ کر سادات کی ناک تو کٹا دی، اور کیا چاہتی ہیں؟ غضب خدا کا، کبھی بیگمیں اس طرح باہر آئی ہوں گی۔ یہ دن بھی دیکھنا تھا، میرے اللہ! بزرگوں کی قبریں پھٹ جائیں گی امی آج! ہائے میرے خدا، یہ کیا ہو رہا ہے آج...''

''اگر زیادہ بولا تو ابھی ابھی کپڑے اتار کر یہیں پر تیرے سامنے الف ننگی ہو جاؤں گی اور تیرے باپ کی ناک کٹا دوں گی۔'' بندہ علی کانپ کر ہٹ گیا اور بیگم بولتی رہیں: ''چل دور، خدا کی مار تجھ پر اور تیرے بزرگ نگوڑوں پہ۔'' اور پھر منشی کمال شیر خاں کی اوندھے منھ پڑی ہوئی پوٹ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی'' اس موئے نمک حرام پہ اللہ کی مار، علی کی سنوار، اس کو تو مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دوں ابھی تو بھی جی ٹھنڈا نہ ہو! گھگھو کا خواص، جہاں گیا نگوڑے نے تباہی مچائی۔''

یہ کہتے ہوئے لڑکی کو نہایت اہتمام اور احترام کے ساتھ اپنے دوشالے میں لپیٹے ہی لپیٹے دو نوکرانیوں کے سہارے اٹھایا، جیسے ہسپتال میں ماہر نرسیں کسی حادثے سے چور زخمی کو فرسٹ ایڈ کے وقت سنبھالتی ہیں، اور حویلی میں لے کر چلی گئیں۔ ... ممکن ہے کہ منشی کمال شیر خاں اور اس کے حالی موالیوں نے اپنی دونوں آقاؤں کی اس حرکتِ ناشائستہ کو چمار زادی اور حجام بچی ہونے پر محمول کیا ہو، لیکن دراصل ان دونوں ساس بہو کے اندر سے خالص عورت کھل کر سامنے آئی تھی — اپنے اصلی

Scanned with CamScanner

روپ اور فطری حالت میں — اور بڑی بیگم کی اندر والی عورت نے نکل کر ایک دفعہ سیّد زادے بیٹے اور اس کے بہادر و بیباک حالی موالی سب کو زیر کر لیا اور اندر سے باہر تک نظام بہشتی کی بادشاہت کا سماں باندھ دیا۔ بندہ علی چپ رہا، منشی کمال شیر خاں اور حالی موالی روپوش ہو گئے۔ عورت کی بے پناہ طاقت کھل کر سامنے آ گئی اور عزت سادات پیٹی کوٹ گورنمنٹ کی گرفت میں تھی۔ حویلی میں لے جا کر بیگم نے شکرے کی جھپٹی ہوئی گوریا کی تالیفِ قلب کی، اور داغ داغ روح والے جسم پر اپنے لباس میں سے ایک ساڑھی نکال کر پہنائی اور دونوں ساس بہو چند نوکرانیوں کو ساتھ لے کر دن دہاڑے ڈیوڑھی میں سے دیوان خانے میں اور دیوان خانے کے پھاٹک میں سے گلی میں نکل آئیں اور چمار کے گھر کی جانب چل پڑیں۔ بستی میں بھونچال سا بپا ہو گیا۔ سورج کی کرنیں بھی کانپنے سی لگیں۔ اِدھر سے اُدھر تک بھاگڑ پڑ گئی۔ جو مرد راستے میں سامنے آیا، اوندھے منھ اُلٹ کر جا پڑا۔ بیگم روزِ روشن میں منھ کھولے باہر تھی! فلسفہ تاریخ حیرت سے منھ کھولے رہ گیا۔ بستی کی جو عورت دروازے یا گلی میں سامنے آ گئی، حیرت کے ساتھ سجدے میں گر گئی۔

لڑکی کو اس کے گھر میں بٹھا کر بیگم نے چمار کی چوپال پہنچ کر کھڑے ہی کھڑے اپنی فکر و استعداد کے مطابق ڈھنڈورا پٹوانے کے احکامات صادر کیے :

1۔ پرکھوتا اور اس کی عورت گھر واپس آ جائے۔

2۔ ہر کاشتکار اپنی زمین پر اپنے ہاتھ سے کام کرے۔ کسی کھیت مزدور کو اُس کی مرضی کے خلاف نہ لے جایا جائے اور منھ مانگی اُجرت دی جائے۔ (ص 330 تا 345)

❁

بستی پر طاری بھادوں کی اماوس میں پہلا شگاف پرکھوتا کی زور آزمائی ہے، جس کے دوران زمیندار کے گماشتے کی ''مرمت ہوئی۔'' اسے کہانی کا راوی ''سنگینیت کے اعتبار سے علاقے بھر میں پہلی اور بڑی واردات'' کہہ رہا ہے۔ دراصل یہ واردات اُس چراغ کی اوّلین کرن ہے جو علاقے بھر میں پہلی بار روشن ہوا؛ اوّلین کرن گویا فتیلے کو چنگاری بنی تو زمیندار کا گماشتہ تلملاتا، بگولے کی طرح سناتا ہوا نکلا، اور پلٹا تو بطور کمک ڈیڑھ دو درجن آدم خور اس کے ساتھ تھے۔ اوّلین کرن کی سرکوبی کے لیے منشی کمال شیر خاں بھی بہ نفس نفیس میدان میں اترا۔ ''اس سے پیشتر آج تک اقبال کام کرتا رہا

تھا۔'' اُس کے ہاتھ میں '' گھوڑے کا سخت کوڑا تھا'' کیونکہ آج ایک آدم زاد، اپنے وجود میں جنمی کرن کے طفیل، بستہ و برہنہ حیوان بننے کا دفعیہ کرنے چلا تھا۔ کمک سمیت ملائم خاں کے بعد منشی کی آمد، پرکھوتا کے عمل کا دوسرا '' اور مہیب ترین '' ردعمل ہے۔

اس مہیب تا مہیب ترین ردعمل نے بستی پر طاری بھادوں کی اماوس کو اس درجہ گہرا دیا کہ سورج کی '' آنکھ اس منظر کی تاب نہ لا کر جھپک گئی۔... لڑکی کو دنیا اندھیر نظر آئی۔... گلی میں گزرتے ہوئے لوگ اُلٹ کر جا پڑے، دروازوں پر کھڑی یا اِدھر سے اُدھر گلیوں میں آتی جاتی عورتیں ہسٹریائی انداز میں بدحواس ہو گئیں اور چیخ کر بے ہوش ہو گئیں... بوڑھی عورتیں سینہ کوبی اور بین کر اُٹھیں... '' گویا'' اینڈتے، بلوں پر بل کھاتے، کوڑا لہراتے'' منشی شیر خاں اور اس کے ڈیڑھ دو درجن آدم خوروں کے علاوہ، آسمان تا زمین سب کی بصیرت پر بستی کی مہیب ترین بھادوں کی اماوس منکشف ہے۔

ایک مہیب ترین ردعمل کا دائرہ پھیلتے پھیلتے، بڑھتے بڑھتے، ایک لازمی ردعمل کے حامل عمل کی صورت اختیار کر گیا۔ یوں، عمل اور ردعمل کے کئی پھیر دکھانے کے بعد بھادوں کی مہیب اماوس میں لپٹی ایک بستی کو اس (آئندہ) عمل پر آمادہ دیکھنا اور دکھانا ہی غالباً ابوالفضل صدیقی کا اصل مدعا ہے۔ آئندہ عمل بھی، ردعمل کے چھوٹے بڑے، بنتے بگڑتے دائروں سے گزرتا ہوا، اختتام کو پہنچے گا۔ ایسے اختتام کو، جس کے بعد کوئی ردعمل کہانی میں درج نہیں۔

42

المیے کی شدت سے بستی میں دن کا چولھا تو کسی گھر میں گرم ہی نہ ہوا تھا۔ شام کو فضا میں بھی '' مرگند'' سی پھیلی ہوئی تھی۔ بچوں ہی نے کھانا کھایا۔ دونوں ہی حادثے ایک سے ایک بڑھ کر ہمالیہ شکن اور بندھیا چل اُلٹ تھے — دن دہاڑے نوخیز دیہاتی لڑکی کا ننگا جلوس، بیگمات کا روز روشن میں حویلی کے اندر سے گلی میں درشن دینا۔ ویسے گاؤں کے اندر ابھی کئی بوڑھے زندہ تھے جنھوں نے انھیں بڑی بیگم کو اِنھیں گلیوں میں سے گوبر کا ٹوکرا اُٹھا کر لے جاتے اور بٹورے کے قریب اُپلے تھاپتے دیکھا تھا، تاہم چالیس برس سے تو کسی نے آنچل کی جھلک بھی نہ دیکھی تھی۔ بہر حال دونوں ہی اقدام اپنی جگہ پر بڑی اہمیت کے حامل تھے، لیکن بیگم کے اس روایت شکن اقدام اور مراعات سے نہ

Scanned with CamScanner

تو پرکھوتا چماری کی اور نہ بستی والوں کی اشک شوئی ہوئی، اور ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ آج ہی قصبے کے اندر ہفتے وار نخاسے اور پینٹھ کا دن تھا۔ دل کھول کر باہر دور دور تمام علاقے کے آئے ہوئے دیہاتیوں سے تبادلۂ خیال ہوا، بات ایک سے دوسرے اور تیسرے چوتھے تک پہنچی۔ سادات نگر کے لوگوں میں تو جیسے دل کی بھڑاس نکل گئی، پھر بھی آج کی رات بستی پر وہ ہُو اور مہیب سناٹا طاری رہا جو کبھی ہیضے طاعون کی وبا میں پورے زور کے دوران راتوں کو طاری ہوا کرتا ہے۔ تاہم بستی کے اندر منشی کمال شیر خاں کی نظامت میں کھلم کھلا کوئی تحریک تو درکنار آنکھ بھی نہ اٹھ سکتی تھی، البتہ بستی سے باہر نخاسے اور ہاٹ کے ذریعے جو خبریں اور افواہیں پہنچیں، انھوں نے پینک (panic) کی دبی دبی ہلکی لہر پھیلائی اور اس علاقے کے اندر پہلی مرتبہ اپنی نوعیت کا ردعمل ظہور پذیر ہوا... اور مختلف چور گلیوں سے اندھیری راتوں کی کالی چادر کی آڑ آڑ یہ اپنی نوعیت کے بالکل ہی نادر جراثیم بنجوں کے بل چل چل کر سادات نگر کی دم بخود سناٹے میں ڈوبی فضا کے اندر داخل ہوئے اور اقتصادی زخم خوردہ مولازادوں نے انھیں قبول کیا اور راتوں رات ان کے اندر کلچر ہو کر چماروں میں حلول کر گئے۔ اس طرح جیسے چوہوں کے بلوں سے نکل کر آبادی کی فضا میں طاعون کے جراثیم پھیلتے ہیں، یہ بغاوت کے کیڑے سادات نگر کے گھر گھر پر محیط ہو گئے۔ آج چمار کی ننگی بیٹی پورے علاقے کی ناک ہو گئی، اس کی جامہ دری کو ہر دیہاتی اپنی بیٹی کی عصمت دری تصور کر کے بل کھانے لگا، لیکن مقابلہ اُس بے ڈھب ٹیڑھے سے تھا جس کی ساری عمر بل نکالتے ہی گزری تھی۔ مگر جب تک منشی جی کے شہر خبرے نوعیت کے انٹیلی جنس گماشتے بھانپ کر اس سازش و بغاوت کے پروان چڑھنے کی اطلاع ان تک پہنچائیں، چماروں کی پنچایت نے اگلے نخاسے ہاٹ کا دن اکٹھ کے لیے تعین بھی کر دیا، اور عام برادری میں کھلم کھلا اعلان بھی کر دیا اور چماروں کے اعلان پر سبھی اچھوت برادریوں نے دستِ تعاون بڑھایا اور یہ ہفت ہزار سالہ تاریخ اور دیومالائی روایت میں پہلا تجربہ تھا... (349 تا 351)

... بستی سے باہر نخاسے والے باغ کے برابر ہی کھلیان کا لق و دق میدان پڑا تھا... شودروں کا یہ عظیم تاریخی اجتماع اسی میدان پر ہوا۔ ایشیا کے اندر برصغیر خطہ ہی شودروں کا ہے، لہٰذا اجتماع میں بھی بھاری تعداد انھی کی ہونی چاہیے، لیکن اس وقت بھی ہمیشہ کی طرح اس عظیم اجتماع کی چمکتی ہوئی حد تک نمایاں شخصیتیں اور صوری و داخلی ہر پہلو سے سربرآوردہ شر کا علاقے کے چند پنڈت برہمن بھی

تھے ...(ص353)

... یہ پلیٹ فارم ازل سے ابد تک انھیں کی تو میراث تھا، جس کی سند منو جی کا کوڈ تھا، لیکن آج یہ کچھ اندر ہی اندر متحیر اور پھر جز بز تھے۔ مجمعے کے تیوروں کا اندازہ کر کے ان بزرگوں نے چہروں کو اور بھی لٹکا لیا اور بعض بعض نے ماحول کی گندگی اور مجمعے کے ملیکش ہونے کا احساس کر کے کانوں پر جنیؤ بھی چڑھا لیے... ہر ایک پریت (برہمن) نے اپنے اپنے حلقۂ جَجمانی کو تھام لینا چاہا اور شودروں کو منوشاستروں اور ویدوں کے حوالوں سے ان کا مقام سمجھایا اور ''راجا پرجا'' کے تعلقات بتائے اور اس کے خلاف عمل اور قول تو در کنار، دل کے اندر خیال بھی لانے کی اس جنم اور آنے والے اور نہ معلوم کتنے جنموں کی پاداش سمجھائی اور ایک دفعہ کو مجمعے کے اندر متزلزل ہونے جیسے آثار رونما ہوئے ہی تھے اور ہر شودر جیسے کچھ سوچ میں پڑ کر ایک دوسرے کا منھ سا تکنے لگا تھا، کہ عین اسی وقت مولازادوں کا پورا گروہ ظہر کے نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے سیدھا ادھر کو آ گیا۔ فرضوں سے قبل والی سنتوں کے بعد جماعت کھڑی ہونے سے قبل آج خلافِ معمول پیش امام نے ملکہ وکٹوریہ کے دور والے علما کا پیٹنٹ وعظ کہا جس کا خلاصہ وہی تھا جو ملکہ وکٹوریہ کے زمانے میں مخصوص قورمہ خور علما نے گڑھا تھا اور خدا، رسولؐ اور حاکم وقت کی اطاعت کرنے کے قرآنی حکم کی تفسیر، بندہ علی، منشی کمال شیر خاں اور کوڑیا مہاجن پر منطبق کی، اور بستی کی تاریخ میں ملاں جی کی آواز پہلی مرتبہ محراب و منبر کے اندر ہی گونج کر رہ گئی اور نماز سے فارغ ہو کر جماعت کی جماعت مسجد سے سیدھی اس مجمعے میں پہنچ گئی۔ مولازادے اس بستی کے ذرا اہم عنصر تھے اور اک سال بھر پہلے تک علاقے کے سب سے بڑے رقبے کے موروثی ذخیل کار کاشتکار تھے۔ شودروں میں ان کی آمد سے نئی روح پھنک گئی اور اب اس بساط پر ہر سطح کا مہرہ جمع تھا۔ پنڈت پریتوں کو ان کی آمد ایسی محسوس ہوئی جیسے کسی راجپوت ٹھاکر کے یہاں تیرھویں کے دان کا بھوجن کرتے ہوئے کچوریوں میں شکر ملا دی جائے، یا لڈوؤں میں پسی ہوئی سیاہ مرچیں ڈال دی جائیں۔ مولازادے آج اپنی عقل سے ملاّ جی کے فتوے کا رد کر کے آئے تھے۔ زن، زر، زمین کا وہی ازلی قضیہ تھا۔ چمار زن کے معاملے میں فریادی تھے۔ کوڑیا مہاجن کے مزدور زر کے اور خود مولازادے زمین کے نالشی تھے، اور سب کے انٹریسٹ اس وقت ایک مرکز پر جمع اور ایک ڈورے میں پروئے ہوئے تھے۔ پشتینی پریتوں اور پنج وقتہ کے امام کی تلقین، منشی کمال شیر

Scanned with CamScanner

خاں کا حکم اور بندہ علی کی آبائی اور پشتینی قوت، ہر طاقت بہت سے بے زبانوں اور کمزور اور ہر آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ ادھر بڑی بیگم کی اعلان کردہ مراعات کا بھی بہانہ تھا۔ سب کے سب دیکھتے ہی رہ گئے، ان شودروں کی پنچایتوں اور بے زمین کھیت مزدوروں کی برادریوں نے طے کر دیا کہ کوڑی مل مہاجن کی تمباکو کی فصل پر کوئی کام کرنے نہیں جائے گا، چاہے بھوکوں مرجائے۔ اور جو کوئی جائے گا اس کو برادری سے خارج کر کے حقہ پانی ڈال دیا جائے گا... (ص 354 تا 356)

❋

کہانی ''پھیر'' کا اختتامی باب کھولنے سے قبل (کئی لحاظ سے) مناسب محسوس ہوتا ہے کہ کہانی ''دھارا'' کے اُس حصے کا مطالعہ کر لیا جائے جس میں (چتر گونٹے کی چپے چپے زمین پر اختیار حاصل کرنے کے بعد) سنگھ بابو نامی نوجوان جاگیردار کی جملہ توتیں، اب سیوتی نامی لڑکی پر، یعنی زمین کے بعد زن پر قبضہ واختیار کے لیے بروئے کار آ رہی ہیں۔

اسملاژ کے ایک جزو (اقتباس:4) میں سیوتی کے حسن و جمال سے متعلق چودھری کے تاثرات کے بعد، کہانی کے در پردہ راوی ابوالفضل نے بتایا ہے کہ سنگھ بابو پر چودھری اور دیگر احباب کی باتوں کا اثر یہ ہوا کہ اس نے سیوتی کو پہلی بار ایک مرد کی نظر سے دیکھا اور دیکھ کر دل وجان کی ایسی بے کلی میں مبتلا ہو گیا جس کی دارو اس کے نزدیک صرف سیوتی تھی۔ (ص 49 تا 56)

گاؤں کا مکھیا چتر سنگھ عرف چتریا ''گاؤں کی سیاست میں اُس کا آنریری مشیر، اہم معاملات میں اُس کا دستِ راستِ اور بے تنخواہ کا انٹیلی جنس آفیسر اور اس کا بچپن کا دوست...'' (صفحہ 57) ہے، جو ہر دوسرے تیسرے رات کے اندھیرے میں اس کے پاس آتا ہے۔

سنگھ بابو نے دل وجان کی بے کلی میں ایک رات اور دو دن کاٹے۔ دوسری رات کا پہلا پہر بیتتے بیتتے، چتریا ملاقات کے لیے ان کے پاس خوابگاہ میں آیا۔ اس نے سنگھ بابو کے بشرے سے نمایاں اضمحلال کو محسوس کرتے ہوئے ان کی مزاج پرسی کی۔ حالانکہ:

43

...وہ تو کل ہی سے خود اپنی پریشانی کا سبب بتانے کے لیے اس کا منتظر تھا مگر اظہار کے لیے

Scanned with CamScanner

الفاظ اب بھی زبان کے پاس نہ تھے اور چتریا کی مجسم سوال جیسی خاموشی نے اس کے دل میں نشتر کی نوک سی چبھو دی، اور جیسے وہ ایک ہی ترنگ سی لگا کر اٹھ کر بیٹھ گیا اور فرد کی دبیز تہوں کے ساتھ اپنے اوپر کی بہت سی تہیں اتار کر پھینک دیں اور وہ یک دم اٹھارہ بیس سال پیچھے جا پڑے، جیسے وہ کسی چڑیا کا گھونسلا بھانپ کر اور سب ساتھیوں سے چھپ کر اس پر چھاپہ مارنے کی صلاح کیا کرتے تھے اور ایک کو دوسرا انڈے بچے چرانے کے لیے چڑھنے کو اپنی پیٹھ اور کندھے پیش کیا کرتا تھا اور بالعموم چتریا ہی کے کندھوں پر چڑھ کر سنگھ بابو گھونسلے میں ہاتھ ڈالا کرتے تھے۔

اور چتریا سے سنگھ بابو نے اپنے دکھ درد کی کہی اور نہایت صاف صاف کہی، اور چتریا تو بھونچکا سارہ گیا۔ آج سنگھ بابو کہاں سے بولے! وہ ان کا منھ تکتا رہا اور وہ کہتے رہے اور یہ سنتا رہا۔ پچھلی تاریخ کے زرّیں ترین ورقوں کے پھاڑنے کی سرسراہٹ! اور پھر سناٹے میں آ گیا۔ بمشکل اس نے اس جوار بھاٹے کو دبایا جس کی تحریک اُس کے اندر سنگھ بابو کے پہلے جملوں پر ہوئی تھی، اور اس مقام پر سنگھ بابو کو اتنی مضبوطی کے ساتھ جما ہوا پا کر جیسے پہلے تو اس کو سانپ سونگھ گیا اور پھر خود اس کو اپنے وجود میں زلزلہ سا محسوس ہوا، اور وہ اپنے دوست آقا کا راز سن کر سچ مچ کانپ اٹھا، اور یہ اسی کے اپنے دل ہی کا تو راز تھا جو آج سنگھ بابو کے منھ سے نکل نکل کر اُس کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح پڑ رہا تھا — اُن کا اپنا راز بن کر! اور جیسے آج یہ راز اُس کا راز نہ رہا تھا اور ابھی تک تو اس کو اپنے راستے میں دریاے برہم پتر کے پھاٹ کی طرح دھارا ہی نظر آتا ہے اور اب تو اس کے پار ہمالیہ پہاڑ کھڑا ہو گیا، اٹل و باجبروت۔ (ص 57 تا 58)

[اور چتریا کو اندازہ تھا کہ] سیوتی خود دھارا کو پسند کرتی تھی اور اس کی تمام تر عزت اور مالی فراغت کے اوپر دھارا کے افلاس اور پریشانیوں کو ترجیح دیتی تھی... (ص 59)

[سنگھ بابو کے دل کی بات سن کر چتریا نے انھیں] دیہاتی و مشرقی اخلاقیات اور روایات کا سبق یاد دلایا اور پھر خاص طور پر اُن کے جدِ امجد کا رعایا کے ساتھ اس ضمن میں سلوک اور رکھ رکھاؤ اور ماں، بہن، بیٹی کا رشتہ یاد دلایا۔ لیکن سنگھ بابو کو تو آج بجز سیوتی اور کچھ یاد ہی نہ تھا اور ایسی چڑھی تھی کہ ہاں میں ہاں ملانے والی جماعت کا پیش امام چتریا زیادہ کٹ حجتی کرنے کی ہمت نہ کر سکتا تھا اور نہ سنگھ بابو ہی اس مسئلے میں زیادہ بارِ سماعت برداشت کر سکتے تھے۔ بالآخر ہر پہلو سے احتیاط کے ساتھ

Scanned with CamScanner

ہلانے جلانے کے بعد اسے، قہر درویش برجانِ درویش، اور سب اہم مسئلوں کی طرح اس مسئلے میں بھی سنگھ بابو سے ان کی مرضی کے مطابق ہاں میں ہاں ملانی پڑی، اور ''سانپ بھی مرجائے گا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے گی'' کا استادانہ وعدہ کر کے ہی اٹھنا پڑا... (ص 60)

❁

سیوتی کے لیے سنگھ بابو اور چتریا کی چاہت اور دھارا اور سیوتی کی ممکنہ شادی کے ذکر سے ابوالفضل نے کہانی میں مطلوبہ پیچیدگی پیدا کردی ہے جو قاری کو تجسس میں مبتلا کر رہی ہے۔ یہاں تک آتے آتے قاری سمجھ لیتا ہے کہ جس طرح کہانی ''پھیر'' میں پرکھوتا کی بیٹی تصادم میں شدت کی وجہ بنی تھی، غالباً اسی طرح ابوالفضل اس کہانی کا اساسی تصادم واضح کرنے کے لیے سیوتی کو وسیلہ بنا رہے ہیں۔ ''پھیر'' میں زمین پر کلّی اختیار کے لیے پیدا شدہ تصادم پرکھوتا کی بیٹی کے سبب شدید ہوا اور دیگر دو عورتوں یعنی رم کلیا اور چاند بی بی — بالخصوص رم کلیا — کے باعث شدید تر صورت اختیار کرتا ہوا اُس اکٹھ تک پہنچ گیا جس میں بے زبان کمزوروں نے ایک حیرت خیز فیصلہ کیا ہے لہٰذا قاری اندازہ کر لیتا ہے کہ کہانی ''گل زمین کی تلاش میں'' کی طرح ان دو کہانیوں میں بھی عمل ورد عمل کے سلسلے اُسی طبقے کی عورتوں کے وسیلے سے شدید تا شدید ترین صورت اختیار کر رہے ہیں جس سے گلابو کا تعلق دکھایا گیا تھا۔ گویا ابوالفضل اپنے قاری کو محسوس کرانا چاہتے ہیں کہ معاملاتِ زندگی ان عورتوں کا بھی اُتنا ہی اور ویسا ہی اثر قبول کرتے ہیں جتنا اور جیسا کسی اعلیٰ کہے جانے والے طبقے کی عورتوں کا۔

کہانی ''دھارا'' میں پیدا کی ہوئی پیچیدگی کو مزید پیچیدہ بناتے ہوئے ابوالفضل نے دکھایا ہے کہ سنگھ بابو نے دل وجان کی تشفی کے لیے سیوتی کے ماں باپ کے نام وسیع اراضی لکھ دینے کی پیشکش کی جس سے ان کی آنکھیں اک ذرا خیرہ ہوئیں لیکن سیوتی بپھر اٹھی: بالکل ویسے ہی جیسے غیرت وحمیت کی پاسدار اور اپنے انسانی وقار سے آگاہ، نام نہاد اعلیٰ طبقے میں جنمی کوئی باشعور لڑکی اپنی عفت وعصمت کے دام لگنے پر بپھر سکتی ہے۔

کچھ بعید نہیں کہ ابوالفضل صدیقی سیوتی کے اس غیرت مندانہ ردعمل میں دھارا کی فہم ونظر کی وہ قوتیں بھی شامل کرانا چاہتے ہوں جو اسے قصبے پار وسیع تر معاشرے میں شمولیت اور انسانی دکھوں میں شرکت کی درس گاہ سے حاصل ہوئی ہیں۔ سنگھ بابو نے دھارا کو بھی زمین کا لالچ دیا تا کہ وہ سیوتی

کے خیال سے باز آ جائے مگر دھارا کی آنکھ اک ذرا بھی خیرہ نہ ہوئی۔

"... سنگھ بابو کو اس سودے میں اپنے لمبے چوڑے رقبے مٹی معلوم ہونے لگے جیسے ان کے فارم کی، اُن کے گاؤں کی سب وسعتیں سمٹ سمٹا کر چماری کے ظرف کی تنگنائیوں میں سما گئیں۔ مگر زمین کی ملکیت کا شعور، اور وہ بھی صدیوں پرانا دماغ میں نمرودیت اور فرعونیت پیدا کر کے خدا کی تسخیر کے جہلِ مرکب میں گرفتار کرتا ہے..." (ص 82 تا 83)

لمبے چوڑے رقبے مٹی ہو گئے تو سنگھ بابو اور چتریا نے اپنے لڑکپن کی مانند ایک منصوبہ بنایا "... جیسے وہ کسی چڑیا کا گھونسلا بھانپ کر اور سب ساتھیوں سے چھپ کر اس پہ چھاپہ مارنے کی صلاح کیا کرتے تھے اور ایک دوسرا، انڈے بچے چرانے کے لیے چڑھنے کو اپنی پیٹھ اور کندھے پیش کیا کرتا تھا اور بالعموم چتریا ہی کے کندھوں پر چڑھ کر سنگھ بابو گھونسلے میں ہاتھ ڈالا کرتے تھے۔" (ص 58)

منصوبہ تھا کہ چتر سنگھ اپنے آدمیوں کی مدد سے سیوتی کو اغوا کر لے اور ان کے چودھری کی جاگیر میں اودھ لے جائے، سنگھ بابو اگلی گاڑی سے وہاں پہنچ جائے گا۔ اس منصوبے کے جملہ مراحل کی در پردہ تکمیل کے لیے تقریباً چار ہفتے کا وقت درکار تھا، مگر سنگھ بابو کے معمر وخیر خواہ مقدم کو منصوبے کی بھنک پڑ گئی۔ اس نے سیوتی کے باپ کو بہ حیلہ ڈرایا دھمکایا۔ اُس نے مقدم سے وعدہ کیا کہ "کل نہیں تو اگلی صبح تڑکے وہ اُسے [سیوتی کو] چار چھ مہینے کے لیے ننھیال بھیج دے گا اور پھر وہیں سے اس کا بیاہ [دھارا کے ساتھ] ہو جائے گا"... (ص 77) لیکن "چتریا نے دوپہر تک سن گن پالی کہ آج ہی رات میں سیوتی کے ماں باپ اُسے ننھیال بھجوانے کے بہانے دھارا کے ساتھ کہیں غائب کرا دیں گے..." (ص 81) یہ خبر لے کر وہ فوراً سنگھ بابو کے پاس پہنچا۔

44

اور آج انھیں مشورہ کرتے تیسرا پہر ہو گیا۔ شام بڑھ رہی تھی، اور جاڑوں کی شام سرپٹ دوڑتی ہے اور معاملہ "ابھی ورنہ کبھی نہیں" کے وقت پر آ لگا تھا۔ "اگر ابھی نہیں پکڑی تو پھر تا زیست سیوتیا کا سایہ بھی اس گاؤں میں دکھائی نہ دے گا" یقینی امر تھا۔ سنگھ بابو کہنے کو میٹھے اور ٹھنڈے ٹھار کر

Scanned with CamScanner

تھے، اور عام طور پر سیدھے اور شریف النفس، اور پھر کالج اور کالج بھی زراعتی کالج کی تعلیم اور اس کے بعد زراعتی اور کاروباری زندگی نے ان پر اور بھی زیادہ شکر پاشی اور برفباری کر دی تھی، اور کالج کے بعد پانچ سال پریکٹیکل فارمنگ کی زندگی نے انھیں جیسے کچھ راجپوت سے بنیا سا بنا دیا تھا، مگر تھے تو ٹھاکر اور یہاں پر بھی اپنے بیجے پن کی آڑ میں اپنی اصل پر پلٹے اور ٹھیٹھ چوہان والا حکم دیا: ''سیوتی کو پکڑ لاؤ!'' اور یوں تو ایک آدھ ملازم چلا جاتا، مگر کچھ سن گن پائے ہوئے تھے، لہٰذا بارہ کے بارہ جمع ہو کر، لٹھ لے کر گئے اور بوڑھے تہنیت (فارم کے مزدوروں کی نگرانی کرنے والا میٹ) کی قیادت میں گھر کے اندر جا دھمکے۔ چمار اور چمریاں خوف کے مارے آواز بھی نہ نکال سکے اور بھیڑ کی طرح سیوتی پکڑ لی اور دن دہاڑے بھیڑیے کی طرح گھسیٹ کر لے چلے، اور جب ان بارھوں کا رسالہ فتح کر کے پلٹا اور گلی کے موڑ پر پہنچے تو یک دم ایک سنگین سی دیوار سامنے پائی اور انھیں معلوم ہوا کہ راج ہٹ ہی نہیں، جنتا ہٹ بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ چوری اور سینہ زوری! دھارا کی سرکردگی میں گاؤں کے بیس چھٹے چھٹے پٹھوں کا غول! اور ان گیدڑوں کے غول کو پختہ کار تہنیت نے مد مقابل دیکھ کر جیسے براہ راست سنگھ بابو کے حلق سے اکتساب کی ہوئی ایک ''غوں'' اپنی کھچڑی مونچھوں کے گچھے میں سے نکالی، مگر گیدڑوں کا غول تو اس شیر کی بھبکی میں نہ آیا اور دوسری ''دھوف'' جیسے بڑے ٹھاکر جی کے گل مچھوں میں سے غنائی، مگر یہ ہاتھی کی طرح جھنجھنا کر جہاں دیدہ تہنیت کے ہونٹوں پر رہ گئی اور سامنے سنگین دیوار حرکت میں آئی۔ جب دونوں جانب سے لاٹھیوں کے پھونکے جڑ گئے تو بوڑھا تہنیت باپ کی سی شکل بنا کر جیسے زمیندار اور کھیت مزدور کے درمیان میں آ گیا اور اپنی مونچھوں پر مربیانہ انداز میں نیچے کو ہاتھ پھیر کر، اپنی لاٹھی نیچے کیے، ہزار سالہ سمجھوتے کی تجدید سی کرنے لگا۔ ادھر کسی طرف سے چتریا بھی برآمد ہو پڑا اور اپنا مکھیا کا عصا تھامے درمیان میں آ گیا اور شاہی برچھا بلند کیے، اور پیشگی تنخواہ پا لینے کے بعد سنگھ بابو کے کام کو چھوڑ دینے کے متعلق قانونی مطالبہ سا کرنے لگا، اور پھر اس سینہ زوری پر بحیثیت مکھیا انھیں قائل معقول کرنے لگا، اور چتریا کے جواب میں دھارا کے اندر سے جیسے شیر بھپر پڑا اور پہلا لٹھ چتریا ہی پر پڑا اور پھر بیس کے بیسوں لٹھ چتریا پر جمع ہو گئے۔ چٹ چٹ چناچٹ پتھر کی چٹان سونے کے بند سے آ ٹکرائی اور چتریا کا جملۂ معترضہ تو چٹان کے پہلے ہی ریلے میں ٹوٹ گیا۔ اور اب لٹھ چلا اور خوب چلا۔ اور ایمانی بات یہ ہے کہ ٹھاکر کے دسوں نوکروں نے ایک

پکڑ خوب ڈٹ کر لی؛ مگر اُجرت پر قاتل تو مل بھی جائے، مقتول مشکل سے ملا کرتا ہے۔ اور دھارا بیس تھا اور سنگھ بابو انیس بھی نہیں، ایک۔ انجام وہی ہوا جو بیس کے مقابلے پر ایک کا ہونا چاہیے۔ میدان دھارا کے ہاتھ رہا مگر خالی؛ سنگھ بابو کے حالی موالی زخمی ہو کر اور چتریا کا انجام دیکھ کر فرار تو ضرور ہو گئے تھے لیکن انجام اندیش تہنیت کے اشارے پر پہلا لٹھ بجتے ہی، وہ دونوں جو سیوتی کو پکڑے ہوئے تھے، پلٹ کر دوسری گلی سے سیوتی کو گھسیٹتے لیے چلے گئے تھے اور اب گلی میں بجز چتریا کی سسکتی نعش کے اور کچھ نہ تھا۔ اور اُسے مردہ چھوڑ کر دھارا باب عالی پر چڑھ دوڑا۔ اور جوں ہی مویشی خانے کے پھاٹک میں دھارا کا رسالہ داخل ہوا، بھونچال سا آ گیا... (ص 83 تا 85)

❊

اس ''بھونچال'' کے طویل ارضی اثرات کا منظر نامہ سپردِ قرطاس کرنے سے پہلے ابوالفضل کا قلم بالکل وہی موقلم بن گیا ہے جس نے آموں کے مقابلے میں گلاب خاص کی فتح کے باعث بڑے بڑے باغ داروں، جاگیرداروں کی ذہنی حالت کو ایک سرریلسٹک منظر (اقتباس: 8) میں ڈھالا تھا۔ ''راج ہٹ'' کے مقابل سینہ سپر ''جناہٹ'' (ص 84) پیشِ نظر کے اندرون میں جو تبدیلیاں دیکھنے کی آرزومند ہے، ان کا سرریلسٹک ورژن ابوالفضل نے یوں ملفوظ کیا ہے :

> ... تاریخ کے ورق دُھندلے ہوتے ہوتے معدوم ہو گئے، جغرافیہ قلابازیاں کھانے لگا۔
> شودر کے پانچ ہزار سالہ ٹھنڈے خون کے پانچوں ہزار خوابیدہ جوش آج ابل پڑے،
> گنگا جمنا کے سب پھانٹ سکڑ گئے اور برہم پتر کے تمام چڑھاؤ اتر گئے، بحرِ ہند کا جوار بھاٹا،
> الٹی گنگا بہاتا، نندا دیوی کی چوٹی پر چڑھا... (ص 86)

اس نقشِ پرشور کے بعد شروع ہوتا ہے اس دو ٹوک منظر کا پہلا جزو جو، فرد فرد، قدم بہ قدم، اپنی عصمت و حمیت کے تحفظ میں اندھا دھند، سماعت سے بے بہرہ، جاری تاریخ کے مقابل اپنے وجود کا حرفِ معنی اک نئے ورق پہ ثبت کرنا چاہتا ہے:

45

...اور اب دھارا کے سرپھرے نوجوان چبوترے کی سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے اور ایک

اکیلے سنگھ بابو صحن میں تن تنہا اپنا ہائی ولاسٹی میگزین رائفل لیے تنے کھڑے تھے، اور انھوں نے سب سے اوپر والی سیڑھی پر دھارا کا تنا ہوا سینہ اور ہتھیلی پر دھرا سر دیکھا اور آج اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ تنازع للبقا کے منفی پہلو سے دو چار ہوے۔ انھیں تو ابتداے آفرینش سے بہت سی زندگیاں لاغر کر کے ایک زندگی کو فربہ کرنے کے سب آداب سکھائے گئے تھے، اور آج تو بہت سی لاغر زندگیاں اپنی فربہی واپس لینے آئی تھیں، اور سنگھ بابو کے اندر عشق کا سودا، دولت کا نشہ، اور حکومت کا زور سب کچھ حفاظتِ خود اختیاری میں قلبِ ماہیت ہو کر رائفل پوائنٹ پر جمع ہو گیا تھا۔ مگر آج ان کی بندوق انھی کے کندھے پر تھی اور اس کی گرپ (grip) عقل کے مضبوط پنجے میں! ویسے بہت سے سینے چاند ماری کے لیے تختے کی طرح سامنے تھے، اور اب تو ان میں کا آخیر آدمی بھی بلند ترین سیڑھی پر پہنچ چکا تھا اور پوری دیوار سامنے تھی، اور سنگھ بابو نے آسمان کی جانب نال اٹھا کر انھیں خائف کر کے بھگانے کے لیے پہلا فیر کیا مگر ان کے جیسے آواز ہی کان میں نہ گئی! اور پہلے چند گز کی بڑھتی ہوئی حرکت کے ساتھ انھوں نے دوسرا فیر اُن کے سروں سے گز بھر نال اونچی کر کے کیا، مگر بے سود۔ اور جب چٹانوں کا جھنڈ اندھا دھند اپنے اوپر ہی کو چلتا دیکھا تو تیسرا ایک اور "ٹھیں" ایس آں ں ں... عین اُن کی کنپٹیوں پر سے موت کا طمانچہ سنسنایا۔ مگر جیسے آج ان کے کان سماعت سے بے بہرہ تھے اور گولی کی جھنجھناہٹ صدا بہ صحرا ہو گئی، وہ اندھے بہرے اور گونگے بس روبوٹ کی طرح پرا باندھے بڑھ رہے تھے — ہاتھی اور شیر پچھاڑنے والی گولیوں کی تاثیر سے بے نیاز۔ ہر حرکت پر ایک "غوں" نکالتے آگے ہی کو! اور تیسرے فیر کی Same Fight کے بعد اُن کی رائفل کی میگزین میں چوتھا اور پانچواں کارتوس باقی تھا، اور دھارا کی گنتی ایک دھارا سے بیس "دھاراؤں" تک تھی۔

سنگھ بابو کا ہاتھ شل ہو گیا اور عقل کا پنجہ شدید تر۔ دو کارتوسوں کی خاراشگاف گولیوں سے بڑھتی ہوئی لہر کی دو دھاریں کاٹنے کے بعد سنگھ بابو کو اپنی زندگی کی دھار کٹتی نظر آئی۔ ذرا رائفل نیچا کر کے انھوں نے اِدھر اُدھر نظر کی، مگر وہاں تو کوئی بھی نہ تھا۔ شاید اپنے دائیں بائیں کی خلا سے مشورہ کیا اور شاہِ شطرنج بچاتا ہوا ایک گھر پیچھے کو چلا — اور گھر کے پچھواڑے والا دروازہ کھول کر سنگھ بابو رائفل تھامے فرار ہو گئے — سیوتی، حکومت، دولت، ہر چیز کو چھوڑ کر، صرف جان لے کر! اور پانچ ہزار سال بعد شکست کھا کر اسی جنگل میں پناہ لی جس میں سے دھارا کو تسخیر کر کے لائے تھے اور دھارا نے تاریخ

کی سادہ کتاب کے اوّل ورق پر پہلے نئے باب کا عنوان ڈالا اور ''دھارا'' لکھا۔ (ص 86 تا 87)

✻

کہانی کا نواں باب پار ہوتے ہوتے بنیادی تصادم کھل کر سامنے آگیا اور قاری نے جان لیا کہ ابوالفضل صدیقی بلاشبہ اس کہانی میں بھی تصادم کا (اوّلین) سبب ایک عورت کو بنا رہے ہیں اور انھوں نے اس عورت کو ایک ایسے مرد سے قریب دکھا کر اپنی فکری صلابت اور فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے، جو ماضی قریب میں منتشر کمزوروں کے ملاپ سے ایک اجتماعی قوت تشکیل دینے میں آگے آگے رہ چکا ہے۔

اسمبلاژ کے گذشتہ دو اجزا (اقتباس: 44 و 45) میں دھارا اور اس کے ساتھیوں کو ٹھاکر کے نوکروں کے مقابل ''سنگین سی دیوار'' اور پھر ''ہائی ولاسٹی میگزین رائفل'' کے سامنے ''روبوٹ کی طرح سینہ سپر دکھا کر مصنف نے قاری کو محسوس کرایا ہے کہ دھارا اور اس کے ساتھی اس وقت بھلے ہی ایک عورت کے تحفظ اور پھر بازیابی کے لیے سنگ و آہن کے پیکر بن گئے ہوں، مگر ان کی یہ قلبِ ماہیت دراصل اپنی اسی اجتماعی عصمت وحمیت کے تحفظ اور بحالی کے لیے ہے جس کے وجود اور معنویت کی روشنی دھارا نے گذشتہ کئی برسوں میں کرن کرن جوڑ کر ان کے باطن میں مجتمع کی ہے — سیوتی تو اس وقت ایک علامت ہے۔

کہانی کا دسواں باب سنگھ بابو کو بے کس ولاچار بنانے والی بھادوں کی اُس اماوس کے اچانک انکشاف کا قصہ ہے جو اُس نے گزشتہ برسوں میں ٹکڑا ٹکڑا، پہر پہر، اپنے کاشتکاروں اور دراصل اپنے وجود کے اطراف وجوانب میں بھی طاری کی تھی۔ آج اُن تمام ٹکڑوں کو یک لخت جوڑ دینے والا اور دبیز وطویل ترین ٹکڑا سیوتی کو پکڑ لانے کے حکم کی صورت ظہور میں آگیا ہے — اور یہ اسی طور ظہور میں آتا رہا ہے — تو وہ ''گنّے کے ایک بڑے جھنڈ میں رم دیدہ خرگوش کی طرح'' دبکا ہوا ہے۔

اس باب میں مصنف نے ان تمام اقدامات کی جانب اشارے کیے ہیں جو کہانی میں وقتاً فوقتاً بہ تفصیل بیان ہو چکے ہیں، مگر ان کے ردعمل ضبطِ تحریر میں نہیں آئے تھے۔ جس طرح کہانی ''پھیر'' میں منشی کمال شیر خاں کے جملہ اقدامات کی زد سادات نگر کی پوری آبادی پر پڑ رہی تھی مگر ردعمل ظاہر نہ تھے بلکہ آبادی کے اجتماعی وجود میں قطرہ قطرہ مواد کی صورت جمع و پرورش ہو کر اپنے ظہور کے لیے ایک انگریزی داں صاحبزادے بابو میاں کی پیش قدمی اور پرکھوتا کی بیٹی کی اہانت کے منتظر تھے —

Scanned with CamScanner

اسی طرح کہانی ''دھارا'' میں سنگھ بابو کے اقدامات کے ردعمل چمر گونٹے کے اجتماعی وجود میں قطرہ قطرہ جمع و پرورش ہو کر اپنے ظہور کے لیے سیوتی کے اغوا اور دھارا کی پیش قدمی کے منتظر تھے۔

بہ الفاظ دیگر ان دونوں کہانیوں میں، زمین کو بہر طور گرفت میں رکھنے والوں کے مرحلہ وار اقدامات کی زد پوری پوری بستی پر ہے تو ان کے ردعمل بھی بستی کے اجتماعی وجود میں شدید ترین کیفیت تک مرحلہ وار ہی پہنچے اور جب اقدامات و ردعمل (ہمیشہ سے) لامعلوم نقطۂ اختتام کو پہنچ گئے تو کمزور بے زبانوں کا اکٹھ اور باجبروت سنگھ بابو کا بے چارگی بھر افراد وجود میں آ گئے؛ اسباب تو بہانہ ہیں جو بار ہا نظر بھی نہیں آتے مگر کہانیوں میں بالعموم دکھائے جاتے ہیں۔

46

...اور جان لے کر بھاگے خرگوش کو خونخوار گرے ہاؤنڈ جبڑے کھولے باغ کے کنجوں اور گنے کے کھیتوں میں اچھل اچھل کر، غرا غرا کر، کھوج لگاتے بوکھلائے سے پھرتے تھے، اور گو بارقبے میں اُدھم سا مچا ہوا تھا اور سنگھ بابو اپنے فارم کے سب سے گھنے قطعے کے بیچوں بیچ گنے کے ایک بڑے جھنڈ میں رم دیدہ خرگوش کی طرح دبکے ہوئے تھے، جہاں اچھے بھلے آدمی کا بھی دن دہاڑے دم گھٹے۔ اور جب کوئی بوکھلایا ہوا چمار جیسے سونگھ کر تلاش کرتا ہوا ان کے دس پانچ گز اِدھر اُدھر سے گزرتا تو وہ سچ مچ لتاڑے خرگوش کی طرح جھنڈ میں ضم ہو کر رہ جاتے، اور جب تک وہ اس کی زد سے باہر نہ ہو جاتے سیف چڑھائے بالکل مارنے مرنے پر تلے رہتے — عاجز بلی کی طرح جو پلنگ کی آنکھ نکال لیتی ہے — اور دو گولی اور بیس، یا اب نہ معلوم کتنے، شاید سارا چمر گونٹا۔ کیونکہ گاؤں اندر مدد تو در کنار کسی نے بیچ بچاؤ تک نہ کیا، ورنہ شاید یہ نوبت نہ پہنچتی۔ اور وہ جانتے تھے کہ گاؤں کا کیا رنگ ہے، بہت سے تو کتھے کے جنگل کے فکرِ فردا میں مبتلا ہیں اور سب کے سب مکینیکل فارم کے غمِ دوش میں ماتم کناں، اور باقی نانِ شبینہ کے چکر میں نالاں! — بس لے دے کے چتریا بیچارہ پُرخلوص، سو اس نے نوکروں سے بھی پرلی طرف حقِ نمک و حقِ دوستی نبھا دیا اور قربان ہو گیا۔ اور انھوں نے اپنی اس پناہ گاہ میں بیٹھے بیٹھے اندازہ کر لیا کہ اُن کے مکان کے اندر سے سیوتی کے ساتھ کل اثاث البیت بھی گیا، اور آج قانون دھارا کے ہاتھ میں ہے، اور اگر ہاتھ آ جائے تو اُن کی جان بھی — باوجود ہائی ولاسٹی رائفل

ہاتھ میں ہونے کے!

اور انھوں نے غور کیا کہ اب ان کے مکان پر شور ذرا کم ہے اور بستی میں اور جانب زیادہ، اور انھوں نے ہر شور کو خوب پہچانا اور وہیں دبکے دبکے سمت کا اندازہ لگا کر سمجھتے رہے کہ کون کون سے نوکر کا گھر لوٹا جا رہا ہے، اور پھر انھیں چتریا کے گھر کی جانب سے لوٹ مار کی آوازیں سنائی دیں، اور وہ سب کچھ اس تاریک کنج میں بیٹھے اس طرح سمجھ رہے تھے جیسے آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، اور لطف یہ کہ ادھر جنگل میں اُن کی بھی تلاش بدستور جاری تھی۔ گھڑی بھر کے لیے ایک ذرا سکون سا ہوا اور پھر ایک مرتبہ جیسے بستی کے باہر چاروں طرف سے آندھیاں سنسنا پڑیں۔ وہ شکاری تھے اور شکاری کے حواسِ خمسہ یوں بھی ذکی الحس ہوتے ہیں اور اس وقت رونگٹا رونگٹا کان بنا ہوا تھا اور نہایت دقتِ نظر کے ساتھ ہر آواز کا تجزیہ کر رہا تھا۔ اور پھر بڑے زور سے فارم کی ایکھوں کا پورا رقبہ کھڑکھڑا اٹھا اور وہ سمجھ گئے کہ اردگرد کے گاؤں کے کسان مزدور یلغار کر رہے ہیں اور بستی کے باہر اور اندر بڑے زور سے ''کتھے کا جنگل نہیں لگے گا'' کا نعرہ گونجا، اور وہ سمجھ گئے کہ کتھے کے جنگل کی بارود میں سیوتی فلیتہ بن گئی۔ اور یہاں تو اپنی جان کے لالے تھے اور کتھے کا جنگل تو انھیں اُن کے نعروں پر یاد آیا۔ اور ایکھیں کیوں کھڑکھڑا رہی ہیں؟ اور وہ خوب دبک کر بیٹھ گئے۔ ''خیریت نہیں...'' اور پھر انھوں نے اپنے فارم کی حدود پر نعرے سنے، ''اپنی زمین پھیر لیں گے!'' اور انھیں پتا چلا کہ پانچ چھ سال کی سیلی ہوئی فارم کی بارود بھی سیوتی کے فلیتے نے بھڑکا دی۔ اور پھر انھوں نے اپنے فارم کی حد پر اپنے فارم کا تار کا جنگلا ٹوٹنے کی کھٹ پٹ سنی۔ اور اب رات ہوگئی تھی اور وہ ایک ایک نئے اور پُرانے زخمی کسان کی آواز پہچان رہے تھے۔

سنگھ بابو سائنٹیفک قسم کا فارمر تھا اور اپنے قبضے اور ملکیت کی حقیقت کو خوب پہچانتا تھا اور اس کے انجام سے باخبر بھی تھا، مگر اتنی جلدی نہیں؛ کم سے کم اپنے جدید نظام کی عمر آدھی صدی تو سمجھتا تھا۔ مگر سیوتی کا بھوت لے اُڑا کمبخت بھک سے! اور اس وقت تو اسے کچھ بھی یاد نہ تھا، فارم، کتھے کا جنگل؛ بس اپنی جان یاد تھی اور اُس نے آوازوں سے اندازہ کیا کہ چمر گونٹے اور اِردگردِ کے مواضعات کے صرف چمار ہی نہیں، کوری، نائی، دُھنے، جولاہے، بھنگی، کہار، سبھی اس ہوا میں چلے آ رہے ہیں، ٹڈی دل کی طرح! جیسے آج اپنے نیچ پن اور غریبی میں وہ ایک دوسرے کے سگے بھائی ہیں

اور چمر گونٹے والے بے دخل شدہ دخیل کاروں اور موروثیوں کو اُن کی زمینیں واپس دلانے آ رہے ہیں اور خود اُس کی اپنی اراضیات سیر وخود کاشت کا رقبہ کھیت مزدوروں میں بانٹ کر برابر جمع کرنے ہو رہے ہیں۔ (ص 88 تا 90)

❁

"یہ اپنے نیچ پن اور غریبی میں" "ہم رشتہ لوگ، ویسے ہی دکھ شریک بھائی ہیں جیسے کہانی "پھیر" کے اکھ میں آن ملی" "ساتوں تومیتیں" (صفحہ 353) اور پھر مولازادوں کا پورا گروہ" (اقتباس: 42)

نہ صرف چمر گونٹے بلکہ اردگرد کے مواضعات کی کوکھ میں قطرہ قطرہ جمع و پرورش ہوتی رات نے اِمشب لیک کر سنگھ بابو کو چاروں اور اسے اندھیروں میں جکڑ لیا ہے:

47

...فارم ہڑپ کر لیا، کتھے کے جنگل کی سائٹ ہڑپ کر لی، بستی ہڑپ کر لی اور نیم تاریک رات نے سب کچھ ہڑپ کر لیا اور سنگھ بابو نے اندازہ کر لیا کہ فارم کی سب حدوں کا جنگلا توڑ دیا۔ کتھے کے جنگل کی سائٹ پر سے گھنٹیاں اُکھیڑ دیں، بستی کے اندر اس کا اور اس کے حالی موالیوں کا ہر مکان لوٹ لیا اور اس نیم تاریک منجمد رات میں اب تک سیوتی بھڑک رہی ہے۔ جگہ جگہ آدمیوں کے کھانسنے کی اور مٹھارنے کی آوازیں بتا رہی تھیں کہ فاتح فوج کی پہلی رات کے انتظام کی طرح پہرہ ہے۔ ناکے ناکے پر آدمی لگے ہوئے تھے اور اب آس پاس کے گاؤں کے علاوہ دور دور سے دھارا کو تسلسل مل رہا تھا اور آدھی رات تک وہ چار چار چھ چھ کوس تک جاتی آوازیں سنتے رہے۔ عظیم بغاوت! شدید ایجی ٹیشن! انھوں نے سب کچھ اپنے کانوں سے سن ہی لیا، اور وہ سب کے سب تھے، اور پہلے تو یہاں سے جان لے کر جانا ہی ہر منٹ مشکل تر ہوتا چلا جا رہا تھا اور پھر یہ تو سارے جہاں کی دشمنی کا تو ان کے پاس جواب ہی نہ تھا، اُن کے لیے تو چمر گونٹے کی یک جہتی ہی کافی سے زیادہ مہلک ہو سکتی تھی۔ وہ پرانے زمیندار تھے اور اپنی زمینداری پر قابض، مگر وہ قبضے کی پھسپھسی بنیادوں کو اچھی طرح پہچانتے تھے اور ساتھ ہی اس قبضۂ غاصبانہ کی اہمیت سے بھی واقف تھے جو اس وقت یہ دیہاتی کر رہے تھے، تو وہ اس کی قانونی صورت سے بھی واقف تھے۔ اس وقت باغی اور غاصب بظاہر قانون

اپنے ہاتھ میں لے کر کر رہے تھے، اور پھر اگر دوبارہ کسی طرح قبضہ واپس بھی لے لیں تو اسے برقرار رکھنا ان بیچارے اکیلے کا کام نہ تھا، اور پھر قانون علاج تو نہیں ہو سکتا! اور آج تو سیوتی، لینڈ ایکوزیشن، سود، بقایا لگان، بیگار، رقم سودائی آبپاشی، شرح مزدوری، قبضہ، ملکیت خود اپنی جان سب کے سب اُن کے اوپر ایک برابر کے تہمت تھے اور تنہا سیوتی کی آڑ میں نہ معلوم کتنی سیوتیاں نکل کر سامنے آ گئی تھیں اور وہ سمجھ گئے کہ صبحِ آفتابِ حشر طلوع کرے گی۔ (ص 90 تا 91)

اور کالی رات بھرپور ڈوب گئی۔ آخیر شب کی اوس میں گنّے کے سر سبز پتّے زیادہ کٹار دار اور بوجھل ہو کر اوپر جھک گئے اور پوری مجرم پوشی کرنے لگے، اور پھر جیسے اس کی بے کسی پر آنسو ٹپکانے لگے۔ اور آج ہزار سالہ زمینداری سے لے کر پنج سالہ فارم تک اور اگلے پنج سالہ کتھے کے جنگل تک، ماضی، حال، مستقبل ہر چیز گنّے کے اس جھنڈ کے تلے سمٹ سمٹا کر جمع ہو گئی تھی جس میں وہ چوہے کی طرح اپنی جان سمیٹے بیٹھے تھے۔ پھٹی پھٹی آنکھوں اور دبی دبی سانسوں میں دسمبر کی پہاڑ سی رات آدھی سے زیادہ کٹ گئی، اور رات کا مزاج بدلا، کہرا اور اس کی کیفیت بدلی، رک رک کر ہلکی پچھوا ہوا کے تیر چلنا شروع ہوئے اور سنگھ بابو کو گنّے کے پتوں کا ہر کھٹکا ایک قاتل کی صورت سر پر چڑھتا سنائی دینے لگا۔ اور وہ صرف ایک سوئٹر قمیص میں یخ بستہ رات اس سے زیادہ بھڑک کے ساتھ گزار گئے جیسے دھڑیوں روئی اور اون پر لپٹ کر اپنی خوابگاہ کے اندر گزارا کرتے تھے۔ کائنات طبقۂ زمہریر بن گئی، مگر وہ تو موسم سے بے نیاز تھے، گویا برانڈی کا ایک بڑا پیگ لگائے ماحول سے بے حس —— اور تمام شب گزری، دھندلے آسمان پر صبحِ صادق کی نشانیاں نمودار ہوئیں۔ مکدر فضائے بسیط میں نور کے آثار نظر آئے اور آسمان کی بلندیوں میں مشرق سے مغرب تک روشنی کا ایک خطِ نور سا بنتا چلا گیا۔ انھوں نے بار بار اپنی گھڑی کے چمکتے ہوئے ہندسے پڑھے، اور گھڑی تو انھوں نے بارہ کے بعد ہی بار بار دیکھنا شروع کر دی تھی جیسے سوئیوں کی حرکت اپنی رفتار کے ساتھ انھیں موت کی منزل کی جانب لیے جا رہی ہے۔ اور موت بھی انچ انچ پر نہیں ملی، میٹر کی ناپ پر بھی نہیں، ننھی منی سیکنڈ کی سوئی کی رفتار ان کے گرد گھومتی اور سیکنڈ کی سوئی کے ساٹھ کے ہندسے پر! اُن کی آنکھ خوف سے بند ہو جاتیں جب ناچتے ناچتے یہ منی سی سوئی، سوئی ہوئی چمکدار دنیا میں ناچنے لگنے لگی، جب آسمان سے زمین تک کا کونا کونا جگمگا اٹھے گا، چپہ گونٹے کا چپہ چپہ چمک کر بھڑک اٹھے گا، ایکھ کے کھیت کے گوشے گوشے میں

روشنی ہو جائے گی اور اپنی نوعیت کی پہلی صبح طلوع ہوگی۔ ماگھ پوس کی اوس اور کہر کی سیاہیوں کا پردہ تار تار ہو جائے گا تو رات کی تاریکی سے سورج کی کرن ہر مجرم کو روزِ روشن کی طرح پیش کر دے گی۔ (ص 91 تا 92)

❋

لمحہ لمحہ اپنی جانب بڑھتی موت کے خوف میں گھرے سنگھ بابو کی کیفیت پر مشتمل اس طویل پارے کی اختتامی سطور (جو آگے مکرر درج ہیں) پڑھتے ہوئے یاد آتا ہے کہ کہانی ''گل زمین کی تلاش میں'' کے اختتامی پارے میں، جس کا اقتباس اسملاژ کا آغاز ہے، ٹکٹ بابو کے سوال سے لاجواب و گم سم سیوتی لال کے باطن سے آیا ہوا جواب لکھتے ہوئے ابوالفضل صدیقی نے اپنے افکار و احساسات میں رچی بسی فلاح و خیر میں آباد انسانی معاشرے کی آرزو، ان بلیغ جملوں میں ظاہر کی تھی:

''...وہاں جہاں کی سرزمین کی مٹی اپنی چھاتی پر گلاب خاص کو کھڑا کر کے پروان چڑھا سکے اور جس فضائے بسیط کی ہوا اس کو پال کر، پروان چڑھا کر چھتنار درخت بنا سکے اور گلاب خاص دیسی گلاب کے پھولوں کی جھاڑی کی طرح لد سکے...''

اور لمحہ لمحہ اپنی جانب بڑھتی موت کے خوف میں گھرے سنگھ بابو کی کیفیت پر مشتمل پارے کی اختتامی سطور میں ابوالفضل صدیقی کے افکار و احساسات میں کروٹیں لیتی شر سے تہی انسانی معاشرے کی آرزو، ان بلیغ جملوں کی صورت اُمڈ آئی ہے:

''..جب ناچتے ناچتے یہ منی سی سوئی، سوئی ہوئی چمکدار دنیا میں ناچنے لگے گی، جب آسمان سے زمین تک کا کونا کونا جگمگا اٹھے گا، چپر گونٹے کا چپہ چپہ چمک کر بھڑک اٹھے گا، ایکھ کے کھیت کے گوشے گوشے میں روشنی ہو جائے گی اور اپنی نوعیت کی پہلی صبح طلوع ہوگی۔ ماگھ پوس کی اوس اور کہر کی سیاہیوں کا پردہ تار تار ہو جائے گا تو رات کی تاریکی سے سورج کی کرن ہر مجرم کو روزِ روشن کی طرح پیش کر دے گی۔''

عام فنی نقطہ نظر سے دیکھیں تو اس کہانی کے واقعات، ایک پیچیدگی اور پھر اضطراب کے بعد، اپنے انجام کو بھی پہنچ چکے ہیں۔ اگر ابوالفضل کے وضاحت و تفصیل پسند طریق سے قطع نظر کر لیں تو کہہ سکتے ہیں کہ بات اس پُر توقع اور تاثراتی جملے پر مکمل ہو گئی کہ ''... سورج کی کرن ہر مجرم کو روزِ روشن کی طرح

پیش کر دے گی۔'' لیکن اگر اس نقطۂ نظر کے مطابق دیکھیں جس کے قائل ابوالفضل صدیقی ہیں، تو معلوم ہوگا کہ بات اس جملے پر بھلے ہی مکمل محسوس ہو رہی ہو مگر ابھی انھوں نے سنگھ بابو نامی کردار کو کسی انجام سے دو چار نہیں دکھایا ہے، لہٰذا کہانی آگے بڑھاتے ہوئے، سنگھ بابو کا احوال بتاتے ہیں:

48

انھوں نے پھر گھڑی دیکھی اور گھبرا کر گہرا سانس لیا — لیٹ ہو رہا ہوں میں، اور زندگی کی ٹرین چھوٹی جا رہی ہے۔ اپنا رائفل سنبھالا، یخ زدہ، مُردے سے زیادہ؛ جس سے وہ دسیوں آدم خور شیر پچھاڑ چکے تھے، آج اپنے قادر انداز مالک کی جان بچانے سے منکر تھا۔ ٹھنڈا لوہا اور دو ٹھناکوں کے بعد تو بالکل ہی مردہ، پھنکنی سے بدتر! اور وہ بغیر کسی پہلو پر غور کیے موت اور زیست کے دوراہے کی جانب بڑھنے ہی والے تھے کہ ایک شیریں سی دردناک کپکپاتی نسائی آواز کہیں قریب ہی سے اُن کے کان میں پڑی اور وہ بے حس و حرکت جیسے اس جھنڈ میں حلول کر گئے اور سانس روک کر جتنا دبک سکتے تھے دبک گئے۔ مگر آواز مانوس تھی ''جیا جیا، لیو اب چلیو، جنگل جھاڑو ہوئے گئو۔'' (بہن بہن، اب چلو، رفع حاجت سے فارغ ہو لیے) اور ڈرے ڈرے کانپتے لہجے میں اس کی بار بار تکرار ہوئی اور انھوں نے بڑی ذکی الحسی کے ساتھ کان لگایا، جانی پہچانی، بچپن سے آج تک کی ہزار بار کی سنی آواز یہاں سے وہاں تک پوری کھیت کی منڈیر منڈیر پر، پورب سے پچھم اور پچھم سے چلتے ہوئے، آہستہ آہستہ کوئی عورت نکال رہی ہے اور مسلسل نکالے جا رہی ہے اور برابر اِدھر سے اُدھر آ جا رہی ہے، کبھی اس سے ذرا دور ہو جاتی ہے اور پھر بالکل قریب سنائی دیتی ہے۔ ''جیا جیا، اب چلیو، جنگل جھاڑو ہوئے گئو۔'' اور سنگھ بابو کے دماغ میں بھک سے روشنی ہو گئی اور یاد آ گیا کہ یہ قطعہ ہر صبح عورتوں کی رفع حاجت کے لیے گاؤں کے قدیم رواج کے مطابق مخصوص ہے اور عورتیں رفع حاجت کے لیے آنا شروع ہو گئیں، اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اس وقت گاؤں کے پُرانے قاعدے کے مطابق اس کے اندر کوئی مرد نہیں رہ سکتا۔ مگر کیا، آج کی صبح بھی اتنے قاعدے کی پابندی کریں گے کہ یہ قطعہ خالی کر جائیں؟ اور آواز تو برابر اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر لپک رہی تھی۔ ان کے بچپن کی کھلائی ''آیا'' کی روتی تھرتھراتی آواز۔ چتریا کی ماں کی گود میں وہ چمر گونٹے آ کر تین چار سال کی عمر میں کھیلا کرتے

تھے اور جو چتریا کو اتار کر انھیں گود میں اٹھا لیا کرتی تھی، یہ آواز نکالتی کھیت کی منڈیر منڈیر اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر چل رہی تھی۔ اور وہ آہستہ سے بڑی احتیاط کے ساتھ بیٹھے ہی بیٹھے کھسکے اور بڑی سبک رفتاری سے، حتی الوسع پتوں کا کھٹکا بچاتے، جیسے نیولے کی طرح رینگ کر، منڈیر تک پہنچ گئے اور منڈیر کے قریب والے جھنڈ میں دبک گئے، اور انھوں نے اندازہ کرلیا کہ عورت بالکل تنہا ہے اور شاید اسی آواز کی آڑ میں انھی کو پکار پکار کر تلاش کرتی پھرتی ہے، اور جوں ہی وہ اُن کے محاذ میں آئی، انھوں نے آہستہ سے کہا، ''پہچان لیا،'' اور آہستہ سے کہا، ''آ یا،'' اور رائفل تانے باہر آ گئے اور عورت نے اُن کے کان کے قریب منھ لا کر اپنی کانپتی ہوئی آواز کو سنبھالتے ہوئے بتایا کہ چتریا کو مرا سمجھ کر چھوڑ آئے تھے اور دو گھنٹے تک تو کوئی گلی میں سے بھی اٹھا کر نہ لایا۔ تمام رات اس کا جواب بند رہا اور سسکتا رہا۔ صبح ہوئے آنکھ ذرا کھلی تو اس نے بھیجا کہ خبر لے اور چونکہ یہ چک بدمعاش اس وقت عورتوں کے جنگل جھاڑنے کے لیے خالی کر گئے ہیں، ذرا دیر کے لیے تو آئی اور چتریا کا یہ پیام سنا دیا کہ تھانے میں جا کر رپٹ دیں کہ اُن کا مکان، اُن کے سب نوکروں کے گھر اور چتریا کا گھر لوٹ لیا، گھوڑی اور بیل مویشی خانے سے کھول کر لے گئے، اور تمام رات دور دور تک خبر پہنچا کر آدمی جمع کرنے کے لیے چڑھے چڑھے پھرتے رہے، اور فارم کے تار توڑ دیے اور اپنی اپنی زمین پر قبضہ کرلیا، کتھے کے جنگل کی پیمائش کی کھنٹیاں اکھیڑ دیں اور دھارا ساری رات گھوڑی پر گاؤں گاؤں بھاگتا پھرا ہے، چمر گونٹے میں کوئی ایسا نہیں جو چتریا کو شفاخانے پہنچادے۔ اُس کے ہاتھ پاؤں توڑ دیے ہیں اور سر پھوڑ دیا ہے اور انھیں [سنگھ بابو کو] جان سے مار ڈالنے کی صلاح کر چکے ہیں۔ اور اس وقت موقع اچھا ہے، وہ نکل جائیں اور سیدھے تھانے جا کر رپٹ دیں۔ سب کچھ سن کر اور بہت کچھ سمجھ کر سنگھ بابو ذرا تن کے کھڑے ہوئے اور اِدھر اُدھر گردن موڑی جیسے مشورے کے لیے کوئی تلاش — چتریا، مقدم... مگر کہرے کے چلتے ستونوں کے سوا کوئی نظر نہ آیا۔ انھوں نے تھانے کی سمت دیکھا اور پانچ میل تک انھیں کہرے ہی کے بھوت نظر آئے اور کہرے ہی کے بھوتوں کی رہنمائی میں اپنے اس بھوت سے وجود کو لے کر چل پڑنے میں عافیت جانی مگر وہ ٹھٹکے... (ص 95 تا 97)

❊

کیونکہ برسوں سے ٹکڑا ٹکڑا، پہر پہر، اپنے اطراف وجوانب پہ طاری کی ہوئی بھادوں کی اماوس،

کہرے کے بھوتوں کی طرح پھیل گئی ہے، سب کچھ اسی میں گم ہے: نہ کوئی مشیر باقی ہے نہ معاون۔

ایک ضعیف سی کرن جو پیام لائی ہے اُس پر عمل درآمد تک پہنچتے پہنچتے وہ روشنی کھل کر پھیل جائے گی جس سے ماگھ پوس کی اوس اور کہرا کٹ گرے گا تو مفرور مجرم کو دور دور تک نہ معلوم کتنے قطعوں میں بھرے ہوئے خون کے پیاسے صاف صاف دیکھ لیں گے۔

49

... مگر وہ ٹھٹکے۔ اور مانا کہ یہ مخصوص قطعہ اس وقت، ان کی تقدیر سے، مردوں سے خالی ہے اور عورتیں بھی ابھی زیادہ آنے نہیں پائی ہیں، مگر آگے چل کر راستے بھر پانچ میل تک ایسے ایسے نہ معلوم کتنے قطعے مردوں سے بھرے ملیں گے اور دور دور تک میدان میں ہر مرد انھیں اپنے ٹھنڈے خون کا پیاسا نظر آ رہا تھا، اور کچھ دور چل کر تو یہ کہرے کے بھوت کمبخت بھی ساتھ چھوڑ جائیں گے اور وہ کھلے میدان دھوپ میں دور سے چمک جائیں گے اور مفرور ملزم کو وہاں تو اتنی بھی آڑ نہ ہوگی جتنی اُس گنّے کے جھنڈ میں تھی جس نے تمام رات قلعہ بن کر اُن کو پناہ دی تھی۔... (ص 97)

❊

ابوالفضل صدیقی نے چتریا کی بوڑھی ماں کے روپ میں سنگھ بابو کے لیے امید کی ایک کرن پیدا کر کے، کہانی پڑھنے والے میں پھر ایک تجسّس جگا دیا ہے کہ آخر امید کی یہ ضعیف سی کرن بابو کے یخ بستہ وجود میں کس طور زندگی پیدا کرتی ہے۔ اسی نے انھیں لڑکپن میں ماں کی طرح گود میں اٹھایا تھا۔ اس کی گود چتر سنگھ سے تقریباً خالی ہوگئی ہے تو یہ گویا انھی سے اپنی گود بھری رکھنے کا پیام لائی ہے۔

کہانی پڑھنے والا یہ ضعیف سی کرن دیکھ کر محسوس کرتا ہے کہ جس طور ''پھیر'' میں ابوالفضل نے پرکھوتا کی بیٹی کے بہانے خلق کردہ شدّت کو بندہ علی کی ماں رم کلیا کے وسیلے سے ایک انجام تک پہنچایا ہے، تقریباً اُسی طرح وہ سیوتی کے باعث خلق کردہ تصادم کو بھی ایک ماں، چتر سنگھ کی ماں، کے وسیلے سے کسی انجام تک لے جا رہے ہیں؛ گویا رم کلیا کے بعد عورت کے ماں روپ کا دوسرا مظاہرہ دکھا رہے ہیں، اور اگر قاری کے ذہن میں گلابو کی گود میں بھرے گلاب خاص کے نوخیز پودے تازہ ہو جاتے ہیں تو یہ بوڑھی، عورت کے ماں روپ کا تیسرا مظاہرہ شمار ہوگی۔

50

...اور بڑھیا نے جلدی کرنے کا تقاضا کیا اور انھوں نے ایک گھونٹ سا لے کر بڑھیا کی طرف دیکھا اور پھر ذرا رکتی ہوئی آواز میں کہا، ''آیا، اپنی اوڑھنی مجھے اُتار دو...''

اور بڑھیا ذرا جھجکی، کچھ متعجب ہوئی اور پھر اُن کے حفظِ ماتقدم کو سمجھ کر اوڑھنی اتار کر حوالے کر دی اور پھر کہا، ''چاہیں کدھر سے نکل جیو، جنگلا سارے پھارم کو توڑ دو ہے رات۔''

اور سنگھ بابو نے نہایت اہتمام کے ساتھ پیٹھ پر رائفل ٹانگا اور سر سے پاؤں تک خوب اچھی طرح اوڑھنی لپیٹی، جوتے اتار کے وہیں چھوڑے اور تھانے کی سمت رُخ کر کے، اس حلیے سے جیسے کوئی عورت پیٹھ پر بچّہ لادے چلی جا رہی ہے، چل پڑے۔...(ص 97 تا 98)

❊

ابوالفضل صدیقی نے ''باجبروت'' سنگھ بابو کا یہ احوال دکھا کر کہ اُس نے اپنے ''بے تنخواہ کے انٹیلی جنس آفیسر'' اور ''ہاں میں ہاں ملانے والی جماعت کے پیش امام'' (اقتباس: 43) کی ماں سے پھنستی رُکتی آواز میں اوڑھنی مانگی ہے، اور گھونگھٹ میں منہ چھپائے، اپنی جاگیر سے ننگے پاؤں نکل کر، اپنی گزشتگی کی رپٹ دینے تن تنہا تھانے کی طرف جا رہا ہے؛ اور دوسری طرف کا یہ حال بتا کر کہ ''دھارا ساری رات [سنگھ بابو کی] گھوڑی پر گاؤں گاؤں بھاگتا پھرا ہے،'' (اقتباس: 48)— کہانی پڑھنے والے کو باور کرانا چاہا ہے کہ بلند و پست کے مظاہرے عارضی ہیں۔ ہر بلندی میں پستی کا بیج پڑ سکتا ہے اور بلندی میں کاشت ہو سکتی ہے۔ لہٰذا جو بلند و پست ہیں وہ سدا سدا کے لیے نہیں، یہ ایک دوسرے سے لازماً منقلب ہوں گے۔ ثبات صرف تغیر کا طرۂ امتیاز ہے، اس کلیے سے چشم پوشی کی راہ منہ چھپانے سے لے کر بے کسی و لاچاری تک جاتی ہے۔

51

... چل پڑے۔ اور انھیں بھی پتا نہ چلا کہ کہاں سے اور کس وقت وہ اپنے کٹیلے تار سے فارم کے حدود سے پار ہو گئے جس کے اندر بجز مخصوص گیٹوں کے اور کہیں سے نکلنا ناممکن تھا۔ اور وہ

Scanned with CamScanner

پوقدے اُڑے چلے جارہے تھے، جان کے خطرے کے احساس سے رفتہ رفتہ آزاد ہوکر مستقبل کا سدباب اور قبضے کے حصول وقیام کی ترکیبیں سوچتے جارہے تھے۔ اور پہلے تو حصول ہی ناممکن سا نظر آتا تھا اور... اور جوں جوں وہ تھانے کے قریب ہوتے جارہے تھے رپورٹ اوّل کا مسودہ دماغ کے اندر مرتب کرنے کی جدوجہد کررہے تھے جس کے ذریعے وہ اپنی گئی ہوئی اراضیات واپس لے سکیں، اپنے نوکروں کو پیٹنے والوں، اپنے اوپر حملہ کرنے والے مجرموں اور چتریا کے قاتلوں اور اپنے فارم کے غاصبوں کو سزا دلا سکیں۔ مگر رپورٹ اوّل کے پہلے خانے کے بعد دوسرے خانے کی خانہ پری ہی انھیں اپنے بس کا روگ نہ معلوم ہوتی تھی، اور تیسرا تو بالکل ہی خالی نظر آتا تھا۔ وہ مدعی تھے اور خیر یہاں تک تو مع ولدیت انھیں معلوم تھا، مگر گواہ کی خانہ پری کے لیے انھیں ایک نام بھی یاد نہ آتا تھا۔ ساری دنیا تو مدعا علیہ تھی اور وہ تنہا ایک مدعی، تو پھر گواہ کہاں سے پیدا ہوتا۔ (ص 98)

❁

کہانی ''پھیر'' کے پانچویں باب میں منعقدہ اِکٹھ کے فیصلے سے متعلق راوی کا کہنا ہے کہ ''اس باغیانہ اقدام پر علاقے کا ہر آدمی انگشت بدنداں رہ گیا تھا، جیسے کرنے والوں کو بھی خود اپنے اوپر یقین نہ آیا تھا۔'' (ص 359)

بے زبان کمزوروں کے اجتماعی شعور میں صدیوں جبۃً جبۃً مجتمع ہوتے ہوتے اچانک ظاہر کی زمین پر اُمڈ آنے ایسا کوئی اِکٹھ بھی کہانی ''دھارا'' میں عصمت وحمیت کے تحفظ کے لیے اجتماعی عمل کی مانند ابوالفضل صدیقی کی شدید آرزو محسوس ہوتا ہے جس میں آدم زاد، چراغِ وجود کے بل پر، منوجی کے کوڑا اور قورمہ خور علما کے پیٹنٹ وعظ کو رد کرکے، اُن کے ہر حکم، تلقین اور قول کو اپنی بارگاہ کا مردود بنا دے کیونکہ بھادوں کی اماوس جیسے یہ سب اسے روشنی کی ڈور میں منظم ہونے سے باز رکھ کر اک کڑے درد کی تاریک گرہوں میں باندھے رہنا چاہتے ہیں۔

کہانی کے اختتامی چھٹے باب میں ابوالفضل اُن تاریک گرہوں کی تفصیل بیان کررہے ہیں جو بہت سے بے زبان کمزوروں کے بلا اختلافِ مذہب اجماع کے فیصلے کو گنگ بنانے کے لیے یکے بعد دیگرے قائم کی گئیں:

Scanned with CamScanner

پہلی گرہ:

... اور ابھی ترپ کا ایک اور اکا بندہ علی کے ہاتھ میں تھا۔ وہی قانون پھر حرکت میں آیا جس کو ''آئین نہم، دستور دیہی واجب الارض شدہ آمد قدیم'' کی لمبی ترکیبوں والا نام دیا گیا ہے اور جو روایت پر مبنی ہونے کے سبب عدلیہ اور مقننہ، دونوں کی ترمیم و تنسیخ کی دسترس سے باہر ہے، اور جس کا نفاذ بھی تازہ ہوا اور سورج کی روشنی کے انداز میں ہوتا چلا آتا ہے، اور جس کا استعمال بھی ہر نیچ پر گھر بیٹھے ہوتا چلا آتا ہے، اور کسی حق دار کو اس کی دادرسی کے لیے آج تک عدالت کے دروازے پر دستک دینے کی نوبت نہ آئی تھی، لیکن آج یہ انہونی بھی ہو کر رہی۔ کوڑی مل مہاجن کے نام کی آڑ سے اس حق کے لیے عدالت میں نالش کرنی پڑی اور اس کمزوری پر آس پاس کے زمینداروں کی چھاتیاں دہل کر رہ گئیں۔ راج کنوروں کو قرب قیامت کی نشانیاں نظر آئیں۔ نالش اور فریاد تو کمزوروں کا عمل ہے۔... (ص 358 تا 359)

دوسری گرہ:

... اور اس نالش کی کارروائی پر دوسری شق کسی کے وہم و گمان میں نہ تھی کہ اپنی حق طلبی کے لیے منشی کمال شیر خاں مختار عام درِ عدالت کھٹکھٹائیں گے!... عدالت میں مدعا علیہم جوابدہی کے لیے نہ گئے۔ یک طرفہ ڈگری بیگار کے استقرار حق کی ہو گئی اور ساتھ ساتھ مخصوص رنگ لیڈر نوعیت کے لوگوں پر آئندہ کے لیے حکم امتناعی جاری ہوا کہ مزدوروں کو کام پر جانے سے نہ روکیں۔ اس عدالتی فیصلے کے سہارے کوڑیا مہاجن نے اپنی تمباکو کی فصل پر کام کے لیے نہ جانے کے سبب اپنے خرچے کی بھاری رقم کے مطالبے کا دوسرا مقدمہ دائر کر دیا اور قرقی قبل فیصلے میں کوئی جائیداد مال تو نہ تھا، مگر مدعا علیہم کے گھر گھر گائے بھینس بھیڑ بکری تھیں، جو ان بے زمین غیر کاشتکار دیہاتیوں کا اب واحد سرمایہ اور روزی کا سہارا تھیں، اور مہاجن نے ان تمام مویشیوں کو قرق کر کے کانجی ہاؤس داخل کرنے کا پروانہ حاصل کر لیا اور فوراً قرق امین عدالت کے ذریعے گھر گھر چھاپے مار کر بھینس سے لے کر میمنے تک ہر جانور قرق کرا لیا اور سب کے سب کانجی ہاؤس ہنکوا دیے۔ اس طرح کاشتکاری تمدن سے دھکا دے کر پہلے انھیں گلہ بانی میں پھینکا اور اب وہ پتھر کے دور والے جیسے شکاری رہ گئے۔ بستی کا تھان ویران ہو گیا۔... (ص 359 تا 360)

Scanned with CamScanner

تیسری گرہ:

... اور اسی دوران کوڑیا مہاجن کے دعوے کی تائید کے لیے عدالت میں حاضر ہو کر بندہ علی کا بیان دینا ناگزیر ہو گیا۔... (ص360)

چنانچہ قصبے سے بعد دوپہر ہاتھی پر سوار ہو کر بندہ علی اور منشی کمال شیر خاں تقریباً چار بجے کچہری پہنچے، اور سب کام پہلے سے تیار تھا؛ آسانی یہ تھی کہ فریقِ ثانی میں سے عذرداری جوابِ دعویٰ کے لیے کوئی آیا ہی نہ تھا... مہاجن کے دعوے کی تردید میں بھی کسی مدعا علیہ نے کوئی عذرداری داخل نہیں کی تھی، اور تائید میں معزز اور معتبر ترین متعلقہ شخصیت پر بندہ علی کا بیان ہو گیا۔ سول جج نے بیان ختم کرتے ہی اسی پر حصر کرتے ہوئے اسٹینو گرافر کو بلا کر مختصر سی تجویز بول دی اور سولہ آنے ڈگری دے دی۔... (ص362)

یعنی بے زبان کمزوروں کے فیصلے پر، بہت پہلے سے فعال قوت کی باندھی ہوئی تمام گرہیں، ہر پہلو سے مستحکم ہو گئیں۔ کامیابیوں سے سرشار مہاجن نے تھیلیوں کے منھ کھول دیے: بندہ علی کو اتنی رقم فیلانہ بطور نذر پیش کی کہ:

52

... تقریباً اُس ہاتھی کو خرید کر پیش کر دیا جس کی پیٹھ پر اس وقت وہ سرکار کے ساتھ بیٹھ جانا چاہتا تھا، اور یہ نذر سرکار نے قبول فرمالی۔ ساتھ ہی ساتھ منشی کمال شیر خاں اپنی مقرر نذر سے اور ہاتھی کے دونوں نوکر، مہابت او چرکٹا، بندہ علی کا ذاتی خدمتگار، سب کے سب انعام واکرام سے نوازے گئے۔ اور... لدا پھندا ہاتھی کچہری سے قصبے روانہ ہوا... (ص363)

قصبہ پندرہ میل تھا۔ ہاتھی چل پڑا۔ کچی سڑک پر تقریباً گیارہ میل طے کرنے کے بعد مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا۔ راستے کے کنارے قدیم جنگل کے دور کی باقیات، چار پانچ ایکڑ رقبے پر پرانے درختوں اور جھاڑیوں کا ایک گھنا قطعہ ایستادہ تھا جس کے اندر کسی بزرگ کا مزار تھا۔ راستے سے بالکل ملحق ایک چھوٹا سا کنواں اور بنجر اراضی کا چھوٹا قطعہ تھا، اور یہیں سرکار نے نماز پڑھنے کے لیے

ہاتھی بٹھانے کا حکم دیا۔ مہابت نے ڈول رسی نکال کر جلدی جلدی پانی کھینچا۔ خدمتگار نے چادریں بچھائیں۔ پانچ کے پانچ سرکار کی امامت میں نماز ادا کرنے کھڑے ہو گئے۔ کوڑی مل دوسری جانب ہاتھی کے بکھوے سے دھوک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ یکدم جھاڑیوں کے اندر چاروں طرف سے لٹھ بند جوان نکل آئے...(ص 364)

❁

کہانی کے اس موڑ پر ذرا رک کر گزشتہ واقعات پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابوالفضل نے ملائم خاں و پرکھوتا کی ردوقدح اور زور آزمائی کے ذریعے کہانی میں جو پیچیدگی پیدا کی تھی، وہ لڑکی کی گرفتاری اور برہنہ جلوس سے شدید ہوتے ہوتے بڑی بیگم کے اقدامات تک شدید تر ہو گئی اور اجتماع کے فیصلے نے اُسے شدید ترین بنا دیا۔

اجتماع کا فیصلہ، بہ یک نظر، کہانی کا اختتام محسوس ہوتا ہے۔ اس کے باوجود مصنف نے کہانی کا چھٹا باب لکھا۔ غالباً اس باعث لکھا کہ یہ فیصلہ اُس ایک قوت کا ہے جو کرن کرن وجود پذیر ہو کر بہت بہت پہلے سے موجود بھادوں کی اماوس کے مقابلے پر آئی ہے۔ لہٰذا یہ ممکن ہی نہ تھا کہ بہت بہت پہلے سے فعال قوت کی جانب سے ردِعمل کا مظاہرہ نہ ہو۔ مظاہرہ عدالتی کارروائی کی صورت میں ہوا اور اوّلین قوت نومولود قوت کو واپس ''پتھر کے دور'' میں پہنچا کر، ''سولہ آنے ڈگری'' پا کر، ہاتھی چڑھی جھومتی بھادوں کی اماوس کے مانند اپنی آماجگاہ کو پلٹی۔

ہاتھی قصبے کی جانب چلا ہے تو کہانی کا پورا ایک صفحہ باقی ہے، جبکہ قاری محسوس کرتا ہے کہ بھادوں کی اماوس اور نومولود روشنی کا تصادم، قدم بہ قدم شدید تا شدید ترین ہوتا ہوا، آخر کار اِس انجام کو پہنچ گیا ہے کہ کوڑی مل مہاجن (درحقیقت اُس کے زرخرید) میر بندہ علی اور منشی کمال شیر خاں وغیرہ (دراصل کوڑی مل کے) ہاتھی پر چڑھے، خوش و خرم (ایک ہی قصبے میں واقع) شاداب گھروں کو لوٹ رہے ہیں۔ مگر قاری بھرم میں پڑ گیا ہے۔ کلاسیکی طرز کی طویل، قصہ در قصہ، کردار در کردار، کہانیاں لکھنے والے ابوالفضل صدیقی کی بیشتر کہانیوں میں حقیقی انجام سے قبل ایک ایسی صورت حال خلق ہوتی ہے جو پڑھنے والے میں کہانی کے انجام کا بھرم پیدا کرتی ہے، لیکن بھرم ٹوٹتا ہے، کہانی آگے بڑھتی ہے اور ایسے (حقیقی) انجام کو پہنچتی ہے، جو قاری کے لیے شاکنگ یا گہری سوچ میں ڈال دینے والا اور

کہانی کی منطق کے مطابق ہوتا ہے۔

اِس کہانی میں قاری دیکھتا ہے کہ عدالت کے سہارے غالب سے غالب تر ہوتی ہوئی اماوس کی راہ میں مدعاعلیہم حارج ہی نہیں ہیں۔ ''فریقِ ثانی میں سے عذرداری جوابِ دعویٰ کے لیے کوئی آیا ہی نہ تھا۔'' ساتھ ہی اُسے یہ تاثر بھی دیا جاتا ہے کہ ''... یہ بھی شاید آقا (میر بندہ علی) کی ہیبت کے طفیل تھا۔'' (ص362) تو قاری سمجھتا ہے کہ کہانی کا انجام، اپنی آماجگاہ پر بھادوں کی اماوس کا غلبہ ہی ہے۔

قاری کے ذہن سے یہ بات محو ہو جاتی ہے کہ جب بے زمین غیر کاشتکار دیہاتیوں کو مہاجن نے ''پتھر کے دور'' میں پہنچا دیا تھا تو راوی نے بتایا تھا کہ:

> ''... بستی کا تھان ویران ہو گیا، اور ایک مرتبہ پھر موت کا سناٹا طاری ہوا۔ اور موت کے سناٹے میں سے اندھیری رات کی چادر کی آڑ آڑ پھر زندگی کیچوے کی طرح رو ریائی، اور آن کی آن میں کیچوا کن کھجورا بنا، اور کن کھجورا سانپ ہو گیا اور سانپ بھی چٹیل افعی اور اس اندھیری رات کی حدیں روزِ انکار کی صبح سے ملی ہوئی تھیں۔ پنجوں کے بل چل چل کر راتوں رات گروہ بندی ہو گئی اور گھر پیچھے ایک ایک جوان خاموشی کے ساتھ ساتھ ہاتھ میں لاٹھی اور سر ہتھیلی پر لیے نکل آیا...'' (ص360)

قاری کو اِس گروہ بندی سے کچھ توقعات بھی پیدا ہو گئی تھیں مگر وہ اس گمان میں گم ہو گئی تھیں کہ مجتمع نوجوان غالباً یہ سوچ کر کسی اقدام سے رُکے ہوئے ہیں کہ ''مہاجن کے دعوے کی تائید کے لیے'' میر بندہ علی عدالت میں حاضر ہو کر بیان دینے کی حد تک نہ جائے اور کمزور بے زبانوں کے خلاف ڈگری نہ ہو پائے، لیکن جب قاری آخری صفحے کے وسط میں دیکھتا ہے کہ ''یکدم جھاڑیوں کے اندر سے چاروں طرف سے لٹھ بند جوان نکل آئے'' تو اُسے پورے چار صفحے پیچھے پڑھی ہوئی یہ بات یاد آ جاتی ہے کہ اندھیری رات کو روزِ انکار کی صبح میں بدلنے کے لیے ہر گھر سے ایک ایک کرن مجتمع ہوئی تھی۔ وہ سمجھ جاتا ہے کہ مدعاعلیہم کی عدالت میں مسلسل عدم موجودگی کا سبب یہی عمل تھا، اور اب کیونکہ مہاجن ''مقررہ نذرانہ'' (ص360) دے کر میر بندہ علی کا بیان کرانے میں کامیاب ہو گیا ہے اور ''سولہ آنے ڈگری'' حاصل کر لی ہے تو اندھیری رات کو روزِ انکار کی صبح میں بدلنے کے لیے ہر گھر سے

Scanned with CamScanner

مجتمع کرنیں ایک دم سے جھاڑیوں کے اندر سے نکل آئی ہیں اور میں بھی اُس بھرم سے نکال لیا گیا ہوں جس میں مجھے ابوالفضل صدیقی نے ہی انتہائی فنکارانہ ڈھنگ سے مبتلا کر دیا تھا اور کہانی اپنے منطقی، شاکنگ اور فکر انگیز انجام کو یوں پہنچی کہ:

53

... یکدم جھاڑیوں کے اندر سے، چاروں طرف سے لٹھ بند جوان نکل آئے۔ ایک ایک قزاق رہزن کو اچھی طرح پہچان کر کوڑیا مہاجن تو پانی بھرنے کی رسی کے سہارے بڑی چابکدستی سے کنویں میں اُتر گیا، اور یہ سب کا سب گروہ ان پانچ آدمیوں پر لاٹھیاں برساتا آن پڑا... فضا میں ایک مرتبہ تو منشی کمال شیر خاں کی مخصوص شیر کی سی غوں سنائی پڑی اور پھر تو آدھ گھنٹہ مسلسل بجز سڑک پر جھرمٹ چلنے جیسی آواز کے اور کوئی آواز بھی نہ سنائی دے سکی۔ ڈھائی سو آدمی اور پانچ نفر — ایک ایک پر پچاس پچاس کا اوسط۔ اور دوسرے روز علی الصباح جب تھانے دار پانچ کھڑے لے کر موقعِ واردات پر پہنچا تو لاٹھی کے کھٹل گولوں سے قیمہ کی ہوئی چھوٹی بڑی ڈھیریوں کے علاوہ کوئی سالم لاش نہ پا سکا، اور نہ پوسٹ مارٹم کرنے والا ڈاکٹر ہی رپورٹ میں کسی کھوپڑی کو کسی دھڑ پر فٹ کر سکا۔ البتہ گوشت کے متفرق ڈھیروں میں ایک اُنگلی ہاتھ آئی جس میں نیلم کی لگی ہوئی ایک انگوٹھی سے اتنی شناخت ہو سکی کہ بندہ علی کی تھی۔ (ص 364)

❋

یہ اسملاژ اس توقع پر تمام کیا جاتا ہے کہ ابوالفضل صدیقی کی کچھ مکمل کہانیوں اور کچھ کہانیوں کے خاص خاص اجزا کی ملی جلی تفہیم نے قاری کو شاید اس طرزِ فکر و بیان سے کچھ کچھ مانوس کر دیا ہو جس کے توسط سے مصنف نے آسودہ و محروم افراد کی صدیوں سے جاری کشمکش کو اپنے ماضی قریب اور حال کے حوالے سے ملفوظ کیا ہے تا کہ ہم عصر اور آئندہ قاری اُن کے دیکھے اور سمجھے کی روشنی سے افراد اور زندگی میں، از ازل تا امروز، جاری معرکہ خیر و شر — اور اسباب خیر و شر — کو پہچان کر جی سکے، سرخرو ہو سکے۔

❋❋

Scanned with CamScanner

نیر مسعود کی کتابیں

عطر کافور

(کہانیاں)

قیمت:80روپے

انیس

(سوانح)

قیمت:375روپے

منتخب مضامین

(تنقید و تحقیق)

قیمت:280روپے

معرکۂ انیس و دبیر

(تنقید و تحقیق)

قیمت:150روپے

ایرانی کہانیاں

(ترجمے)

قیمت:90روپے

مرثیہ خوانی کا فن

(تنقید و تحقیق)

قیمت:150 روپے

کافکا کے افسانے

(افسانے)

قیمت:70روپے

گنجفہ

(کہانیاں)

قیمت:200روپے

Scanned with CamScanner

سٹی پریس میں دستیاب اردو رسائل و جرائد

سہ ماہی نقاط، فیصل آباد
مدیر: قاسم یعقوب
قیمت:150 روپے

سہ ماہی دنیازاد، کراچی
مدیر: آصف فرخی
قیمت:160روپے

سہ ماہی آئندہ، کراچی
مدیر: محمود واجد
قیمت:80روپے

بادبان، کراچی
مدیر: ناصر بغدادی
قیمت:200روپے

سہ ماہی ارتقا، کراچی
ترتیب: راحت سعید/ڈاکٹر محمد علی صدیقی
قیمت:100روپے

سہ ماہی روشنائی، کراچی
مدیر: احمد زین الدین
قیمت:250روپے

سہ ماہی سمبل، راولپنڈی
مدیر: محمد علی فرشی
قیمت:150روپے

کتابی سلسلہ اجرا، کراچی
مدیر: احسن سلیم
قیمت:250روپے

کتابی سلسلہ مکالمہ، کراچی
مدیر: مبین مرزا
قیمت:350روپے

شعر و حکمت، حیدرآباد دکن
مدیر: شہریار، مغنی تبسم
قیمت: ضخامت کے اعتبار سے

سہ ماہی نیا ورق، ممبئی
مدیر: ساجد رشید
قیمت:120

سہ ماہی اردو، کراچی
مدیر: ڈاکٹر ممتاز احمد خان
قیمت:100

ماہنامہ قومی زبان، کراچی
مدیر: ڈاکٹر ممتاز احمد خان
قیمت:15روپے

ماہنامہ الحمراء، لاہور
مدیر: شاہد علی خاں
قیمت:50روپے

ماہنامہ نیا زمانہ، لاہور
مدیر: محمد شعیب عادل
قیمت:20روپے

Scanned with CamScanner

سٹی پریس کی کتابیں یہاں دستیاب ہیں

ویلکم بک پورٹ
اردو بازار
کراچی
فون:32633151

فضلی سنز
ٹیمپل روڈ، اردو بازار
کراچی
فون:32212991

تھامس اینڈ تھامس
نزد صدر جی پی او
کراچی
فون:35682220

سٹی بک پوائنٹ
نزد مقدس مسجد، اردو بازار
کراچی
فون:32732912

فرید پبلشرز
نزد مقدس مسجد
اردو بازار، کراچی
فون:32770057

کریمی بک کارپوریشن
نزد چاندنی شاپنگ مال
حیدرآباد کینٹ
فون: 780182

خالد بک ڈپو
درانی چوک
خانپور
فون:5577839

کتاب نگر
حسن آرکیڈ
ملتان کینٹ
فون:4510444

سانجھ پبلی کیشنز
دوسری منزل، مفتی بلڈنگ
ٹمپل روڈ، لاہور
فون:042-7355323

کوپرا بک شاپ
70، شاہراہِ قائداعظم
لاہور
فون:7321161

بک ہوم
بک اسٹریٹ،
46 مزنگ روڈ، لاہور
فون:7231518

مرزا غالب کتاب مرکز
I-8 دکان نمبر 10
سٹی آرکیڈ پلازہ بیسمینٹ
اسلام آباد

Scanned with CamScanner

نئی کتابیں

آج
(پہلی جلد)

ترتیب: اجمل کمال

Rs.795

ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ

ارشد محمود

R s.200

تیسری جنس

سندھ کے خواجہ سراؤں کی

معاشرت کا ایک مطالعہ

مؤلف: اختر حسین بلوچ

Rs.200

شہزادہ احتجاب
(ناول)

ہوشنگ گلشیری

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

Rs.70

ریت پہ بہتا پانی
(شاعری)

قاسم یعقوب

Rs.160

اردو کا ابتدائی زمانہ
(تنقید و تحقیق)

(تیسرا ایڈیشن)

شمس الرحمٰن فاروقی

Rs.250

امید اور دوسرے خطرناک مشاغل
(ناول)

لیلیٰ العلمی

انگریزی سے ترجمہ: محمد عمر میمن

Rs.100

اِنکی کے دیس میں
(ناول)

ولاس سارنگ

مراٹھی سے ترجمہ: گوری پٹوردھن، اجمل کمال

Rs.150

Scanned with CamScanner

سہ ماہی ادبی کتابی سلسلے ''آج'' کی اشاعت ستمبر 1989 میں کراچی سے شروع ہوئی، اور اب تک اس کے 65 شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ ''آج'' کے اب تک شائع ہونے والے خصوصی شماروں میں گابریئل گارسیا مارکیز، ''سرائیوو سرائیوو'' (بوسنیا)، برازیل، ورما، اور ''کراچی کی کہانی'' کے علاوہ عربی، فارسی اور ہندی کہانیوں کے انتخاب پر مشتمل شمارے بھی شامل ہیں۔

''آج'' کی مستقل خریداری حاصل کر کے آپ اس کا ہر شمارہ گھر بیٹھے وصول کر سکتے ہیں اور ''آج کی کتابیں'' اور ''سٹی پریس'' کی شائع کردہ کتابیں 50 فیصد رعایت پر خرید سکتے ہیں۔
(یہ رعایت فی الحال صرف پاکستانی سالانہ خریداروں کے لیے دستیاب ہے۔)

چار شماروں کے لیے شرح خریداری (بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان میں: 600 روپے

بیرون ملک: 70 امریکی ڈالر

*

آج کے کچھ پچھلے شمارے محدود تعداد میں دستیاب ہیں

اس کے علاوہ ماہنامہ ''شب خون'' الٰہ آباد
کے بھی کچھ پچھلے شمارے محدود تعداد میں دستیاب ہیں

Scanned with CamScanner

THE ANNUAL OF URDU STUDIES

Editor: Muhammad Umar Memon
(*University of Wisconsin, Madison*)
Assistant Editor: Jane A. Shum
(*University of Wisconsin, Madison*)

With the 25th (2010) issue of *The Annual of Urdu Studies*, this once-yearly publication will be available for South Asian readers in a special edition to be published by City Press.

Highlights of AUS 25 (2010)

The upcoming issue (roughly 400 pages) will include: (critical writing by) M.H. Askari, Anna C. Oldfield, Alison Safadi, Ian Bedford, Tariq Rahman, Ali Hashmi; (a Progressive Miscellany of writings by) Akhtar Husain Raipuri, M.H. Askari, Saadat Hasan Manto, Progressive Writers' Association, Zaheer Kashmiri, Aziz Ahmad); (Fiction by) Naiyer Masud, Zakia Mashhadi, Shafiqur Rahman, Mohsin Khan, Siddiq Alam; (Poetry by) Ghalib, Kaifi Azmi, Miraji, Ali Sardar Jafari, Zeeshan Sahil; and in its Urdu section: (fiction by) Naiyer Masud, Fahmida Riaz; (Poetry by) Najeeba Arif; and (book review by) Masoodul Hasan.

City Press
316 Madina City Mall Abdullah Haroon Road
Saddar, Karachi 74400

Scanned with CamScanner

٦٦

قیمت

۳۰۰ روپے

آج کی کتابیں

۳۱٦ مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ،

صدر، کراچی ۷۴۴۰۰

Scanned with CamScanner